جامعہ

بسم اللہ

جامعہ

زیرِ ادارت - ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

جلد ۲۸ | جنوری

فہرست

قیمت سالانہ صہ | فی پرچہ ۸ر

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس میں
چھپوا کر شایع کیا

عبادت

مذہبی عقائد کی چھان بین اور جذبہ دینی کے ارتقا کا سلسلہ قائم کرنے کی جو کوشش یورپی عالم ستر
اسّی برس سے کر رہے ہیں اُن سے کوئی اور نتیجہ نکلا ہو یا نہ ہو، قدیم زمانے کی مذہبی روایتوں اور دیومالا
کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ مشرق اور مغرب کی مقدس کتابوں کے ترجموں اور تشریحوں
نے پہلے کے مقابلے میں مذہبی عقائد کا مطالعہ بہت آسان کر دیا ہے جو عالم مختلف مذہبوں کو اپنے
سامنے رکھ کر ان پر اسی انداز سے غور کرتے ہیں جیسے کہ ایک نقاد مختلف شاعروں کے کلام پر وہ
اس نتیجے کو پہنچے ہیں کہ کسی قدیم یا جدید مذہب میں کوئی بات نئی یا نرالی نہیں ہے، اور کسی مذہب کے
پیرو یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے عقائد صحیح اور باقی سب کے غلط ہیں۔ کیوں کہ جس قدر ہم غور
کرتے ہیں اتنے ہی ہمیں اس کے ثبوت ملتے جاتے ہیں۔ کہ مذہبوں میں مشترک صفات زیادہ
ہیں۔ اور انفرادی خصوصیات کم، اور یہ خصوصیات بھی حالات اور مذاق کے فرق نے پیدا کی
ہیں۔ ایسے حقائق نئے نہیں کہ جن کا علم پہلے کسی کو نہ تھا۔ ایک اور نتیجہ جو اس تحقیق سے نکلا ہے یہ ہے
کہ ہر مذہب، خواہ وہ کسی قوم کی میراث ہو جس سے وہ اور سب کو الگ رکھنا چاہتی ہو یا ایسا
کہ جو عالم گیر بننے کا حوصلہ رکھتا ہو، دراصل انسانوں کی ایسی مادی ضروریات اور اغراض کا ایک
عکس ہوتا ہے جن کا پورا ہونا انسان کی ترقی اور کامیابی کے لئے ناگزیر ہو اور اسی وجہ سے اس
کو تقدس کا زرہ پہنا کر انکار اور مخالفت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ اور ایسی بہت سی باتیں یورپی عالموں نے اپنے کلیسا، اس کی تعلیم اور اس کے تعصبات
کی ضد میں کہیں، اور چونکہ دینی معلم شروع شروع میں ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے وہ ان
پر بہت جز بز ہوئے۔ اور ایسے تعلیم یافتہ لوگ جو پرانے عقائد سے مطمئن نہ
تھے اس نئے علم کو اصل حقیقت سمجھ بیٹھے۔ مسلمانوں میں پچھلے سو ڈیڑھ سو برس کے اندر نہ عالم ایسے

دشمن کے بچے ہوئے ہیں کہ اپنی عاقبت کو علمی تجسس کی نذر کر دیں نہ مذہبی رہنما ایسے صاحب انتہا کہ جس کھوپڑی کو غلط خیالات سے بھرا ہوا پائیں اسے پھوڑ کر رکھ دیں۔ نئے علم اور پرانے مذہب میں تضاد لوگ اب بھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ علم کی کمی یا طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے ہے، اور جیسے علم بڑھتا جائے گا اور ذہن غلامی کے اثرات سے پاک ہوتا جائے گا مذہب اور علم کی ہم آہنگی اور یک جہتی بڑھتی جائے گی۔

اگر علمی تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ دنیا کے تمام مذہب ایک ہی حقیقت کو بیان کرنے کے مختلف طریقے ہیں جیسے دنیا کی تمام نسلیں اور قومیں ایک اصل کے مختلف نمونے ہیں تو اس سے کسی مذہب کی قدر گھٹ نہیں جاتی، اور اس کی شخصیت میں بھی فرق نہیں آتا۔ نوع انسانی کا ہر فرد، خواہ اسے تعلیم اور ماحول نے ایک نمونے کے مطابق ڈھالنے کی کتنی کوشش کی ہو، اپنی الگ شخصیت ضرور رکھتا ہے۔ اور بعض افراد جن میں زیادہ قوت ہوتی ہے ہر طرح کے دباؤ کے باوجود ابھر کر نقل کی جگہ نیا نمونہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جذبۂ دینی اصل میں ہر جگہ ایک ہے لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جس میں وہ ابھر کر ایک نیا ماحول پیدا کرنے کی قوت حاصل کر لیتا ہے اور اگر بانی مذہب ایسا کامل ہو کہ ایک قوم یا ایک نسل ہی اسے اپنا نہ سمجھے بلکہ ہر قوم اور ہر نسل یعنی انسانی فطرت کا ہر نمونہ اس میں مرغوب صفات کی کامل صورت دیکھے تو مذہب خود بخود عالم گیر ہو سکتا ہے۔ اس مذہب میں ایسی حقیقت ہو نہیں سکتی جس کا کبھی کسی کو علم یا احساس نہ تھا۔ اس لئے کہ ایسی نئی حقیقت کے لئے نیا نظام کائنات اور نئی انسانی سرشت درکار ہوگی، نئی بات ہر مذہب میں بانی کی حیثیت، اس کی تعلیم کی مجموعی شکل ہوتی ہے اور مذہب کو پرکھنے کی کسوٹی یہ اندازہ ہے کہ اس میں عام انسانی سرشت اور عام انسانی ماحول کس حد تک مدنظر رکھا گیا ہے اور کس حد تک ایک خاص قوم کا مذاق اور مزاج یعنی وہ صرف اپنوں کی فکر کرتا ہے یا اپنے پرائے کی قید سے آزاد ہے۔

علمی تحقیق نے مذہب کے متعلق جو دوسری حقیقت معلوم کی ہے کہ وہ اصل میں مادی ضروریات اور اغراض کا عکس ہے علم کے پرستاروں کے نزدیک مذہب پر ایک کاری ضرب ہے۔ کیونکہ وہ

اس طرح انسانی ذہن کو تاریخ کے کھونٹے سے باندھ دیتے ہیں اور ان شاعرانہ اور علم کے نقطہ نظر
سے آوارہ خیال آرائیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ جن پر جذبۂ دینی کی پرورش کی جاتی ہے
اب ہر عقیدے کی تاریخ بیان کر دینا گویا اس کے کپڑے اتار لینا ہے کہ پھر وہ بھلے آدمیوں کا سامنا
کرنے کے لائق نہ رہے اور پرانے سے پرانے ملاقاتی بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے شرمائیں۔ لیکن
اگر تاریخ بیان کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے تو ایک عقیدہ ہی منہ چھپانے پر مجبور نہیں ہوگا۔ بلکہ ساری
انسانی تہذیب، اور علم کی روشنی میں اندھے ہو کر ہم پھر وحشیوں کی طرح ایسی حقیقتوں کو ٹٹولتے پھریں
گے، جو ہماری زندگی کا سہارا بن سکیں۔ بس فرق یہ ہوا کہ وحشی آئندہ زندگی کا سامان اپنے دلوں میں
لئے ہوئے تھے اور ہمارے دل ویرانے ہوں گے۔ ایسے انجام سے بچنے کے لئے ہمیں غور کرنا ہوگا کہ
تاریخ حقیقت کے ہر پہلو پر حاوی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اور انسان جسے پیٹ کی غلامی نے رسوا کر
دیا ہے اب کتاب کا غلام ہو کر رہے گا۔ یا اس کے ارادے میں اتنی قوت ہے کہ ان نئی زنجیروں کو
توڑ سکے۔

ارادہ تو ہر تندرست آدمی میں ہوتا ہے، تاریخ کی کرامات یہ ہے کہ اس نے ارادے کو عین
پابندی ثابت کیا ہے۔ مگر ہم کبھی کبھی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ پامال قوموں میں اچانک ایسی شخصیتیں نمودار ہوتی
ہیں کہ وہی ماحول جس پر پہلے خزاں کی تاثیر تھی بادِ بہار بن کر خوابیدہ قوتوں کو جگاتا اور مردوں میں جان
ڈال دیتا ہے۔ تاریخ کے نئے عالم ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ماحول میں اس کی قدرت ہے کہ وہ آپ
اپنی ضد بن جائے اور ایک طرح سے اپنا جادو نہ چلا سکے تو وہ دوسری طرح چلائے۔ اس کے معنی
ہیں کہ ماحول ایک ایسی قوت، اثرات کا ایسا طلسم ہے کہ جو ہمارے ذہن اور تخیل کے قابو میں نہیں
آسکتا۔ اور اسے مختارِ کل ٹھہرانا ویسا ہی عقیدہ ہے جیسے کہ اور ہزاروں عقیدے جن کی عزت کرنا علم کی
شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے اس پر طرہ یہ کہ اس عقیدے کی بدولت اچھے اور برے غلط اور
صحیح کی تمیز بھی نہیں رہتی، اس عقیدے کا مقصد سمجھانا، واضح کرنا، تحقیق کا سلسلہ جاری رکھنا ہے ہدایت
تو ہمیں نہ اس عقیدے سے حاصل ہوتی ہے نہ تاریخ کے اس دیے سے جو اس مندر میں جلایا گیا ہے تاریخ

پتا سکتی ہے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ لیکن جو واقع ہو اس کی اخلاقی قدر و قیمت جانچنے کے لئے تاریخ کا اپنا کوئی معیار نہیں۔ مورخوں کا البتہ اپنا معیار ہوتا ہے جسے ان کے عقیدے اور ذہنی تعصبات قائم کرتے ہیں لیکن اس غیر علمی معیار کو وہ اپنے عقیدوں میں اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ دیکھنے والے کو اس کا پتہ نہیں چلتا یہ ہماری سادہ لوحی ہے کہ ہم عالم اور شعبدہ باز کو آدمیوں کی دو مختلف قسمیں سمجھ بیٹھے ہیں ورنہ عالموں کے بستے پر ہر طرح کا شعبدہ کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے۔

تاریخ کے عالم شعبدہ بازی پر اس وجہ سے مجبور ہوئے ہیں کہ وہ تاریخ سے ایسے کام نکالنا چاہتے ہیں جو اس کے دائرے سے باہر اور اس کے اصل مقصد سے دور ہیں۔ تاریخ ایک نئے دین کی بنیاد نہیں بن سکتی، لیکن جذبۂ دینی کے مظاہر سے ہمیں واقف کر سکتی ہے۔ ماحول قادرِ مطلق نہیں ہے لیکن وہ انسانی زندگی کے تمام راز اپنے سینے میں رکھتا ہے۔ اس طرح یہ دعویٰ کہ مذہب مادی ضروریات اور اغراض کا عکس ہے۔ موجودہ مذہبوں کو مٹانے اور ایک علمی مذہب قائم کرنے کی نیت سے پیش کیا جائے تو وہ غلط ہے اس لئے کہ مادی اثرات معلوم کرنے کے لئے ہمارے جو ذریعے ہیں وہ محدود ہیں اور محدود رہیں گے اور ان کی حد سے گذرنے کے لئے ایسی بصیرت درکار ہے جو علم کی ایک علیحدہ اور بہت اعلیٰ قسم ہے اور کتابی عالموں اور اصطلاحوں سے بحث کرنے والے فلسفیوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن اگر یہی دعوے جذبۂ دینی کو انتہا پسندوں کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے کیا جائے تو وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ مذہب کوئی کتابی علم نہیں ہے۔ عقل کے کارخانے کی بنی ہوئی چیز نہیں۔ جذبۂ دینی انسانی زندگی اور انسانی شخصیت کو نمو اور فروغ دینے والی قوتوں کا سرچشمہ اور ان کا غیر محدود قدرتی ذخیرہ ہے اور جب تک ہم کو اس دنیا کے خاص مادی ماحول میں زندگی بسر کرنا ہے۔ مذہب کو مادی ضروریات اور اغراض سے کس طرح جدا کیا جا سکتا ہے۔ مادی ضروریات اور اغراض ادنےٰ بھی ہوتی ہیں اور اعلیٰ بھی، مگر اس کا کیا۔ انسان اشرف المخلوقات بھی ہے اور حیوان بھی۔

عبادت جذبہ دینی کی وہ شکل ہے جو مذہب اور زندگی کے تعلق کو قائم رکھتی ہے اور عبادت

کے طریقے اور اس کے جو مقصد کسی مذہب نے مقرر کئے ہوں، انھیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ
مذہب اور زندگی کا تعلق کس قسم کا ہے۔ عبادت کے ابتدائی طریقے۔ جن کا رگ وید کے بھجن اعلیٰ
سے اعلیٰ، اور جان پرستی سب سے ادنیٰ نمونہ ہے، نوع انسانی کی خیر و عافیت کے لئے دعائیں مانگنے
کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن یہ نوع انسانی کی وہ حالت تھی جب اخلاقی خیر و شر، عدل اور انصاف کا
معیار بن کر تیار نہ ہوا تھا، اور نجات کی وہ تمنا جس کے سائے میں لبعد کو زندگی بسر ہونے والی تھی
جسمانی سلامتی کی خواہش سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ عبادت کے طریقے جبلی ہیں، فطری ہیں۔ اخلاقی اور
روحانی نہیں ہیں، تاریخ اور حیاتیات کے علم ان کے اور مہذب انسانوں کی عبادت کے درمیان
رشتہ قائم کرنے میں اتنے ہی ناکامیاب ہوئے ہیں جتنا کہ انسان کا بندر سے سلسلہ ملانے میں، آدمی
انسان اسی وقت سے مانا جا سکتا ہے جب اس کو خیر و شر کا شعور اور علم ہوا۔ اور جب اس نے
اپنے اخلاقی معیار کے مطابق زندگی کی طرح ڈالنے کا حوصلہ کیا۔ اس اعتبار سے گوتم بدھ، حضرت
عیسیٰ اور پیغمبر اسلام کی تعلیم اور عبادت کا وہ مفہوم جو اس تعلیم میں مضمر ہے پہلے کے اور تمام مذہبوں
سے جدا اور اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی تاریخ کے سب سے اہم اور نتیجہ خیز انقلاب انھیں مذہبوں
کے پھیلنے سے ہوئے۔ یہی وہ اتفاقات ہیں جنھیں تاریخ سمجھا نہیں سکتی، آزاد اخلاقی ارادے،
کے وہ عظیم الشان مظہر جو ہماری آئندہ ترقی کے ضامن اور اس وقت ہمارا سب سے مضبوط سہارا
ہیں۔ یہاں اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ یہ علمی تحقیق کے کارنامے نہیں تھے۔ عبادت کے نئے
طریقوں کے ذریعے سے نئی زندگی تعمیر کرنے کے منصوبے تھے اور اس وقت بھی ہماری کامیابی
اس پر منحصر ہے کہ ہم اپنی حکمتِ عملی کو علوم صحیحہ کا محتاج نہ بنائیں۔ بلکہ اسے عبادت کا مظہر جانیں
میں دراصل کچھ کہنا اور چاہتا ہوں یہ تمہید تو اس لئے ضروری تھی کہ بغیر اس کے میں اپنا
مطلب سمجھا نہیں سکتا تھا۔ جب ایک طرف لوگ مذہب کو اپنی نئی زندگی سے جان بوجھ کر خارج
کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف لوگ بغیر جانے بوجھے اپنے مذہب کا اسی نئی زندگی سے رشتہ
توڑ رہے ہیں۔ ہندوستان میں مذہب کی مخالفت کرنے والے بہت سے ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ

وہ ارتقار کی اس منزل سے گذر چکے ہیں۔ جہاں اخلاق اور اعلیٰ مقاصد کے لئے مذہب اور عقیدے کا سہارا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے یورپ میں تعلیم پائی ہے یا ان کی نئی معاشرت ان پابندیوں کو گوارا نہیں کر سکتی جو مذہب نے مقرر کی ہیں۔ ان میں سے جو لوگ تعلیم کی بدولت پہنچے ہوئے بنتے ہیں ان کا علمی اور عقلی سرمایہ یورپ کے کسی مفکر کے دو چار نظریے ہوتے ہیں۔ یہ بے بھگو وہ احتیاط بھی نہیں برتتے جو خود علم سکھاتا ہے اور ایسے نظریوں کو بھی بڑے جوش کے ساتھ دہراتے رہتے ہیں جو اگر غلط ثابت نہیں کئے جا چکے ہیں تو حقیقت کا مرتبہ ہرگز نہیں رکھتے، چونکہ وہ خود ارتقار کی اس منزل سے گذر چکے ہیں جہاں قول اور عمل پر ادب اور احترام کی قید لگی ہوتی ہے۔ وہ سقراط کی طرح اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ناداقوں کو چھیڑ کر دانا بنائیں۔ لیکن ان میں سقراط کی سی انسانی ہمدردی اور خلوص نہیں ہوتا۔ سقراط تو سقراط تھا[1] یہ ڈانس بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جن کی قسمت ذرا اچھی ہوتی ہے بعض تو بے چارے اپنے غصہ کی آگ میں بھنتے رہتے ہیں۔ نہ آدمی نہ کباب، نئی معاشرت کے شیدائی پھر کچھ اچھے رہتے ہیں ان کے پاس روپیہ ہوتا ہے، چین سے رہتے ہیں۔ اپنے ہی جیسوں سے میل جول رکھتے ہیں اور بحث کا موقع ہوا تو اپنے کسی عام بھائی کو سامنے کر دیتے ہیں۔ نئی زندگی کے یہ دونوں قسم کے ہراول اپنے ان بھائیوں سے جو مذہب اور قدامت پسندی میں گرفتار ہیں سبقت لے جاتے ہیں تو بس اس اعتبار سے کہ اُن کی گرفتاری اور غلامی نئی وضع کی ہے۔

ہندوستان میں مذہب کے ایسے مخالف بھی ہیں جو مصلحت کی بنا پر مذہب کو بحث سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اب تک فسادیوں اور غداروں نے ہمیشہ مذہب اور ملت کی آڑ لی ہے اور سیاسی اغراض اور مفادِ عامہ کا احساس ہندوستانیوں میں جو تھوڑا بہت اتحاد پیدا کرتا ہے اسے مذہب اکثر مٹا دیتا ہے ان لوگوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ترقی اور اصلاح کے رستے میں مذہب کے روڑے اٹکانے والے آدمی کیسے ہیں اور قوم کو دھوکا دیتے ہوئے وہ اپنی ذاتی اغراض کو چھپا سکتے ہیں

---

[1] سقراط نے ایتھنز کی جمہوری عدالت کے سامنے یہ عذر پیش کیا تھا کہ میں ڈانس ہوں میرا کام ایتھنز والوں کو ستانا ہے

یا نہیں وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ فساد اور غداری کسی کو ملت سے خارج نہیں کر دیتی۔ اور مسلمان مسلمان رہتا ہے چاہے وہ ملت کا خادم ہو یا اسے ہر خریدار کے ہاتھ بیچتا پھرے۔ اس صورت میں مذہب سے علیحدہ ہوئے بغیر کوئی کام نہیں بنتا اور اگر مذہب کو چھوڑنے سے ایسے بہت سے آدمی بھی چھٹ جائیں جو قومی مقاصد حاصل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں اس خیال کے جو لوگ ہیں وہ چاہے اصولاً ہر مذہب کے مخالف ہوں اور وہی عقیدے رکھتے ہوں جو یورپی علم یا معاشرے کے غلاموں کے ہیں۔ اُن کی شکایت بالکل بجا ہے۔ ہم برسوں سے ہر روز اور ہر جگہ مذہب کے دغاباز خیرخواہوں کو ہندوستانی قوم ہی نہیں بلکہ اپنی ملت کا کام بگاڑتے اور بے آبرو کرتے دیکھتے آئے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرف سے جو اصولاً اور پورے خلوص کے ساتھ مذہب کو صحیح زندگی اور سچی کامیابی کی بنیاد مانتے ہیں کوئی تحریک نہیں ہوئی ہے کہ دین داری کو پرکھنے کے لئے قوم پرور اخلاق اور مفاد عامہ کا معیار مقرر کیا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسا معیار مقرر نہ کیا گیا تو ہندوستان کی ہر ملت اور سب سے پہلے مسلمان خود پرست اور انگریز پرست غداروں کے ہاتھوں تباہ ہوں گے۔

تو باوجود اس کے کہ مذہب پر اعتراض کرنے کا طریقہ اکثر خود قابل اعتراض ہوتا ہے ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں، اور اب میں بحث صرف مسلمانوں سے کرنا چاہتا ہوں، دین اور دنیا کے درمیان وہ رشتہ نہیں رہا ہے جو ان کا دین سکھاتا ہے وہ اپنی عبادت کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہیں یا اسے نظر انداز کر رہے ہیں جس کا ہماری موجودہ پستی اور انتشار ہی ایک ایسا ثبوت ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہماری عبادت سراسر روحانی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ایک تقریب بھی ہے۔ وہ شخصی صرف اس حد تک ہو سکتی ہے کہ خلوص ہر شخص کے لئے لازمی ہے۔ وہ پرستش کا طریقہ ہی نہیں۔ اتحاد اور یک جہتی رکھنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ انتہا پسندی نے عبادت کے مفہوم کو روزہ نماز کی پابندی تک محدود کر دیا ہے۔ اور روزہ نماز کا مقصد بھی ثواب کمانا ٹھہرایا ہے۔ اور اگر اسلام نے دینی فرائض مقرر کرنے

ہوئے دنیاوی ضروریات کا خیال رکھ کر ایسے رجحانات کی پیش بندی نہ کر لی ہوتی تو ہمارے انتہا پسند بزرگ ایسے اپاہج کے سوا جس کی عمر پلنگ سے اُٹھ کر مصلے پر اور مصلے سے اُٹھ کر پلنگ پر جانے میں صرف ہو، کسی اور طرح کا مزاج اور جو صلہ رکھنے والے آدمی کے لئے دین دار بننا مشکل کر دیتے، لیکن اسلام کی حکمت اور اس کی فطرت شناسی میں بھی ہیں اس تنگ نظری یا یوں کہئے اس روحانی کاہلی سے بچا نہیں سکی ہے جو عبادت کے آسان سے آسان طریقے تلاش کر کے انھیں محبت اور تحسین کی موشگافیوں اور تقدس اور سند کے وزن کے ذمہ داری کا ایک اچھا خاصا پیا بنا دیتی ہے اور بہت سے فرائض کو جنھیں ادا کئے بغیر اسلامی عبادت کبھی مکمل نہیں ہو سکتی نظر انداز کر دیتی ہے اسے ہم صاف صاف کہنا چاہیں تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ روزے اور نماز کو لوگ آسان دیکھ کر انھیں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ جہاد کو جو ارکان اسلام میں اتنی ہی بڑی حیثیت رکھتا ہے بھلا دیتے ہیں۔ اس کی ایسی مہمل تشریح کرتے ہیں کہ اس کا موجودہ حالت میں فرض ہونا ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔ مسلمان جہاد کی کسوٹی پر کسی کے ایمان کو پرکھ نہیں سکتے، ایک ریاکاری ہی نہیں بلکہ صریحی غداری کو تسبیح اور مصلے کی بساط بچھاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور کچھ کہہ نہیں سکتے، اس لئے کہ وہ غلط فہمی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ہمیشہ مخالف اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے مرحلے ہی سے گذر نہیں پاتے۔ نقصان وہ پہنچاتی ہے، لعنت کسی اور پر بھیجی جاتی ہے

اپنی جداگانہ حیثیت رکھنے کے علاوہ یہ کہنا بھی غلط تھا اور اب بھی غلط ہے کہ مسلمان پر روزے نماز کی ادائگی فرض نہیں غور اسی پر کرنا ہے کہ روزہ اور نماز علامت ہیں اس عبادت کی جو ملت کی معاشی، سیاسی اور اخلاقی اصلاح اور ترقی سے ادا ہوتی ہے مسجد بنا کر کھڑی کر دینا کافی نہیں کہ قبلہ صرف ملی آزادی کی صاف فضا میں نظر آ سکتا ہے۔ غریب اور امیر کا ایک صف میں کھڑا ہو جانا کافی نہیں۔ قوم اور ملت کی معاشی حالت میں توازن پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ گھر میں وقت سے نماز پڑھ لینا کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے اگر شخصی زندگی میں کوئی ضبط اور نظام اور مقصد نہیں، نیت باندھنے سے پہلے اور سلام پھیرنے کے بعد نمازی کے دل پر ذاتی اغراض

کا ہم رہتا ہے اور وہ خلوص کے ساتھ صرف اپنی ہی سلامتی اور کامیابی کے لئے دعا مانگ سکتا ہے۔ جب تک جہاد کا حوصلہ دل میں نہ ہو اور زندگی میں اپنا رنگ نہ دکھلائے ہماری عبادات ادھوری رہ جاتی ہیں۔

جہاد کے لئے کافر کی شرط لگائی جائے تو وہ بے شک ایک فرض ثابت نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ کفار مکہ کے نمونے اس وقت ہمیں بہت تلاش کرنے پڑیں گے لیکن اگر ہم یہ سوچیں کہ مسلمانوں کو پچھلے دو تین سو برس میں کس نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور کیسے تو ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کے اصل دشمن کون ہیں اور ہندوستان میں ہمارے مذہب اور ہماری ملت پر غلامی کا جو دھبہ ہے وہ کیسے مٹایا جا سکتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو۔ ہندوستان کو آزاد کرنا، اور بلا کسی شرط اور تحفظ حقوق کے آزاد کرنا ہمارا دینی فرض ہو جاتا ہے اور اگر ہم بے وقوف نہیں بننا چاہتے ہیں تو ہمیں ہتھیار بھی وہی استعمال کرنا چاہئیں جو اس وقت کام آسکتے ہیں۔ ہمارا مقصد میدان میں پرا جما کر کھڑے ہونے سے پورا نہیں ہوگا بلکہ اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے سے۔ جان دینے سے نہیں بلکہ جان کھپانے سے، اس کا نام قومی خدمت یعنی قوم پر احسان کرنا کہئے تو یہ بہت مشکل ہوتا ہے اور اس سے طبیعت جلد اکتا جاتی ہے۔ اسے عبادت سمجھئے تو یہ عادت بن جاتا ہے، خود بخود ہوتا رہتا ہے اور آدمی کی نظر دنیا کی کامیابی پر نہیں بلکہ عاقبت پر رکھ کر اس میں وہ عاقبت اندیشی اور انسانی فطرت کا لحاظ پیدا کر دیتا ہے جو اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتا۔

لیکن دنیا نے آج کل ایسا رنگ اختیار کیا ہے کہ سیاسی آزادی جہاد کی تمہید نہیں تو اس کا پہلا باب ہی ہو سکتی ہے کہ سیاسی آزادی کے ساتھ ایسی معاشی غلامی ہونا بھی ممکن ہے جو آدمی کی آبرو کو خاک میں ملا دے اور اسے اس لائق بھی نہ رکھے کہ وہ بازار میں اپنی محنت کیا اپنے آپ کو بیچ کر بھی دو کوڑی حاصل کر سکے۔ ایسا افلاس ممکن ہے جو انسانیت کو بالکل پامال کر دے۔ مختلف طبقوں اور ملتوں میں ایسی بیگانگی اور عداوت ممکن ہے جو کھلم کھلا خانہ جنگی

سے بھی بدتر ہو۔ ہمارے دشمن غیر ہی نہیں بلکہ مختلف طبقوں اور ملتوں کی غیریت بھی ہے اور اغراض کا ایسا اختلاف اور تصادم جو کہ آزادی کے مفہوم ہی کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہو، تاریخ کو دیکھئے تو آزادی کے مطالبے کے ساتھ ہمیشہ ایک غرض لگی ہوتی ہے۔ آزادی کے جھنڈے کے نیچے ایک فوج بھی کھڑی ہوئی ہے۔ کبھی آزادی مذہبی جماعتوں کا مطالبہ تھی جو آزاد ہوئے بغیر اطمینان سے اپنے مذہب کی پیروی نہیں کر سکتی تھیں۔ کبھی وہ ایسے طبقوں کا نعرہ تھی جن کی نشوونما ریاست یا قدامت پسند طبقے روکے ہوئے تھے۔ اس نے بعض جو نیا یا دہ سیاسی تھا، لیکن تھی در اصل وہ کچھ اور اس وقت اگر ہم یہ سمجھیں کہ آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو ہم آزادی کی بس ظاہری شکل دیکھیں گے۔ اور ظاہری شکل کے ساتھ ہمیشہ ڈھول کے اندر پول کا شبہ لگا رہتا ہے۔ ہمارے دلوں میں آزادی کے حوصلے کو ایک نئی زندگی تعمیر کرنے کا حوصلہ ہونا چاہئے اور زندگی ایک طبقے کے مفاد، کسی ایک خیال کے پرچار سے بہت زیادہ بڑی چیز ہے۔

اس وقت یہ ممکن ہے کہ ان لوگوں کو جو مظلوم ہیں یا اپنے حق سے محروم رکھے گئے ہیں ظلم اور زیادتی کا احساس دلا کر بیدار کیا جائے اور انھیں ان اغراض کی مخالفت ہی پر نہیں جن کی بدولت یہ ظلم ہوا بلکہ اس سارے نظام حیات کو جس نے یہ ظلم روا رکھا درہم برہم کرنے پر آمادہ کیا جائے یعنی مختلف طبقوں کی عداوت مذہب اور تہذیب کی بیخ کنی اور سماج کے اندر خانہ جنگی، وہ تمام مرحلے طے کئے جائیں جنھیں بغیر آجکل انقلابی تحریک کا اصولاً صحیح اور عملاً کامیاب ہونا دشوار مانا جاتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم روس کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں، قومی سیرت اور مخصوص حالات کا گہرا مطالعہ کریں دنیا کا رنگ دیکھتے رہیں اور زندگی کی ایسی اصلاح کریں جو چاہے کسی خاص فلسفے کے مطابق نہ ہو مگر ہمارے دیس اور دیس والوں کو پورا پورا فیض پہنچائے۔ یعنی اس وقت جو ظلم ہو رہا ہے اسے بند کرنے، جو اندھیرا پھیلا ہے اسے دور کرنے، جو مردنی چھائی ہے اس میں نئے حوصلوں کی جان ڈالنے کے لئے دو صورتیں ممکن ہیں، عداوت اور عبادت، اور اگر ہماری عبادت ثواب کمانے تک محدود رہی تو عداوت بلا روک ٹوک اپنا کام کرے گی۔

غزل کی حمایت

اعتراضات اور جوابات

ذیل کا مضمون حکیم آزاد انصاری صاحب
کے مجموعہ کلام کے مقدمے کا ایک حصہ ہے
جو ہنوز زیرِ طبع ہے۔

بعض کور مذاق اپنی زبان اور اپنے شعر و ادب کے دشمن کچھ عرصہ سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ غزل کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا جائے۔ یہ نادان اپنی غزل کی دشمنی کے ثبوت میں حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔ (۱) "غزل کا معشوق مذکر ہوتا ہے، اور یہ ایک شرمناک امر ہے" (۲) "غزل آج تک انہیں مضامین و مطالب کی حامل چلی آ رہی ہے جو صدیوں پہلے ظاہر کئے جا چکے ہیں، اس میں خیالات نو کی مطلق گنجائش نہیں"۔ (۳) "غزل کے معشوق کا دہن موہوم ہوتا ہے، کمر معدوم ہوتی ہے، قد سرو و شمشاد سے بھی دو ہاتھ اونچا ہوتا ہے، گردن گردنِ صراحی سے بھی دو تین بالشت لمبی ہوتی ہے، اس کی آنکھیں گلہائے نرگس کے مثل، اس کے بال سنبل کے مانند، اس کی زبان برگ سوسن کے مشابہ ہوتی ہے۔ یہ معشوق ایک ناممکنات کا پتلا ہوتا ہے، اگر کسی طرح مجسم کر دیا جائے تو آدمی ڈر ڈر کے بھاگنے لگیں" (۴) "غزل بوالہوسی اور پست خیالی سکھاتی ہے" (۵) "غزل کا ہر شعر جداگانہ اور متضاد مضمون کا حامل ہوتا ہے، اس کے اشعار میں کوئی ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا، وہ بالکل ایک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے، جو ذہن انسانی کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ واحد دماغ میں بیک وقت اتنے مختلف اور متضاد خیالات پیدا ہو سکیں" (۶) "تمام اصنافِ سخن میں تو مطالب و معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، مگر غزل میں اس کے برخلاف الفاظ کے لئے مطالب و معانی کی جستجو کی جاتی ہے اور یہ ایک بالکل غیر فطری طریقہ ہے"۔ یہ دلائل بظاہر تو نہایت وزنی اور قطعی مسکت نظر آتی ہیں، مگر درحقیقت بالکل بے وزن، بے حد

فریب دہ اور محض ہیچ پوچ ہیں اور ان کی پیداوار نتیجہ ہیں صرف مغرب زدگی کا ۔ بالترتیب جوابات ملاحظہ ہوں

(۱) "غزل کا معشوق مذکر ہوتا ہے، اور یہ ایک شرمناک امر ہے" غزل کا معشوق مذکر نہیں ہوتا بلکہ اس میں افعال و صفات مذکر استعمال کئے جاتے ہیں، یہی بالکل درست ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے اس کی وجوہ حسبِ ذیل ہیں:۔

اوّل مرد صنفِ قوی ہے اور عورت صنفِ نازک، اور ہر امر میں صنفِ قوی کا لحاظ زیادہ رکھا جاتا ہے۔ اگر مرد و عورت کا جدا جدا ذکر کریں گے تو یوں کہیں گے "اتنے مرد آئے، اتنی عورتیں آئیں" لیکن جب مخلوط و مشترک ذکر منظور ہوگا تو یوں کہنا پڑے گا "اتنے مرد عورت آئے۔ یا اتنے عورت مرد آئے"۔ یعنی لفظ عورت خواہ مقدم ہو یا موخر فعل دونوں صورتوں میں مذکر ہی رہے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افعال و صفات مذکر کو افعال و صفاتِ مونث پر ترجیح ہے اور یہ دونوں صنفوں کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

دوم جب کوئی ایسا عام حکم دیا جاتا ہے جو مرد و عورت دونوں کو حاوی ہو اس وقت بھی ہمیشہ افعال و صفات مذکر ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً "جو شخص اس رستے سے گذرے گا اس کو دس روپے جرمانے کی سزا دی جائے گی"۔ یہاں بھی فعل مذکر ہی استعمال کیا گیا ہے۔ مگر صرف اس بنا پر کہ اس حکم میں فعل مونث "گذرے گی" استعمال نہیں کیا گیا عورت کو اس حکم کے اثر سے مستثنےٰ قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اگر یوں کہا جاتا "جو اس رستے سے گذرے گی اُس کو دس روپے جرمانے کی سزا دی جائے گی"۔ تو بالیقین مرد اس حکم کے دائرۂ اثر سے خارج ہوتا۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ افعال و صفات مذکر کو ترجیح ہے اور ان کا دائرۂ اثر مرد و عورت دونوں کو محیط ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کے قوانینِ حکومت اور ہر مذہب کے قوانینِ شرع میں تمام و کمال افعال و صفات مذکر ہی استعمال کئے گئے ہیں، جو مرد و عورت دونوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دیکھو مقدمہ شعر و شاعری مصنفہ علامہ حالیؒ۔

سوم، اگر غزل میں افعال و صفات مونث لائے جانے لگیں تو صرف عورت بہ حیثیت معشوق باقی رہ جائے گی اور مرد اس کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا، حالانکہ کبھی مرد عاشق ہوتا ہے اور کبھی عورت

اور غزل ظاہری مرد و عورت دونوں کے معاملاتِ عشق کے اظہار کا ذریعہ اس لئے غزل میں افعال و صفات مذکر ہی کا استعمال زیادہ انسب ہے کہ وہ ان دونوں صنفوں کو حاوی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عورتیں بھی جب غزل کہتی ہیں تو وہ بھی افعال و صفات مذکر ہی کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہندی میں شاعری صنفِ نازک کی زبان سے کی جاتی ہے اور اس میں افعال و صفات مؤنث استعمال کئے جاتے ہیں، اور مرد و عورت دونوں کو حاوی ہوتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ جناب آپ کے اس استدلال کو افعال و صفات مذکر کی حد تک تو قبول کیا جا سکتا ہے مگر ستم تو یہ ہے کہ غزل میں "سبزہ خط" "چہرا" "دستار" "ترک بچہ" اور "ہندو بچہ" جیسے مخصوص بہ صنف قوی الفاظ بھی تو پائے جاتے ہیں، جس سے قطعی یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل کا معشوق مذکر ہی ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت! آپ ایسے مرد کا مرد کے ساتھ عشق جتاتا کیوں کہتے ہیں، ممکن ہے ان میں عورت کے جذباتِ عشق ظاہر کئے گئے ہوں، اب اگر یہ کہیں گے کہ جناب! یہ اشعار تو اکثر مردوں کے کہے ہوئے ہیں"۔ تو میں کہوں گا کہ بے شک یہ مردوں کے کہے ہوئے ہیں۔ مگر کیا مرد عورت کے جذباتِ عشق ظاہر نہیں کر سکتا؟ آخر کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا عورت مرد پر عاشق نہیں ہوتی اگر مرد نے عورت کے جذباتِ عشق بھی حوالہ قلم کر دئے تو اس نے کیا گناہ کیا۔ اگر یہ کوئی عیب ہے تو اس کو ہر حالت میں عیب ہونا چاہئے۔ یہ کیا ستم ہے کہ مرد ہندی شاعری میں عورت کے جذباتِ عشق ظاہر کرے تو وہ درست مگر غزل میں نادرست۔ اور پھر آپ اس عیب کو اپنی دیگر اصنافِ سخن مثنوی اور نظم وغیرہ میں تو جائز رکھیں اور بیچاری غزل کو اس بنا پر گشتنی و گردن زدنی قرار دے دیں۔ اور آخر مردانہ حسن بھی تو آخر حسن ہوتا ہے، وہ بھی دلوں کو لبھاتا ہے، وہ بھی نظروں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے، اس میں بھی ایک خاص کشش ہوتی ہے، وہ بھی تعریف کئے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ جب یہ درست ہے اور درحقیقت درست ہے تو پھر ایسے اشعار کو برے معنی پہنانے کس کا قصور ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ایک مرد نے ایک مرد کے حسن کی تعریف کر دی ہے اور بس۔

اب ایک آخری صورت اور باقی رہ گئی ہے، اور وہ یہ کہ اگر مرد جذبات عشق ظاہر کرے تو اس کو افعال وصفات مونث استعمال کرنے چاہئیں، اور اگر عورت ظاہر کرے تو اس کو افعال و صفات مذکر البتہ یہ درست بھی ہے اور مناسب بھی، واقعی ایسا ہی ہونا چاہئے، مگر غزل میں نہیں بلکہ دیگر اصناف سخن مثنوی اور نظم وغیرہ میں۔ اس کی وجہ وجہ چہارم میں ملاحظہ ہو۔

چہارم۔ دنیا بھر جانتی ہے کہ متغزلین کی شاعری مجازی شاعری تک محدود نہیں ہوتی، ان کو حقیقی شاعری یعنی متصوفانہ شاعری بھی کرنی پڑتی ہے، اور معشوق حقیقی مذکر ہے، اس کو مونث نہیں بنایا جاسکتا اس لئے غزل میں افعال وصفات مذکر کا استعمال صرف بہتر و مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری و ناگزیر بھی ہے۔

(۲) غزل آج تک انھیں مضامین ومطالب کی حامل چلی آرہی ہے جو صدیوں پہلے ظاہر کئے جا چکے ہیں، اس میں خیالاتِ نو کی مطلق گنجائش نہیں" یہ غزل دشمن اصحاب شاید واقف نہیں۔ اگر واقف ہیں تو بالیقین اس کھلی حقیقت کے اعترافِ سے پہلو تہی کرتے ہیں کہ صنف غزل مخصوص ہے صرف معاملات حسن وعشق کے اظہار کے لئے۔ یہ جذبات واحساسات تمام دوسرے جذبات واحساسات سے محبوب ومرغوب تر جذبات واحساسات ہیں۔ یہ کبھی پہلے چھپائے جا سکے ہیں، نہ آئندہ چھپائے جاسکیں گے، یہ ہمیشہ ظاہر کئے جاتے رہے ہیں اور ہمیشہ ظاہر کئے جاتے رہیں گے۔ یہ اس قدر قوی ہیں کہ کوئی مخالف ومزاحم قوت ان کے اظہار کو روک نہیں سکتی جس طرح زندگی کے لئے چلنا پھرنا کھانا پینا اور سانس لینا ضروری ہے اسی طرح ان کا اظہار بھی ضروری ہے۔ یہ جذبات واحساسات محدود ہیں، غیر محدود نہیں، ان کی ہمیشہ تکرار ہوتی رہی ہے، اور ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ آخر بیچارے غزل گو حضرات نئے جذبات واحساسات لائیں کہاں سے، ایک بڑے سے بڑا متغزل بھی صرف اتنا ہی کر سکتا ہے کہ ان جذبات واحساسات کو اپنی قوتِ تخیلہ اور اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے مدد لے کر ایک نئی، دل کش، انوکھی اور حسین تر صورت میں پیش کر دے اور بس، اور اسی کا نام شاعری و کمال شاعری ہے۔ بہ فرض محال اگر دشمنانِ غزل غزل کے مٹانے میں کامیاب بھی ہو جائیں، اور

غزل صنفِ شاعری سے محو بھی کر دی جائے تو بہرحال ان جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے کوئی دوسری صنفِ شعر تلاش کرنی پڑے گی۔ جب ایسا ہے اور ضرور ایسا ہی ہے تو پھر غریب غزل ہی نے کیا قصور کیا ہے، جو آپ اس کو حلال گردانا چاہتے ہیں۔

اب رہا اس اعتراض کا دوسرا جزو کہ غزل میں خیالاتِ نو کی گنجائش نہیں، یہ بھی ایک بڑی حد تک غلط ہے۔ اگر کوئی غزل میں یہ گنجائش پیدا کرنا چاہے تو بالیقین پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور بلند خیال اور وسیع النظر متغزلین یہ گنجائش پیدا بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ گنجائش اسی حد تک پیدا کی جا سکتی ہے جس حد تک کہ غزل غزل باقی رہے لیکن دشمنانِ غزل تو غزل کا وجود ہی باقی رکھنا نہیں چاہتے۔ اس حیثیت سے تو لفظ "گنجائش" لفظ مہمل ہو کے رہ جاتا ہے۔

(۳) "غزل کے معشوق کا دہن موہوم ہوتا ہے۔ قد سرو شمشاد سے بھی دو ہاتھ اونچا ہوتا ہے گردن گردنِ صراحی سے بھی دو چار بالشت لمبی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں گلہائے نرگس کا نقشہ اس کے بال سنبل کے مشابہ اور اس کی زبان برگِ سوسن کے مانند ہوتی ہے، یہ معشوق ایک ناممکنات کا تپلا ہوتا ہے، اگر اس کو کسی طرح مجسم کر دیا جائے تو آدمی ڈر ڈر کے بھاگنے لگیں۔"

دشمنانِ غزل کا یہ اعتراض بھی چنداں قابلِ اعتنا نہیں۔ اصلیت صرف اتنی ہے، کہ چھوٹا دہانہ (دہن) پتلی کمر، دراز قد اور لمبی گردن خوشنما معلوم ہوتے ہیں، اور اگر ایک حسین میں حسن کے ساتھ یہ صفات بھی پائی جائیں تو اس کا حسن زیادہ دلفریب اور زیادہ جاذبِ نظر ہو جاتا ہے۔ اب رہ گئے سرو شمشاد، نرگس، سنبل و سوسن۔ یہ محض تشبیہی الفاظ و اشیا ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ سرو شمشاد اپنے قد و قامت کے لحاظ سے خوش نما نہیں ہوتے۔ نرگس کے پھول میں چشمِ معشوق کی سی مستی نہیں پائی جاتی، سنبل کسی حسین کے بکھرے بالوں کی یاد نہیں دلاتی۔ برگِ سوسن کسی کی زبانِ حسین سے مشابہ نہیں ہوتی، مختصر یہ ہے کہ یہ سب تشبیہی الفاظ اور تشبیہی اشیا ہیں۔ ان کا استعمال غزل میں محض تشبیہاً کیا جاتا ہے نہ کہ بطور اصل و حقیقت۔ مگر دشمنانِ غزل ہیں کہ ان تشبیہات کا اک خوفناک مجسمہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ہم غزل سے نفور ہو جائیں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ بعض مبالغہ پسند

غزل گو اصحاب نے ان تشبیہات کا استعمال حد سے گذرے ہوئے مبالغہ کے ساتھ کیا ہے اور مخالفین غزل کو اسی سے غزل کے معشوق کی ایسی بھونڈی تصویر بنانے کا سامان . . . . . . ہاتھ آیا ہے۔ مگر یہ تصور ان مبالغہ پسند غزل گویوں کا ہے نہ کہ غزل کا۔

(۲) تو غزل پست خیالی اور بوالہوسی سکھاتی، بلکہ پست خیال غزل گو یہ گندگی پھیلاتے ہیں، کیونکہ غزل گویوں میں اکثریت پست خیال شعرا کی ہے۔ مگر یہ غزل گویوں ہی پر کیا منحصر ہے، ہر صنف شعر میں بہت خیال شعرا کی کثرت ہوا کرتی ہے، اور وہ اپنے پست خیالات اور شرمناک جذبات کی اشاعت سے ملک کی ادبی فضا کو گندہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ شعرا حقیقت میں شاعر نہیں ہوتے بلکہ متشاعر ہوتے ہیں۔ یہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر دَور میں ہوتے ہیں۔ یہ پہلے بھی تھے، اور اب بھی موجود ہیں اگر یہ سچ ہے کہ ہر شے اور ہر کیفیت اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے تو شعرا کے ساتھ متشاعرین کا وجود بھی اسی طرح لازم و ضروری ہے، جس طرح نور کے ساتھ ظلمت کا وجود، اگر متشاعر نہ ہوں تو حقیقی شاعر کی تمیز ناممکن ہو جائے۔ متشاعرین کی شاعری ہمیشہ نظرانداز کی جاتی رہی ہے، اور اسی کو اب بھی نظرانداز کر دینا چاہئے۔ یہ خود کبھی باقی رہے ہیں نہ ان کی شاعری باقی رہی ہے، نہ یہ آئندہ باقی رہیں گے، نہ ان کی شاعری باقی رہے گی۔

متشاعرین کے برخلاف حقیقی شعرا ہر زمانے میں کم ہوتے ہیں، اور بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ پہلے بھی کم ہوتے تھے اور اب بھی کم ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ پیغمبروں کی طرح عندالضرورت کبھی کبھی مبعوث ہوا کرتے ہیں، نہ یہ خود پست ہوتے ہیں اور نہ ان کی شاعری پست ہوتی ہے، یہ بلند فطرت، بلند خیال اور بلند نظر ہوتے ہیں۔ یہ جب آتے ہیں تو اپنی قوم، اپنے ملک اور اپنے شعر و ادب کے لئے حیاتِ نو کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ اور جب جاتے ہیں تو ان سب کو بقائے دوام عطا کر جاتے ہیں، ایسے بلند فطرت شعرا کو پست خیالی اور بوالہوسی کی اشاعت کا ذمہ دار قرار دینا چاند سورج کو تاریکی و ظلمت کا ذمہ دار ٹھہرانے سے ہرگز کم نہیں۔

زمانۂ حال کے بلند فطرت اور بلند خیال شعرا کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔ جنابِ بیخودؔ دہلوی

حضرت جگر مراد آبادی ۔ مولانا وحشی شاہجہاں پوری، مولانا حسرت موہانی ۔ جناب آرزو لکھنوی، جناب صفی لکھنوی ۔ جناب فانی بدایونی ۔ جناب جوش ملیح آبادی ۔ جناب نجم آفندی اکبرآبادی ۔ جناب سیماب اکبرآبادی ۔ جناب امجد حیدرآبادی ۔ جناب ضامن کنتوری ۔ جناب چکبست مرحوم ۔ علامہ کیفی دہلوی ۔ جناب پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی ۔ جناب مولانا ظفر علی خاں صاحب ۔ علامہ سر اقبال ۔ جناب سالک مدیر انقلاب لاہور (اگر کسی ضروری صاحب کمال کا نام بوجہ لاعلمی یا سہواً اندراج سے رہ گیا ہو تو خواستگار معافی ہوں)

ان میں بعض صرف غزل گو حضرات ہیں اور بعض ناظم (نظم کہنے والے) بعض ایسے جامع کمال ہیں کہ وہ غزل گو بھی ہیں اور ناظم بھی، اور بعض ایسے وسیع نظر اور وسیع الخیال افراد ہیں جن کی شاعری غزلیاتی یا منظوماتی شاعری کے دائرے کو توڑ کر حکیمانہ و مصلحانہ شاعری کی حدود میں داخل ہو چکی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان غیر معمولی شاعرانہ دل و دماغ رکھنے والی صاحبِ کمال ہستیوں میں سے علامہ سر اقبال، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت فانی بدایونی، مولانا ظفر علی خاں صاحب اور علامہ سیماب اکبرآبادی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

اگر آپ مندرجہ بالا فہرست پر تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو اس میں آپ کو اکثریت متغزلین ہی کی نظر آئے گی۔ للہ ہم کو بتایا جائے کہ ان صاحبِ کمال ہستیوں میں سے خواہ وہ متغزل ہوں یا غیر متغزل کس کی شاعری پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بوالہوسی و پست خیالی سکھانے والی ہے۔ اب اگر آپ ان کو چھوڑ کر یا ان میں شامل کر کے کلّو، ننھو، بدھو یا شبراتی وغیرہ جیسے وقیع شعرا کے نام پیش کرنے کی جرأت کریں گے تو پھر آپ کو جوابِ جاہلاں باشد خموشی۔ سننے کو تیار رہنا چاہئے۔ بہر حال غزل کی بلندی و پستی بھی اور اصنافِ سخن کی طرح کہنے والے پر موقوف ہے اگر کہنے والا پست خیال ہے تو وہ ضرور پست ہو گی، اور بلند خیال ہے تو وہ بالیقین بلند ہو گی یہ اگر سچ ہے اور درحقیقت سچ ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پست خیالی و بوالہوسی کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں تو وہ ہمارے ملک کے متشاعر ہیں، یا پھر وہ مدیرانِ رسائل و جرائد جو اپنی سنہری

روپہلی مصلحتوں کی بنا، یہاں متشاعرین کا کلام شایع کرتے رہتے ہیں۔

(۵) "غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال اور جذبے کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے اشعار میں کوئی ربط، ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا۔ وہ بالکل ایک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے۔ خود ہی انسان کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے، یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک واحد دماغ میں بہ یک وقت اس قدر مختلف اور متضاد خیالات پیدا ہو سکیں"۔ اس اعتراض کے تین جزو ہیں۔ پہلا جزو یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال یا جذبے کا حامل ہوتا ہے، اس کے اشعار میں کوئی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا۔" یہ بالکل درست ہے کہ عموماً غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال کا حامل ہوتا۔ مگر یہ بالکل غلط ہے کہ اس میں کوئی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا۔ مسلسل غزلیں کی حد تک تو جو فارسی میں زیادہ اور اُردو میں نسبتاً کم پائی جاتی ہیں، شاید غزل دشمن حضرات بھی ربط و ہم آہنگی اور تسلسل کے قائل ہوں، رہ گئیں غیر مسلسل غزلیں۔ اگر غائر نظر سے دیکھا جائے اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیا جائے تو وہ بھی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل سے معرا نہیں ہوتیں، کیونکہ غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک مختصر نظم ہوتا ہے، اور ایسی نظم ہوتا ہے کہ اگر وہ مناسب الفاظ میں پوری قوت سے ادا ہو جائے تو ہزار طول و طویل نظمیں مل کر بھی اس ایک شعر کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ آخر نظم گو حضرات ہی کیا تیر مارتے ہیں۔ یہی نا کہ ایک مفرد خیال کو دس پندرہ یا بیس پچیس اشعار میں پھیلا کر ایک کافی حد تک شرح و بسط سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر غزل گو شخص اسی پھیلے ہوئے خیال کو سمیٹ کر اور اپنے مخصوص متغزلانہ اشاروں، کنایوں، اور تلمیحات سے کام لے کر صرف ایک شعر میں ادا کر دیتا ہے جس کا ہر اشارہ یا کنایہ ہزار داستان در آغوش ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی پھر اس سمٹے ہوئے خیال کو دس بیس اشعار میں پھیلا کر نظم کے قالب میں ڈھالے گا (جیسا کہ اکثر آج کل کے نظم گو حضرات کرتے رہتے ہیں) تو یقیناً طاقت تقسیم ہو جائے گی اور جس حد تک طاقت تقسیم ہو جائے گی اسی حد تک اس کا مرتبہ شعریت بھی پست ہو جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ آج کل زیادہ سے زیادہ بیس پچیس برس سے "نظم" کا لفظ بہ اتباع مغرب جس معنی میں مستعمل ہو رہا ہے اس معنی میں ہمارے ہاں نظم کا وجود نہ تھا، مگر یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہماری شاعری میں سرے سے نظم کا وجود ہی نہ تھا۔ تھا اور ضرور تھا۔ مگر دوسری صورتوں میں اور ان صورتوں کو نظم کے نام سے موسوم

نہیں کیا جاتا تھا، فارسی زبان میں زیادہ اور اُردو زبان میں کم اکثر مسلسل غزلیں پائی جاتی ہیں، اور مسلسل غزلیں بھی نظم ہی کی صنف میں داخل ہیں، اگرچہ غیر مسلسل غزلیات کا ہر شعر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، بجائے خود ایک مختصر و مکمل نظم ہوتا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے اشعار میں اوّل سے لے کر آخر تک یعنی از مطلع تا مقطع بالاکثر تسلسل نہیں پایا جاتا، اور پایا بھی نہ جانا چاہئے کیوں کہ صنف غزل مسلسل اور طول طویل خیالات ادا کرنے کے لئے ایجاد ہی نہیں کی گئی۔ وہ وضع کی گئی ہے صرف مفرد یا مرکب خیالات کے ادا کرنے کے لئے بے حد ایجاز و اختصار کے ساتھ مسلسل اور طول طویل خیالات ادا کرنے کے لئے ہماری شاعری میں دوسری ایک درجن کے قریب اصناف موجود ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

رباعی، قطعہ، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مثمن، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد، مثنوی۔

ان میں سے رباعی غزل کے بعد دوسری دلچسپ و کارآمد صنف ہے، جو غزل ہی کی طرح ایجاز و اختصار کے لئے وضع کی گئی ہے، فرق صرف اسقدر ہے کہ رباعی میں متغزلانہ افکار و انداز بیان کی کوئی قید نہیں، اور اس میں غزل کے برخلاف ایک شعر کی جگہ دو شعروں میں اپنے خیالات کو تسلسل کے ساتھ نظم کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے، غزل اور رباعی دونوں کے بعد تیسری صنف قطعہ ہے۔ یہ صنف ایجاز و اختصار اور شرح و بسط دونوں کو مشترک ہے، کیونکہ قطعہ رباعی کی طرح کم سے کم دو شعر تک محدود ہے اور زیادہ کے لئے اگر قافیہ تنگی نہ کرے تو اشعار کی کوئی تعداد مقرر نہیں، یعنی یہ صنف رباعی کی طرح ایجاز و اختصار کے کام بھی آسکتی ہے اور نظم کی طرح تسلسل اور شرح و بسط کے بھی۔ ان تینوں صنفوں کے علاوہ باقی جس قدر صنف ہیں وہ سب کی سب مسلسل خیالات ربط و ہم آہنگی کے ساتھ ادا کرنے کے لئے ایجاد کی گئی ہیں۔ ان میں سے خصوصاً مثنوی تو ہماری شاعری میں وہ ہمہ گیر و کارآمد صنف ہے جس میں ہر قسم کے بڑے سے بڑے اور طویل سے طویل خیالات بلکہ افسانوں، داستانوں اور تاریخوں تک کو نظم کا جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ اور ایسی سب اصناف سخن جن میں طویل یا حقیر خیالات و واقعات تسلسل کے ساتھ

منظوم کئے جاتے ہیں یا کئے جا سکتے یقیناً نظم ہی کہلانے کی مستحق ہیں۔ اس بحث سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم نے مذکورہ بالا تمام اصناف سخن میں سے اگر کوئی صنف اپنے خیالات کو پورے ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے لئے وضع کی ہے تو وہ صرف ایک غزل ہے۔ اگرچہ رباعی اور قطعہ سے بھی ایک حد تک یہ کام لیا جا سکتا ہے مگر ان کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب اتنی اصناف ہماری شاعری میں مسلسل اور طول طویل خیالات ادا کرنے کے لئے موجود ہیں اور ہم نے ان میں سے صرف ایک غزل کو ایجاز و اختصار کے لئے چُن لیا ہے، جو اس کے لئے ہر طرح موزوں اور مناسب بھی ہے، اور حالت یہ ہے کہ اس ضروری صنف کا کوئی بُرا بھلا بدل بھی پیش نہیں کیا جاتا تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ غزل کو مٹا ڈالنے کے درپے ہو جانا کہاں کی عقل مندی اور کون سی دانائی اور مصلحت پر مبنی ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ کسی خیال کو شرح و بسط کے ساتھ مسلسل ادا کرنے میں جزئیات کا احاطہ کرنا پڑتا ہے۔ اور جزئیات کا احاطہ کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ایجاز و اختصار کا مرتبہ کہیں بلند ہے۔ اور پھر ایجاز و اختصار بھی ایسا ایجاز و اختصار جو جامع و مانع بھی ہو اور ماقل و دل بھی اور اسی قسم کے ایجاز و اختصار کا غزل کے سوا کسی دوسری صنفِ شعر میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے غزل کا مٹا ڈالنا اپنی شاعری کی ایک بے حد دلچسپ اور ضروری صنف ایجاز و اختصار کا مٹا ڈالنا ہے جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔

اس اعتراض کا دوسرا جزو یہ ہے کہ چونکہ غزل کے اشعار میں باہم کوئی تسلسل یا ربط و ہم آہنگی نہیں ہوتی لہٰذا وہ بالکل اک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے، جو ذہن انسانی کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ماتم کرنے کی جگہ ہے کہ مغرب زدگی نے مخالفین غزل کے ذوقِ صحیح اور وجدانِ سلیم کو اس درجہ مسخ و مغلوب کر دیا ہے کہ طعام و لباس سے لے کر شعر و ادب تک ہر وہ چیز جو ایشیا کی خصوصیات کی حامل ہے خواہ وہ ہماری تہذیب اور ہمارے مذاق کے نقطہ نظر سے کتنی ہی صحیح، دلچسپ اور مفید و اہم کیوں نہ ہو مگر مغربی ذوق اس پر مہر تصدیق ثبت نہیں کرتا وہ ان دشمنانِ وطن کے نزدیک صفحہ ہستی سے بالکل

شامل لینے کے قابل ہے۔ خدا جانے یہ حضرات غزل کو جو ایک خالص ایشیائی چیز ہے مغربی عینک لگا کر کیوں دیکھتے ہیں۔ آخر اس نظر سے کیوں نہیں دیکھتے کہ وہ ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ چند مختلف المضامین نظموں کا جو ایک ہی بحر اور ایک ہی ردیف و قافیہ میں لکھی جاتی ہے، اور جس کا ہر شعر بجائے خود ایک مختصر اور مکمل نظم ہوتا ہے ہمیں یقین ہے کہ اگر یہی حضرات اپنی آنکھوں سے مغربی عینک اتار کر غزل کو ہماری بتائی نظر سے جو ہماری فطری اور حقیقی نظر ہے دیکھنے کی تکلیف گوارہ فرمائیں گے تو پھر غزل ان کو نہ تو چوں چوں کا مربہ دکھائی دے گی اور نہ کسی قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا کرے گی، بلکہ اس کے برخلاف غزل میں وہ عجیب عجیب خصوصیات اور ایسی ایسی ناقابلِ انکار خوبیاں نظر آئیں گی جو مغربی شاعری میں ہزاروں قسم کی جدید العصر ذہنی ترقیات کے باوجود آج تک بھی مفقود و معدوم ہیں۔

اس اعتراض کا تیسرا جز یہ ہے کہ یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک واحد دماغ میں بیک وقت اس قدر مختلف اور متضاد خیالات سما سکیں"۔ اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں جنھیں درج ذیل کیا جاتا ہے۔

اوّل تو یہی غلط ہے کہ "ایک دماغ میں بہ یک وقت دو یا دو سے زیادہ متضاد یا غیر متضاد خیال پیدا ہونے ناممکن ہیں" خاص خاص حالتوں میں اکثر مشاہدے میں آیا ہوگا کہ انسان وقتِ واحد میں رو بھی رہا ہے اور ہنس بھی رہا ہے، مغموم بھی ہے اور اپنے غم پر خوش و قانع بھی، شکووں سے معمور بھی ہے اور شکر سے تر زبان بھی، مضطرب بھی ہے اور سکونِ خاطر سے لذت یاب بھی، پریشان بھی ہے اور اپنی پریشانی کا مدح خواں بھی، مانوس بھی ہے اور مایوس بھی، بیدل بھی ہے اور ساعی بھی۔ ایسے واقعات کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر ہم یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ اکثر دیکھا ہوگا۔ کہ جب بچھڑے ہوئے دو عزیز یا دو دلی دوست یا عاشق و معشوق مدت کے بعد ملتے ہیں تو بے اختیار باہم لپٹ جاتے ہیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں اور جب تک دلوں کی بھڑاس اچھی طرح نہیں نکل جاتی ان کے لپٹ لپٹ کے رونے رلانے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت ان کے دلوں میں خوشی و غم کے دوگونہ جذبات و خیالات موجزن نہیں ہوتے اور یہی خوشی و غم کی وہ ملی جلی کیفیت ہے جو عام طور سے "گریہ مسرت" کے دلچسپ اور معنی خیز نام سے مشہور ہے۔ یہ مثال تو

کسی انسانی دل ودماغ میں بہ یک وقت صرف دو متضاد یا غیر متضاد خیالات وجذبات سما سکنے کی مثال تھی اب ہم ایک ایسا شعر پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے ایک انسانی دل ودماغ میں بیک وقت چار یا چھ سے زیادہ مخالف ومتضاد خیالات وجذبات کے مستولی ہونے کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ یہ شعر ہمارا ہی ہے۔ خدا اسکے لئے اس کو یہ مجبور کریا کہہ کر ردنہ کر دیجئے کہ چونکہ یہ تیرا لکھا ہوا ہے اس لئے ناقابلِ قبول ہے۔

بیدل بھی ہوں، شاداں بھی، شاکی بھی ہوں، نازاں بھی

جو داغ دیا ہوگا، دلچسپ دیا ہوگا

عاشق معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں تمہارے سلوکوں سے بیدل (مایوس وغمگین) بھی ہوں اور شاداں (پُرامید ومسرور) بھی۔ شاکی (شکایت مند اور فریادی) بھی ہوں اور نازاں (مفتخر، شکرگذار اور احسان مند) بھی کیونکہ تم نے مجھے آج تک جتنے داغ بھی دیئے ہیں سب دلچسپ دئیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب داغ تکلیف دہ ہوتے ہیں اور ان سے اذیت پا کے مایوس وغمگین اور شاکی، فریادی ہونا قدرتی بات ہے۔ مگر چونکہ معشوق نے یہ داغ دورانِ محبت میں دئیے ہیں اور دورانِ محبت میں معشوق کے ہاتھوں پہنچی ہوئی تکلیف بھی راحت سے زیادہ قابلِ قدر ہوتی ہے، پھر دلچسپ تکلیف تو اور زیادہ قابلِ قدر ہونی چاہئے۔ اس لئے عاشق خوش بھی ہے اور پُرامید بھی، اور نازاں بھی ہے اور شکرگذار و احسان مند بھی۔ اس حالت میں وہ جن متضاد یا غیر متضاد خیالات وجذبات سے متاثر نظر آرہا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔ (۱) خوشی وغم (۲) امید وبیم (۳) تکلیف وراحت (۴) شکر وشکایت (۵) مدح وذم۔ (۶) بے صبری اور صبر ورضا (۷) احسان مندی ونا احسان مندی وغیرہ۔ ایسی صریح مثالوں کی موجودگی میں کوئی احمق سے احمق بھی یہ کہنے کی جراءت نہیں کرسکتا کہ کسی انسانی دل ودماغ میں بیک وقت دو یا دو سے متضاد یا غیر متضاد خیالات وجذبات نہیں سما سکتے۔ اگر نہیں سما سکتے تو فرمائیے اتنے جذبات وخیالات کا حامل شعر بہ یک وقت کیونکر موزوں ہوگیا۔

دوئم یہ کہ غزل صرف ایک سانس یا آنِ واحد میں تو کہہ نہیں دی جاتی، اس کے کہنے اور لکھنے کے لئے بھی کچھ مدت درکار ہوتی ہے اور بعض اوقات تو یہ مدت دس دس دن اور پندرہ پندرہ دن

یک طویل ہو جاتی ہے۔ جب ایسا ہے اور فی الواقع ایسا ہی ہے تو اس سے بالبداہت ثابت ہوتا ہے کہ غزل کے مختلف و متضاد مضامین نہ بیک وقت دماغ میں آتے ہیں اور نہ بیک وقت نظم کئے جاتے ہیں۔ بلکہ یکے بعد دیگرے دماغ میں آتے ہیں اور یکے بعد دیگرے نظم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک غزل سات شعر کی ہے۔ اور اس کی تیاری پر ایک گھنٹہ اور دس منٹ خرچ ہوئے ہیں، یعنی ہر شعر بالاوسط دس منٹ میں کہا اور لکھا گیا ہے یعنی پہلے دس منٹ میں اور دوسرے دس منٹ میں دوسرے متضاد یا غیر متضاد مضمون کا دوسرا شعر، اور اسی طرح تیسرا اور چوتھا اور باقی بھی علیٰ ہذا القیاس۔ مطلب یہ نکلا کہ یہ ساتوں شعر بیک وقت موزوں نہیں کر دئے گئے بلکہ یکے بعد دیگرے موزوں کئے گئے ہیں، جن کے موزوں کرنے پر جدا جدا دس دس منٹ کا وقت صرف کیا گیا ہے۔ اور حالت یہ ہے کہ انسانی خیال مطلق بے لگام و بے مہار ہوتا ہے اور ایک ایک لمحے میں ہزار ہزار موافق و مخالف راہیں اختیار کرتا رہتا ہے، انتشار یا بے لگامی، اور بے مہاری اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر اس کو بہ جبر و کوشش روکا نہ جائے تو وہ ایک ثانیے کے لئے بھی ایک مرکز یا ایک نقطے پر قایم نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام اور جوگیوں وغیرہ کو سالہا سال تک اپنے خیال کو ایک مرکز یا نقطے پر مرکوز رکھنے کی کوشش و مشق کرنی پڑتی ہے۔ جب انسانی خیال کی یہ حالت ہے کہ ایک ثانیے کے لئے بھی کسی ایک مرکز پر قایم نہیں رہتا تو دس دس منٹ کا فصل زمانی ہے مخالف یا موافق جذبات و خیالات کو موزوں کرنا کیونکر ناممکن قرار دیا جا سکتا ہے۔

بہر حال جب نہ تو یہ صحیح ہے کہ انسانی دل و دماغ بہ یک وقت دو یا دو سے زیادہ مخالف یا موافق جذبات و خیالات سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ اور نہ یہ درست کہ "غزل کے تمام اشعار آنِ واحد میں نظم کر دئے جاتے ہیں"۔ تو پھر ان فریب دہ اور لاطائل دلائل کی بنا پر غزل کی جان کا لاگو ہو جانا محض مغرب زدگی کی پیدا کردہ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔

(۶) "تمام اصنافِ سخن میں تو مطالب و معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، مگر غزل میں اس کے برخلاف الفاظ کے لئے مطالب و معانی کی جستجو کی جاتی ہے"۔ یہ اعتراض مخالفین غزل کی افواجِ قاہرہ کے سپہ سالارِ اعظم شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کے غزل کش دماغ کی پیدا وار

ہے، مگر اس اعتراض میں بھی کوئی جان نہیں، بلکہ یہ دوسرے اعتراضوں سے بھی زیادہ کمزور اور بودا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ کلام خواہ نظم ہو یا نثر، دو اجزا سے مرکب ہوتا ہے (۱) الفاظ (۲) معانی۔ ہر ادیب کو خواہ وہ ناظم ہو یا ناثر کبھی معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، اور کبھی الفاظ کے لئے معانی۔ یہ دونوں صورتیں لازم و ملزوم اور فطری ہیں اور ان میں باہم کوئی تضاد نہیں۔ کیا دوران تصنیف و تالیف میں کبھی کبھی، کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر ایسے مواقع پیش نہیں آتے کہ استعارے، تشبیہ یا مخصوص تراکیب اور الفاظ کی مختلف اقسام نشست اور دروبست سے ان کو نئے نئے معانی پہنانے پڑتے ہوں۔ ایسے معانی جو روزمرہ کی بول چال اور ان کے لغوی معنی سے بالکل جدا ہوں جس کے بغیر کلام میں جدت، تازگی، تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی، زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں۔ یہاں چند مثالیں درج کر دینی کافی ہوں گی۔

پہلی مثال "گل" "بانگ"۔ یہ دو معمولی لفظ ہیں۔ پہلے لفظ کے معنی پھول ہیں، اور دوسرے کے معنی آواز۔ علیحدہ علیحدہ یہ دونوں لفظ بجز اس کے کہ اپنے لغوی معنی دیں کسی قسم کی گہرائی یا تاثیر اپنے اندر نہیں رکھتے۔ مگر جب انھیں دونوں لفظوں کو ملا کر "گلبانگ" بنا دیا جاتا ہے تو کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہی دونوں لفظ معمولی ترکیب پانے سے پہلے کیا تھے اور ترکیب پا کر کیا بن گئے۔ پہلے ان دونوں لفظوں کے معنی کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ ترکیب پانے کے بعد جو رنگینی، دلکشی اور طاقت لفظ گلبانگ میں پیدا ہو گئی ہے۔ کیا اس کی تشریح ممکن ہے؟

دوسری مثال۔ "سمند" اور "ناز" بھی دو معمولی لفظ ہیں۔ پہلے لفظ کے معنی "گھوڑا" اور دوسرے کے معنی "ناز" یعنی اک خاص قسم کی "ادائے معشوقانہ"۔ ان میں بھی علیحدہ علیحدہ کوئی جاذبیت اور شوخی نہیں اور نہ لفظاً و معناً کوئی ربط ہے۔ بلکہ ایک شدید قسم کا تنافر پایا جاتا ہے۔ مگر جب یہی دونوں لفظ اس شدید بے ربطی و تنافر کے باوجود ترکیبِ اضافی سے ملا کر "سمندِ ناز" میں تبدیل کر دیتے ہیں تو کس بے پناہ طاقت کے حامل ہو جاتے ہیں، کس قدر لطیف، دلکش اور ناقابلِ اظہار معنی پیدا کر دیتے ہیں، اور اپنے مفہوم کو بدل کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

تیسری مثال۔ یہ ایک مثال چند در چند مثالوں کا مجموعہ ہے۔ ذیل کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس "زود پشیماں" کا پشیماں ہونا

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

مندرجہ بالا اشعار کی جدت، تازگی، دلفریب انداز بیان اور رفعت خیالی کو چھوڑیے کہ یہ ایسی ظاہر ہر چیزیں ہیں جن کو ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے۔ صرف "زود پشیماں" کی دلنواز ترکیب، اور "نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے" کی عجیب وغریب اور معجزانہ اسالیب بیان پر غور فرمائیے۔ کہا تو گیا ہے "زود پشیماں" مگر معنی پیدا کر دیئے گئے ہیں "دیر پشیماں" کے اور پھر کسقدر "دیر پشیماں" کہ قتل کرنے کے بعد جفا سے توبہ کی جا رہی ہے۔ ظاہر تو کیا جا رہا ہے کہ "نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے" لیکن مقصد یہ ہے کہ ہم سمجھ گئے کہ تم کہیں سے آ رہے ہو۔ اور پھر یہی نہیں کہ سمجھ گئے کہ تم کہیں سے آ رہے ہو، بلکہ یہ بھی سمجھ گئے کہ کہاں سے آ رہے ہو" اور مزید براں یہ بھی کہ "کیا کر کے آ رہے ہو" آپ نے دیکھا کہ اس مصرعے کے چند سیدھے سادے الفاظ کن کن عجیب وغریب بلیغ مطالب ومعانی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں اور پھر رہنمائی بھی کتنی کامیاب رہنمائی۔ اب اس شعر کا دوسرا مصرعہ لیجئے "پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے"۔ اک غزل کے انداز بیان سے ناواقف شخص تو یہ کہدے گا کہ "یہ مصرعہ بالکل مہمل ہے، نہ اس کو پہلے مصرعہ سے کوئی ربط اور نہ یہ خود کسی مطلب ومعنی کا حامل، مگر ایک ادادان غزل اسے سن کر پھڑک اٹھے گا اور بے ساختہ پھڑک اُٹھے گا، اور شورِ "احسنت ومرحبا" سے آسمان سر پر اٹھالے گا۔ وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ "شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں"۔ اب غور فرمائیے کہاں تو "پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے"۔ اور کہاں "شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں"۔ کن معمولی الفاظ کو کن دلچسپ اور عجیب وغریب معنی کا حامل بنا دیا گیا ہے۔ یہ غزل کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم اس قسم کی اور سینکڑوں مثالیں پیش کر سکتے تھے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ سمجھنے والے کے لئے اتنی مثالیں کافی ہو سکتی ہیں۔ اور جو نہ سمجھنا چاہے اس کے لئے لاکھوں مثالیں بھی بیکار محض ہیں

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ مذکورہ بالا مثالوں میں انھیں روزمرہ کے معمولی الفاظ کو جنھیں ہم ہمیشہ استعمال کرتے رہتے ہیں اور جن کی نسبت ہم کو کبھی شبہ بھی نہ گذرا تھا کہ ان کے کچھ اور معنی بھی ہو سکتے ہیں، کیسے کیسے نئے دلکش اور ماورائے فہم وقیاس مطالب ومعانی کا جامہ پہنا دیا گیا ہے جن کا لغوی معنی سے کوئی تعلق نہیں اور یہ جامہ پہنا کر ان کو ایسی غیر محدود طاقت کا مالک بنا دیا گیا ہے جس کا احاطہ کرنا بھی دشوار ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھیں روزمرہ کے معمولی الفاظ کو جن میں اس سے پہلے کوئی جان نہ تھی۔ یہ ناقابلِ قیاس طاقت کس نے بخش دی اس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ محض شاعر کی اس طاقتِ خلاقی نے جو اس گر سے آگاہ تھی کہ الفاظ کو اک خاص صورت سے ترکیب دے کر ان میں نئے نئے مطالب ومعانی کیونکر پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ بہرحال وہ ادیب، شاعر جو معانی کو صرف الفاظ کا جامہ پہنانا تو جانتا ہے، مگر الفاظ کے لئے نئے نئے مفہوم اور نئے نئے معانی پیدا کرنے سے عاجز وقاصر ہے، ہرگز ادیب وشاعر کہلانے کا مستحق نہیں، کیونکہ گو معانی کو الفاظ کا جامہ پہنانا بھی فکر وکاوش کا محتاج ہے، مگر پھر بھی آسان کام ہے لیکن الفاظ میں نئے نئے مفہوم ومعانی پیدا کرنا سخت دشوار ہے اور ہر ادیب وشاعر کے بس کا روگ نہیں۔

غزل پر مذکورہ بالا اعتراضات کے علاوہ بعض اور اعتراضات کئے گئے ہیں، مگر وہ اسقدر غیر اہم ہیں کہ ان کے باضابطہ جواب دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ان میں سے چند کے مختصر جوابات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض:۔ "غزل کا وجود فارسی اور اردو کے سوا اور کسی زبان میں نہیں پایا جاتا، یہ کھلا ثبوت ہے اس امر کا کہ غزل ایک بیکار چیز ہے۔" اول تو یہی غلط ہے کہ غزل کا وجود دنیا کی اور زبانوں میں نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ کسی زبان کی شاعری کا جذبات حسن وعشق سے خالی رہنا ناممکن ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری مروجہ غزل کی صورت میں نہیں پایا جاتا۔ دوسری صورتوں میں پایا جاتا ہو مگر ان جذبات کا اظہار جس صورت میں بھی پایا جائے ہم اسکو اپنی زبان میں "غزل" کے سوا اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ دوسرے اگر دنیا کی دوسری زبانوں میں غزل جیسی کارآمد اور دلچسپ صنف کا وجود نہیں پایا جاتا تو اس کو ان زبانوں کی بدقسمتی سمجھئے۔

دوسرا اعتراض:۔ "غزل میں ایک ایک عاشق کے ہزار ہزار رقیب ہوتے ہیں، جن سے

ساتھ دن جوتی پیزار ہوتی رہتی ہے"۔

جواب۔ اول تو بات یہ ہے کہ انتہائے عشق میں عاشق کے احساسات بہت نازک ہو جاتے ہیں، وہ انسان تو انسان ہُوا، گھٹا، دریا، پہاڑ، چاند، سورج، باغ، صحرا، طوطا، مینا، آئینہ، کنگھی وغیرہ جس جس چیز کی طرف معشوق کی نگاہِ التفات جاتی ہے، ان سب کو اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے۔ یہ دلیل ہے کمالِ محبت کی، اور کمالِ محبت کمالِ عشق مانا گیا ہے، جو مذہبِ عشق کی رُو سے اجرِ عظیم کا مستحق ہے، دوسرے ایک حسین پر بہت سے انسانوں کا فریفتہ ہو جانا بھی تو کوئی عجیب و نادر واقعہ نہیں بلکہ یہ تو بالکل اِک کھلا ثبوت ہے معشوق کی فراوانیٔ حسن کا، اور یہی شاعر کا منشا ہوتا ہے۔ اب رہا جوتی پیزار کا معاملہ، سو اگر آپ کو شاعر بہ حیثیت عاشق اپنے رقیبوں سے لفظی اظہارِ بیزاری یا زبانی ہاتھا پائی، سچ مچ کی جوتی پیزار نظر آنے لگے تو اس میں بے چارے شاعر کا کیا قصور، بہتر ہو کہ آپ اپنی آنکھوں کا علاج کرائیں۔

تیسرا اعتراض: "غزل کے مضامین میں یک رنگی و توافق نہیں ہوتا۔ یعنی ایک شعر میں جس شے کو سراہ کر عزیز بنایا جاتا ہے اُسی کو دوسرے شعر میں مذمت کر کے گرا دیا جاتا ہے۔"

جواب۔ شاعر کوئی فلسفی یا مورخ نہیں ہوتا کہ اس کے کلام میں یک رنگی و توافق کا نہ پایا جانا عیب میں داخل سمجھا جائے۔ وہ صرف شاعر ہوتا ہے۔ اور شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ کسی شے کو دیکھ کر جن مخالف و موافق جذبات سے متاثر ہو ان کو شعر کا جامہ پہنا دے۔ اگر اس نے ایک شعر میں ایک چیز کو سراہا ہے اور دوسرے شعر میں اس کی مذمت کی ہے، اور ان دونوں شعروں میں کافی شاعرانہ دلکشی پائی جاتی ہے تو یہ اس کے کمالِ فن کی دلیل ہے نہ کہ نقصِ کمال کی۔ تفصیل کے لئے دیکھو مقدمہ شعر و شاعری مصنفہ علامہ حالی علیہ الرحمہ۔

چوتھا اعتراض: "غزل گو، غزل میں خاص اپنے اصلی جذبات ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا بلکہ اسکو یا تو یہ جذبات اپنے اوپر بہ جبر طاری کرنے پڑتے یا پھر اسے اس پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات کو حوالۂ قلم کرے۔"

جواب۔ اول تو یہ غلط ہے کہ غزل گو، غزل میں اپنے جذبات ظاہر کرنے پہ قادر نہیں ہوتا۔ اگر وہ فی الواقع قادر نہیں ہوتا تو پھر وہ شاعر نہیں بلکہ متشاعر ہے، کیونکہ شاعری میں اپنے خیالات وجذبات کو جامۂ شعر پہنانا اس سے آسان کام ہے، اور چونکہ یہ آسان کام ہے اس لئے ہر غزل گو شاعر غزل میں بالاکثر اپنے ہی خیالات وجذبات کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور وہ زیادہ تر ایسے ہی قافیوں کا انتخاب کرتا ہے جو اس کو اس کام میں مدد دے سکیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہر متغزل کے کلام میں بعض خیالات وجذبات کی بہتات ہوتی ہے، اور بعض کم، بعض بہت کم یا کالعدم ہوتے ہیں، اور اسی کمی بیشی سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ایک شاعر کے رجحانات طبیعت اپنی زندگی میں کیا تھے، اور اس کو کن خیالات وجذبات یا کن معاملات سے زیادہ سابقہ پڑا تھا، اور کن سے کم۔ دوسرے شاعر کو تو ترجمانِ عالم کہا گیا ہے، اور بجا طور پر کہا گیا ہے، اس کے لئے اپنے خیالات وجذبات ظاہر کرنا تو ایک پیش پا افتادہ چیز ہے، اس کو تو چرند پرند، نباتات وجمادات، کوہ ودریا، چاند سورج، آسمان وزمین، غرضکہ ہر چیز کی زبان سے بولنے اور ان سے گفتگو کرنے کی قدرت ہوتی ہے جب یہ صحیح ہے تو پھر اگر ایک غزل گو شاعر اپنے علاوہ اپنے دوسرے ابنائے جنس کے خیالات وجذبات کو جامۂ شعر پہنانے یا دنیا کی دوسری جاندار اور بے جان اشیا کی زبان سے بولنے اور ان سے ہم کلام ہونے پر قادر ہے تو یہ اس کے شاعرانہ کمال کی ایک روشن دلیل ہے، نہ کہ کوئی قابلِ الزام وگرفت جرم۔ یہ کونسا انصاف ہے کہ آپ تمام دیگر اصنافِ سخن یعنی نظموں وغیرہ میں تو اس جرم کا ارتکاب روا رکھیں اور اس کو مستحسن سمجھیں، مگر بے چاری غزل کو اس مستحسن جرم کی پاداش میں جلاد کے حوالے کردیں۔

یورپ کے نوجوان

کاش اس مضمون کا عنوان "یورپ کے نوجوان" کے بجائے "یورپی نوجوان" ہوتا۔ مگر یہ تخیل اب چند سال سے امید موہوم ہو کر رہ گیا ہے۔ یورپ کے مختلف ممالک کے نوجوان اپنے اپنے مقاصد کے ماتحت متحد ضرور ہیں۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ آیا انھیں کبھی اتنی قوت نصیب ہوگی کہ وہ سیاسی، جماعتی یا کم سے کم اخلاقی مسائل میں فیصلہ کن ثابت ہو سکے۔

جنگِ عظیم کے بعد ہم نوجوانوں کو یقین نہ آتا تھا کہ پھر اس پیمانے کی دوسری کشمکش بھی ہو سکتی ہے یہ خیال فاتح اور مفتوح دونوں کے یہاں مسلم تھا۔ مگر ۱۹۲۲ء میں ویسٹ منسٹر ایبی میں مجھے پہلی بار یہ خیال ہوا کہ شاید میں غلطی پر ہوں۔ میں "نامعلوم سپاہی" کی قبر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی لوح پر لکھا تھا "وہ جو خدا کی راہ میں کام آیا اور اپنے ملک اور بادشاہ کے لئے قربان ہوا۔ اس نے عدل و انصاف اور بنی نوع انسان کی آزادی کی خاطر اپنی جان دی"۔ چند ہی گھنٹوں کے بعد مجھے ایک تھانے میں جانے کا اتفاق ہوا کیونکہ میں ایک ایسے ملک کا باشندہ ہوں جو کبھی دشمن رہ چکا تھا اور اسی لئے میری وہاں تصدیق اور جانچ ہونی تھی۔ تھانے کے افسر نے مجھ سے پوچھا "تم جنگ میں شریک تھے؟" میں نے کہا "میں اس وقت بہت چھوٹا تھا"! اس نے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا، اور کہنے لگا "خیر، اگلی جنگ کے لئے بہت موزوں ہو"۔ اس موقع پر تو مجھے گمان بھی نہیں گذرا کہ سارجنٹ کا قول ٹھیک نکلے گا۔ مگر یہ شبہ جو اس وقت پیدا ہوا تھا، اب پورے یقین کے درجے تک پہنچ چکا ہے۔

یورپ کی موجودہ نسل کے اندر وہی انقلابی جذبہ اور کشمکش نظر آتی ہے، جو بالعموم ان نوجوانوں کے اندر کارفرما ہوا کرتی ہے جو کسی اہم تاریخی زمانے میں نشوونما پاتے ہیں۔ نوجوانوں نے اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی نظام ادبی رجحانات، فنونِ لطیفہ کے معیار اور مذہب کے

تخیلات کے خلاف ہمیشہ بغاوت کی ہے۔ اس لئے موجودہ انقلابی جذبہ بھی کوئی نئی چیز نہیں، ہاں مقاصد کی پیچیدگی کشمکش کی شدت اور دباؤ کی زیادتی کی وجہ سے نمایاں معلوم ہوتا ہے۔

یورپ کی اس نئی نسل کو عمر سے قطع نظر تجربے کے لحاظ سے دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلے گروہ میں اکثر وہ لوگ شامل ہیں جن کے دلوں میں جنگ کے قبل کے زمانے کی یاد باقی ہے، اور دوسرے میں وہ لوگ ہیں جو اثنائے جنگ یا اس کے بعد کے ایام میں پلے اور بڑھے۔ روزی کا سوال دونوں کے لئے یکساں طور پر مشکل ہے۔ مگر اس سے بھی مشکل یہ امر ہے کہ وہ اپنے لئے مناسب نصب العین تجویز کرسکیں جو ان کے مقاصد کے شایانِ شان ہو۔ اس لئے جوں جوں وہ عمر میں ترقی کرتے جاتے ہیں، ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ حالات چونکہ ناقابل حل ہوتے جا رہے ہیں، اس لئے انقلاب کی ضرورت ناگزیر تر ہوتی جاتی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ اسی لئے آج کل مختلف ممالک کے نوجوان نہایت سرگرمی کے ساتھ ایسے سیاسی نظام کے ماتحت مصروفِ عمل ہیں جن کا فلسفیانہ پہلو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

جنگ کے بعد یورپ کی نئی نسل کے سامنے کون کون سی صورتیں تھیں؟ ایک طرف تو مختلف ممالک کی محدود قوم پرستی جس کی بنیاد ملوکیت پر تھی، ایک دوسرے سے دست وگریباں تھی اور دوسری جانب آزاد سرمایہ داری اور آمرانہ اشتراکیت (Dictatorial Comunism) میں رقابت تھی۔ جنگ کے بعد فوراً ہی ہر جگہ اشتراکی انقلابات سے آزاد سرمایہ داری کو اندیشہ ہو چلا تھا۔ مگر قوم پرستی نے پھر سنبھالا لیا اور اب نوجوان اس گومگو میں پڑ گئے کہ آیا جمہوریت ابھی دنیا میں باقی رہے گی یا اشتراکی پیغمبروں کا قول کہ ایک عالمگیر انقلاب قریب ہے، صحیح نکلے گا۔ مگر یہ سوال جتنا بظاہر سادہ معلوم ہوتا ہے اتنا آسان نہیں ہے۔ کم وبیش تمام ممالک میں ان دونوں صورتوں میں انتخاب کرنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اور جہاں ناممکن نہیں تھا وہاں بھی اب متضاد سیاسی تخیلات کے ایک جگہ جمع ہوجانے سے مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ اس کا وجود عقلِ سلیم پر مبنی ہے اور اس کے ذریعے ساری دنیا کا بھلا ہوگا۔ اس نے جمہوریت سے آمریت تک اپنے

مدارج مقرر کئے ہیں۔ اس کی مدمقابل آزاد یا قدامت پسند سرمایہ داری ہے جو اس تخیل پر مبنی ہے
کہ عدم مداخلت (Laissez Faire) کے اصول کے ماتحت جماعت کی جو خود بخود ترتیب ہو جاتی
ہے وہی برقرار رکھی جائے۔ فاشستیوں کے نزدیک بھی حصولِ مقاصد کا ذریعہ استدلال" اور "عقل"
ہے۔ مگر نازیوں کے یہاں کامیاب زندگی کا گُر یہ ہے کہ جو کچھ فوراً سمجھ میں آجائے اس پر بے چون و چرا
اور بغیر کسی استدلال کے کاربند ہو جانا چاہئے۔ جب موجودہ نسل کے رہنما قوت و اقتدار کے لئے سرمایہ دارانہ
اور اشتراکی تہذیبوں میں جنگ کے نعرے لگاتے ہوئے اُٹھتے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش
کرتے ہیں کہ "قیامِ انسانیت" کی خاطر جنگ ناگزیر ہے۔ تو تخیلات کی حسرتناک پیچیدگی اپنی اصلی صورت
میں نمایاں ہو جاتی ہے۔

غرض یورپ کی نئی نسل کا نہ تو زاویہ نگاہ ایک ہو سکتا ہے، اور نہ مقاصد۔ البتہ انہوں نے
اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جو طریق عمل اختیار کیا ہے اسی کی بنا پر ان کو دو مختلف گروہوں
میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حامیانِ جنگ کا طبقہ جس نے اس چار سالہ کشمکش کے دوران میں ہوش
سنبھالا ہے، یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ قوت کی حکومت کو تسلیم کرنا چاہئے۔ چنانچہ جنگ کو ناگزیر سمجھ کر
انھوں نے طے کر دیا کہ سیاسی اور جماعتی مسائل کا فیصلہ مشین گن پر چھوڑ دینا چاہئے۔

حامیان امن جنھوں نے جنگ کے بعد کے زمانے میں ہوش سنبھالا، یہ سمجھتے ہیں کہ
قیامِ امن کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ کوششِ امن سے ان کا مقصد جنگ کا
سرے سے خاتمہ کرنا نہیں ہے بلکہ وہ اسے نیک کام سمجھ کر کرتے ہیں وہ بین الاقوامی اور قومی مفادات
کے درمیان خوش معاملگی پیدا کرنے کے حامی ہیں اور اس سے پیشتر کہ باہمی کشمکش اسقدر نازک اور
پیچیدہ صورت اختیار کرے کہ بغیر جنگ کے اسکا تصفیہ ہی نہ ہو سکے وہ اس گتھی کو سلجھا دینا چاہتے
ہیں۔ حامیانِ جنگ میں ایسے لوگ شامل ہیں جو طاقت اور اثر کے لحاظ سے بڑھے ہوئے ہیں
اور روز بروز اُن کی طاقت اور تعداد میں ترقی ہو رہی ہے لیکن حامیانِ امن میں بھی ایسے لوگ
شامل ہیں جن کے سیاسی، جماعتی اور معاشی تجربات نسبتاً زیادہ پختہ اور مسلّم ہیں، اور روز بروز یہ

طبقہ بھی ترقی کر رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یورپ کے نوجوانوں کی اکثریت ان دو طبقوں میں سے کس کے ساتھ ہوگی۔ یورپ میں نوجوانوں کی موجودہ تحریکات پر سیر حاصل تبصرے کے لئے تو مضامین کا ایک سلسلہ درکار ہے، مگر ہم یہاں ان کی ذہنیت کا مختصر طور سے تجزیہ کریں گے جس سے اُن کے طریقِ عمل پر کچھ روشنی پڑے گی۔ یورپ کی نئی نسل کی اخلاقی اور ذہنی کیفیت کا شاید سب سے زیادہ یاس انگیز پہلو یہ ہے کہ آج کل آپس میں خیالات و جذبات کا تبادلہ تقریباً ختم ہوگیا ہے اور وہ اپنے ہی ملک کے محدود دائرے میں رہ کر قوموں کے اندر مناقشانہ جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں۔ ہر عقیدے اور مسلک کے لوگوں نے اپنے ارد گرد گویا جادو کا ایک حلقہ سا بنا لیا ہے جس کے اندر رہ کر وہ طرح طرح کے قومی ترانوں اور نعروں کی صورت میں صرف اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنایا کرتے ہیں اور محض اپنے ہی مسائل میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ آج کل سائنس کی بدولت باہمی میل جول کی کتنی سہولتیں فراہم ہیں، اس کے باوجود یہ جادو نہیں ٹوٹتا۔ اور کیا مجال کہ ان "طلسمی حلقوں" کے باہر کوئی قدم رکھ سکے۔ آج یورپ ذہنی اعتبار سے متعدد حصوں میں اس طرح تقسیم ہے کہ ایک کو دوسرے کے خیالات کی مطلق خبر نہیں۔ یہ صورت اتنی نمایاں ہے کہ یورپ میں ذہنی بیداری کے نشاۃ ثانیہ کے بعد سے آج تک کبھی رونما نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہی مثال لیجئے۔ سولھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک Erasmus کی تصانیف کا مطالعہ — جو تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مشترکہ زبان (Lingua franca) لاطینی میں لکھتا تھا۔ یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہایت آزادی کے ساتھ کیا جاسکتا تھا۔ اور اس کا ترجمہ بھی اسی طرح آزادی کے ساتھ درجنوں زبانوں میں ہوتا تھا اور کونگزبرگ سے آکسفورڈ تک تمام یورپ میں علم کی خاطر سفر کرتے تھے۔ اور اربابِ علم و ادب کا ہر ملک میں سرگرمی سے خیر مقدم ہوتا تھا۔ مگر ایک آج کا زمانہ ہے کہ کتابوں کی درآمد تک محال ہے۔ یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں بیرونی طالب علموں کی تعداد ایام انقلاب فرانس کے

علاوہ امنی کم کبھی نہیں رہی جتنی آج ہے۔

جن لوگوں نے روسیک کے کھیل دیکھے ہیں۔ یا جنھیں عالمگیر اسکاؤٹس جمہوری دیکھنے کا موقع ملا ہے، انھیں ان دونوں موقعوں پر عالمگیر اجتماع کو دیکھ کر یقین ہوگیا ہے کہ نوجوان دنیا کو باہم منظم دیکھنے کے متمنی اور مشترکہ نظام عمل کو نہایت دلیری کے ساتھ قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان مظاہروں کے دیکھنے کے بعد یورپ کے موجودہ نوجوانوں سے کچھ امید بندھتی ہے مگر کون نہیں جانتا کہ محض امید ہی کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ضرورت کس چیز کی ہے؟ اگرچہ اس سوال کو سُن کر بیشتر نوجوان جواب کی طرف سے آنکھیں پھیرلیں گے اور اپنے مسائل میں مصروف ہوجائیں گے۔ لیکن ہر ملک میں ایسے چند نوجوان بھی ملیں گے جو قوموں کے بنیادی اختلافات کو دور کر کے ان کو ہم آہنگ کرنے کی ضرورت اور ان کے باہمی تعلقات میں لوچ پیدا کرنے کی اہمیت کو محسوس کریں گے۔

انھیں اس امر کا زیادہ سے زیادہ احساس ہو رہا ہے کہ دنیا تو خیر یورپ کو بھی متحد کرنے میں نہ اشتراکیت کے متعدد پہلوؤں میں سے کوئی پہلو اور نہ سرمایہ داری کی آزادانہ شکل کوئی بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ان میں سے کسی کو کامیابی ہوگی بھی تو اس حالت میں کہ اس کے اصولوں کو تمام دنیا متفقہ طور پر سمجھ لے اور انھیں برتنے کے لئے تیار ہوجائے۔ نظری حیثیت سے تو دنیا اشتراکیت کے زیر اثر بھی اور سرمایہ داری کے ماتحت بھی شکوہ سے رہے گی، اس لئے کہ دونوں نظریوں کی بنیاد اس مفروضے پر قایم ہے کہ ہر جگہ ایک ہی قسم کے انسان بستے ہیں۔ آزاد خیال طبقے کے لائحہ عمل کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ یہ نتیجہ انفرادی کوششوں سے رونما ہوگا۔ اس کے برعکس اشتراکیوں کا دھیان ہے کہ یہ یکسانیت طاقت کے بغیر نہیں پیدا ہوسکتی۔ ان نظریوں کے عملی پہلو نے انھیں ایسی پیچیدگی میں ڈال دیا ہے کہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں قسم کی ریاستوں میں اس مقصد کے حصول کے لئے طاقت کے استعمال کو ضروری سمجھا جاتا ہے مساوات کا یہ نظریہ ممکن ہے قومی مسائل کو کسی حد تک حل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ مگر جب

یہ بین الاقوامی معاملات میں برتا جائے گا تو بالکل بیکار ثابت ہوگا حتیٰ کہ تمام دنیا جماعتی دباؤ سے تنگ آکر ایسا طریقۂ فکر و عمل اختیار کرنے پر مجبور ہوگی جو ایلڈ وکسلے (Aldous Huxley) نے کم و بیش اپنی تصنیف "خیالی دنیائے جدید" (Brave New World) میں پیش کیا ہے نوجوانانِ یورپ کے مفکرین کو اب احساس ہو چلا ہے کہ یورپ میں جمہوریت، آمریت، فاشیت اور اشتراکیت کا سایہ پہلو بہ پہلو قایم رہے گا۔ ان کے حامی ممکن ہے اپنے اندرونی ملکی مسائل کو سلجھانے میں کامیاب ہو جائیں، مگر مستقبل میں انھیں اُس وقت تک دوام اور استقلال میسر نہیں ہو سکتا جب تک ان میں بین الاقوامی معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت نہ پیدا ہو جائے۔ ایسی کوئی اسکیم ابھی تک مرتب نہیں ہوئی ہے، مگر اس کی ضرورت کو سب محسوس کر رہے ہیں۔ اگر ذہنیتوں میں معقولیت پسندی آگئی تو یہ سوال کہ کس ملک میں کونسا سیاسی اور معاشی نظام رائج ہے کچھ زیادہ اہم نہ ہوگا لیکن اگر ان کے خیالات میں وسعت اور رواداری نہ آئی تو ان کے درمیان تو ایک اندیشہ ناک کشمکش جاری ہی ہے۔ دوسری ریاستوں سے بھی ان کے تعلقات خوش گوار نہ رہیں گے۔

آج کل یورپ میں باہمی اختلافات اور اتحاد بالجبر کے مسائل نے جو صورتِ حال اختیار کر رکھی ہے اس کی ایک جیتی جاگتی تصویر جولین بنڈا (Julien Benda) کے مشہور مقالہ "اقوامِ یورپ" (Discours a la Nation Europeenne) میں نظر آتی ہے۔ مقالہ نگار نے یہ مقالہ مشہور جرمن فلسفی "فشٹے" (Fichte) کے خطبات کے جواب میں لکھا ہے۔ فشٹے نے ایک صدی پہلے یہ خطبات برلن یونیورسٹی میں (Rede an die Deutsche Nation) کے عنوان سے دئے تھے۔ یہ دونوں تصنیفیں علمی و ادبی حیثیت سے اپنی اپنی جگہ ممتاز ہیں اور جتنی مقبولیت نوجوانانِ یورپ میں ان کو حاصل ہوئی شاید ہی کسی اور تصنیف کو حاصل ہوئی ہو۔ اگر کوئی شخص ان دونوں نظریات میں سے انتخاب کرنا چاہے تو اس کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں تقریروں کا مطالعہ اگر غور سے کیا جائے اور ان کی اصلیت کو

سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں کوئی تین اور بنیادی فرق نہیں ہے۔ نِشٹے نے قومیت کی تعلیم دی ہے اور اُسے فلسفۂ حیات کی بنیاد کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اِس کی رُو سے افراد کی زندگی و عمل کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس سے جرمن قوم کی تہذیبی سماجی اور معاشی ترقی میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے۔ گویا نشٹے کی تعلیم مشترکہ مفاد پر انفرادی مفاد کی قربانی کی حامی ہے۔ اِس کے علاوہ بین الاقوامی معاملات میں فشٹے نے بھی دوسری قوموں کے ساتھ رواداری، احترام اور مساوات کے اصولوں کو برتنے کی بڑے زور سے حمایت کی ہے، دوسری جانب بنڈا (Benda) "مذہب انسانیت" (Humanitarianism) کا علمبردار ہے اور بین الاقوامی کشمکش میں اُسی "انسانی رویہ" کے اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

بنڈا نے اپنی تصنیف میں فکر و عمل کے دو معیار قایم کئے ہیں۔ ایک اعلیٰ اور دوسرا ادنیٰ۔ اُس نے "یورپ" کو مقدم اور "قوم" کو موخر رکھا ہے۔ مگر بہ حالتِ موجودہ جب فشٹے اور بنڈا کے حامی "قومی" اور "یورپی" جذبے کی تعریف کرنے لگتے ہیں تو دونوں کے دونوں اِسے کھینچ تان کر اپنے ہی معیار کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بنڈا کا منتہائے نظر "یورپی قوم" سے یہ نہیں تھا کہ وہ یورپ کو ایک قوم کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس سے اس کا مفہوم وہ ہے جو یورپ کے متعلق فشٹے نے پیش کیا ہے۔

جا۔ اوٹن (Jo Otten) نے جو یورپ کی نئی نسل کے نمائندوں میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ بنڈا کے خطبے پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اپنے مقالہ (Imobility and Revolution) میں لکھتا ہے۔

"ہمیں شاعرانہ اور مبہم باتوں، خیالی اور متعصبانہ اصولوں اور روایتی پابندیوں سے آزاد ہونا پڑے گا۔ اپنے ہمسایوں کی غلط روایات اور مضرت رساں تعصبات میں رواداری کا جذبہ پیدا کرنا تو مشکل ہے ہی۔ مگر اس سے بھی مشکل یہ ہے کہ ان عقائد و تخیلات کی درشتی کو دور کیا جائے جن کے ہاتھوں یورپ تباہ ہو رہا ہے۔ لیکن اگر

ہمیں اچھی فصل کاٹنا اور دوسری کاشت کرنا ہے تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

ضرورت اِس امر کی ہے کہ یورپ کے نوجوانوں میں ایک غیر مقلدانہ جذبۂ خدمت و ایثار پیدا ہو، وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہیں اور قومی اور بین الاقوامی زندگی کے تمام تغیرات پر جو آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں، نظر رکھتے ہوں اور ان پر قابو پانے کے لئے کوشاں رہیں۔

کیا ان خیالات کے علمبردار کوشش کریں گے کہ یورپ کے نوجوانوں میں اِس مقصد کی اہمیت اور ضرورت کا احساس پیدا ہو جائے؟ اور کیا اس کی تکمیل کے لئے وہ کوئی راستہ نکالنے کی منظم کوشش کریں گے؟ یا پھر اُس حسرتناک انجام کا انتظار کیا جائے جو کبھی سماریا کے اچھوتوں کا ہوا تھا۔ کیا انجیل مقدس کا نظریۂ حیات و موت یہ نہیں:۔

"موت کے انتظار میں ہم یہاں کیوں بیٹھے رہیں، اِس خوف سے کہ شہر میں داخل ہوں گے تو سب مر جائیں گے، ہم قدم نہ اٹھائیں تو یہاں بھی تو آخر مرنا ہی ہے۔"

کیا ممکن نہیں کہ نوجوانانِ یورپ بھی انہی انسانوں کی طرح آگے قدم بڑھائیں اور کامرانی کا پیغام لائیں؟

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصہ اسی گھر میں گذر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا، میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہونگے، لیکن جس پر گذرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزہ آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے کو تباہ کئے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لئے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگدل ہے، مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لئے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب انہیں کو دیکھو۔ صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ بازار سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دوکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دوکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے، نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دوکان بدنام ہی کیوں ہوتی۔ انھیں ایسی ہی دوکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بار بار کہا کسی چلتی ہوئی دوکان سے چیزیں لایا کرو وہاں مال زیادہ کھپتا ہے۔ اس لئے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں۔ ٹٹپونجیوں سے ان کی ہمدردی ہے۔ اور وہ انھیں اُلٹے اُسترے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب، گھنا ہوا چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے۔ دال میں کنکر بھرے ہوئے۔ منوں لکڑی جلا ڈالو کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل۔ اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم تیل لائینگے تو ملاوٹ کا۔ بالوں میں ڈالو تو چکٹ جائیں۔ مگر دام دے آئیں گے اعلیٰ درجے کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دوکان پر جاتے تو جیسے انہیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دوکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دوکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک ان کی بات ہو تو برداشت کر لی جائے۔ روز روز کی یہ مصیبت نہیں برداشت

ہوتی۔ میں کہتی ہوں آخر آپ ٹٹپونجیوں کی دوکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمہیں نے لے لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انھیں بلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دیئے، بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے۔ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ دھوکا کھاؤ گی۔ میں ایک سنار کو جانتا ہوں۔ میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ میرے ساتھ چالبازی نہیں کر سکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا زیور اور پچاس روپے ان کے حوالے کئے۔ اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دیدیئے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا۔ اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی۔ برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں جنھیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں بھی عار نہیں۔ انکی دوستی بھی انھیں لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست، قلانچ، بے سروسامان ہیں، جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک نہ ایک صاحب قرض مانگنے کے لئے سر پر سوار رہتے ہیں اور بلا لئے گلا نہیں چھوڑتے۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ کسی نے روپے ادا کئے ہوں۔ آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے، دو بار کھو کر سیکھتا ہے۔ مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں روپے تو دے آئے۔ اب مانگ کیوں نہیں لاتے، کیا مر گئے تمہارے وہ دوست۔ تو بغلیں جھانک کر رہ جاتے ہیں۔ آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں

دیا جاتا۔ خیر شو کھا جواب نہ دو۔ میں بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروتی کرو۔ مگر ٹال تو سکتے ہو کیا بہانے نہیں بنا سکتے۔ مگر آپ انکار نہیں کر سکتے۔ کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔ بیچارے کیسے انکار کر دیں۔ آخر لوگ جان جائیں گے کہ یہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں۔ دنیا انہیں امیر سمجھتی رہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گرو رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے۔ اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک بیسے کے وارے نیارے نہ کر لے، اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں۔ میری تو ناک میں دم آ گیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح سر پر سوار۔ نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں۔ کوئی کہیں سے آ کر مرتا ہے، کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈا ہے۔ ذرا سا تو گھر مشکل سے دو چارپائیاں اوڑھنا بچھونا بھی بافراط نہیں۔ مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دعوت دینے کے لئے تیار۔ آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے اس لئے انہیں چارپائی بھی چاہیئے، اوڑھنا بچھونا بھی چاہیئے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے۔ جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سر۔ زمین پر پڑے پڑے سکڑ کر رات کاٹتے ہیں۔ گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں۔ لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آ جاتی ہے گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کو لئے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتے تک نہیں۔ خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ ایک بھی ایسا خدا کا بندہ نہیں جو ضرورت کے وقت انہیں دھیلے سے بھی مدد دے سکے دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر اس مرد خدا نے تو جیسے آنکھیں کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے۔ ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔ جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے وہ آپ کا دوست ہے۔ شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں۔ آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں۔

کسی کے پاس نہیں جاتے۔ امرا مغرور ہیں، مدمّغ ہیں، خوشامد پسند ہیں۔ ان کے پاس کیسے جائیں دبتی کانٹھیں گے الیوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمتگار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمتگار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی۔ مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رُکی ہوئی ہے۔ ایکدن جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے مگر آپنے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں۔ بڑا فرماں بردار ہے، پرلے سرے کا ایمان دار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجے کا باتمیز۔ خیر، میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیونکر ان کی باتوں میں آجاتی ہوں، مجھے خود تعجّب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں۔ بے ایمان نہ تھا، مگر احمق اول نمبر کا۔ بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھا جاتا ہے۔ کم بخت دوکانداروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اُسے دس تک کی گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیہ دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصّہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سُور کے کان اُکھاڑلوں۔ مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا لیکن انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اُسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کمبخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے۔ اس میں جھاڑو دیتا تو اِدھر کی چیز اُدھر، اوپر کی نیچے گویا سارے کمرہ میں زلزلہ آگیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل۔ مگر آپ کمرہ میں اطمینان سے بیٹھے رہتے، گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اُسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا اگر کل

سے تو نے سلیقہ سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دونگی۔ سویرے سو کر اٹھی تو دیکھتی ہوں کمرہ میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ ہر ایک چیز قرینہ سے رکھی ہے، گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔ آپ نے فوراً ہنسکر کہا دیکھتی کیا ہو آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا۔ تم طریقہ تو بتاتی نہیں ہو، اُلٹی ڈانٹنے لگتی ہو۔ لیجئے صاحب، یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر۔ میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقہ کے ساتھ کیا۔ اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا۔ اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی۔ اتفاق کی بات۔ ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اُٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی تندہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخواہ تو بیباق کر دو۔ خوب! ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے، اس پر تنخواہ بھی دیدوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ ایک کُرتہ دیا تھا وہ بھی چھین لیا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے رُکے۔

ایک دن مہتر نے اُتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بیکاری کے زمانے میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی کافی نہیں۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آجائے گا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جاسکتا ہے۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی شدّت کی تھی۔ اس کا مجھے خود احساس تھا۔ غریبوں پر کیا گزرتی ہے، اس کا بھی علم تھا۔ لیکن میرے یا آپ کے پاس اس کا افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب رؤسا اور امراء کے پاس ایک ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری پڑی ہوئی ہے تو پھر غربا کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں۔ خیر۔ میں نے تو اسے جواب دے دیا۔ آپ نے کیا کیا کہ اپنا کوٹ اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک

کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا، دعائیں دیں، اور اپنی راہ لی۔ آخر کئی دن سردی کھاتے رہے۔ صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے، وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی انھیں قدرت نے عجیب قسم کا دیا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو کٹ جاتی ہوں۔ آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے آپ کی بلا سے۔ آخر مجھ سے نہ دیکھا گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ جائیں تو اور بھی آفت آجائے آخر کام تو انھیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں۔ شاید انھیں ان اوصاف پر ناز ہو۔ میں انھیں نیک نفس نہیں سمجھتی۔ نہ منکسر مزاج ہی سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی ہے سیدھی سادی حماقت۔ جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات کو شراب کے نشہ میں بدمست، جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہیئے؟ اتنی عمر گذر گئی مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل سے میرے لئے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بیشک میں جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انھیں کلام نہیں مطلق عذر نہیں۔ مگر روپے میں دیدوں یہ شرط ہے۔ انھیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بیچارے اپنے لئے بھی کبھی کچھ نہیں لاتے۔ میں جو کچھ منگوا دوں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر آخر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے۔ اور مردوں کو دیکھتی ہوں۔ گھر میں عورت کے لئے طرح طرح کے زیور، کپڑے۔ شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لئے بھی مٹھائی، کھلونے، باجے، بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں قسم سی کھالی ہے۔ اس لئے میں تو انھیں بخیل کہوں گی۔ بدشوق کہوں گی۔ مردہ دل کہوں گی فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص نمود اور

سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں۔ آپ کی منکسر مزاجی کا یہ عالم ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدے دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔ نذر نیاز ڈالی تو دور کی بات ہے۔ اور تو اور، کبھی کسی افسر کے گھر جاتے بھی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اٹھائیں تو کون اٹھائے۔ اوروں کو رعائتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے۔ بیچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ مشکل کام آجائے تو انھیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انھیں مطلق عذر نہیں۔ دفتر میں انھیں گھسو اور پسّو وغیرہ خطابات ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں، ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے۔ میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو دنیا میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے۔ اگر ہم کسی سے کھچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھچا رہے۔ پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے یا جس پر اعتماد ہوتا ہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی۔ افسر بھی انسان ہیں۔ اس کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہے وہ کہاں پوری ہو۔ جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے۔ یا تو افسروں سے لڑ گئے۔ یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے۔ آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آجکل تحصیلدار ہیں۔ گھر کی جائداد انھیں کی نگرانی میں ہے۔ وہ شان سے رہتے ہیں۔ موٹر خرید لی ہے۔ کئی نوکر ہیں۔ مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی

میں نے کہا اپنے برادر مکرم سے کیوں نہیں مانگتے۔ کہنے لگے کیوں انھیں پریشان کروں۔ آخر انھیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔ کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہو گی۔ میں نے بہت مجبور کیا تو آپ نے خط لکھا بمعلوم نہیں خط میں کیا لکھا۔ لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟ آپ نے ترش ہو کر کہا ابھی ایک ہفتہ تو خط پہنچے ہوئے ابھی کیا جواب آسکتا ہے۔ ایک ہفتہ اور گذرا۔ اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات چیت کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش کوئی نہ کوئی شگوفہ لئے ہوئے۔ میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے۔ میرے میکے والوں کی تعریف بھی ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دلجوئیاں محض اس لئے تھیں کہ آپ کے برادر مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی، مالی، اخلاقی، تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کئے جاتے تھے۔ اتنی تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے۔ محض اس لئے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے لیکن میں کب چوکنے والی تھی۔ جب پورے دو ہفتہ گذر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آپہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا۔ تمہارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایا۔ یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا نفع نو دس سال قبل تھا۔ اب ایک ہزار سے کم نہ ہو گا۔ کبھی ایک جھنجھی کوڑی بھی ہمیں نہیں ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیئے۔ دو ہزار نہ ہو۔ ایک ہزار ہو، پانچ سو ہو۔ ڈھائی سو ہو۔ کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھر کو تو ہو۔ تحصیلدار کی آمدنی ہماری آمدنی کی چوگنی ہے۔ رشوتیں بھی لیتے ہی ہیں۔ تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔ آپ ہیں ہیں ہاں ہاں کرنے لگے۔ یہ بیچارے گھر کی مرمت کراتے ہیں۔ عزیز و اقارب کی مہمان داری کا بار بھی تو انھیں پر ہے۔ خوب! گویا جائداد کا منشا محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے۔ اس بھلے آدمی کو بہانے گھڑنے بھی نہیں آتے۔ مجھ سے پوچھتے میں ایک نہیں ہزار بتا دیتی

کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا۔ یا چوری ہو گئی۔ چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا۔ یا دس ہزار کا غلہ خریدا تھا اس میں خسارہ ہو گیا، گھاٹے سے بیچنا پڑا۔ یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی، اس میں دیوالہ پٹ گیا۔ آپ کو سوجھی بھی تو بھڑسی بات۔ اس جولانی طبع پر آپ مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں۔ تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی۔ پڑوس کی بیوی سے قرض لئے تب جا کر کام چلا۔ پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایسے برادران یوسف سے خدا بچائے!

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں۔ دو بچیاں بھی ہیں۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں۔ سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذ اللہ۔ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں، بڑے صاحبزادے ابھی گھوم کر نہیں آئے ہیں گھبرا رہی ہوں۔ آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلائی ہوئی آتی ہوں، اور اخبار چھین کر کہتی ہوں جا کر ذرا دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا۔ نہ جانے تمہارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں۔ تمہیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی۔ آج آئے تو خوب ڈانٹنا۔ تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں۔ ابھی تک نہیں آیا! بڑا شیطان ہے۔ آج بچا آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں۔ مارے ہنٹروں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ یوں بگڑ کر، طیش کے عالم میں آپ اس کی تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ اُدھر جاتے ہیں، اِدھر لڑکا آجاتا ہے۔ میں کہتی ہوں تو کدھر سے آگیا۔ وہ بیچارے تجھے ڈھونڈھنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے یہ عادت ہی چھوٹ جائے گی۔ دانت پیس رہے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے؟ آج قدر عافیت معلوم ہو گی۔ لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں۔ حیران و پریشان، اور بدحواس۔ گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے ہیں آیا کہ نہیں؟ میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں۔ آکر بیٹھا تو ہے۔ جا کر پوچھتے کیوں نہیں؟ پوچھ کر

ہار گئی کہاں گیا تھا۔ کچھ بولتا ہی نہیں۔

آپ گرج پڑتے ہیں۔ منّو۔ یہاں آؤ۔

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آ کر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے۔ چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے۔ آپ جامہ سے باہر ہیں، ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضبناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی۔ آپ لڑکے کے پاس جاتے ہیں۔ مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بناوٹی غصہ سے کہتے ہیں، تم کہاں گئے تھے جی۔ منع کیا جاتا ہے، مانتے نہیں ہو۔ خبردار جواب اتنی دیر کی۔ آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا ادھر اُدھر گھومتا ہے؟

میں سمجھ رہی ہوں کہ یہ تمہید ہے۔ قصیدہ اب شروع ہوگا۔ گریز تو بری نہیں لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے۔ بس آپ کا غصہ فرو ہو گیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالباً خوشی سے اُچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں۔ "تم تو جیسے ڈر گئے۔ بھلا دو چار طمانچے تو لگائے ہوتے۔ اسی طرح تو لڑکے شیر ہو جاتے ہیں۔ آج آٹھ بجے آیا ہے کل نو کی خبر لیگا۔ اس نے بھی دل میں کیا سمجھا ہوگا۔"

آپ فرماتے ہیں۔ "تم نے سنا نہیں میں نے کتنے زور سے ڈانٹا۔ بچہ کی روح ہی فنا ہو گئی ہوگی۔ دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے۔"

"تم نے ڈانٹا تو نہیں، ہاں آنسو پوچھ دیئے۔"

آپ نے ایک نئی اُپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیئے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیئے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشو و نما میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ

لڑکے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے کبھی گولیاں، کبھی کنکوے۔ حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو متجاوز آپ کی عمر ہے مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کہ کوئی لڑکا کنکوا اڑالے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ سکول سے جونہی لڑکے واپس آتے پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں جوت دیتے۔ یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں ایسے باپ کا بھلا لڑکوں پر کیا رُعب ہو سکتا ہے۔ ابّا جان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی۔ انھوں نے گھر میں قدم رکھا اور خموشی طاری ہوئی۔ ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی یہ برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے۔ تو ابّا جان کی ہی صحت کون بہت اچھی تھی۔ بیچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے۔ پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہو جاتی۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ تعلیم و تادیب میں انھوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحبزادے کو کنکوا اُڑانے کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ، یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو۔ ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے گویا گرو منتر دے رہے ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے۔ میں نے صاف کہہ دیا تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے۔ تمھیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ نہ ہو۔ لیکن آپ میرے بچوں کو خراب نہ کیجئے۔ بُرے بُرے شوق نہ پیدا کیجئے۔ اگر آپ انھیں سدھار نہیں سکتے تو کم سے کم بگاڑیئے نہیں۔ لگے باتیں بنانے۔ ابّا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہیں لیجاتے تھے لڑکا سر پٹک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے اور ان بھلے آدمی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے

پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو، وہاں بڑی بہار ہے، خوب آتشبازیاں چھوٹیں گی، غبارے اڑیں گے۔ ولایتی چرخیاں بھی ہیں۔ ان پر مزے سے بیٹھنا۔ اور تو اور۔ آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ کرکیٹ، فٹ بال، ہاکی لک سے ایک مہلک۔ گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ میں جیت کر آجاتا ہے تو کتنے خوش ہوتے ہیں گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کو چوٹ لگ گئی تو کیا ہوگا ہاتھ پانوں ٹوٹ گیا تو بیچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دیں گے، چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں، پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے، اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہوسکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے احتراز کریں، لیکن اس کا اثر عام حالات پر بہت کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قائم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لئے بھی بیس پچیس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں جہاں پیغام دیئے جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑائی۔ جب اس طرح ایک پورا سال گذر گیا اور لڑکی کا سترہواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کرلی۔ حضرت بھی راضی ہو گئے۔ کیونکہ ان لوگوں نے قرارداد نہیں کی۔ حالانکہ دل میں انھیں پورا یقین تھا کہ اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی۔ شادی کے بہ خیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہہ نہ تھا۔ لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی۔ یہ رسم بیہودہ ہے۔ یہ رسم بے معنی ہے۔ یہاں روپیہ کی کیا ضرورت؟ یہاں گیتوں

کی کیا ضرورت؟ ناک میں دم تھا۔ یہ کیوں، وہ کیوں؟ یہ تو صاف چھیڑ ہے۔ تم نے میرے مُنہ میں کالک لگادی۔ میری آبرو مٹادی۔ ذرا خیال کیجئے بارات دروازے پر پڑی ہوئی ہے اور یہاں بات بات پر ردّ و قدح ہو رہی ہے۔ شادی کی ساعت رات کے بارہ بجے تھی اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں۔ میں نے بھی برت رکھا۔ لیکن آپ کو ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں۔ میں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسب معمول ناشتہ کیا۔ کھانا کھایا۔ خیر۔ رات کو شادی کے وقت کنیا دان کی رسم آئی۔ آپ کو کنیا دان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے۔ اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں۔ لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپے پیسے کا ہوتا ہے۔ جانور بھی دان دئے جاسکتے ہیں۔ لیکن لڑکی کا دان ایک لچر سی بات ہے کتنا سمجھاتی ہوں صاحب، پرانا رواج ہے۔ شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے۔ عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہو گئے۔ مگر آپ کان ہی نہیں دیتے۔ پیروں پڑی۔ یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا۔ جو کچھ کرنا ہوگا میں کرلوں گی تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور اسے دعا دو۔ مگر اس مردِ خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آگیا۔ باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے، یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی۔ آپ گھر میں جھانکے تک نہیں۔ اور لطف یہ کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر

ہو جاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا، حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھیں اُٹھا کر نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے۔ بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں، کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پرزے گھس گھسا کر فٹ ہو گئے ہوں۔ اور ایک پرزے کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول اور نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رستے سے ہم بے خوف، آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔ اس کے نشیب و فراز، موڑ اور گھماؤ، سب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے۔ ہر لمحہ چور اور رہزن کا خوف! بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

افلاطون کی وصیّت

معلمین اور متعلمین کے لئے

مشہور و معروف یونانی فلسفی "افلاطون" کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں آج اس کی وصیت و نصیحت جو استادوں شاگردوں اور طلبہ کے سرپرستوں کے لئے بہت کارآمد ہے پیش کی جارہی ہے۔ یہ وصیت اس قابل ہے کہ لوگ اسے دستورالعمل قرار دیں۔ وہ کہتا ہے کہ :۔

"میں نہ تو اہل فلسفہ و حکمت اور ماہرین فن بلاغت کے اعلیٰ طبقے کی جماعت کو خطاب کرتا ہوں اور نہ اس سے کمتر طبقے کے لوگوں سے میرا خطاب ہے۔ بلکہ میرا روئے سخن ان دونوں طبقوں کے درمیانی گروہ کی طرف ہے

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ پر خود اپنے نفس کی اصلاح و تذکیر اور علم و ادب کے لئے ترغیب و تحریص لازم ہے۔ بجائے اس کے کہ میں کسی دوسرے شخص کو اپنی اصلاح و تہذیب کی ضرورت کا احساس دلاؤں۔ عقلاً یہ ضروری ہے کہ میں خود اپنے نفس کو اپنے نفع و نقصان کا محاسب قرار دوں۔ جب میں ایسا کروں گا تو ارباب علم و ادب سے بہرہ مند ہو سکوں گا۔

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ میں اپنے آپ کو نہیں پہچانتا، میں نہ حکیم ہوں نہ دانا اور نہ علم و تعلیم پر حاوی۔ میں اب تک ادب و حکمت کا طالب ہوں، کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرے بعد فصیح و بلیغ صاحب تحریر اور شاہراہ ہدایت قائم کرنے والا کون ہوگا۔ جو دونوں جماعتوں کو ایک ساتھ مطمئن کرے، اعلیٰ طبقہ (علماء و حکماء کی جماعت) بھی خوش رہے اور ادنیٰ طبقے کی تعلیم و تادیب بھی ہو جائے۔ نہ اُن کے ساتھ زیادتی ہو نہ اُن پر سختی، نہ اُن کا کسی خیال سے اکرام کرے، نہ اُن کے ساتھ زجر و توبیخ سے ذلت کا سلوک کرے نہ ان لوگوں میں گھل مل کر قرابت کا سا رویہ

اختیار کرے ۔ نہ ان کے ساتھ تساہل و غفلت اور بے رُخی کا برتاؤ کرے ۔ بلکہ دونوں گروہوں کے ساتھ مساوات اختیار کرے یعنی اپنے علو مرتبت و شان ریاست (سرداری) کو میری تعلیم کے مطابق قائم رکھے اور اُن کو اس بات کی تعلیم دے جو میں نے بتلائی ہے۔

تادیب و تعلیم کے مدعیو! اگر تم دبستان ادب کے سرتاج معلم بننا چاہتے ہو تو میری وصیت کو سمجھو۔ جو میں تم کو لکھ کر دیتا ہوں۔ تمھارے اخلاق تلامذہ و طلبہ کے ساتھ بلا زیادت و نقصان نہایت صحیح و مستقیم ہونے چاہئیں۔ قسم ہے اللہ کی جس نے ہر علم و ادب کو پیدا کیا ہے میں تم سے حلف لیتا ہوں کہ تم حد سے ہرگز متجاوز نہ ہونا۔ اپنی عادات کو پاکیزہ بناؤ اور اپنے علو مرتبت کا خیال رکھو۔ روحانی روشنی حقیقی آب و تاب کے مجسمے بن جاؤ۔ طلباء کے لئے صاف شفاف آئینہ بن جاؤ ۔ انسانیت و مروت ، تہذیب و فتوّت کے ہادی بنو تاکہ وہ تہذیب و فتو ت حاصل کرلیں۔ بُری باتوں، مصیبت و آلام، موت و فنا کا سبب بن جانے والی خواہشوں سے ان کو باز رکھو اور تم شہوت مذمومہ اور ارتکاب خطایا سے باز رہو۔ اُن سے خندہ پیشانی سے ملنے اور شیریں زبانی سے گفتگو کرنے میں بخل نہ کرو۔ ایسی چیز کے پاس نہ جاؤ جو تمھاری ملامت کا باعث ہو اور نہ تم کسی مذموم عادت کا سبب بنو کہ جس کی وجہ سے تمھارے شاگرد تمھارے ساتھ جسارت و دلیری سے پیش آئیں۔ تم ان کو اپنے ساتھ کھانا کھانے کی جرأت نہ دلاؤ۔ کسی ناپسندیدہ ، مکروہ بات کا ان کے سامنے ذکر نہ کرو۔ اُن کے ساتھ تمھارا برتاؤ رازداری کا ہرگز نہ ہونا چاہئے جب تم ان کو تعلیم دو تو ایسا کلام نہ کرو جو حاضرین (طلباء) کی جماعت سے پوشیدہ رہنے والا ہو۔ دھوکا اور فریب کے ساتھ اُن کو تعلیم مت دو۔ انعام و اکرام کے ساتھ ان کا تقرب حاصل نہ کرو۔ ان کے سامنے مت ہنسو۔ اُن کے ساتھ اُن کے استحقاق کے مطابق برتاؤ کرو۔ ان کو سکھاؤ کہ وہ اپنے علمی مراتب سے تنزل نہ کریں۔ ورنہ تم بھی ان کی تعلیم میں اپنے مرتبے سے تنزل کر جاؤ گے۔ رات کے خواب، زوال پذیر نعمت و دولت اور فانی لذتوں کے ساتھ مخلیں قائم نہ کرو، ورنہ تمھاری ذات کا خلوص اور تعلیم کا وقار

جاتا رہے گا۔ تم ان سے حیا کرو۔ عیوب سے بچو اور توقیر اختیار کرو۔ تم کو اور تمھارے شاگردوں کو بھی چاہئے کہ اس بیش قیمت پند و نصیحت پر عمل کر کے اپنے آپ کو سعن طعن۔ جرح قدح سے محفوظ کرلیں تم ان کو اپنی اور اپنے ہم پیشہ لوگوں کی نیز دوسرے اشخاص کی اکرام و اعزاز کے ساتھ خدمت کرنے کا عادی بناؤ اور تم ان کو اس سے نہ روکو۔

تم ان کو موقع و محل پر ادب کی تعلیم دو اور صحیح طور پر سمجھ بوجھ کر بہ شک و شبہ نہ ہو کہ تم نے ان کے ساتھ کوئی بے جا روش اختیار کی ہے۔ مبادا کہ تم اپنے علو مرتبہ سے تنزل کر جاؤ طلبأ میں سے جسارت کرنے والوں کے ساتھ والدین کی طرح نرم دلی نہ اختیار کرو اور نہ اس سے عزیز و اقارب جیسی محبت کرو۔ بلکہ اجنبی کی طرح بالکل ابتدائی تعلق سمجھ کر سیاست و تہذیب دینی چاہئے۔ اور تکلیف و مشقت کے ساتھ ان سے مواخذہ کرنا چاہئے۔ اگر ان کے عزیز و اقارب میں سے کوئی اس سیاست و تادیب و گرفت سے منع کرے اور تم سے رحم دلی اور نرمی کی درخواست کرے تو اس کو اپنے پاس سے نکال دو۔

تمھاری اصلاح و سزا غصہ اور بدحواسی کی حالت میں نہ ہو اور نہ تم اُن کو اپنی بے التفاتی اور نامہربانی کی وجہ سے بے کار چھوڑ دو۔ تمھارے سلوک کی رفتار غیر منظم، بے ترتیب نہ ہونی چاہئے اور نہ ان کو بغیر کسی قاعدے کی پابندی کے آزاد چھوڑ دینا چاہئے۔ تم ان کے اجسام اور خط و خال پر نظر تامل کرنے سے اجتناب کرو۔ جب کبھی ان سے محبت کرنے لگو اور ان پر تمھاری مہربانی زیادہ ہونے لگے تو تم ان کو بجائے دشمن کے خیال کرو اور وقعت و بزرگی کا لحاظ رکھ کر ان کو روحانی حقیقی تعلیم دینا یاد رکھو۔ اور ضرورت کے وقت لطیف اور عمدہ دواؤں سے ان کا علاج کرو تاکہ ان کے ذہن صاف اور روشن ہو جائیں اور جو علم تم ان کو سکھانا چاہتے ہو وہ ان کے واسطے باعثِ فخر و عزت ہو، ان کو باقلا، لوبیا، پیاز، لہسن جیسے نسیان پیدا کرنے والے کھانوں سے پرہیز کرنے کا عادی بناؤ اور سمیات کے استعمال سے بھی، نیز اس قسم کے اور کھانوں سے بھی ان کو باز رکھو مقررہ اوقات کے اندر عمدہ لطیف غذا کی معین مقدار کھانے کا پابند بناؤ۔ کھانے کی حرص

اور نشے سے ان کو بچاؤ، ان کی علمی حالت کے موافق عمل میں حد اعتدال سے تجاوز نہ کرنے دو بدکاری کی طرف مائل کرنے والی اور مہلک شہوانی نظر سے ان کو باز رکھو، بیہودہ نامعقول تیز رفتار سے چلنے کی ممانعت کرو۔

ان ہی میں سے ایک نائب استاد (مانیٹر) ان پر مقرر کرو۔ جو ان پر مناسب طور سے نگران رہے۔ اور وہ سب سے متقدم (علمی) ہونا چاہئے۔ خواہ وہ غنی ہو یا فقیر، وجیہہ وشکیل ہو یا بدشکل، بے عقل خوب صورت کا خیال نہ کرنا چاہئے بلکہ عقل و دانش کو مقدم سمجھنا چاہئے۔ اُن نوجوان طلباء کا مانیٹر ایسا ہونا چاہئے جس پر وثوق و اعتماد کیا جاسکے، جو ذکی سمجھ دار بارعب ہو اس کی شہرت، بدسلوکی، بدمعاملگی، بدباطنی، سے داغ دار نہ ہو، بدافعال شخصوں کو مانیٹر نہ بناؤ بلکہ اُن سے دور رہو۔ جب تم کو خوش قسمتی سے، صفات حسنہ و اخلاق فاضلہ سے مزین آراستہ مانیٹر مل جائے تو اس وقت مناسب ہے کہ تم طلباء کا روپیہ پیسہ، زر امانت اور ان کی چیزیں اس کے سپرد کردو کہ وہ انتظام کے ساتھ اُن کے لئے تصرف میں لائے۔

تم کو اپنے ہر طالب علم کے لئے مناسب تعلیم کا فیصلہ کرنا چاہئے۔ تمھاری تعلیم ان کے لئے امتیاز و تربیت کے خلاف نہ ہو، ان پر ان کی طاقت کے مطابق بار ہونا چاہئے۔ جبر و اکراہ اور تکلیف مالا یطاق سے ان کے دلوں کو مردہ مت بناؤ۔ ان میں سے ہزار ہزار، سو سو پچاس، پچاس، دس، دس پر نائب استاد مقرر کرو۔ جو اپنے طلباء پر امر و نہی کا مختار ہوگا اور اگر کبھی کوئی نائب علم و ادب کے راستے سے ہٹ کر اپنے طلباء کو ایسے کام کی ہدایت کرے جس کا وہ خود عامل نہیں۔ تو اس کو معزول کرکے دوسرے کو اس کی جگہ قائم کرنا چاہئے۔ حزم و احتیاط کے یہ بات خلاف ہے کہ کسی خائن اور جھوٹے پر اعتماد کیا جائے۔ اور جو شخص عمداً کسی کی جان لے لے اس کا بھی عذر قبول نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کسی نوجوان سے لغزش ہو جائے تو معاف کر دینا چاہئے اور تین مرتبہ تک یہ معافی ہو سکتی ہے۔ تین دفعہ غلطی کے بعد اس کو طلباء کی جماعت سے خارج کر دیا جائے اور اس کی آمد و رفت بند کر دی جائے تاکہ اور نوجوان اس سے متاثر نہ ہوسکیں۔

علم وادب کو دوست رکھنے والے بھائیو! میری وصیت سنو اور یاد رکھو، میں بھی تمہاری طرح علم وحکمت کا شیدائی ہوں، میں تم کو ایک آسان مقالہ لکھ کر دیتا ہوں جس میں تم کو ہر عمدہ علم وفن حاصل کرنے کا راستہ بتاؤں گا۔ جس سے ہر متعلم لطف اندوز ہوگا۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ علم کی تحصیل شروع کرنے سے پہلے تم کو بالکل پاک باطن اور صاف دل ہونا چاہئے نہ تم میں کسی طرح کا عیب ہو۔ کیوں کہ ناپاک اشیا پاک صاف چیزوں کے ساتھ، اور پاک چیزیں ناپاک کے ساتھ نہیں مل سکتیں۔ ناپاک لوگوں کو تعلیم مت دو۔ بلکہ پاک صاف نیک طبع لوگوں کو زیور علم سے آراستہ کرو۔ عیب دار، کور باطن شخص کو پاک باطن، صاف دل انسان کے پاس بھی نہ آنے دیا جائے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ صاف لطیف اور شیریں پانی کا ایک گلاس متعفن کالی مٹی کے گھڑے کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نیز کم زور آشوب زدہ نگاہ سورج کی شعاعوں کی تاب نہیں لاسکتی۔ ایسے جسم کے اندر جس میں جہل وحرص کا خمیر ہوچکا ہو، روح نفس پر تہذیب و تادیب کا اثر نہیں ہوسکتا۔ عاقل انسان کے لئے اس سے زیادہ قبیح اور بری بات کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ لوگوں کو ایسی بات بتلائے جس سے وہ خود بے بہرہ ہو اور ارتکاب معصیت سے آلودہ ہو۔ علم وحکمت اور اللہ عزوجل سے تشبہ (بمضمون تخلقوا باخلاق اللہ) افعال حسنہ واخلاق فاضلہ کا رہنما اور عقل و دانش کا معلم ہے۔

حسد سے بچو! یہ نفاق وشقاق، جدائی وافتراق پیدا کرنے والی چیز ہے۔ تمہارا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تواضع کا سلوک ہونا چاہئے۔ کمال محبت کے اندر مساوات اختیار کرنی چاہئے اپنے نفسوں کو اللہ کی طرف جھکا دو اور عقلائے کاملین اور فضلائے عالمین کی اطاعت کرو جو اپنے افعال واعتدال اور صبر وقناعت کی وجہ سے عظمت کا کامل استحقاق رکھتے ہیں۔

آباواجداد پر فخر کرنے والے ناقابل اعتماد ہیں۔ وہ ایسی اولاد ہیں کہ اپنے بزرگوں سے تہذیب نفس کا علم اور دیگر ضروریات ولوازم سے واقفیت حاصل کرنے میں قاصر رہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ طلبا کے سامنے آبائی ورثہ کے بلا استحقاق مدعی بنتے ہیں۔ یہ لوگ ظالم ہیں، علم وحکمت

کے دشمن ہیں۔ شیطان کے جال میں پھنسانے والے ہیں ان سے اجتناب لازم ہے۔ تم میں سے ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے رفیق کو اپنے جیسا سمجھے۔ اس کو رازداری کا اہل خیال کرے۔ ہر ایک پر دوسرے کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت ضروری ہے تاکہ آپس میں رازداری بلا خوف و خطر ہو سکے۔

سننے والے اطاعت شعار، حق و حکمت کے طالب و پرستار، حق کی طرف سے برسرِ پیکار، صدق و راستی کے دوست دار ہو، اوقات و ازمنہ اور ان کے اختلافات کا علم حاصل کرو، صلاح و سکون، سلامتی و اطمینان کے قیام کے واسطے معتمد مرکز بن جاؤ۔ نیک لوگوں کی باتیں کیا کرو۔ ان کی ظاہری و باطنی بصیرت سے متواضع و منکسر ہو کر بینائی حاصل کرو، متکبّر مت بنو، خداؤں (معبودوں) کی سی رفعت حاصل کرو، ہمیشہ ترک لذات کا سبق دیتے رہو۔ روحانیت و حقائق کے اندر تدبر و تفکر کیا کرو۔ ایسا کلام اختیار کرو جو دائمی حیات کا باعث ہو۔ فضائل و محاسن سے تمسک کرو، تکبّر کا بارگراں اپنے کندھوں پر نہ اٹھاؤ۔ اپنے مراتب سے تجاوز نہ کرو۔ جھوٹی تعریف اور غیر واقعی باتوں سے اپنی شان کا اظہار نہ کرو۔ فخر و مباہات سے اپنی عظمت قائم نہ کرو، سرکش جابر لوگوں کے اخلاق سے دور رہو۔ تم اپنی کم علمی و نادانی سے بے خبر غافل نہ رہو۔ جو کچھ تم سکھلاتے ہو اس سے کامل طور پر واقف بنو اپنے حدود سے تجاوز کرنے کی جرأت نہ کرو۔ بے حقیقت باتوں پر مت جھگڑو۔ غلط اور لغو باتیں اختیار نہ کرو۔

شہوات قبیحہ سے بچو۔ ایسی خواہشات کی طرف رجحان نفس و میلان طبع کو روکو، علمی کتابوں کا مطالعہ لازم سمجھو، اور کبھی مطالعے سے مکدر و بد دل نہ ہو۔ حکماء علماء کے سامنے کامل سکوت و سکون اختیار کرو۔ اپنے والد اور بزرگوں کا خوف و ادب ملحوظ رکھو۔ اپنی ماؤں کا اکرام و احترام کرو آرام طلبی و کاہلی اور نیند اور سستی نہ پسند کرو۔ خیر و شر میں امتیاز، نفع و نقصان میں فرق کرو۔ جب تک تم سے سوال نہ کیا جائے جواب نہ دو۔ جھگڑے قضیوں سے بچو لطیف غذا

استعمال کرو۔ کھانے کی حرص سے گریز کرو۔ مسکرات ونشہ آور چیزوں سے باز رہو بلکہ معارف وحکم اور علم وادب کی دائمی حلاوت پر خوردونوش کی فانی لذت کو ترجیح نہ دو۔ اور شراب خوری کی حرص نہ کرو۔ تمہارے کھانے کے اوقات مقرر ہونے چاہئیں۔ اگر ممکن ہو تو کھانے میں شہد بھی استعمال کرو۔

"اللہ عزوجل کا ذکر بہت کیا کرو۔ اس کے احسانات کو فرداً فرداً بھی اور مجتمع ہو کر بھی یاد کیا کرو۔ اپنے سے بڑے اور زیادہ عمر والے کے سامنے اپنی آواز بلند نہ کرو۔ ان سے کلام وگفتگو میں جرح وقدح نہ کرو، ان کے سامنے لغو باتوں کے لئے اپنی زبان کو آزادی نہ دو۔ دوسروں کی برائیوں کو اپنا مشغلہ نہ بناؤ۔ تم اپنے آپ کو عاقل ودانشمند نہ سمجھو۔ بلکہ دوسرے خود تمہاری دانش وحکمت کی شہادت دیں گے۔ جب کبھی تمہاری بات صحیح ودرست اور تمہاری دلیل قوی ہو جائے تو اپنے دل میں خوش نہ ہو۔ اور مخالف پر غالب آجانے سے فخر نہ کرو۔"

"تنہائی ووحدت کے اندر سکون واطمینان اختیار کرو، رفعت وسرداری کی خواہش نہ کرو۔ اگر کوئی شخص تمہاری تعظیم وتکریم کرے تو تم اپنے دل میں متواضع اور منکسر ہو۔ اگر کوئی ذمہ دار حاکم شخص تم کو کسی کام کا ذمہ دار بنائے تو تم اس کام کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دو۔ غصے کو پی جانا اپنی عادت بناؤ، غیظ وغضب کو جلدی اختیار نہ کرو۔ عزت نفس وخودداری کا خیال رکھو۔ اس کی وجہ سے تم کو عظمت حاصل ہوگی، کوئی کام غیظ وغضب کی حالت میں نہ کرو۔ دوستوں کا دوستی سے پہلے امتحان کر لو۔ آزمائش سے قبل دوست نہ بناؤ۔"

"بازاروں میں کھڑا ہونا معیوب سمجھو۔ اگر تم بازار نہ جانے کا انتظام کر سکو تو ضرور کرو، کیوں کہ بازار، آبادی اور شہر کے گھورے ہیں۔ اور وہاں انسان کو کوئی پاک صاف چیز نہیں ملتی۔ عوام خصوصاً بازار کے لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ وہ لوگ بے خبر، بے عقل، سفلے ہیں ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ صحیح علم حقیقی معرفت سے بے بہرہ ہیں۔ اپنے اسرار وبھید کسی کو نہ بتاؤ۔ حکام سے تواضع کے ساتھ بات کرو۔ بلکہ ہر شخص کے لئے جھک جاؤ۔ متواضع

ہوجاؤ، لوگوں کے ساتھ میل جول کم رکھو، تم سب آرام سے رہوگے۔ تم کو اگر تکلیف ہوگی تو جان پہچان والوں ہی سے ہوگی۔ اس دنیا کی عارضی عزت وشوکت جو اکثر لوگوں کی نگاہ میں بہت بڑی چیز ہے تمھارے دل میں اس کی وقعت بالکل نہ ہونی چاہیئے۔ جب کسی انسان کا کوئی فعل تم کو ناگوار معلوم ہو تو اس کو اسی وقت متنبہ کردو، دو رُخی مت اختیار کرو، تمھاری محبت میں چاند کی روشنی کے اختلاف و انقلاب کی طرح تلون و تغیر نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ سورج کی روشنی کی طرح قائم ودائم بلا زیادت ونقصان رہنا چاہیئے۔ احکام کے اندر لوگوں کی طبیعت کا خیال نہ کرو بلکہ عاقلاً بلاخوف وخطر حکم بنو، جو تمھاری نظروں سے غائب ہیں اُن کی برائی مت کرو۔ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے قسم نہ کھاؤ، تم سلاطین وملوک کے زمرے میں مت رہو اگر وہ تمھارے حق میں غائب ہیں۔ تم کو بوڑھا ضعیف اور ذہن وحافظہ کو خراب کرنے والے لہو ولعب سے بچنا چاہیئے ہنسی کی مداومت سے دور رہو اور ایسے لوگوں کی مجالست سے اجتناب کرو جو شہوات قبیحہ کو مستحسن ومزین کرکے دکھلاتے ہیں اور اپنی تدبیروں سے غلط کاریوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو اپنی دسیسہ کاری سے ناقص خواہشات، فاسد خیالات پیدا کرکے تم کو سانپ، اژدہا، سمیات، اور مہلک ادویات پر جرأت دلاتے ہیں ان لوگوں سے بھی دور رہو جو ایسی ایسی عجیب چیزیں دکھلاتے ہیں جن کی حقیقت کچھ نہیں۔ شعبدہ بازی، جادوگری جھاڑ پھونک اور ہنسی دلانے والی باتوں سے بھی بچو، دوست نما دشمن، اور اس بھائی سے بھی بچو جس کے کلام میں صداقت نہیں۔ ضمانت وذمہ داری کا اعتبار نہیں۔ بات کے اندر صواب وراستی نہیں۔

" نوجوانوں کو فن حرب کے متعلق صف بندی، نشانہ بازی، بھاگ دوڑ، پہلوانی اور اسلحہ کے استعمال کی ضروری ضروری باتیں معلوم ہونی چاہئیں۔ لیکن ان چیزوں میں انہماک نہ ہونا چاہیئے۔ ان کے لئے گھوڑے کی سواری ضروری ہے۔"

" علم موسیقی کے متعلق بھی کچھ واقفیت مناسب ہے۔ کیونکہ فنون لطیفہ میں سے ایک یہ بھی

ہے۔ آوازہ لحن کے جوڑ توڑ اور مخارج کی مناسبات اور عود کے اقسام معلوم کرو۔ اور دوسرے آلات موسیقی سے بھی کچھ واقفیت ہو جانی چاہئے۔ سب سے بہتر "ارغن" ہے جس میں طبائع اربعہ کے لحاظ سے "اسی" تار ہوتے ہیں"۔

"دیکھو! جب تم اس تہذیب و حکمت کے زیور سے آراستہ ہو جاؤ اور تم کو اس کی بہت ہدایت و رشد حاصل ہو جائے تو تم علم و ادب کے آسمان پر خورشید جہانتاب و مہر عالمتاب ہو کر چمکوگے پھر تم اس "احد" کا شکریہ ادا کرو جو تمام و کل کا مدبر، ازلی، قدیم، حق و انصاف کا قائم کرنے والا ہے جو اس وصیت و نصیحت کے خلاف کرے تو متعلمین کے ذمہ دار نگران پر اس کی تادیب واجب ہے کیونکہ ہر خطا کے لئے سزا ضرور ہے۔ خواہ فوری ہو یا بتاخیر، لیکن فوری سزا اختیار کرنا بہتر ہے۔ تاکہ لوگوں میں خلل و فساد کا سبب اور مجادلہ و مقاتلہ کا باعث نہ ہو جائے۔ ایسے شخص کو نکال دینا چاہئے اور متعلمین کی جماعت میں نہ شامل ہونے دیا جائے۔ بلکہ اس کو آرام و چین کی زندگی بھی بسر کرنے دی جائے"۔

"نوجوانوں کے نظام و تدبیر کے ذمہ دار نگراں پر واجب ہے کہ وہ صاف شفاف آئینہ کے مانند ہو، کیونکہ وہ افسری و سرداری کا ذمہ دار ہے جو اس وصیت پر عمل کرنے میں کوتاہی کرے اس کو تعلیم طلبہ و تادیب متعلمین سے معزول و برطرف ہو جانا چاہئے"۔

سانپ کے منہ میں مینڈک نہ اُگلا جائے نہ نگلا جائے۔

اسپین کے ساتھ مدعیانِ ہمدردی کی دستگیری

ورسائی کے معاہدے پر ایک اور ضرب

ورسائی کے معاہدہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جرمنی دریا بین الاقوامی اختیار میں رہیں گے لیکن ہٹلر نے نومبر ۱۹۳۶ء میں اپنے ملک کے سب دریاؤں پر کامل قبضہ کا اعلان کر دیا۔

دنیا کی بڑی طاقتوں کا جنگی ساز و سامان

بحری قوت - ایک جہاز برابر ہے ایک لاکھ ٹن کے

ملک	ٹن
برطانیہ	ٹن ۱۱۶۱۰۰۰
امریکہ	〃 ۱۰۷۳۰۰۰
جاپان	〃 ۸۵۰۰۰
فرانس	〃 ۵۰۲۰۰۰
اٹلی	〃 ۴۱۶۵۰۰
روس	〃 ۲۰۰۰۰۰
جرمنی	〃 ۱۸۰۰۰۰

ہوائی طاقت - ایک جہاز برابر ہے ۵۰۰ جہازوں کے

ملک	جہاز
روس	۴۰۰۰
برطانیہ	۳۵۰۰
فرانس	۳۱۰۰
جرمنی	۳۰۰۰
اٹلی	۳۰۰۰
امریکہ	۱۵۰۰
جاپان	۱۰۰۰

بری طاقت

ایک آدمی برابر ہے ایک لاکھ فوج کے

ملک	فوج
جرمنی سپاہی	۱۳۰۰۰۰۰
روس	〃 ۱۳۰۰۰۰۰
اٹلی	〃 ۷۵۰۰۰۰
فرانس	〃 ۶۶۵۰۰۰
برطانیہ	〃 ۵۴۰۰۰۰
جاپان	〃 ۴۰۰۰۰۰
امریکہ	〃 ۱۴۰۰۰۰

کلام آزاد

جناب حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری اردو کے نہایت خوش فکر شعرا میں سے ہیں۔ غزل گوئی میں آپکا پایہ بہت بلند ہے اور اردو کے چوٹی کے غزل گو شعرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کے کلام کی خصوصیت انتہائی سلاست و روانی کے ساتھ باریک سے باریک فلسفیانہ اور عارفانہ مسائل کا بیان کرنا ہے۔ مگر اس کے باوجود آپ کی غزل، غزل کے حدود سے متجاوز ہو کر وعظ و خطبہ کی صورت نہیں اختیار کرتی اسکی رنگینی اور دلکشی برابر قائم رہتی ہے۔ ذیل میں ہم موصوف کی زیر طبع دیوان سے چند غزلیں منتخب کر کے پیش کرتے ہیں۔ اس انتخاب کا باقی حصہ اگلی اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔

حالِ دلِ فگار سنایا نہ جائے گا ۔۔۔ زخمِ درونِ سینہ دکھایا نہ جائے گا
ظاہر کا ربط و ضبط بڑھانے سے فائدہ ۔۔۔ دل ایسی چیز ہے کہ گنوایا نہ جائے گا
اِک مدعائے واجب الاظہار دل میں ہے ۔۔۔ لیکن زبان تک کبھی لایا نہ جائے گا
یارانِ غمگسار کی غمخواریاں فضول ۔۔۔ الفت وہ درد ہے کہ بٹایا نہ جائے گا
اب تیری عادتوں کا بدلنا محال ہے ۔۔۔ جو ہم نے کھو دیا ہے وہ پایا نہ جائے گا
تیرے ستم جو آج نہ بھولے تو کل سہی ۔۔۔ لیکن ترا خیال بھلایا نہ جائے گا
انجامِ کار کا بھی تجھے کچھ خیال ہے ۔۔۔ کیا جو ستائیگا وہ ستایا نہ جائے گا
غیروں کے واسطے ہی مسیحائے وقت ہو ۔۔۔ ہم کو تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

آزاد مفت جان کھپانے سے فائدہ
قسمت کی خوبیوں سے بر آیا نہ جائے گا

کبھی مہرباں ہو کے دل شاد فرما ۔۔۔ کبھی قدرِ خدماتِ آزاد فرما
اگر ہو سکے بھول کر یاد فرما ۔۔۔ اگر شاد فرما سکے شاد فرما
کبھی اپنی موجودہ غفلت سے باز آ ۔۔۔ کبھی الفتِ ماسبق یاد فرما
یہ خاموشی حیرت افزا کہاں تک ۔۔۔ کچھ احباب کے حق میں ارشاد فرما

اسیرانِ الفت بہ تنگ آچکے ہیں — جو خوفِ خدا ہے تو آزاد فرما
کچھ احساسِ تکلیفِ شوقِ نہاں کر — کچھ اظہارِ دردِ خداداد فرما
جو بر لا سکے حاجتِ شوق بر لا — جو فرما سکے فکرِ امداد فرما
ترے لطف بے انتہا ہیں تو ہونگے — کبھی کوئی تشریحِ اعداد فرما
جہاں تک ہو پامال جور و جفا کر — جہاں تک ہو تکمیلِ بیداد فرما
کہاں تک جنونِ تغافل کہاں تک — کچھ اصلاحِ طبعِ خداداد فرما
کبھی شرطِ منصف مزاجی بجا لا — کبھی حق رسیہائے آزاد فرما

شکر ہے کہ دل دے کر یار دلربا پایا — یعنی جس قدر کھویا اس سے کچھ سوا پایا
خنجرِ فنا کھا کر ثمرۂ بقا پایا — زیست کی بنا ڈھا کر زیست کا مزا پایا
جس نے ہر دو عالم کو چشمِ غور سے دیکھا — اس نے ہر دو عالم سے تم کو ماورے پایا
ہم نے بے نشاں ہو کر آپ کا نشاں ڈھونڈا — ہم نے آپ کو کھو کر آپ کا پتا پایا
شاد رہ کے بھی شاکر رنج سہہ کے بھی شاکر — بندۂ محبت کو بندۂ رضا پایا
ہم کو بتکدے میں بھی شانِ حق نظر آئی — ہم نے بتکدے کو بھی خانۂ خدا پایا
صرف اک غمِ الفت وجہ صد خوشی دیکھا — ورنہ ہر تعلق کو رنج و غم فزا پایا
ہاں متاعِ راحت بھی قیمتی سہی لیکن — جنسِ دردِ الفت کو جنس بے بہا پایا
اے ندیم دور اندیش! ہمیں نے عشقِ جاناں میں — یہ نہ پوچھ کیا کھویا اس کو دیکھ کیا پایا
اس میں شک نہیں آزاد شوخ بھی ہے منہ پھٹ بھی — کچھ سہی مگر اس کو آدمی کھرا پایا

سرسبز پھر بہار سے سارا چمن ہوا — معمور جلوۂ گل و سرو و سمن ہوا
پھر حکم مے کشی مسرت کا عام ہے — پھر اذن چارۂ غم و رنج و محن ہوا

پھر شیخ دل سے پیرِ مغاں کا مرید ہے ۔۔۔ پھر زاہدوں کا نشۂ تقویٰ ہرن ہوا
پھر محو سادہ زاہدِ شب زندہ دار ہے ۔۔۔ پھر رہن بادہ خرقۂ زہد کہن ہوا
پھر جام لے کے ساقیِ رنگیں ادا ہوا ۔۔۔ پھر گرم نغمہ مطربِ گل پیرہن ہوا
پھر صحنِ گلستاں میں بساطِ طرب بچھی ۔۔۔ پھر شغلِ مے کشی لبِ نہرِ چمن ہوا
پھر جلسۂ طرب میں غزلخوانیاں چھڑیں ۔۔۔ پھر انعقادِ محفلِ شعر و سخن ہوا
پھر چار سمت سرو قدوں کے ہجوم ہیں ۔۔۔ پھر اجتماعِ لالہ رخانِ زمن ہوا
پھر ہم زبان ہر صنمِ گل بدن بنا ۔۔۔ پھر مہربان ہر بتِ غنچہ دہن ہوا
پھر اخترِ مقدرِ عالم چمک اٹھا ۔۔۔ پھر آفتابِ لطفِ خدا ضو فگن ہوا

پھر اب کے سال چار طرف اتنے خم لنڈھے
آزاد فاقہ مست بھی پی کر مگن ہوا

حقِ الفت ادا کریں گے آپ؟ ۔۔۔ آپ پاسِ وفا کریں گے آپ؟
ہم فریبِ نگاہ کیوں کھاتے ۔۔۔ کیا خبر تھی دغا کریں گے آپ
کون واقف کسی کا دل لے کر ۔۔۔ کیا بنائیں گے کیا کریں گے آپ
آپ کیوں درپئے دل و جاں ہیں ۔۔۔ ہم نثار ادا کریں گے آپ
آپ پرسانِ حالِ غم ہوں گے؟ ۔۔۔ آپ خوفِ خدا کریں گے آپ؟
کب تک آزاد جبر کے ہوتے ۔۔۔ صبر پر اکتفا کریں گے آپ

اس کو قیدِ مکاں سے کیا نسبت ۔۔۔ بے نشاں ہے نشاں سے کیا نسبت
عرش و کرسی کی رفعتیں برحق، ۔۔۔ مگر اس آستاں سے کیا نسبت
مہر بھی ضو فشاں سہی لیکن ۔۔۔ اس رخِ ضو فشاں سے کیا نسبت

شیخ کعبہ خدا کا گھر ہی سہی
پھر و پیر مغاں سے کیا نسبت
برق مضطر سہی مگر آزادؔ
میرے قلبِ تپاں سے کیا نسبت

میں وہ بیکس کہ واجب الامداد
تو وہ کافر کہ خوگر بیداد

دل بھی ناشاد جان بھی ناشاد
ہر طرح جی پہ آبنی فریاد

ایک دل اور سینکڑوں دلبر
ایک صید اور لاتعد صیاد

ہائے وہ لطف الفت باہم
یاد ہے آج تک وہ عالم یاد

منزل عشق پرخطر ہے تو ہو
شوق کہتا ہے ہر چہ بادا باد

او ستم دوست انصفی فرما
داد خواہوں پر اور یہ بیداد

کون تاب مقاومت لاتا
ہم تھے اور تیرے عشق کی افتاد

اب وہ ظالم ہے اور فکر جفا
لے، امید وفا مبارک باد

نہ وہ صبر و سکون دل باقی
نہ وہ صبر و سکوں کی استعداد

میرے غم سے نمود شادی غم
میرے دم سے وجود کون و فساد

کہیں آیا وہی نہ ہونے دیا
بارک اللہ! قسمت برباد

حال آزادؔ کیا گذارش ہو
کہ وہ آزادیاں نہ وہ آزاد

اک مرا دل کہ مصائب کا شکار
اک مری جان کہ صرف افکار

تو اور اک چشم عنایت سے دریغ
میں اور امید وفا کا آزار

نامرادانہ بسر ہوتی ہے
نہ وہ دنیا ہے نہ وہ لیل و نہار

نہ وہ تسکین کے پہلو باقی
نہ وہ امید نہ وہ صبر و قرار

نہ کوئی درد و مصیبت کا شریک
نہ کوئی یار نہ کوئی غم خوار

نہ وہ خوش وقتی بزم عشرت
نہ وہ دلچسپئ سیر گلزار

نہ وہ محفل نہ وہ غوغائے نشاط
نہ وہ گلشن نہ وہ دنیائے بہار

نہ وہ آنکھیں نہ وہ رنگیں جلوے
نہ وہ نظریں نہ وہ لطف دیدار

جس جگہ جائیے دل کو وحشت
جس طرف دیکھئے کلفت دو چار

کامرانی کا زمانہ نہ رہا
کوئی حسرت ہو نکلنی دشوار

کیا پڑی ہے کہ کوئی رہبر ہو
میں ہوں اور منزل دشوار گذار

اسے ترے لطف کی دنیا بھولی
اس طرف بھی نگہ لطف شعار

کوئی انجام کا کھٹکا نہ رہا
اے زہے شغل ہجوم افکار

وضع آزاد نرالی دیکھی
ہاتھ میں سبحہ گلے میں زنار

تو کہ ہر وقت غرق جلوۂ ناز
میں کہ دن رات سجدہ ہائے نیاز

بارک اللہ دلربا انداز
آنکھ میں سحر بات میں اعجاز

میری امید یاس کی تمہید
میری تسکین درد کا پرواز

میرے حصے کا اضطراب ازل
میرے قصے کا درد سے آغاز

تیرے گھر کے طواف میراج
تیرے در کے سجود میری نماز

تیری منزل بلند تر منزل
میری پرواز پست تر پرواز

وہ کمال کرم وہ غایت قرب
وہ وصال بہم وہ راز و نیاز

طاقت ضبط راز۔ سلب نہ کر
جو مرا راز خود وہ تیرا راز

تم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں
دل کی آواز غیب کی آواز

شکر احسان دوست، دل بخشا | اور وہ دل کہ درد سے ممتاز
سرمدی زندگی عطا کردی | اے غم دوست تیری عمر دراز

بندہ پرور اب آپ کا آزادؔ
خود ہی بندہ ہے خود ہی بندہ نواز

وہ شیدائے اصنام ہے اور بس | یہ عہد در و بام ہے اور بس
کل آفاق اب تک بایں عقل ورائے | گرفتار اوہام ہے اور بس
وجودِ وفا کی تلاشیں عبث | فقط نام ہی نام ہے اور بس
نہ اذکار دنیا نہ اذکار دیں | حدیث مے و جام ہے اور بس
وہی ہم ہیں اور شغل بیکار عشق | وہی فرصت نام ہے اور بس
زمانہ ہے اور کوشش جد وجہد | مگر ہم ہیں آرام ہے اور بس

نہ آزادؔ مے کش نہ شاہد پرست
وہ کم بخت بدنام ہے اور بس

تو ہے اور فکرِ جفا ہے اور بس | میں ہوں اور شکرِ خدا ہے اور بس
بندہ پرور اس طرف بھی اِک نظر | اِک نظر کی التجا ہے اور بس
یا تو دل تھا اور لاکھوں مدّعا | یا دل بے مدعا ہے اور بس
کوئی بارِ عشق اٹھا سکتا بھی ہو | ادّعا ہے ادّعا ہے اور بس
عادت چون و چرا کے دن گئے | اب سر صبر و رضا ہے اور بس
کل تک اصرار خطا تھا لیکن آج | میں ہوں اقبال خطا ہی اور بس
ہو چکے دنیا کے شکوے ہو چکے | اب فقط تجھ سے گلا ہے اور بس

ناخدا بھی ناخدائی کر چکے — اب خدا کا آسرا ہے اور بس
دوستو ناصح مرا دشمن نہیں — اک ذرا سر پھر گیا ہے اور بس

شکوۂ جور و جفا سے کیا غرض — کیا غرض اِک بیوفا سے کیا غرض
اب کوئی امید ہی دل میں نہیں — زحمتِ بیم و رجا سے کیا غرض
دل جہاں بہلے وہی گلزار ہے — باغ و گلشن کی فضا سے کیا غرض
مجھ کو اپنی زندگی دو بھر نہیں — التفات جاں فزا سے کیا غرض
آپ کے ارمان بھی تھوڑے نہیں — جستجوئے ماسوا سے کیا غرض
آپ کی حسرت بھی ناکافی نہیں — خواہش ہر دو سرا سے کیا غرض
اب سراپا مدعا ہوں اب مجھے — عرض حال مدعا سے کیا غرض
آپ تکمیلِ ستم فرمائیے — آپ کو خوف خدا سے کیا غرض
جن کو توفیق مے و معشوق ہے — ان کو ضبط اتقا سے کیا غرض

حضرت آزاد ہم اک رند ہیں
پارسایانہ ریا سے کیا غرض

تنقید و تبصرہ

پیلیاس اور میلی ساند | ڈراما مصنفہ مارس میٹر لنک، مترجمہ جناب تمنائی صاحب، مقدمہ از پروفیسر شرف عالم آرزو جلیلی صاحب، ناشر پنجاب بک ڈپو تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۹۰ صفحے۔ قیمت ۱۲

مارس میٹر لنک یورپ کے انوکھے ڈراما نویسوں، ادیبوں اور فلسفیوں میں مشہور ہے۔ انسانوں کی دلی، بے بسی، موت کے بعد کی انجان دنیا کے خیالی نقشے، یہ اس کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ زبان میں اسے خاص ملکہ ہے۔ بلکہ بیشتر فرانسیسی ادیبوں کی طرح اس کا اصل سرمایہ زبان ہی ہے۔ وہ حقیقت نگاری کی دنیا اور زندگی اور انسانوں کی اس شکل کو جو ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں نظر انداز کرکے تمام تصورات اور جذبات کو تمثیل کے کڑھاؤ میں گھوٹتا ہے اور زبان کے قوام میں ڈال کر نئے نئے مزے کی مٹھائیاں تیار کرتا ہے جن میں سے سب کی تعریف یہ ہے کہ وہ معدے تک پہنچنے نہیں پاتیں۔ کبھی منہ ہی میں گھل کر ہوا بن جاتی ہیں۔ کبھی دماغ میں ہلکا سا سرور پیدا کرکے رہ جاتی ہیں۔

پروفیسر آرزو جلیلی صاحب نے مقدمے میں میٹر لنک کی سوانح حیات اور اس کی ادبی خصوصیات بیان کی ہیں اور خاصی وضاحت سے۔ ترجمہ بھی خاصا رواں ہے۔ لیکن ہم اصل سے مقابلہ نہیں کر سکے۔ اس لئے اسکی صحت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ چھپائی اچھی نہیں ہے۔ اور نام صحیح پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ شروع میں منیجر صاحب پنجاب بک ڈپو نے فاضل مترجم، اور مقدمہ نویس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور اشاعت کے آداب میں اس نئی رسم کا اضافہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

م م

نصاب شہریت | مصنفہ پروفیسر عطار اللہ، ایم اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ناشر قومی کتب خانہ لاہور، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۲۰۶ صفحے۔

یہ کتاب مڈل اسکولوں کے طلبار کے لئے تیار کی گئی ہے اور اس میں پنجاب کے حالات خاص طور پر مدنظر رکھے گئے ہیں۔ نظام حکومت کا کوئی بڑا شعبہ توجہ سے محروم نہیں رہا ہے اور آخر میں مجلس اقوام یا لیگ آف نیشنز کا بھی ذکر خیر ہے۔ اگر خیال نہیں رکھا گیا ہے تو طالب علم کی طبیعت اور دلچسپی کا، اور اس حقیقت کا کہ ضروری معلومات کے ساتھ طالب علم کے دل میں ایسے حوصلے پیدا ہونا چاہئیں جو اسے اچھا اور سچا شہری بنائیں۔ اس ایک کتاب کے مضامین کو چار کتابوں میں تقسیم کرکے انھیں اس طرح بیان کرنا چاہئے تھا کہ طالب علم کا شوق بڑھے اور علم سے اسے لگاؤ ہو جائے۔ لیکن دنیا کی مصلحتوں کو کوئی کیا کرے۔

م م

فن انشا پردازی | ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے، پی ایچ ڈی، پروفیسر ادبیات اردو، جامعہ عثمانیہ، ناشر کا نام و پتہ درج نہیں۔ تقطیع ۶"×۷"، حجم ۵۱۱ صفحے مع اشاریہ

یہ اس قسم کی کتاب ہے جیسے کہ انگریزی میں کولر کاوچ کی تصنیف لکھنے کا فن (THE ART OF WRITING, QUILLER COUCH) اور اتنی ہی مفید اور دلچسپ بھی ہے۔ اس میں نوشق ادیبوں کو جو ہدائیتیں دی گئی ہیں وہ بیشتر صحیح اور اچھی ہیں اور اس وقت جو بد مذاقی پیدا ہو گئی ہے اس میں اعتراض کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا گیا ہے۔ بلکن ایک بڑی کسر یہ رہ گئی ہے کہ مختلف اچھے اور بُرے طرز کی عبارتوں، موزوں اور ناموزوں تشبیہوں اور استعاروں کے نمونے نہیں دیے گئے ہیں۔ انشار پرداز کو اپنی زبان سے محبت ہونا ضروری ہے اور یہ محبت زبان کے اچھے نمونے ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عنوانات کے مسئلے پر اس قدر تفصیل سے بحث کرنا جیسے کہ فاضل مصنف نے کیا ہے۔ چنداں کار آمد نہیں۔ مضمون سمجھ میں آجائے تو عنوان خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ اور مضمون سمجھ میں آنے کے لئے موضوعوں اور عنوانوں کی فہرست نہیں بلکہ مطالعہ اور مشاہدے کا شوق درکار ہے اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ انشا پردازی کے علم کو افسانہ نویسی کے فن سے براہ راست کوئی مطلب نہیں۔ افسانہ نویس کی ہدایت نقاد کا کام ہے معلوم نہیں فاضل مصنف نے شاعری کو بحث سے کیوں خارج کر دیا ہے۔ ہم کو تو صرف نثر

لکھنے والوں پر یہ جتانا ہے کہ انھیں الفاظ اور محاوروں اور زبان کی روانی پر اتنی ہی توجہ کرنا چاہئے جتنی کہ شاعر کرتے ہیں ۔ دوسری زبانوں میں بھی نظم کی ادبی خوبیاں نثر کے لئے نمونہ مانی جاتی ہیں لیکن فاضل مصنف کے مدنظر اصولی بحث نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس وقت کی ضرورت، اور اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کتاب بہت مناسب ہے اور خاصی مکمل بھی۔

م م

ہندوستانی لسانیات | ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے، پی ایچ، ڈی پروفیسر ہو بیات اردو ۔ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، تقطیع ۲۲×۱۸ حجم ۱۹۰ صفحے مع اشاریہ ۔ ناشر کا نام درج نہیں ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، کتابستان، رشی روڈ، الہ آباد، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۔

اردو زبان کی تاریخ پر کام کیا جاچکا ہے ۔ لیکن یہ پہلی کتاب ہے جس میں اردو اور ہندوستانی پر علم لسانیات کے اصولوں کے مطابق بحث کی گئی ہے ۔ فاضل مصنف نے ابتدا علم لسانیات سے کی ہے ۔ اور زبان کی ماہیت، آغاز اور تشکیل کے طریقے سمجھا کر اور دنیا کی زبانوں کی تقسیم پر ایک نظر ڈال کر ہندوستان کی زبانوں کی تقسیم واضح کی ہے ۔ کتاب کے دوسرے حصے میں صرف ہندوستان پر بحث کیگئی ہے اور اس بحث میں لسانیات، تاریخ، روشن خیالی اور وسعت نظر سب نے برابر کا حصہ لیا ہے ۔

یہ کتاب ضروری معلومات کا ایک خزانہ ہے اور وہ اردو بولنے والے بہت ہی غریب رہ جائیں گے جو اس سرمائے سے فائدہ نہ اٹھائیں ۔

م م

بچہ کا دل اور دوسرے ڈرامے | از سعدی مچھلی شہری، ناشر بچوں کا کتب خانہ، کلائیو روڈ، نئی دہلی ۔ حجم ۱۷۰ صفحے، تقطیع ۲۰×۳۰

یہ سات ڈراموں کا مجموعہ ہے، اور خواجہ حسن نظامی صاحب، شوکت تھانوی صاحب فرید جعفری صاحب نے اس کا مقدمہ، دیباچہ اور تعارف لکھا ہے، ڈرامے سب بالکل مہمل ہیں ۔

نوجوان مصنف کو اگر واقعی ادبی ذوق ہے تو انھیں اچھے ڈراموں کا مطالعہ کرنا اور لکھنے کی مشق کرنا چاہیئے۔

ضربِ کلیم بال جبریل کے بعد ڈاکٹر اقبال کے تازہ اردو کلام کا مجموعہ ضرب کلیم کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ کس قدر دلکش اور روح پرور ہے صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان اشعار کی تعریف کرنا یا دوسرے شعرا کے کلام کی طرح اُن کی داد دینا، یا اپنے خیال کے ساتھ ان کی مطابقت دکھانا، یا بے کیف توضیحات کر کے اُن کی لطافت کو کھونا نہ صرف کور ذوقی ہے بلکہ شریعت ادب میں گناہ کبیرہ ہے۔ کیونکہ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حیاتِ ملیہ اسلامیہ کے ان اہم مسائل کے متعلق جن میں مفکرین غلطاں و پیچاں ہیں۔ اور جو دفتر کے دفتر سیاہ کرنے سے بھی حل نہیں ہوتے دو دو اور چار چار شعروں میں جنچی اور تلی رائیں، روشن تعلیمات، اور بے پردہ حقائق ہیں جو اہل بصیرت کی نگاہوں میں موتی کی طرح بڑی چمک رہا ہیں۔ ان کی کیفیت بقول مرزا بیدل یہ ہے

نزاکتہاست در تصویر مینا خانۂ حیرت ۔۔۔ مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

ان کو تو بس دیکھئے، پڑھئے، سوچئے اور نہاں خانۂ دل کے کسی گوشہ میں محفوظ رکھ لیجئے۔

لیکن چونکہ میرا طریقۂ فکر جداگانہ ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بعض باتوں سے کلی طور پر میں متفق نہیں ہو سکا۔ انھیں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مہدی کے عنوان سے وہ فرماتے ہیں

مجذوب فرنگی نے باندازِ فرنگی ۔۔۔ مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار ۔۔۔ نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

اس میں غالباً روئے سخن میری طرف ہے۔ کیونکہ مہدی کے عقیدے کے قرآنی ہونے سے سب سے پہلے میں نے علی الاعلان انکار کیا ہے، اس لئے گذارش کرتا ہوں کہ تخیل سے مراد اگر عقیدہ ہے تو ہمارے پاس اس کا ایک معیار ہے یعنی کلام اللہ۔ اس میں کہیں مہدی بھیجنے کا

وعدہ نہیں کیا گیا ہے لہٰذا اگر ہم یہ عقیدہ رکھا بھی کریں تو اللہ کے اوپر کیا ذمہ داری ہے کہ وہ مہدی کو بھیجے۔ اور اگر محض تخیل مقصود ہے تو مایوس قوموں کے تخیلات بھی اُن کے لئے عذاب ہی ہوا کرتے ہیں صدیوں پر صدیاں گذرتی جا رہی ہیں اور امت ہے کہ اس امید میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے کہ

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کبھی کبھی جب مایوسی کا غلبہ ہوتا ہے تو گھبرا کے کہنے لگتی ہے۔

یہ انتظارِ مہدی و عیسےٰ بھی چھوڑ دے

پھر مجبور ہو کر اس ٹوٹی ہوئی امید کا سہارا لیتی ہے اور پکارتی ہے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

غالباً اسی تخیل کا اثر ہے کہ ملت کے اُن سربرآوردہ افراد کو بھی جو اس وقت تعمیرِ قوت میں سرگرم ہیں ڈاکٹر صاحب اپنے بلند معیار کے مطابق نہیں پاتے اور کہتے ہیں

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی | کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے کہا ہے۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے | غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

یہ خالص شاعرانہ استدلال ہے۔ غالب کی طرح جس نے کہا ہے۔

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد | مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

جس طرح مگس کی قے کہہ دینے سے شہد کی لطافت اور شیرینی میں فرق نہیں آسکتا اسی طرح محکومیت کی نسبت سے الہام بھی اگر حق ہو۔ غارت گرِ اقوام نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت عیسےٰ علیہ السلام رومی سلطنت کے محکوم تھے جن کی نسبت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا

نبیٔ عفت و غمخواری و کم آزاری

بلکہ اکثر انبیاء کرام علیہم السلام محکوم اقوام ہی میں مبعوث کئے گئے جس کے خاص اسباب وعلل تھے جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔

در اصل نبوت کی صداقت کا معیار حاکمیت یا محکومیت پر نہیں ہے بلکہ خود الہام کی نوعیت پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی مجموعے میں ایک دوسرے شعر میں اس کسوٹی پر بھی اس کو کسا ہے۔

وہ نبوت ہے مسلمان کے لئے برگ حشیش　　　جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

نسخ جہاد اور کفر کی غلامی کا دوامی پٹہ کبھی سچی نبوت کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

پنجابی مسلمانوں کی مذہبی ذہنیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اسکی طبیعت　　　کرے کہیں منزل تو گذرتا ہے بہت جلد

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا　　　ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے　　　یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

یہ حقیقت اگرچہ ناقابل انکار ہے مگر اسی ذم سے پنجابی مسلمان کی مدح کا بھی ایک پہلو نکلتا ہے جو یقیناً ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر بھی رہا ہوگا۔ مگر انھوں نے اس تنبیہہ کے موقع پر اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن میں تو ظاہر کئے بغیر نہیں رہوں گا۔ یعنی

لیکن اُسے مل جائے جو اچھا کوئی رہبر　　　بگڑا ہوا مدت کا سنورتا ہے بہت جلد

نظریہ حیات کے متعلق تین اقوال لکھے ہیں۔

سپنوزا

نظر حیات پہ رکھتا ہے مرد دانشمند　　　حیات کیا ہے حضور و سرور و نور وجود

فلاطون

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مرد دانشمند　　　حیات ہے شب تاریک میں شرر کی نمود

اقبال

حیات و موت نہیں التفات کے لائق　　　فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

فلسفۂ خودی پر اپنج کر رک گئے۔ لیکن تصوف (کہ بہانۂ شعر گفتن خوب است) ایک
قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور صوفی کی زبان سے کہتا ہے۔

حیات و موت و خودی جلوہ ہیں عوارض نفس حقیقت ایک ہے جو خود ہے شاہد و مشہود

(اسلم)

بلاغ الحق | مصنفہ شمس العلما حافظ سید محب الحق صاحب۔ کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ،
تقطیع ۲۰×۲۶ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت فی نسخہ ۶؍۔

مصنف سے پرفضا" پٹنہ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

شمس العلما حافظ محب الحق صاحب کا سلسلۂ حقانیہ چار جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی تین
جلدیں دعوۃ الحق، منہاج الحق، اور شرعۃ الحق مطبوع ہو کر شائع ہو چکیں اور عام طور اہل نظر نے ان کو
پسند کیا اور ان کو بے مثل تصنیف قرار دیا۔ لیکن یہ چوتھا حصہ جو ان سب کا نچوڑ اور بیان کی خوبی اور دلائل کے
متانت کے باعث نہایت پر مغز ہے اب تک نہیں چھپا تھا۔ یہ پہلی بار شہزادہ ناصر الدین محمد اسد الرحمٰن
قدسی کے حکم سے عزیزی پریس آگرہ میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ اس میں عقائد اسلامی، عبادات
معاملات، اور اخلاق وغیرہ کے متعلق قرآن کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔ جو لوگ قرآن سے ذوق رکھتے
ہیں ان کے لئے یہ کتاب نہ صرف مفید بلکہ شمع راہ ہے۔

جامع النحو | مولفہ حکیم محمد احمد صاحب۔ معلم مدرسۃ الاصلاح۔ سرائے میر اعظم گڈھ۔ لکھائی
چھپائی اور کاغذ عمدہ ضخامت ۱۰۰ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۶ قیمت فی نسخہ ۱۲؍

مصنف سے مل سکتی ہے۔

حکیم محمد احمد صاحب زمانے سے صرف و نحو کی تعلیم دیتے دیتے اس کے ماہر ہو گئے
ہیں۔ انھوں نے اپنے تعلیمی تجربے کے بعد طلبار کی آسانی کے لئے یہ کتاب لکھی۔ میرا خیال ہے
کہ جس سہولت کے ساتھ اس کتاب سے نحو عربی کے مسائل ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔ اس آسانی

کے ساتھ کسی درسی کتاب سے نہیں ہو سکتے۔ اس میں طلباء کی ضروریات پیش نظر رکھی گئی ہیں اور
خوش اسلوبی کے ساتھ مسائل ترتیب دئے گئے ہیں۔ جو لوگ عربی سیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کو
نحو کے لئے یہ کتاب ضرور منگانی چاہئے۔

بسم اللہ

جامعہ

زیرِ ادارت۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

جلد [illegible]	فروری سنہ ۱۹۳۷ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

بدل سالانہ صہ | فی پرچہ ۸ر

پروفیسر محمد مجیب۔ بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شایع کی ہیں، جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں، از راہِ کرم مطلع فرمائیں مطلوبہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں :-

(۱) مطبوعاتِ جامعہ۔ جامعہ کی شایع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۲) ناشرینِ اُردو۔ جامعہ کے علاوہ اردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

(۳) مصنفینِ اُردو۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مؤلفین اردو کی کتابوں کی فہرست

(۴) بچوں کی کتابیں۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۵) عورتوں کی کتابیں۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں۔

(۶) مختصر فہرست کتب۔ کتب اُردو کی تقریباً ایکہزار مشہور کتابوں کی فہرست۔

(۷) ادبی کتابیں۔ تاریخ وتنقید ادب، مقالات و انشار، ناول، افسانہ، نظم، ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۸) مذہبی کتابیں۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

(۹) تاریخی کتابیں۔ پانچسو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست۔

(۱۰) اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبیعات، کیمیا، طب، حفظانِ صحت، زراعت اور صنعت وحرفت پر اردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیرِ طبع ہے۔ عنقریب شایع ہوگی۔

مکتبہ جامعہ دہلی

مولانا نذیر احمد کے مختصر سوانح

اور

ان کی تصنیفات کا عام رنگ

مختصر سوانح آپ کا پورا نام مع خطابات اور ڈگریوں کے شمس العلماء مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد ال ال ڈی ہے۔ آپ ۶ دسمبر ۱۸۳۰ء کو نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ فارسی گھر پر اپنے والد مولوی سعادت علی صاحب سے پڑھی۔ عربی کی تکمیل دہلی کالج میں کی ۱۸۵۴ء میں ضلع گجرات میں ایک اسکول میں نوکر ہوئے مگر دو ہی برس بعد اپنے صوبے میں جگہ مل گئی۔ اور کانپور کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوگئے۔ اسی زمانے میں آپ نے مرآۃ العروس اور بنات النعش لکھی۔ یہ کتابیں عام طور پر بہت مقبول ہوئیں۔ گورنمنٹ سے آپ کو ان پر انعام ملا۔ اور آپ کا تبادلہ الہ آباد کر دیا گیا، یہاں آپ نے انگریزی بھی اتنی حاصل کرلی کہ اس زبان کی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے لگے۔ اس زمانے میں تعزیرات ہند کا اردو میں ترجمہ ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ مولانا نذیر احمد نے بھی چند صفحے ترجمہ کرکے پیش کئے۔ ڈائرکٹر صاحب نے ان کے ترجمے کو پسند فرمایا۔ اور یہ کام اُن کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ آپ نے تھوڑی ہی مدت میں انکم ٹیکس اور تعزیرات ہند کے ترجمے کر ڈالے۔ گورنمنٹ نے ان کاموں سے خوش ہوکر آپ کو ۱۸۶۱ء میں تحصیل داری عنایت کی آپ نے اس عہدے کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت کے بھی ترجمے کر ڈالے اور ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔

گورنمنٹ سے پنشن لینے کے بعد آپ حیدر آباد طلب کئے گئے اور ایک بڑے عہدے پر مقرر ہوئے۔ یہاں کی عام رعایا سے موانست بڑھانے کے لئے آپ نے تلنگی زبان سیکھی

اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں مشغول رہے۔ جب حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو دہلی واپس آئے اور وہیں مستقل قیام فرمایا۔ اس پیرانہ سالی میں بھی علمی ذوق و شوق کا یہ عالم رہا کہ سنسکرت سی مشکل زبان حاصل کی اور تصنیفات اور لکچروں کے ساتھ ساتھ برابر طلبا کو مکان پر درس دیتے رہے۔ ۱۰ر اپریل سنہ ۱۹۱۲ء کو آپ نے بعارضہ فالج انتقال کیا۔

تصانیف اور ان کا عام رنگ

علاوہ ان ترجموں کے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے آپ نے آخر میں قرآن مجید کا بھی ترجمہ فرمایا ہے، جو اس الہامی کتاب کے سب سے بہتر ترجموں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ چند پند، مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، محصنات، رویائے صادقہ، ایامیٰ، الحقوق والفرائض، ابن الوقت اور موعظہ حسنہ، بھی آپ کی یادگار ہیں۔ ہمیں اس وقت مولانا کے ترجموں، مواعظ اور خطبوں سے بحث نہیں وہ اس کتاب کے موضوع سے علیحدہ چیزیں ہیں۔ ہمیں ان پر اس وقت بحیثیت ایک قصہ گو اور ناولسٹ کے نظر ڈالنی چاہیے۔

مولانا واعظ ہیں

اس سے پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا باقاعدہ ناول نویس نہیں کہے جا سکتے ہیں اور نہ اس حیثیت سے وہ اس کتاب میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کا ذکر اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ اردو میں سب سے پہلے انھیں نے فطری قصوں کی طرف توجہ کی ہے اس کا سہرا انھیں کے سر ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ اس امر کو محسوس کیا کہ اردو میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہماری معاشرتی زندگی کے فوٹو پیش کئے جائیں، اور ہم جن، پری، بھوت پریت کی کہانیوں کو ترک کرکے اپنے گرد و پیش کے لوگوں اور اپنی ہی طرح کے معمولی انسانوں کے قصے بیان کریں۔ مولانا نے اس سلسلے میں یہ ضرور غلطی کی کہ وہ شروع ہی سے واعظ و ناصح بن بیٹھے، اور جتنے قصے لکھے ان میں اپنے اغراض و مقاصد کو اس طرح عیاں کر دیا کہ قصے کی دلچسپی بڑی حد تک جاتی رہی پھر بھی ان کا اپنی تصانیف سے غیر فطری اجزا کا نکال ہی دینا اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ فطرۃً ایک حقیقت نگار تھے۔ ہم [illegible]

نے دوسری زبان کے ناولوں کا مطالعہ اپنی مولویت کے زور میں ناجائز اور غیر مستحسن نہ سمجھ لیا ہوتا تو شاید معاشرتی ناول لکھنے میں ان سے زیادہ کوئی کامیاب نہ ہو سکتا۔

پلاٹ بہت ہی مختصر ہوتے ہیں

اسی فن ناول نویسی سے ناواقفیت ہی کا یہ بھی نتیجہ ہے کہ مولانا نے جتنے پلاٹ بنائے ہیں ان کا خلاصہ ابتدا ہی کے چند ابواب دیکھنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے انھوں نے جہاں اپنے اشخاص قصہ سے تعارف کرایا ہے وہیں پر ان کی سیرتیں اس طرح واضح طور پر تفصیل کے ساتھ پیش کر دی ہیں کہ ناظر بہت ہی آسانی سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ نذیر احمد کا قلم اس سیرت کا کیا حشر کرنے والا ہے۔ لیکن مولانا کی صفائی میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان کا مقصد ناول لکھنا نہیں تھا۔ نہ وہ ان چیزوں کو بحیثیت آرٹ کے پیش کر کے انسانی خوشی اور مسرت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ انھوں نے ہر کتاب کا تعارف کراتے وقت اس کے مقاصد بتا دئے ہیں اور اس کی غرض ظاہر کر دی ہے "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" عورتوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ "محصنات" تعدد ازدواج کی مخالفت میں ہے۔ توبۃ النصوح طاعت و اطاعت کے بارے میں۔ اور ابن الوقت انگریزی معاشرت و لباس کی مذمت میں ہے چنانچہ "محصنات" کے دیباچے میں "سر ولیم میور" لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی "یوپی" کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے اپنے اغراض یوں ظاہر فرمائے ہیں:۔

"انھیں کی قدردانی مجھے تصنیف و تالیف کے باعث ہوئی۔ یہاں تک کہ عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ مرتب ہو گیا۔ خانہ داری میں مراۃ العروس، معلومات میں بنات النعش، خدا پرستی میں توبۃ النصوح.......... انھیں دنوں مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں مردوں کی آزادی، دو بہت بڑے نقص ہیں۔ میں نے ایک نقص کے رفع کرنے میں (جہد المقل) کوشش کی ہے تو دوسرے نقص کے دفع میں بھی کچھ کرنا ضرور ہے۔"

غرض "محصنات" اسی "جہد المقل" کا نتیجہ ہے! اب رہا ابن الوقت، تو وہ غالباً سر سید

کے مذہبی خیالات کی تردید ہے۔ اس لئے کہ وہی مسلمانوں کے ریفارمر تھے اور انھیں کو اپنے ملت کے لوگ "نیچری، لامذہب، کرسٹان" اور خدا جانے کیا کیا کہتے تھے، مگر مولانا نے پوری کتاب میں کہیں ان کا نام نہیں لیا ہے بلکہ اپنے قصے کا ہیرو ایک ایسے شخص کو بنایا ہے جسے تقریباً اسی طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ جو سرسید کے سوانح میں ملتے ہیں اور جس کے خیالات بھی بہت حد تک ان نظریوں سے ملتے جلتے ہیں۔ جن کی تبلیغ سرسید نے کی ہے۔ بہرنوع نذیر احمد کے قصوں کا یہ سب سے بڑا عیب ہے کہ ان میں سے ہر ایک کسی خاص اخلاقی و اصلاحی مقصد کو پیش نظر رکھ کے لکھے گئے ہیں اور انہیں واضح کرانے کے لئے اشخاص قصہ کی زبانی بڑی طولانی بحثیں کرائی پڑی ہیں۔ مثلاً میر متقی نے بھانجے اور بھانجی سے جو گفتگو کی ہے وہ اتنی خشک اور طولانی ہے کہ پڑھنے والے کا دم الجھنے لگتا ہے۔ نصوح نے اپنے خیالات کی وضاحت میں جہاں کہیں تقریریں کی ہیں وہ اتنی طویل اور خشک ہیں کہ معلوم ہوتا ہے نماز جمعہ کے بعد خطبہ پڑھا جا رہا ہے۔ حجۃ الاسلام اور ابن الوقت کی بحثیں دیکھئے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ باقاعدہ مناظرہ چھڑ گیا ہے اور ایک نظریے کے پیش کئے جانے کے بعد دوسرے کے پیش کرنے کے لئے آدھ گھنٹے سے زیادہ صرف تمہیدی تقریروں میں صرف ہو رہا ہے۔ ان حصوں کے پڑھنے کے لئے بڑے استقلال اور سخت پامردی کی ضرورت ہے ان طولانی مباحث اور تقاریر کی وجہ سے عام قصے کی دلچسپی میں بے حد کمی ہو جاتی ہے۔ مگر مولانا کے نزدیک اصل چیزیں یہی تھیں اور سارا قصہ انھیں خیالات کے اظہار کے لئے لکھا گیا تھا اس لئے ان میں ترمیم یا تخفیف بالکل ناممکن تھی!

مولانا کا نظریۂ تعلیم

مولانا نے اپنی تعلیمی کتابوں میں جو نظریہ تعلیم پیش کیا ہے اس میں صحیح طرح کی تربیت، صحبت اراذل سے پرہیز، اطاعت والدین اور احکام خدا پر خاص طور سے زور دیا ہے۔

تربیت

چنانچہ بچوں کی تربیت کے متعلق ان کے خیالات مراۃ العروس اور توبۃ النصوح دونوں کتابوں میں واضح طور پر موجود ہیں۔ اکبری کی سیرت کی خرابی کا باعث محض

ماں اور نانی کا لاڈ پیار ہے۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں :۔

"جو لڑکیاں چھٹ پن میں لاڈ پیار میں رہا کرتی ہیں اور ہنر اور سلیقہ نہیں سیکھتیں، یوں اکبری کی طرح عمر بھر رنج و تکلیف اٹھاتی ہیں۔ اکبری کی ماں اور نانی کے لاڈ نے زندگی بھر کیسی مصیبت میں گیا"

نصوح کا بڑا لڑکا کلیم اور بڑی لڑکی سلیمہ اس لئے غیر مطیع اور خود سر بن گئے کہ ان کے بچپنے میں ان کو صحیح طور پر تربیت نہیں دی گئی بلکہ ہمیشہ اُن کی ہر خواہش کو پورا کرنے اور ہر ہٹ کو ماننے کی کوشش کی گئی۔

صحبت اراذل سے پرہیز

اس تربیت کے سلسلہ میں صحبت کا مسئلہ بھی آجاتا ہے مولانا نذیر احمد "پسر نوح با بداں بنشست۔ خانداں بنوتش گم شد" سے بھی کچھ زیادہ ہی کے قائل تھے وہ آج کل کے زمانے والوں کی طرح مساواتی نہیں تھے، عورتوں کے لئے وہ اس کے سختی سے قائل تھے کہ انھیں شریفوں کی بہو بیٹیوں کے علاوہ چھوٹی قوم والوں سے بالکل نہ ملنا چاہیئے۔ مراۃ العروس میں وہ محمد عاقل کی زبانی اکبری پر یوں طعن کرتے ہیں :۔

"محلے میں جو آدمی بازاری طور کے رہتے ہیں تم نے انھیں کی لڑکیوں کو بہن بنا رکھا ہے رات دن بھوندو بھٹیارے کی بیٹی جینیہ اور بخشو قلعی گر کی بیٹی زلفن کمو کی بیٹی راحت، مومن کنجڑے کی بیٹی سلمتی، تمہارے پاس گھسی رہا کرتی ہیں اور تم کو اس بات کا کچھ خیال نہیں کہ یہ لوگ نہ ہماری برادری میں ہیں اور نہ بھائی بند، نہ ان سے ہماری ملاقات، نہ راہ و رسم، نہ محبت۔ تمام محلے میں چرچا ہو رہا ہے کہ کیسی بہو آئی ہے۔ جب دیکھو ایسی ہی لڑکیاں اس کے پاس بیٹھی ہیں۔"

اصغری جب بیاہ کر آئی تو اس کے یہاں بھی ایسی ہی لڑکیوں کا ہجوم ہوا مگر اصغری نے انھیں منہ نہیں لگایا۔ بقول مولانا :۔

"محلے کے کمینوں کی لڑکیاں تو چاٹ کی آشنا ہوتی ہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ نہ

تو پان پر پان ملتا ہے، نہ سودے سلف کا ذکر ہے۔ چھ سات دن میں باوی کی طرح چھپٹ کر الگ ہو گئیں۔"

ماحول تربیت | چنانچہ مولانا جس طرح کے ماحول کے مخالف تھے اور جس طرح کے ماحول کے حامی۔ دونوں کی تصویریں آپ کو توبۃ النصوح میں کلیم اور نعیمہ کی زبانی مل جائیں گی۔ نصوح نے جب تک خواب نہ دیکھا اس کے گھر کا وہ رنگ تھا جو مولانا کسی مسلمان کے یہاں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے بعد کا رنگ خاص مولانا کی پسند کا ہے دیکھئے نعیمہ اپنی خالہ زاد بہن صالحہ سے اپنے گھر کی بدلی ہوئی کیفیت یوں بیان کرتی ہے۔

نعیمہ:۔ جب سے اس روزے نماز کا چرچا ہمارے گھر میں ہوا۔ بھلمنساہت اور شرافت سب گئی گذری ہوئی۔ اب آئی ہو تو دو چار دن رہ کر ہر ایک کا رنگ ڈھنگ دیکھنا، نہ وہ زمین رہی نہ آسمان، گھر کا باوا آدم ہی کچھ بدل گیا ہے۔ نہ وہ ہنسی ہے، نہ وہ دل لگی ہے۔ نہ وہ چرچے ہیں، نہ وہ مذاق، نہ وہ چہچہے ہیں، گھر میں ایک اُداسی چھائی رہتی ہے۔ ورنہ ابھی ایک مہینے کا ذکر ہے کہ محلے کی عورتیں تمام تمام دن بھری رہا کرتی تھیں، کوئی گیت گا رہی ہے کوئی کہانی کہہ رہی ہے یہ ہمسائی اجو بہ کچھ اس طرح کی زندہ دل ہیں کہ ہر روز نئی نئی نقلیں کر کے سب کو ہنساتے لٹا لٹا دیتی تھیں۔ اب کوئی گھر میں آکر تھوکتا بھی نہیں گھر ہے کہ کمبخت اکیلا پڑا بھائیں بھائیں کیا کرتا ہے۔

صالحہ:۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟

نعیمہ:۔ سب تمھاری خالہ جان اور حمیدہ کے ابا جان کی بد مزاجی۔ کسی کو کیا غرض کیا مطلب؟ کہ اپنے کام کا حرج کرے اور پرائے گھر آکر بیٹھے۔ کیا لوگوں کے گھروں میں بیٹھنے کو جگہ نہیں ہے۔ لوگوں کی خاطر داری ہوتی تھی محبت سے اُن کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ لوگ دوڑے آتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ ہر وقت منہ کپے کی طرح پھولا رہتا ہے۔ غیر آدمی کیوں برداشت کرنے لگے۔ سب کے سب چلتے پھرتے نظر آئے، ابا جان کے اچھے ہونے پر

ڈومنیوں نے سینکڑوں ہی پھیرے کئے ، سبھی نے کہا ، ہمسائی اجوبہ نے منتیں کیں ، ہاتھ جوڑے ہیک ننانی ، آخر وہ رت جگا تو خاک بھی نہ ہوا ۔ نگوڑے مسجدوں کے ملاؤں کو بلا کر کھلا دیا ، اب تو بوا دن رات نماز کا وظیفہ ہے ۔ وہ دیکھو تخت پر ہر وقت نماز کا چیتھڑا بچھا رہتا ہے ۔ وضو کا گھڑا کیا مجال کہ کسی وقت پاس سے الگ ہو جائے ، کام سے فارغ ہوئیں تو یا نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں ، یا کتاب پڑھنے بیٹھ گئیں ، ایک حمیدہ کمبخت ان کو ایسی مل گئی ہے کہ اور اُن کو اکسایا کرتی ہے میرا بس چلے تو کتیا کو ایسا ماروں ، ایسا ماروں کہ یاد کرے ۔"

کلیم نے بھی ان ماحولوں پر دوسرے پہلو سے روشنی ڈالی ہے ۔ وہ کہتا ہے

"کل کی بات ہے کہ میری مدح ہوتی تھی اور مجھ کو ہر بات پر شاباش ملتی تھی ، دفعتاً میں ایسا بے ہنر ہو گیا کہ مجھکو سیکھنے اور تعلیم پانے کی ضرورت ہے ۔ ع ہائے ہم کیا کہیں کیا ہو گئے کیا کیا ہو کر میرا کون سا فعل ہے جو تم کو اور ابا جان کو معلوم نہیں ۔ کیا ابا جان نے میری غزلیں نہیں سنیں ؟ میں اُن کے ہاتھ کی صاد کی ہوئی دکھا سکتا ہوں ۔ ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں گذرا کہ شطرنج کا ایک بڑا مشکل نقشہ ابا جان نے کسی اخبار میں دیکھا ۔ اس کو میں نے حل کیا ۔ کبوتر اُڑاتے نہیں دیکھے یا پتنگوں کی لڑائی انھوں نے نہیں سنی ، کبھی تم نے روکا یا انھوں نے ٹوکا ؟ اب نئی بات البتہ سننے میں آئی ہے کہ نماز پڑھو ، مسجد میں معتکف بن کر بیٹھو ۔ کھیلو مت ، کسی یار و آشنا سے ملو مت ، بازار مت جاؤ ۔ میلے تماشے میں مت شریک ہو ۔ بھلا مجھ سے یہ باتیں ہونے والی ہیں ؎

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے — وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے "

اگر ان کالموں سے مولانا کی پسند کا ماحول واضح نہ ہو تو اس مرقع کو ملاحظہ فرمائیے جب نصوح نے کلیم کے کمرے کا جائزہ لیا ہے دیکھئے کہ مولینا کے ہیرو نے آرٹ کا کس طرح خون کیا ہے ۔ ٹکڑا ذرا طول ہے مگر خالی از لطف نہیں ۔

مولانا کی آرٹ سے دشمنی

"عشرت خانہ کھولا گیا تو ایک تکلف خانہ تھا کمرے کے بیچ میں چوکیوں کا فرش اس پر دری اس پر سفید چاندنی اس خوش سلیقگی کے ساتھ تنی ہوئی کہ کہیں دھبے یا سلوٹ کا نام نہیں صدر کی جانب گجرات کا نفیس قالین بچھا ہوا گاؤ تکیہ لگا ہوا سامنے اگالدان لب قالین پیچوان چوکیوں

کے اردگرد کرسیاں تھیں تو لکڑی کی، لیکن آئینہ کی طرح صاف اور چمکتی ہوئی۔ چھت میں پٹاپٹی
کی گوٹ کا پنکھا لٹکا ہوا۔ ہلانے کے واسطے نہیں بلکہ دکھلانے کے لئے۔ اس کے پہلوؤں میں جھاڑ،
جھاڑوں کے بیچ میں رنگ برنگ کی ہانڈیاں۔ چھت کیا تھی بلامبالغہ آسمان کا نمونہ تھا جس میں پنکھا
بجائے کہکشاں کے تھا۔ جھاڑ بمنزلہ آفتاب و ماہتاب اور ہانڈیاں ہو بہو جیسے ستارے،
چھت کے مناسب حالت دیواریں، تصویروں اور قطعات اور دیوارگیروں سے آراستہ تھیں
نصوح اس سازوسامان کو تھوڑی دیر تک ایک سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد
ایک آہ کھینچ کر بولا کہ افسوس کتنی دولت خداداد اس بیہودہ نمائش اور تکلف اور آرائش میں
ضائع کی گئی ہے۔ کیا اچھا ہوتا یہ روپیہ محتاجوں کی امداد اور غریبوں کی کاربرآری میں صرف
کیا جاتا۔ اس کے بعد اس کی نگاہ مقابل صدر جا پڑی تو کیا دیکھتا ہے کہ آمنے سامنے دو میزیں
لگی ہیں۔ ایک پر گنجفہ، شطرنج، چوسر، تاش، کھیل کی چیزیں اور ارگن باجے رکھے تھے۔ دوسری
پر گلدان اور عطردان وغیرہ کے علاوہ ایک نہایت عمدہ طلائی جلد کی موٹی سی کتاب، نصوح
نے نہایت شوق سے اس کتاب کو کھولا تو تصویروں کا البم تھا۔ مگر تصویریں کسی عالم، حافظ، درویش یا
خدا پرست کی نہیں، کھوا پکھاوجی، تان سن گویا، میر ناصر احمد بین نواز، صمد خان پہلوان
کھلونا بھانڈ، حیدر علی قوال، نتھوا ہیجڑا، قاضی محمد علی پٹنگر، عدو جواری، اس قسم کے لوگوں
کی، خبیثہ الات کی وجہ سے نصوح نے دیوار والی تصویروں کو بغور نہیں دیکھا تھا، اب البم
کو دیکھ کر اسے خیال آیا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو وہ تصویریں اور بھی بیہودہ تھیں قطعے اور
طغرے اگرچہ ان کا سوادِ خط پاکیزہ تھا۔ مگر مضمون و مطلب دین کے خلاف، مذہب کے برعکس
نصوح نے وہیں سے ایک میز فرش اٹھا کر ان سب کی خبر لینی شروع کی اور بات کی بات میں
کل چیزوں کو توڑ پھوڑ برابر کیا اور جو کچھ باقی رہا اس کو صحن میں رکھ آگ لگا دی اور نوکروں کو
حکم دیا کہ اچھا اب خلوت خانہ کھولو، اس میں تکلف کے معمولی سازوسامان کے علاوہ کتابوں کی
ایک الماری تھی، دیکھنے میں تو اتنی جلدیں تھیں کہ انسان ان کی فہرست لکھنا چاہے تو سارے

دان میں بھی تمام نہ ہو۔ لیکن کیا اردو کیا فارسی، سب کی سب کچھ ایک ہی طرح کی تھیں، جھوٹے قصے، بیہودہ باتیں، فحش مطلب، لچے مضمون، اخلاق سے بعید، حیا سے دور۔ نصوح ان کتابوں کی جلد کی عمدگی، خط کی پاکیزگی، کاغذ کی صفائی، عبارت کی خوبی، طرز ادا کی برجستگی پر نظر کرتا تھا۔ تو کلیم کا کتب خانہ اس کو ذخیرۂ بے بہا معلوم ہوتا تھا۔ مگر معنی و مطلب کے اعتبار سے ہر ایک جلد سوختنی اور دریدنی تھی۔ اسی تردید میں اس کو دو پہر ہو گئی، کئی مرتبہ کھانے کے لئے گھر سے اس کی طلب ہوئی۔ مگر اس کو فرصت نہ تھی، بار بار کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا تھا اور رکھ رکھ دیتا تھا آخر یہی رائے قرار پائی کہ ان کا جلا دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ بھری الماری کتابیں لکڑی کنڈے کی طرح اوپر تلے رکھ آگ لگا دی۔ نصوح کا یہ برتاؤ دیکھ کر اندر سے باہر تک تہلکہ اور زلزلہ پڑ گیا۔ علیم دوڑا دوڑا جا اپنا "کلیات آتش" اور "دیوان شرر" اٹھا لایا اور باپ سے کہا کہ جناب میرے پاس بھی یہ دو کتابیں اسی طرح کی ہیں۔ علیم نے آتش کو دہکتی آگ اور شرر کو جلتے انگاروں میں پھینک دیا۔ علیم کی دیکھا دیکھی میاں سلیم نے بھی "واسوخت امانت" لا باپ کے حوالے کی اور کہا کہ ایک دن کوئی کتاب فروش کتابیں بیچنے لایا تھا۔ بڑے بھائی جان نے فسانۂ عجائب، قصہ گل بکاؤلی، آرائش محفل، مثنوی میر حسن، مضحکات نعمت خاں عالی، منتخب غزلیات جرکیں، ہزلیات جعفر زٹلی، قصائد ہجویہ مرزا رفیع سودا، دیوان جان صاحب، بہار دانش بالتصویر، اندر سبھا، دریائے لطافت، میر انشاء اللہ خاں، کلیات رند وغیرہ بہت سی کتابیں اس سے لی تھیں، میں بھی بیٹھا ہوا تھا مجھ کو دیکھ کر بولے۔ کیوں سلیم تم بھی کوئی کتاب لوگے؟" میں "جو آپ تجویز فرمائیں" بھائی جان "کون سی کتاب تم کو دے دوں؟ یہ کتابیں جو میں نے لی ہیں اول تو میرے شوق کی ہیں۔ دوسرے تم کو ان کا مزا نہیں ملے گا۔ کتاب والے کی گٹھری میں سے "واسوخت" اور "دیوان نظیر اکبر آبادی" دو کتابیں انھوں نے میرے لئے نکالیں اور کہا کہ واسوخت تو خیر مگر یہ دیوان بڑی عمدہ کتاب ہے،....

میاں مومد کے اشعار آج تک کسی نے جمع نہیں کئے تھے اس کے حاشیہ پر وہ بھی ہیں چونکہ

بھائی جان نے دیوان کی بہت تعریف کی تھی۔ میں نے اس کو نہایت شوق سے کھولا تو پہلے چوہوں کا اچار نکلا۔ اس کے مضمون سے میری طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ میں نے دونوں کتابیں پھیر دیں۔ مگر بھائی جان نے یہ "واسوخت" زبردستی میرے سر منڈھ دی.... "

غرض فنون لطیفہ اور تفریحی سامان کے ساتھ ساتھ ادب کی بھی گت بنی اور سب تو سب آتش و نظیر اکبرآبادی بھی آگ میں جھونک دئے گئے۔ حالانکہ آتش و نظیر دونوں کے ہاں تصوف کا رنگ غالب ہے اور اخلاقی تعلیمات کا عنصر حد درجہ واضح، مگر نذیر احمد کے سے ملائے مسجدی کو یہ بھی پسند نہ تھے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی گلستاں کے متعلق جو نصوح اور فہمیدہ کے درمیان گفتگو لکھی ہے۔ وہ اس موضوع پر یادگار چیز ہے۔ عجب نہیں کہ جب کبھی یہ ٹکڑا پڑھایا پڑھا جاتا ہو تو شیخ علیہ الرحمہ کی بوسیدہ ہڈیاں ان کی منہدم تربت میں کروٹیں لینے لگتی ہوں ملاحظہ ہو:۔

نصوح:۔ "کیا تم کو گلستاں پڑھانا یاد ہے؟"

فہمیدہ:۔ "ہاں یاد کیوں نہیں ہے، جس دن حمیدہ کا دودھ چھٹا ہے۔ اس کے دوسرے دن میں نے گلستاں شروع کی تھی۔"

نصوح:۔ "بھلا تم کو یہ بھی یاد ہے کہ میں تمہارے سبق سے آگے جا بجا سطروں کی سطروں پر سیاہی پھیر دیا کرتا تھا، بعض دفعہ صفحہ کے صفحہ اٹے ہیں کہ مجھ کو اوپر سے سادہ کاغذ لگا کر ان کی چھپانے کی ضرورت ہوتی۔"

فہمیدہ:۔ "خوب اچھی طرح یاد ہے، چوتھائی کتاب سے کم تو نہ کٹی ہوگی۔"

نصوح:۔ "تم پڑھتی تھیں تب چوتھائی بھی کٹی۔ اگر کوئی دوسری عورت یا لڑکی پڑھتی ہوتی تو آدھی کی خبر لیتا، وہ تمام بیہودہ کتابیں تھیں۔ جن کو میں کاٹتا اور چھپاتا پھرتا تھا۔"

فہمیدہ:۔ "سچ کہو، لوگ بھی مشکل جان کر چھڑوا دیتے ہیں۔"

نصوح:۔ "بڑی مشکل یہ تھی کہ میں ان واہی اور فحش باتوں کو تمہارے روبرو بیان نہیں

کرسکتا۔ پھر یہ اس کتاب کا حال ہے جو پند و اخلاق میں ہے اور تصنیف بھی ایسے بزرگ کی ہے کہ کوئی مسلمان ایسا کم تر نکلے گا کہ ان کا نام لے اور شروع میں حضرت اور اخیر میں رحمۃ اللہ علیہ یا قدس اللہ سرہ العزیز نہ کہے۔ یعنی ان کا اعتقاد اولیاء اللہ میں ہے اور جو کتابیں ہیں نے جلائیں۔ کتابیں کاہے کو تھیں گالی، پھکڑ، ہزلیات، بڑ، بکواس، ہزیاں، خرافات، میں نہیں جانتا، ان میں سے کون سا نام اُن کے لئے زیادہ زیبا ہے"!

غرض مولانا کے ہاں تعلیم کے معنی ہیں قرآن اور حدیث کی مزاولت اور زندگی کے معنی ہیں ہر لحظہ قال اللہ و قال الرسول کی تکرار!

مگر مجھے خوف ہے کہ احادیث رسول اور کلام پاک میں بھی ایسے اجزا ضرور ہی نکل آئیں گے جنھیں پڑھ کر نصوح کی افراط حیا "اچھوتیوں" کی طرح شرما جائے گی اور نوعروسوں کی طرح عرق عرق نظر آئے گی! یہ نہیں معلوم کہ مولانا کی شریعت میں ایسے ٹکڑوں کا فہمیدہ کو پڑھانا اور سمجھانا جائز ہوگا۔ یا وہاں بھی کاغذ کی چیپیاں لگانا پڑیں گی!

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ ابھی ہمیں اپنے مصنف کے دوسرے نظریوں کا ذکر منظور ہے ان میں سے مخصوص چیزیں نظریہ حق العباد، نظریہ دین، اور نظریہ تقدیر ہیں۔

حق العباد

مبتلا میں سید حاضر سے میر متقی نے جو تقریر کی ہے اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو اس سے حق العباد کے نظریے پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

"انسان کے ذمے دو طرح کے حقوق ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد، لوگ حقوق العباد کی نسبت بڑی غلطی میں پڑے ہیں اور اُن کو آسان سمجھ لیا ہے، حالانکہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، اگر کسی آدمی سے اللہ کے حقوق ضائع ہوں اور سبھی سے ہوتے ہیں تو بندے کا خدا سے کیا مقابلہ، حقوق الٰہی کا ضیاع اکثر سہو اور غفلت اور نادانی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے ہوتا ہے اور امید ہے کہ خداوند غفور الرحیم بندوں کے ضعف پر نظر فرما کر اُن کے قصور معاف کرے اور کرے گا۔ مگر حقوق العباد کا یہ حال نہیں ہے۔ اس میں ایک بندہ زور سے، ظلم سے، ہیکڑی

ے، زبردستی سے دوسرے بندے کو ستانا، اس کے دل کو دکھانا۔ اس کو ایذا پہنچانا ہے اور اس قصور کا معاف کرنا نہ کرنا اسی بندۂ مظلوم کے اختیار میں ہے۔ مگر انصاف کرو دنیا میں کتنے لوگ اس کی پرواکرتے ہیں، لاکھوں مظلمے ہیں جن کو بندگانِ خدا مرتے وقت اپنے سر ول پر لادکرلے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دین کو کھیل اور مذہب کو ہنسی سمجھ رکھا ہو۔ منہ سے کہتے ہیں کہ مرنا برحق۔ نکیرین کے ساتھ سوال وجواب کا ہونا برحق۔ عذاب قبر برحق، دوزخ برحق مرنے کے بعد زندہ ہونا برحق، رتی رتی کا حساب دینا برحق، جنت برحق، دوزخ برحق اور کردار حق تو......"

دین مولانا نے جو دین کے معنی سمجھائے ہیں اس سے اُن کا منشاء اور زیادہ واضح ہوتا ہے وہ بھی سن لیجئے، میرتقی مبتلا سے یوں فرماتے ہیں:۔

"ہمارے نزدیک بلکہ تمام اہل ادیان کے نزدیک دین کے معنی ہیں انسان کی اصلاح اور اس کے دو حصے ہیں۔ اصلاح معاد اور اصلاح معاش، پس دین اور دنیا میں اگر ایک طرح کی منطقی مغائرت ہے۔ جیسے عموماً کل اور جزمیں ہوا کرتی ہے۔ اس کو تباین یا تناقص یا تنافر، یا بے تعلقی سے تعبیر کرنا مغالطہ دہی ہے۔ کتنا ہی پڑھاؤ، جب انسان میں دین نہیں، حمیت نہیں مروت نہیں، محبت نہیں، خلاصہ یہ کہ انسانیت نہیں اس پر بھی اگر وہ آدمی دنیا کے کام کا ہو تو اس دنیا کو خیرباد ہو اور اس کام کو سلام......" ابن الوقت میں دین کی تعریف حجۃ الاسلام کی زبانی یوں کرائی ہے۔

دین حق کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہو کہ دنیا اور دنیا کے تعلقات سب ہیچ ہیں، دنیاوی خوشیوں کو منغص نہیں بلکہ دنیاوی رنج اور خوشی دونوں کو انسان کی نظر میں حقیر اور ناچیز کر دیتا ہے جو شخص غصے کو پی جائے، انتقام نہ لے، جھوٹ نہ بولے، غیبت نہ کرے، حریص وطماع نہ ہو جابر وسخت گیر نہ ہو، ممسک وبخیل نہ ہو، مغرور ومتکبر نہ ہو، کسی سے لڑے نہ جھگڑے نہ کسی کا حسد کرے، نہ کسی کو دیکھ کر جلے، عافیت میں شاکر، مصیبت میں صابر، منکسر خلیق، بردبار دتحمل، متحمل متواضع، منکسر مستغنی، نفس پر ضابط، قانع، سیرچشم، متوکل، تواب، عافیت کا امیدوار، متواضع، منکسر مستغنی نفس پر ضابطہ، قانع، سیرچشم، متوکل، تواب، عافیت کا امیدوار یعنی خلاصہ یہ کہ دیندار ہو۔"

اگر آپ ان منقول حصوں سے یہ سمجھتے ہوں کہ مولانا ہر شخص کو اپنی سیرت کے بنانے اور بگاڑنے میں آزاد سمجھتے تھے اور وہ انسان کو فاعل مختار مانتے تھے تو آپ بہت بڑی غلطی کریں گے۔ مولینا کے نزدیک باوجود ان تمام باتوں کے جو ابھی انھیں کے الفاظ میں بیان کی گئی ہیں انسان بالکل مجبور ہے۔ ہر امر اس کے لئے پہلے سی سے مقدر ہے اور جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ صرف خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ چنانچہ نظریہ تقدیر کو لیجیے۔

نظریۂ تقدیر و جبر

اصغری اپنے میاں سے گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہے۔

"سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ نوکری تقدیر سے ملتی ہے۔ بڑے لائق منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں، اور اگر خدا کو منظور ہوتا ہے، تو نہ وسیلہ نہ لیاقت، چھپر پھاڑ کر دیتا ہے گھر سے بلا کر دیتا ہے۔ تقدیر سے بڑھ کر مل نہیں سکتا۔"

اور فلسفۂ جبر کے بارے میں میر تقی کی زبانی یوں روشنی ڈالی گئی ہے:۔

"بندے بھلے اور برے، امیر اور غریب، قوی اور ضعیف، حاکم اور محکوم، بادشاہ اور رعیت، یہاں تک کہ ولی اور پیغمبر سب کے سب اس قدر عاجز اور بے اختیار ہیں کہ بدون خدا کی مرضی کے ایک پتا ہلانا چاہیں تو نہیں ہلا سکتے۔ ایک ذرے کو جگہ سے سرکانا چاہیں تو نہیں سرکا سکتے۔ کسی انسان کا نفع اور ضرر نہ اس کے اختیار میں ہے نہ کسی دوسرے انسان کے دنیا میں جس کسی کو جس کسی کے ساتھ کسی طرح کی محبت ہے اس کے یہی معنی ہوسکتے ہیں کہ جس کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔ اس کا فائدہ چاہتا ہے نہ یہ کہ اس کو فائدہ پہنچاتا ہے یا پہنچا سکتا ہے اسی واسطے دنیا کی ساری محبتیں از برائے نام ہیں۔ سچی اور اصل محبت خدا کی ہے کہ ساری نعمتیں اور ساری برکتیں جو ہم کو حاصل ہیں۔ یہاں تک کہ زندگی اسی کی دی ہوئی ہے، بایں ہمہ انسان کو اس زندگی میں ایذائیں بھی پہنچتی ہیں مگر ان میں ضرور انسان کا کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے۔"

مولانا کے ہم عصر سر سید احمد اور مولانا حالی مرحوم کی رائیں اس کے بالکل برعکس تھیں ان کا خیال ہی نہیں بلکہ ایمان تھا کہ انسان فاعل مختار ہے۔ کامیابی و ناکامی، برائی

اور اچھائی، سب کچھ اسی کی تدبیر اور اسی کے خیال پر منحصر ہے۔ حالی نے ایک مختصر رسالہ اسی بحث پر لکھا ہے اور اس امر کو ثابت کیا ہے کہ "مسلمانوں کے کاہل اور آپاہج ہونے کا سب سے بڑا باعث یہی نظریۂ تقدیر ہے" ہم نے جس موضوع کے نقد کا ذمہ اپنے سر لیا ہے اس سے یہ بحث بہت دور ہے اور ہمیں اصولی طور پر ان چیزوں کا ذکر ہی اس کتاب میں نہ کرنا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ مولانا نذیر احمد کی کتابوں کا اصلی رنگ دکھانا اور ان کو ناولوں کے زمرے میں نہ شامل کرنے کا باعث بھی بتانا ضروری تھا اس لئے ان کی یہ مخصوص چیزیں مذکور ہوئیں۔

اب ہم ان چند خصوصیات پر بھی نظر ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی وجہ سے بعض ناقدین مغالطہ میں پڑ کر مولانا نذیر احمد کو باقاعدہ ناول نویسوں میں شمار کرنے لگے ہیں۔ ان میں سب سے پہلی چیز حقیقت نگاری ہے۔

حقیقت نگاری

مولانا نے جہاں تک عورتوں کی خانگی زندگی کا تعلق ہے بہت حد تک حقیقت نگاری کی ہے ان کی آپس کی رنجشیں، جھگڑے، لین دین، رشک، حسد وغیرہ بہت ہی عمدہ طرز پر پیش کیا ہے۔ کہیں کہیں پر دوسرے جذبات سے بھی بحث کی ہے مثلاً اولاد سے محبت، بھائی سے محبت، باپ سے محبت، مگر اس کے ساتھ ان کی متشرع طبیعت، رنگین محبت ہی سے نہیں، بلکہ زن و شوہر کی محبت کے نام سے بھی "لجاتی" ہے۔ اُن کی معرکۃ الآرا کتاب مرأۃ العروس نام ہی نام کی رنگینی ہے۔ اس کی ہیروئن اصغری اس طرح کی قدسی صفات ہے کہ اس کا شوہر غالباً اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے پہلے وضو کرنا ضروری سمجھتا ہوگا۔ بنات النعش کی چمک بھی صرف نام ہی تک محدود ہے۔ ورنہ جن مستورات کا اس میں ذکر ہے وہ دن ہو یا رات کسی وقت بھی "عریاں" ہونے والی نہیں۔ توبۃ النصوح میں تو توبہ و استغفار ہی ہے، بھلا اس کی "فہمیدہ" میں قیامت کی متانت نہ ہوگی تو کس میں ہوگی؟ رہیں مبتلا اور ابن الوقت سی تصنیفیں تو آخر الذکر کے ہیرو نے ساری عمر انگریز بننے میں صرف کر دی، اسے صنف نازک کو جنس لطیف سمجھنے کا وقت ہی نہ ملا اور اول الذکر نے گو ایک کی جگہ دو دو بیویوں کا بیک وقت تجربہ حاصل کیا

مگر نہ اس کے ہاں ان دکھیاریوں کے لئے کوئی خاص کشش پیدا ہوئی اور نہ اُن بے چاریوں کے ہاں اس مابہ النزاع سرتاج کے لئے، ہمارے نزدیک اس لطیف ترین جذبے کے ذکر سے اغماض کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو مولانا ان کا ذکر ہی بے حیائی سمجھتے تھے یا انھیں اس دنیا سے کلیتہً ناواقفیت تھی ان میں سے جو بھی سبب ہو۔ مگر اس عنصر کے عدم نے مولانا کی کتابوں سے ناول کہلانے کا حق سلب کر لیا۔ اور خود انھیں حقیقت نگار کے خطاب سے محروم کر دیا۔

مکالمہ وزبان

اب رہا مکالمہ تو بے شک وشبہہ مولانا عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں، صنعت نازک کا تکلم، طرز گفتگو نشست الفاظ، اور روزمرہ و محاورہ پر جیسا انھیں عبور ہے۔ سوائے سرشار اور مرزا رسوا کے کسی کو نصیب نہیں، ان مقامات پر مولانا نے سلاست، روانی اور آمد کے دریا بہا دئے ہیں اور اتنی ٹکسالی زبان لکھی ہے کہ ہر فقرے پر جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ مگر جس جگہ پر خود اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں یا مردوں کی گفتگو لکھی ہے۔ وہاں روانی کا دریا عربی کے ثقیل الفاظ کی چٹانوں سے بار بار ٹکراتا ہے۔ زور وہاں بھی بلا کا ہے۔ بہاؤ میں کمی نہیں۔ مگر ہاں یہ سبزہ زاروں سے گذرتا ہوا دریا نہیں، بلکہ کوہساروں سے الجھتی ہوئی ندی ہے۔ پھر ان مقامات کی زبان بھی دلی اور لکھنو کی ٹکسال کی پابند نہیں، اس میں جگہ جگہ پر اس کے بیّن ثبوت ملتے ہیں کہ مولانا نے مدت العمر ایک دورہ کرنے والے ڈپٹی کی زندگی بسر کی ہے اور ان کا اصلی وطن دلی کا شہر نہ تھا بلکہ یوپی کا بجنور، ا

امثالُ القرآنْ

یہ پُرمغز مقالہ جامعہ کے شعبۂ دینیات کے ماتحت پڑھا گیا تھا۔ امثال القرآن جیسے اہم موضوع پر اردو زبان میں بہت کم مواد موجود ہے۔ مولانا نجم الدین صاحب نے اسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ امید ہے کہ قرآنی مباحث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات غور و توجہ سے اس کا مطالعہ کریں گے۔

یہ مقالہ عنقریب کتابی صورت میں بھی شائع کیا جائے گا۔

قرآن حکیم ایک ایسی جامع اور مکمل کتاب اور دستور العمل ہے جو انسانی ترقی کے لئے تمام اصول و مبادی، قواعد و قوانین پر مشتمل ہے۔ ابتدائے نزول سے لیکر اس وقت تک کسی دور یا کسی ملک یا کسی قوم کو اس پر عمل پیرا ہو کر شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوتے ہوئے کوئی دشواری یا رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ نوعِ انسانی کی تمام ترقیوں اور کمالات حاصل کرنے کے لئے اس میں ہدایات اور احکام موجود ہیں۔ مثلاً اگر کسی صوفی اہل اللہ کو مقامات تصوف اور احوال نفسانی و فیوض روحانی کی جستجو و آرزو دامنگیر ہو۔ تو قرآن حکیم اس کے لئے بھی مشعلِ راہ و چراغِ ہدایت کا کام دیتا ہے۔ مراتبِ روحانی و مقاماتِ علیا کے لئے جا بجا ارشادات موجود ہیں۔ ابتدائی مراحل سے انتہا تک ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً مقام خوف کے لئے جا بجا اس مضمون کا اعادہ فرمایا گیا۔

یدعونَ ربّھم خوفاً وطمعاً۔

رجاء کے لئے :۔

من کانَ یرجو لقاءَ اللہِ فَاِنَّ اجل اللہ لاٰتٍ۔

جوع اور ترکِ شہوت کے لئے متعدد آیات میں رہنمائی فرمائی گئی :۔

وَلنبلونّکم بشیٍٔ مِن الخوفِ والجوعِ ..... وَبشّر الصّابرین۔

وَیُؤثِرُونَ علیٰ انفسہم ولوکان بھم خصاصۃ۔

مقامِ خشوع اور تواضع کے لئے یوں ارشاد ہوا:۔

قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلوٰتھم خاشعون۔

مخالفت نفس وہوا کے لئے:۔

وَاَمّا من خافَ مقام ربہٖ ونَھَی النفسَ عنِ الھواء فَاِنَّ الجنّۃَ ھِیَ المأویٰ۔

اسی طور پر ہر ایک مقام قناعت۔ صبر۔ شکر۔ توکل۔ انابت۔ فتوت۔ یقین۔ توبہ۔ مراقبہ رضاء۔ عبودیت۔ استقامت۔ اخلاص۔ وغیرہ درجات کا ذکر مختلف آیات میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت ذیل میں بطور عموم جملہ درجاتِ تصوّف کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔

ایسے ہی اگر کسی بادشاہ یا خلیفہ کو ملک گیری یا ملک داری کے قوانین اساسی و ضوابط ملکی و سیاسی کی ضرورت لاحق ہو تو قرآن مجید اسکی ہر ایک موقع و محل پر پوری امداد و اعانت فرما کر رہنمائی کرتا ہے۔ خصوصاً سورۂ انفال۔ توبہ اور احزاب، فتح اور بقرہ میں اس قسم کے احکام جا بجا پائے جاتے ہیں۔

امور معاشرتی و خانہ داری کے سلجھانے کے لئے بھی اس نے ہر ایک پہلو کو مکمل طور پر واضح کر دیا ہے۔ سورۂ بقرہ۔ نساء۔ نور۔ احزاب۔ طلاق و تحریم میں اس کا نمایاں حصہ ذکر فرمایا گیا ہے

غیر مسلم اقوام سے عہد و پیمان کے تعلقات اور اعلان جنگ وغیرہ کے احکام پر بھی مکمل بحث کی ہے۔ سورۂ انفال۔ توبہ۔ سورۂ محمد۔ فتح میں اس کی زیادہ تشریح پائی جاتی ہے۔

فصل خصومات و ضابطۂ دیوانی و فوجداری کا ایک مکمل نقشہ پیش کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ کے آخر میں اور نساء کے بعض حصص میں اور مائدہ و نور میں بھی اس کی توضیح فرمائی گئی ہے۔

اور اس میں سپہ سالار کے لئے فوجی قواعد کی پوری تشریح موجود ہے۔ اکثر حصہ سورۂ توبہ انفال، فتح و محمد میں پایا جاتا ہے۔

غرضکہ جس پہلو اور جس عنوان پر نگاہ ڈالی جائے، ذی فہم انسان کے لئے ایک مکمل دستور العمل موجود ہے۔ اور آیۃ

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل ع۱۲ پارہ ۱۴)

کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اور فرمان واجب الاذعان۔

وَاِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَاتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (سجدہ پ۲۴ ع۵) کا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلعم نے اسی قرآن کریم پر عمل فرما کر ترقی کا جو نمونہ پیش فرمایا ہے اولین و آخرین اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ آنحضرت صلعم نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں فرمایا۔ ان کے پاس صرف یہی قرآن حکیم تھا، جس پر عمل پیرا ہو کر دُنیا کو حیران و متعجب کر دیا اسی کتاب اللہ پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آنحضرت صلعم کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر اور اس کی روشنی میں کارفرما ہو کر جس بام عروج کو پہنچے وہ کسی سے مخفی اور پنہاں نہیں۔

آنحضرت صلعم کے زمانے سے لے کر اس وقت تک مختلف اوقات و ازمنہ میں لوگوں نے قرآن حمید کی تفسیریں لکھیں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ہر ایک مفسر نے اپنے اپنے خیال و مذاق کے مطابق اس کے مطالب اخذ کرنے میں کوشش کی۔ کسی نے مسائل فقہیہ کے استنباط اور استخراج میں اپنی ساری کوشش صرف کر دی۔ تفسیر احکام القرآن ابو بکر جصاص اور احکام القرآن ابن عربی وغیرہ کا یہی مقصد، اور منتہائے مرام ہے۔ ان لوگوں نے صرف آیات احکام ہی کو اپنے فن کا موضوع قرار دے کر ہر ممکن خدمت انجام دی ہے۔

متاخرین میں سے تفسیر احمدی میں ملاں جیونؒ نے بھی اسی مقصد کو ملحوظ رکھا اگر کسی کا مذاق محدثانہ تھا تو اس نے بھی اپنے فن کا پورے طور پر پاس رکھا۔ زیر بحث آیات میں جس قدر احادیث یا اقوال سلف صالحین کا امکان تھا جمع کیا اور اس میں کسی قسم کی کمی اور خامی نہ چھوڑی۔ ابن جریر اور ابن کثیر کی تفسیروں کا عموماً یہی مذاق ہے اگرچہ فن توجیہ کو بھی انہوں نے ہاتھ سے نہیں دیا مگر یہ حصہ مغلوب اور پہلا غالب ہے جلال الدین سیوطیؒ نے بھی اپنی تفسیر درمنثور میں اسی روش کو اختیار کیا ہے۔

اگر کسی عالم کا مذاق عربیت کی طرف زیادہ مائل تھا تو اس نے قرآن حکیم کے نظم و نسق سے فصاحت و بلاغت کے نکات نکالنے اور صرف و نحو کے استشہاد پیش کرنے میں ساری کوشش صرف کردی۔ علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی نے اسی روش کو پسند فرمایا، اگرچہ انہوں نے فن توجیہہ اور اثبات اعتزال یا اس کی تردید میں بھی کافی بحث کی ہے مگر اول حصہ زیادہ نمایاں ہے۔

صاحب جلالین نے تو کوئی انتہا ہی نہ چھوڑی سوائے چند ترکیبوں کے کسی شئی کو معرض بحث قرار ہی نہیں دیا۔ اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ

جب کسی عالم کا توغل عقلیات و فلسفیات کے ساتھ تھا اور اسی میں اس کی مزاولت رہی تو اس نے کتاب اللہ سے تمام مسائل فلسفیہ اور دلائل عقلیہ کے طرز بیان کو اختیار کر کے اپنی پوری ہمت کا مظاہرہ کیا۔ اس صف میں علامہ فخر الدین رازیؒ سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جب کبھی کسی آیت سے ذرا بھی گنجائش نظر آئی تو فوراً انہوں نے مصطلحات فلسفہ کو اس میں ٹھونسنے کی کوشش کی۔ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں انہوں نے علم ہیئت کے تمام مسائل کو بالاستیعاب ذکر کر دیا۔ اسی طرح جہاں بھی خلق السمٰوات والارض یا کسی ستارے یا سورج چاند کا ذکر ہوا۔ فوراً ان کا ذہن علم ہیئت کی طرف منتقل ہوا۔ اسی طور پر جب کبھی کسی فلسفی طبعی یا الٰہی مسئلہ

کا تھوڑا سا حصہ بھی کسی آیت سے نظر آیا تو تمام طبیعیات و الٰہیات کے دفتر کھول کر رکھ دیئے ان کی تقلید میں اور بھی کئی علماء اسی رو میں بہ نکلے۔ اگرچہ تفسیر رازی میں بہت سے مسائل متعلق تشریح و تفسیر قرآن حکیم موجود ہیں اور نکات و حکم سے وہ خالی نہیں ہیں مگر غلبہ غیر متعلق مسائل کے باعث یہ کہا گیا۔ کُلّ شئٍ فیہ الّا التفسیر۔

اگر کسی اہل ذوق کو روحانیات اور عالم ملکوت سے زیادہ تعلق تھا تو اس نے انسان کے روحانی کمالات اور مدارج کے استنباط کرنے پر اپنی نظر کو محدود رکھا۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی مشہور تفسیر میں اسی رنگ کو اختیار کیا۔ کوئی آیت ایسی نہیں چھوڑی جس کو فلسفۂ تصوف پر انھوں نے حل نہ کیا ہو۔ ان کے علاوہ صاحب روح المعانی نے بھی اپنی تفسیر میں عام متداول تفسیر کا ذکر کرنے کے بعد اس سلسلے کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اول سے لے کر آخر تک اس کو بھی ساتھ ہی ساتھ نباہتے چلے گئے غرض ہر ذی فہم صاحب ذوق نے اپنے مذاق کا مطالعہ قرآن مجید کی نظم و نسق سے فرما کر ناظرین سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ہمارے خیال میں ہر ایک مفسر نے قرآن کریم کی خدمت کو اپنا مقصد قرار دے کر اپنے فہم کے مطابق عہدہ برائی کی۔ جزاھم اللّٰہ عنا خیر الجزاء۔

باوجود اس قدر تفاسیر لکھے جانے اور اس خدمت کے بجا لانے کے میرے ناقص خیال میں تفسیر کے بعض پہلو تا حال مکمل طور پر زیر بحث نہیں لائے گئے۔ جن پر غور و پرداخت کرنا امت پر فرض تھا اور ہے۔

(۱) اول اقسام القرآن یعنی قسموں کی تشریح اور غرض قسم اور قسم اور جواب قسم میں ربط قائم کرنا۔ اس موضوع پر مستقل اور علیحدہ مکمل بحث کرنے کی اشد ضرورت تھی مگر میری نظر سے اس وقت تک اس موضوع پر صرف دو کتابیں گزری ہیں۔ ممکن ہے کہ سلف صالحین اور متاخرین نے اس فن پر اور کتابیں بھی لکھی ہوں مگر وہ ہم تک نہیں پہنچیں۔

(۱) تبیان فی اقسام القرآن مصنفہ حافظ ابن قیمؒ۔ اس کتاب میں اگرچہ انھوں نے حسب تبحر غور و بحث سے نکات تفسیر یہ ذکر فرمائے ہیں۔ مگر اصل موضوع پر کوئی ایسی معتدبہ روشنی نہیں ڈالی جو مشتاق منتظر کے انتظار کو رفع کرسکے کہیں کہیں وہ ذکر کر جاتے ہیں کہ اقسام سے مقصود استشہاد ہوتا ہے۔ مقسم بہ کی حالت اور اس کے اطوار گرد و پیش کے حالات سے جواب قسم کا اثبات مقصود ہوتا ہے مگر جب کسی قسم کی تفسیر پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہی پرانا قصہ مقسم بہ کی عظمت اور شان وغیرہ کے مباحث چھڑ جاتے ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے تصریح بھی فرمائی ہے۔ کہ قسم سے مقصود استشہاد ہوتا ہے۔ مگر عملی رنگ میں۔ کسی سورت میں بطور نمونہ جاری کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ خدا جانے انھوں نے باوجود سابق تصریح کے کیوں پہلو تہی کی ۔

(۲) امعان فی اقسام القرآن مصنفہ مولانا عبدالحمید فراہی مرحوم۔ مصنف نے اس کتاب میں اس سلسلے کے لئے کچھ داغ بیل ڈالی ہے۔ مگر ان کو بھی تکمیل کی فرصت نہیں ملی۔ اگرچہ اصولی طور پر انھوں نے بہت سے امور ذکر فرمائے ہیں جن کی مدد سے صاحب ذوق سلیم فائدہ اٹھا سکتا ہے اور تکمیل کا رنگ پیدا کرسکتا ہے۔ اگر خود مصنف علیہ الرحمۃ اس چیز کو مفصل لکھ جاتے تو کیا ہی اچھا ہوتا ۔

(۲) دوم ربط الآیات والسوَر۔ یہ مسئلہ نہایت ہی اہم اور ضروری تھا۔ اور عین عقل کے تقاضے کے مطابق ایک سورت کی آیتوں میں ربط کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے اور سورتوں کا اس ترتیب پر دکھا جانا جو شان نزول کی تاریخ کے خلاف ہے ضرور کسی حکمت اور فائدے پر مبنی ہوگا۔ ورنہ ترتیب نزولی کو ہی اختیار کیا جاتا۔ ترتیب نزولی ایک طبعی اور فطرتی چیز ہے۔ اس کا خلاف اسی وقت اختیار کیا جاسکتا ہے، جب اس کے مقابل میں کوئی داعئ قوی موجود ہو۔ مگر مسئلہ ربط ایک ایسا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے جو عام نظروں سے مخفی اور مستتر رہا۔ اسی خفاء اور استتار کے باعث

بہت سے علماء نے سرے سے ربط کے وجود کا ہی انکار کر دیا اور برملا کہہ دیا۔ نہ تو ایک سورت کی آیات میں باہم کوئی ربط ہے اور نہ ہی ایک سورۃ کا دوسری سورۃ کے ساتھ کوئی ایسا لگاؤ ہے جو اس کا یہ مقتضی ہو کہ وہ اس کے بعد ذکر کی جائے۔ اور جن لوگوں نے ربط کو مانا ہے انھوں نے بھی کوئی ایسی معتد بہ شے پیش نہیں کی جو مخالفین کی غفلت یا تساہل کو دور کر سکتی یا ہماری پیاس کو بجھا سکتی اور قرآن حکیم کی شایان شان معلوم ہوتی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اس مسئلہ کی طرف کوئی زیادہ توجہ مبذول نہیں فرمائی ورنہ وہ اس موضوع پر کافی روشنی ڈال سکتے تھے۔

علامہ فخر الدین رازی نے آیات میں ربط پیدا کرنے کی بہت کوشش کی، اور بالالتزام اس بحث کو عام طور پر نباہتے گئے۔ مگر انھوں نے صرف چند مقاصد کو پیش نظر رکھ کر آیات کو باہم مرتبط کر دیا۔ عام طور پر انھوں نے مقاصد قرآنی کو مندرجہ ذیل مضامین میں حصر کر دیا ہے۔ توحید۔ رسالت۔ حشر نشر۔ کہیں تو توحید کا ذکر مقدم آ گیا اس کے بعد رسالت۔ اس کے بعد حشر نشر اور کہیں بالعکس۔ ان تین چیزوں کی ضرورت ہر ایک شخص کے نزدیک مسلم ہے جو بھی پہلے آجائے اس کے بعد دوسرے کا لانا کوئی بے ربط نہیں ہو سکتا۔ یہ ربط کوئی ایسا نہیں جو اعجاز قرآنی اور شان تنزیل کے مناسب ہو کیونکہ قرآن کریم کے مقاصد نہایت ہی وسیع اور تمام ضروریات بشری کے متکفل ہیں۔ جن میں کبھی بھی تبدیلی یا ترمیم کی ضرورت نہیں پڑی اور نہ پڑے گی۔ جب ہمارے سامنے یہی دستور العمل اور قانون دائمی ہے۔ تو ہر ضرورت کے لئے اس میں بحث اور مادہ کا ہونا ضروری اور لابدی معلوم ہوتا ہے۔

علامہ فخر الدین رازی کے بعد چند دیگر مفسرین نے بھی اس مذاق کو پسند فرمایا۔ مگر بالاستیعاب ربط کو ذکر نہیں کیا گیا۔

سید علی مہائمی نے بھی اپنی تفسیر کا اعلے مقصد اسی کو قرار دیکر قابل قدر سعی فرمائی۔ مگر

تاحال جن مقاصد کے استنباط کرنے کے لئے اہل ذوق کے قلوب منتظر ہیں وہ ابھی تک معرض شہود میں نہیں آسکے۔ آنحضرت صلعم کا اعلان بالکل صحیح اور مطابق واقع ہے۔ لا ینقضی عجائبہٗ چیدہ چیدہ چند مفسرین نے غیر لازمی طور پر کہیں کہیں ربط قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بعض مواقع پر انھوں نے اعلےٰ قسم کے نکات بیان فرماکر ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور بعض مقامات پر محض ایک معمولی بات پر قناعت کرکے آگے چل دیئے بہر حال وہ ہمارے شکریئے اور دعائے خیر کے مستوجب و مستحق ہیں۔

صاحب تفسیر بقاعی نے بھی ربط قائم کرنے کا التزام کیا ہے۔ بہت سے حضرات نے اس کی بہت توصیف بھی فرمائی۔ مجھے اس کے پورے طور پر مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اتفاق حسنہ سے ایک دفعہ ایک جلد تھوڑی دیر کے لئے میری نظر سے گذری وہ بھی کچھ زیادہ مفید معلوم نہیں ہوئی۔ جس طرح اور لوگوں نے ربط کے متعلق سعی فرمائی ہے انھوں نے بھی وہی مسلک پسند فرمایا ہے۔ شاید دوسرے حصص کے دیکھنے کے بعد رائے میں کچھ تبدیلی ہوسکے تاحال اس کی طباعت نہیں ہوئی قلمی نسخہ میرے مطالعہ سے گزرا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں جب کوئی مصنف کوئی کتاب تصنیف کرنے لگتا ہے تو مضامین میں ضرور کوئی ربط قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ترتیب کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اگر کسی کتاب میں کوئی مسئلہ بے محل ذکر ہوجائے تو تمام لوگوں کی نگاہیں اس بے ربطی اور بے مذاقی پر اٹھتی ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں مقام پر یہ چیز بے ربط اور بے محل ذکر کردی ایسے ہی کوئی واعظ یا مقرر اپنے وعظ و تقریر میں کوئی جملہ یا قصہ یا حکایت بے ربط و بے ترتیب ذکر کردے تو تمام حاضرین اس کی بدمذاقی اور بے ذوقی پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔ جب انسانی کلام میں فطرتی طور پر ربط کا ہونا ضروری ہے تو احکم الحاکمین کے کلام قدیم میں کیونکر بے ربطی کو گوارا کیا جاسکتا ہے۔ جو کلام علےٰ رؤس الاشہاد تمام انسانوں بلکہ جن وانس کو اپنی نظیر پیش کرنے سے عاجز قرار دیتا ہے وہ کیونکر بے ربط و بے ترتیب ہوسکتا ہے۔ مانا کہ ہم

اس کی تہ تک یا حقیقت تک کما حقہٗ نہیں پہنچ سکتے۔ مگر یہ انصاف نہیں کہ جو چیز ہماری سمجھ سے بالاتر ہو اس کا ہم انکار کریں۔ بلکہ ہمارا ایمان ہے کہ وفوق کل ذی علم علیم۔ عرب میں جب کوئی شاعر یہ تم میں رزم یا رزم میں بزم کا رنگ پیدا کرتا تھا تو فوراً اس پر گرفت شروع ہو جایا کرتی تھی۔ قرآن کریم کے نزول کے وقت صدہا شعراء و فصحاء و بلغاءِ عرب موجود تھے۔ کسی نے اس پر یہ اعتراض نہ کیا کہ یہ کلام غیر مرتبط اور غیر مناسب ہے۔ حالانکہ ان کے پاس اس قسم کے دواعی موجود تھے جو انھیں قرآن حکیم پر نکتہ چینی کرنے کے لئے مجبور کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کے ربط کے متعلق دشمنانِ اسلام کو بھی کوئی شبہ نہ تھا ورنہ ضرور وہ یہ اعتراض کرتے السکوتُ فی معرضِ البیان بیانٌ کے مقولے کے مطابق ان کا اعتراف پایا جاتا ہے کہ قرآنِ حکیم کی آیات میں ضرور ارتباط ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ جن لوگوں نے ربط کا انکار کیا ہے ان کا اصل مقصد کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت فرما کر اپنی رضا حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔

(۳) تیسری بات۔ قرآن حکیم میں ایک ہی قصہ مختلف سورتوں میں مختلف ترتیب سے ذکر فرمایا جاتا ہے۔ کہیں کسی واقعہ کو ابتدا سے لے کر انتہا تک ذکر کر دیا جاتا ہے اور کہیں بالکل اجمالی طور پر کسی خاص حصے کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ اور کہیں ایک مضمون ایک سورۃ میں مقدم ذکر کیا جاتا ہے۔ اور دوسری سورۃ میں اسی مضمون کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم لایا جاتا ہے لامحالہ کلام الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ کے مطابق ضرور اُسلوبِ بیان اور تفصیل و اجمال و عکسِ ترتیب میں کوئی نہ کوئی حکمت ملحوظ رکھی گئی ہو گی، جس کے سمجھنے سے ہمارے عقول و اذہان تاحال قاصر ہیں۔

(۴) چوتھی چیز امثال القرآن ہے۔ قرآن حکیم میں مختلف مضامین مختلف قسم کے حالات کو مشاہدہ و مشخص کرنے کے لئے یا اعمال کے حُسن و قبح دکھانے کے واسطے امثالاً ذکر کئے گئے ہیں۔ ان پر مفسرینؒ نے حتی الامکان بہت کچھ تحقیق و تدقیق فرمائی ہے۔ تاہم امثال کے بعض پہلو ابھی تک پورے طور پر منقح اور مشرح نہیں ہوئے جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

غالباً وہ ان حضرات کی نگاہ میں اس قدر ضروری اور اہم نہ ہوں گے جیسے کہ ہمیں ضروری معلوم ہو رہے ہیں۔ ورنہ وہ لوگ ضرور ہی ان کو بغیر تحقیق وتشریح نہ چھوڑتے۔ آج کے مقالہ میں اس وقت صرف امثال القرآن کے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا۔ اس موضوع پر مکمل بحث کرنے کے لئے چند امور کا جاننا ضروری ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) لفظ مثل کی تحقیق۔

(۲) اس کی تاریخی حیثیت۔

(۳) غرض مثل۔

(۴) مثل لہٗ اور مثل کے درمیان تطبیق اور امثال کی تشریح اور ان کے نتائج مثل کی حقیقت اور اس کی فقہی حیثیت۔

(۱) لفظ مثل کی لغوی تحقیق پر علمائے لغت نے بہت کچھ لکھا ہے۔ صاحب قاموس اور اس کے شارح صاحب تاج العروس اور لسان العرب و صاحب کشاف و مبرد وغیرہ کے حوالے میرے زیر نظر ہیں مگر سردست میں صرف مفردات امام راغب اصفہانی کا قول نقل کرتا ہوں جس کو انھوں نے غرائب القرآن میں ذکر کیا ہے۔

قال الامام الراغب الاصفہانی فی غرائب القرآن وَ المَثَلُ عبارۃٌ عن قولٍ فی شیٔ یُشبِہُ قولاً فی شیٔ آخر بینہُمَا مُشَابہۃٌ لِیُبَیِّن احدھما الآخر ویصورہٗ نحوُ قولھم فی الصیف ضَیَّعتِ اللَّبَنَ۔ فَاِنَّ ھٰذا القولَ یُشبِہُ قولکَ اھملتِ وَقتَ الامکان امرکِ وَعلیٰ ھٰذا الوجہِ مَا ضرب اللّٰہ تعالیٰ الامثالَ فَقَالَ وَتلک الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون وفی اُخریٰ وَمَا یعقلھا الّا العَالمونَ والمثل علیٰ وجھین احدھما بمعنی المثل نحو شَبَہٍ وَشِبْہٍ وَنَقَضٍ وَنِقْضٍ قَالَ بَعضھم وقد یُعَبِّرُ بِھِمَا عن وَصفِ الشیٔ نحو قولہ تعالیٰ مثل الجنۃ التی وعد المتقون۔

وَالثانی عبارۃٌ عن المشابھۃ لغیرہٖ فی معنًا من المعانی ای معنًا کان وھو اعمُّ الالفاظ الموضوعۃ للمشابھۃ وذالک ان الندّ یقال فیما یُشارکہٗ فی الجوھر فقط وشِبْہٌ یقال فیما یُشارکُ فی الکیفیۃ والمساوی یقالُ فیما یُشارکُ فی الکمیۃ فقط۔ والشکل یقال فیما یشارکہٗ فی القدر والمساحۃ فقط۔ والمثلُ عامٌّ فی جمیع ذالک فبھذا لما اراد اللّٰہ تعالیٰ نفی التشبیہ من کل وجہ خصّصَہٗ بالذکر فقال لیس کمثلہٖ شئٌ۔ واَمّا الجمع بین الکاف والمثلِ فقد قیل ذالک لتاکید النفی تنبیھًا علیٰ انّہ لایصح استعمال المثلِ والکاف۔ فنفی بلیس الامرین جمیعاً وقیل المثلُ ھٰھُنا ھو بمعنی الصّفت ومعناہُ لیس کصفتہٖ صفتہٗ تنبیھاً علیٰ انّہٗ وانْ وُصِفَ بکثیرٍ مّما یُوصَفُ بہٖ البشرُ فلیس تلک الصفاتُ لہٗ علیٰ حسب ما یُستعمل فی البشر وقولہٗ للذین لایومنون بالاٰخرۃِ مَثَلُ السّوءِ وللّٰہِ المثل الاعلیٰ۔

(۲) مثال کا استعمال حکما اور علما کے کلام میں ہمیشہ رہا۔ قدیم ترین کتاب میں جس کو ایک قوم کے خیال میں کلامِ الٰہی مانا جاتا ہے، جسے وید کہتے ہیں۔ جابجا امثال موجود ہیں۔ اشیاء کے حسن و قبح یا ترہیب و ترغیب کے لئے بہت سے اشلوکوں میں امثال کا استعمال ہوا ہے۔ جن میں سے بعض بعض تمثیل نہایت ہی نفیس اور قابل قدر ہیں۔

تورٰۃ انجیل میں بھی جابجا امثال کا ذکر آتا ہے۔ قرآن حکیم نے بھی اسی دستور العمل قدیم کو ملحوظ فرماتے ہوئے کثرت سے امثال ذکر فرمائیں۔ امام ابوالحسن الماوردیؒ نے جو شوافع کے بڑے علماء میں سے شمار ہوتے ہیں، امثال القرآن پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ مگر وہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری۔ نہ معلوم کہ انھوں نے اس کتاب میں کیا کیا باتیں ذکر فرمائی ہیں۔

اگر کتب سماوی یا غیر سماوی کے امثال کا بطور نمونہ یہاں تذکرہ کیا جائے تو ایک بحث طویل شروع ہو جاتی ہے۔ جس کو ہمارے اصل موضوع کے ساتھ چنداں تعلق نہیں صرف سلسلۂ موضوع کے ارتباط کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ امثال کا استعمال قرآن حکیم سے پیشتر بھی ہوتا رہا۔ قرآن مجید نے امثال کے ذکر کرنے سے مخاطبین کو کسی غیر مانوس چیز کے سمجھنے کی طرف متوجہ نہیں فرمایا۔

(۳) مثل کے ذکر کرنے سے بہت سے اغراض ہوا کرتے ہیں جو نہایت ہی اہم اور ضروری ہیں۔ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات سے اس کی طرف توجہ اور تفکر اور تدبر کا ارشاد ہوا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وَلقد ضربنا للناسِ فی ھٰذ القرآنِ من کلِ مثل لعلھُم یتذ کّرون۔ وقال اللہ تعالےٰ وَتلک الامثالُ نضربھا للناس وما یعقلھا الا العالمون۔ وَقال اللہ تعالیٰ وتلک الامثال نضربھا للناس لعلہم یتفکرون۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی ایک آیات سے امثال میں تفکر کرنے اور نتائج اخذ کرنے کے لئے حکم دیا گیا ہے۔ ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مثل کوئی معمولی چیز نہیں جسے انسان سطحی نظر سے دیکھ کر آگے چل دے۔ مذکورۂ بالا تین آیات کے فواصل میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امثال کے فوائد اور نتائج کا اخذ کرنا ہر کہہ و مہہ کا کام نہیں۔ پہلی آیت میں لعلھم یتذ کرون کا لفظ خاص ارباب ذکر کے استفادہ حاصل کرنے کی طرف مشعر ہے۔ دوسری میں وَمَا یعقلھا الا العالمون کا لفظ ارباب عقل و علم کے مستفید ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ عقل فطرتی کے ساتھ علم اکتسابی کی بھی امثال کے سمجھنے میں ازبس ضرورت ہے۔ جن لوگوں میں عقل ہی نہیں۔ یا جو ذوقِ علم سے بے بہرہ ہیں وہ امثال قرآنی سے فائدہ اٹھانے کے اہل نہیں۔ ان دو شرطوں کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ ورنہ فاقدہ الشرطین کے نزدیک تو امثال غیر مفید و بے سود ہیں۔ تیسری آیت میں لعلھم یتفکرون کا لفظ ارباب فکر و

نظر کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے۔ امثال سے وہی لوگ فائدہ اٹھانے کے قابل ہیں جو مبادی سے مطلوب کی طرف انتقال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور وہی حقیقی طور پر امثال سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ احادیث میں بھی تدبر بالامثال و اعتبار بالامثال کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان القرآن نزل علیٰ خمسۃ اوجہ حلال وحرام ومحکم ومتشابہ وامثال فاعملوا بالحلال واجتنبوا الحرام واتبعوا المحکم وآمنوا بالمتشابہ واعتبروا بالامثال رواہ البیھقی۔ (اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۳۱)

اس حدیث سے جو امثال کی اہمیت معلوم ہوتی ہے وہ کسی ذی فہم اور عقلمند پر مخفی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے مضامین کو پانچ قسموں میں منحصر فرمایا ہے۔ پانچویں قسم امثال القرآن ہے۔ جس سے عبرت اور استنباط کرنا اہل اسلام کا فرض لازم ہے۔

امام ماوردیؒ نے امثال کے متعلق یہ لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ من اعظم علم القرآن علم امثالہ والناس فی غفلۃ عنہ لاشتغالھم بالامثال واغفالھم عن الممثلات والمثل بلا ممثل کفرس بلا لجام والناقۃ بلا امام۔ (اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۳۱)۔

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ہر مجتہد پر امثال کی معرفت اور ان کا علم واجب اور لازم ہے امثال کے اندر اوامر و نواہی کے بے انتہا مسائل مضمر ہیں۔ ہم مثل کو پڑھ کر بلا تفکر و تدبر آگے چل پڑتے ہیں۔ مگر جو غرض اور مقصد اصلی تھا۔ اس کی طرف ہماری توجہ بہت کم مبذول ہوتی ہے۔ شیخ عز الدین بن عبد السلام نے فرمایا ہے۔ انما ضرب اللہ الامثال فی القرآن تذکیراً ووعظاً فما اشتمل منھا علیٰ تفاوت فی ثواب او علیٰ احباط عمل او علیٰ مدح او علیٰ ذم او نحوہ فانہ یدل علی الاحکام۔ (اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۳۱)

دیکھو ان بڑے بڑے علماء اور مجتہدین نے امثال کو کس قدر اہم اور ضروری سمجھا ہے
ضرب الامثال سے حسب موقع بہت سے امور کا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ کبھی تو تذکیر مقصود ہوتی ہے۔ تذکیر کی تین قسمیں ہیں۔ کبھی تو تذکیر بآیات اللہ مقصود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مظاہر قدرت کو بطور تمثیل کسی شئے کے امکان یا امتناع پر بطور دلیل پیش فرمایا کرتا ہے۔
اور کبھی تذکیر بایام اللہ مطلوب ہوتی ہے۔ امم سابقہ کے حالات تعمیری یا تخریبی بیان فرما کر مخاطبین کو ان کے نقش قدم پر چلنے یا ان کی گمراہی سے دور رہنے کی ہدایت کی جاتی ہے اور کسی موقع پر تذکیر بما بعد الموت مقصود ہوتی ہے۔ انسان کی اس نشأۃ کے ختم ہونے کے بعد جو واقعات اس کو عالم برزخ میں یا قیامت کے دن پیش آنے والے ہیں ان کو امثال کے رنگ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی ضرب الامثال سے یہ مقصود ہوتا ہے۔ کہ مخاطب کو کسی کام پر برانگیختہ کیا جائے یا کسی بری چیز سے اس کے افعال یا عقائد و اعمال کو تشبیہ دے کر اسے متنفر و مجتنب کیا جاتا ہے بسا اوقات کوئی ایسا مسئلہ مخاطب کے سامنے ذکر کیا جاتا ہے جو اچھی طرح اس کے ذہن نشین نہیں ہوتا۔ تو مثال کے ذریعے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ بعض موقعوں پر انسان اپنی کوتاہ فہمی کے باعث کسی امر کو غیر ممکن یا ممکن الوقوع کو غیر ممکن الوقوع خیال کر بیٹھتا ہے تو اس کی غلط فہمی کے ازالہ کے لئے مثال کے ذریعے سے اس کے سامنے باطل کی تردید کی جاتی ہے۔ اور بعض موقعوں پر کسی غیر محسوس شے کو محسوس مثال سے متقرر فی الذہن کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مثال سے کبھی ایک متوہم شے کو مشاہد دکھانا مطلوب ہوتا ہے۔ اور بعض مواقع پر بذریعہ امثال کسی شے کی عظمت و فخامت یا ذلت و حقارت بیان کی جاتی ہے۔
علم بیان میں ایک ہی مضمون کو مختلف طرق و اسالیب سے ادا کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ علم الامثال اس فن کا ایک بڑا شعبہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن عظیم میں وعلمہ البیان کے امتنان کی تکمیل کے لئے امثال کو کثرت سے ذکر فرمایا گیا۔

اصل مقصد تو امثال سے ممثل لہٗ کی حقیقت کو واضح کرنا۔ یا دوسرے اغراض کو مکمل کرنا ہے ممثل کی شان یا عظمت کا مثال کے ساتھ مطابق یا مساوی یا اس کے شان کے شایاں ہونا ضروری اور لازمی نہیں۔ مگر بعض غلط فہم لوگوں نے یہ خیال کیا کہ مثال کو ممثل کی شان کے برابر ہونا ضروری ہے۔ ان لوگوں کی تردید کے لئے قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ان اللہ لا یستحی ان یضرب مثلاً ما بعوضۃ فما فوقہا الخ الا الفاسقین۔ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کفار کے معبودات باطلہ کو عاجز۔ غیر مقتدر۔ غیر مفید ثابت کرنے کے لئے مندرجہ ذیل دو آیتیں نازل فرمائیں تو کفار نے یہ اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ اس قسم کی کمزور چیزوں کا ذکر کرنا خدا کی شان کے لائق نہیں۔ ایسی چیزوں کا ذکر تو وہ کرے جو کمزور و کم حیثیت ہستی کا مالک ہو۔ خدا کی ہستی کے لائق تو یہ تھا کہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانوں یا کواکب یا آسمانوں یا ملائکہ جیسی عظیم ترین ہستیوں کا ذکر فرماتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں ان اللہ لا یستحی ان یضرب کو نازل فرمایا۔ جن دو آیتوں سے ان کو شبہ پیدا ہوا تھا وہ یہ ہیں۔ ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذباباً ولو اجتمعوا لہٗ وان یسلبہم الذباب شیئاً لا یستنقذوہ منہ ضعف الطالب والمطلوب وما قدروا اللہ حق قدرہ ان اللہ لقوی عزیز (پارہ ۱۷ سورہ حج)

(۲) مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتاً وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت (پارہ ۲۰ سورہ عنکبوت)

ان بیوقوفوں کو اس بات کی سمجھ نہ آئی کہ اللہ تعالیٰ جس شے کی مثال بیان فرمارہا ہے اس کے مطابق یہی مثال ہو سکتی ہے کیونکہ ان دو مثالوں کے بیان کرنے سے یہ مقصد ہے کہ ان کے معبودات باطلہ کسی مفید چیز کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور نہ کسی مضر چیز کو معدوم کر سکتے ہیں۔ جب مکھی جیسی کمزور چیز کو پیدا کرنے کی انہیں قدرت نہیں تو کسی بڑی چیز کے پیدا یا معدوم کرنے کی ان سے کیونکر توقع ہو سکتی ہے۔ اگر مکھی ان سے کوئی

چیز چھین کر لے جائے تو اس کمزور ہستی کے جانور سے وہ چیز واپس دلانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ خواہ وہ سب کے سب اکٹھے ہو کر اس کے پیدا کرنے یا اس سے چیز کو واپس لینے کے در پے وساعی ہو جائیں۔ شیطان نے ان کو کس قدر جاہل اور گمراہ بنایا کہ ایسی بے حیثیت بے بس چیزوں کو انھوں نے اپنا معبود قرار دے کر حوائج و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ان سے التجائیں شروع کر دیں۔ اور اپنے عجز و انکسار کو ان کے سامنے اس طور پر ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ خالق مطلق کے سامنے ہونا چاہیئے۔ مَاقدروا اللّٰہ حق قدرہٖ۔

دوسری مثال میں بھی ان کی جہالت اور حماقت کا اظہار کیا گیا ہے۔ انسان دنیا میں جب مکان اور گھر تیار کرتا ہے تو اس کے سامنے کئی مقصد ہوتے ہیں مثلاً موسمی تغیرات سے بچنے کے لئے مکان مفید ہوتا ہے۔ یا دشمنوں کے حملے سے محفوظ رہنے کے لئے ممد و معاون بنتا ہے۔ مگر عنکبوت کا گھر نہ تو ہوا کے جھونکوں سے بچاتا ہے اور نہ سردی گرمی کے حملوں کو روکتا ہے اور نہ ہی دشمنوں کی زد سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح ان کے معبوداتِ باطلہ کسی مصیبت سے بچانے یا کسی فائدہ کے پہنچانے میں کارگر ثابت نہیں ہوتے ان کے مناسب حال یہی مثال ہو سکتی تھی جس کو قرآن حکیم نے ذکر فرمایا۔ مگر ان کی عقلوں پر ایسے پتھر پڑے ہیں بجائے اس کے کہ وہ مثالوں سے ممثل لہ، کے حالات کا موازنہ کرتے اُلٹے مثال پر اعتراض کرنا شروع کر دیا۔

(۴) مثلهم كمثل الذى استوقد نارًا فلما اضاءت ما حوله ذهب الله بنورهم وتركهم فى ظلمات لا يبصرون صمٌّ بكمٌ عميٌ فهم لا يرجعون او كصيبٍ من السماء فيه ظلمات ورعدٌ وبرقٌ يجعلون اصابعهم فى اذانهم من الصواعق حذر الموت والله محيطٌ بالكفرين يكاد البرق يخطف ابصارهم كلما اضاء لهم مشوا فيه واذا اظلم عليهم قاموا ولو شاء الله لذهب بسمعهم وابصارهم ان الله على كل شئ قدير۔ (پارہ اول سورہ بقرہ)

جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اختیار کر لیا اور بصارت کے عوض عمی کو پسند کیا۔ ان منافقوں کے حال کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیات میں دو مثالیں ذکر فرمائیں۔ ایک ناری اور دوسری مائی۔ نار سے روشنی اور اشراق معلوم ہوتا ہے اور پانی سے زندگی اور حیات۔ جو وحی اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل فرمائی وہ بھی دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ اول حیات قلوب۔ دوم اضاءت نفوس۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو کہیں تو کلمۂ روح سے تعبیر فرمایا۔ اور کہیں اسے نور کہا گیا۔ اس سے فائدہ اٹھانے والوں کو احیاء کہا گیا۔ اور جنھوں نے اس کو قبول نہیں کیا انکو اموات سے تعبیر کیا گیا۔ وحی الٰہی کے نزول کے بعد جو حالت ان منافقین پر طاری ہوئی اس کی شکل یہ ہے۔ جیسے کسی شخص نے آگ جلائی تاکہ اس سے روشنی اور فائدہ اٹھائے منافقوں نے بھی اسلام میں داخل ہو کر اپنے قلوب کو زندہ اور روشن کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ اور کلمہ اسلام زبان پر لائے اور مسلمانوں سے میل جول کرنا شروع کیا۔ ظاہری کلمہ گو ہونے سے ان کے جان و مال محفوظ ہو گئے اور اہل اسلام میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ہر ایک بات میں مسلمانوں کے ساتھ مساوی حقوق کے مستحق ہو گئے۔ کلمۂ اسلام چونکہ صرف ان کی زبان پر تھا۔ نور اسلام اور چراغ ہدایت ان کے دلوں میں نہ تھا لہٰذا ان کی روشنی گل ہو گئی۔ اظہار اسلام کے بعد انھوں نے نفاق کا کام شروع کیا۔ یا ابتدا میں پکے مُسلم بنے آخر میں نفاق کو پسند کیا۔ جیسا کہ ذھب اللہ بنورھم سے معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نور کے چلا جانے کا ذکر فرمایا ہے۔ نار کے بجھ جانے کا تذکرہ نہیں فرمایا۔ جو اس بات کی طرف مشعر ہے کہ نار سے دو فائدے ہیں۔ اضاءت اور احراق۔ نور کے چلے جانے کے بعد اضاءت کا تو نام و نشان بھی باقی نہ رہا مگر نار کی دوسری صفت کا کام بدستور ان کے حق میں باقی رہا۔ جس سے تکلیف ان کو برابر پہنچتی رہی یعنی احراق اور دخان سے وہ دوچار ہوتے رہے۔ نور کے چلے جانے کے بعد وہ ایسے مرتد اور برگشتہ از اسلام ہوئے کہ دوبارہ زمرۂ اسلام میں آنے کی توقع ہی نہیں رہی۔ جیسا کہ صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ کے ارشاد سے ظاہر ہے۔ یہ ایک منافقوں کی خاص جماعت ہے جس پر مثال

نا ہی منطبق ہوتی ہے۔

اَوْكَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ الخ کو بھی عام مفسرین نے اسی قسم کے منافقین کی مثال بیان فرمائی ہے۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک گروہ کی مثالیں نہیں ہوسکتیں کیونکہ آیت صُمٌّ بُكْمٌ عُمْیٌ الخ سے ان پر عدم رجوع الی الاسلام کا قطعی حکم لگایا گیا ہے۔ دوسری مثال میں صاف طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یَكَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ الخ ابھی تک ان میں بصارت کا مادہ موجود ہے۔ اور اس بات کا امکان ہے کہ وہ شاید ہدایت پر چل کر کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھاتے رہیں جیسا کہ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ سے مفہوم ہوتا ہے۔ ان الفاظ میں غور کرنے کے بعد یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں منافقوں کی دو قسموں کی دو مثالیں بیان کی گئی ہیں ایک نفاق فی الاعتقاد۔ دوسرا نفاق فی العمل۔ پہلی مثال منافقین فی الاعتقاد کی ہے اور دوسری مثال منافقین فی العمل کی۔ منافقین فی العمل کا اعتقاد اسلام کے متعلق درست ہے وہ اسلام کو سچا مذہب جانتے ہیں مگر شامت اعمال اور تکاسل کے باعث میدان عمل میں کمزوری دکھاتے ہیں۔ جیسا کہ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ الخ سے ظاہر ہے۔ اسلام کے تہدید آمیز جملے اور اوامر و نواہی کو جب سنتے ہیں تو انھیں صاعقہ کے مشابہ نظر آتے ہیں۔ اور احکام و اوامر ان کی جان پر ایسے مشکل معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ صاعقہ کا برداشت کرنا۔ انسان کی طاقت سے بالاتر ہے۔ اسی خوف کے مارے اس کے سننے سے اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونستے ہیں تاکہ نہ وہ سنیں اور نہ تکلیف شرعی کے پابند ہوں۔ مگر جب انھیں کوئی خاص مطلب یا ضرورت در پیش آتی ہے تو اس وقت پورے منقاد و مطیع ہوجاتے ہیں یا جب غنیمت اور مال مل جانے کی توقع ہوتی ہے تو پکے مومن بن جاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی جنگ یا سفر میں فتح اور کامیابی نہ ہو تو اسلام کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ اور اگر پھر کسی مصیبت کو دور کرانے یا کسی حاجت کو پورا کرانے کے لئے ضرورت لاحق ہو تو پھر پورے پابند اور عامل بالشرع ہوجاتے ہیں۔ ابن الوقت کی طرح جب مطلب پورا ہوجاتا ہے

تو سب کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور اپنے مشاغل دنیاوی میں منہمک اور مستغرق نظر آتے ہیں۔ جب
پھر کسی موقع پر کوئی ضرورت درپیش آئی تو راہ خدا میں جانثار ہونے کے مدعی بن جاتے ہیں۔
کلما کا لفظ تکرار پر دلالت کرتا ہے۔ یکاد البرق سے عدم زوال بصر کا پتہ چلتا ہے لہذا
ان دو مثالوں کو ایک گروہ پر چسپاں کرنا عدم تدبر الفاظ قرآن پر دال ہے۔ ان منافقین کی
مثال کے مناسب مدعیان اسلام میں سے اور بھی کئی خاص فرقے پائے جاتے ہیں۔ جن
کے دلوں میں اگرچہ اسلام جاگزیں ہے۔ مگر بعض بعض مسائل اور معتقدات میں ان کا رہن وجہ
اختلاف ہے جیسے منکرین صفاتِ الٰہی خدا کی توحید اور ذات کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہیں
مگر جب ان کے سامنے آیات صفاتِ الٰہی یا احادیث صفات الٰہی جو ان کے معتقدات
باطلہ کے خلاف ہیں پڑھی جائیں، تو وہ منافقین کی طرح کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ اور
اس آیت کے مصداق بن جاتے ہیں۔ کانھم حمر مستنفرۃ فرت من قسورۃ۔ پارہ ۲۹
سورہ مدثر۔

ایسے ہی وہ لوگ جو کسی نوع کے شرک میں مبتلا اور گرفتار ہیں۔ اگر توحید خالص کی
آیتیں ان پر پڑھی جائیں تو وہ بھی اس آیت شریفہ کے مصداق بن جاتے ہیں جو اللہ تعالے
نے ان کے حق میں نازل فرمائی ہے۔

وَاذا ذکر اللہ وَحْدَہٗ اشْمَأَزَّتْ قلوب الذین لا یومنون بالاٰخرۃ
واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون۔ (سورہ زمر پارہ ۲۴)

ایسے ہی اعدائے صحابہؓ رفضہ یا اعدائے اہل بیتؓ خوارج کے روبرو جب صحابہ رضؓ
یا اہل بیت رضؓ کے فضائل کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں یا ان کی فضیلت میں احادیث نبویؐ
سنائی جاتی ہیں تو انھیں نہایت ہی گراں معلوم ہوتی ہیں اور ان کے دل اس کے سننے سے بہت
بیزار ہوتے ہیں۔ حفظنا اللہ تعالیٰ عما ابتلا بہ کثیراً من الناس۔

مثال مذکور میں منافقین کی غیر محسوس تکلیف کو بصورت محسوس دکھانا مقصود ہے

منافق دل ہی دل میں نہایت پریشانیوں اور مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ اگر ان تکالیف و مصائب کو محسوس صورت میں دکھایا جائے تو بعینہٖ مستوقد نار یا اصحاب صیّب کی سی مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ ہر ایک مثال چونکہ تشبیہ مرکب کی قسم سے ہے اجزائے مثل اور ممثل لہٗ کا باہم منطبق ہونا ضروری نہیں صرف ایک حالت کو دوسری حالت سے تشبیہ دینا مطلوب ہو۔ جیسے قرآن حکیم نے منافقین کی دو قسمیں ذکر فرمائیں ویسے ہی مومنین اور کفار کی بھی دو قسمیں ہیں:۔
مومنین اول السابقون المقربون جن کا ذکر سورہ واقعہ میں آیا ہے۔

(۲) انزل من السماء ماءً فسالت اودیۃٌ بقدرھا فاحتمل السیل زبداً رابیاً ومما یوقدون علیہ فی النار ابتغاء حلیۃٍ او متاعٍ زبدٌ مثلہ کذالک یضرب اللہ الحق والباطل فاما الزبد فیذھب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کذالک یضرب اللہ الامثال (سورہ رعد پارہ ۱۳)

یہاں بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں ایک ناری اور دوسری مائی۔ جو وحی کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتاری تاکہ مومنین کے قلوب اور قوائے نظریہ وغیرہ میں زندگی پیدا کرے اس کو اس پانی سے تشبیہ دی گئی جو آسمان سے زمین کی زندگی اور اس کے نشوونما کے واسطے اتارا جاتا ہے۔

قلوب کو وادیوں سے تشبیہ دی گئی۔ بعض قلوب وسیع ہوتے ہیں جو بہت سے علوم کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ وادیٔ کبیر میں زیادہ پانی کی گنجائش ہوتی ہے اور بعض قلوب صغیر جو اپنی بساط کے مطابق تھوڑے سے علم کی استعداد رکھتے ہیں۔ جیسا کہ وادی صغیر میں تھوڑا سا پانی سما سکتا ہے۔ جیسا کہ وادیاں اپنی گنجائش کے مطابق پانی کو اپنے اندر جگہ دیتی ہیں۔ اسی طور پر قلوب بھی علم اور ہدایت کو اپنی استعداد کے مطابق قبول کر لیا کرتے ہیں۔ جس زمین پر سیلاب گزرتا ہے اس کے خس و خاشاک اور تنکوں کو اپنے کندھے پر اٹھا لیتا ہے۔ اسی طرح علم اور ہدایت بھی جب قلوب میں جاگزیں ہوتے ہیں تو تمام شبہات۔ شہوات باطلہ قلبیہ کو باہر نکال لاتے ہیں۔

جیسے کسی مریض کو جب دوائے مسہل پلائی جائے تو وہ اسکے پیٹ سے مواد ردیہ و اخلاط فاسدہ کو ابھار کر باہر نکالنے میں امداد دیتی ہے
اس وقت اگرچہ مریض کی طبیعت میں پریشانی اور غثیان و تکدر کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں مگر در اصل یہ پریشانی اسکی صحت کا
پیش خیمہ ہے یہ دوا اسکے بدن کو مواد موذیہ و اخلاط غیر طبعیہ سے پاک و صاف کر دیگی۔ ایسے ہی وحی الہٰی کا پانی جب قلوب
انسانی میں منجذب و مجتمع ہوتا ہے تو تمام عقائد باطلہ و شبہات شیطانیہ کے استیصال میں ممد و معاون بنتا ہے۔ باطل اور
ردی مواد کے اخراج کے بعد قلوب آئینہ وار ہو کر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ انوار وحی کا عکس قبول کر لیں۔

مثل ناری میں بھی اسی طرح حق و باطل کے امتیاز کا تذکرہ فرمایا گیا۔ سنار جب سونے چاندی وغیرہ کے فلزات
معدنیہ کو کٹھالی میں ڈال کر آگ پر رکھتا ہے تو جو غل و غش اس میں ملے ہوئے ہیں انکو اعماق فلزات سے نکالکر
ظاہری سطح پر نمودار کر دیتا ہے اس موقع پر کھرے اور کھوٹے مفید و غیر مفید کو علیحدہ کرنا نہایت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ خالص
سونا یا چاندی کٹھالی کی تہ میں منجمد و بستہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس طرح پہلی مثال میں پانی کی سطح بالا سے خس و خاشاک کا
دور کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ وحی الہٰی و علوم خداوندی کا نزول جس وقت قلوب و نفوس پر ہوتا ہے تو شبہات و خواہشات
نفسانی کی صورت بالکل الگ تھلگ نظر آنے لگتی ہے۔ ان حالات میں ہر ذی بصر سونے کو سونا، پانی کو پانی حق
کو حق باطل کو باطل جاننے میں متردد و متحیر نہیں رہتا پانی سے ہر قسم کے منافع و فوائد حاصل کئے جاتے ہیں اور
خس و خاشاک بیکار و ردی سمجھے جاتے ہیں ایسے ہی زبد بیکار اور ردی شمار کی جاتی ہیں۔ علوم حقیقۃ و معارف حقہ کے
منافع علی الدوام ثمرات حسنہ و نتائج مفیدہ کیلئے منتج ہوتے رہتے ہیں اور شکوک و شبہات بے حقیقت ہو کر غیر ملتفت الیہ اور
بے اعتنا خیال کئے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں قلوب بنی آدم کی تقسیم تین قسموں پر فرمائی ہے جیسے
نزول مآءٍ من السماءِ کے وقت زمین کی تین قسمیں ذکر فرمائیں۔

(۱) زمین طیب شیریں جو پانی کو اپنے اندر جذب کر کے قوائے نامیہ و مولدہ کو مستعد و آمادہ کر دیتی ہے۔
مناسب موسم و ملائم وقت پر مختلف قسم کی کھیتیاں اور پھول پھل پیدا کرتی ہے جس سے ہزارہا نفوس انسانی
و حیوانی متمتع و مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کھیتیاں اور پھول پھل خود زمین کے لئے بھی موجب حسن و خوبصورتی
سمجھے جاتے ہیں اور جن لوگوں کی زندگی کا دارومدار ہی ان پر ہے انکے فوائد و عوائد کا تو ذکر ہی کیا۔

(۲) دوسری قسم کی وہ زمین ہے جو بصورت حوض پانی کو تو جمع کر لیتی ہے لیکن خاص میں کوئی سبزہ اُگتا ہے۔ اور نہ کوئی کھیتی باڑی پھول و پھل نشو و نما پاتے ہیں۔ لیکن ہزاروں جانوروں کی پیاس بجھانے اور سیر کرنے میں وہ ممد و کار آمد ثابت ہوتی ہے۔

(۳) تیسری قسم کی وہ زمین ہے جو چٹیل میدان کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ نہ تو وہ خود پانی کو جذب کرتی ہے۔ اور نہ اس کی وضع ایسی بنائی گئی جو پانی کو جمع کر سکے۔ جو بوند آسمان سے اس پر گرتی ہے اسے پھسلا کر دوسری زمین کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔

پہلی زمین کی مثال ان لوگوں کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔ جنھوں نے علوم الٰہی کو اپنے دلوں میں جگہ دی اور ان سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے میں اعانت کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے علوم الٰہی کو حاصل کرنے کے بعد ان پر عمل پیرا ہو کر دوسروں کو اپنی تبلیغ و پند و نصیحت سے فائدہ پہنچایا۔

دوسری زمین کی مثال ان لوگوں کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے جو بہت سے علوم حقہ پڑھ کر یاد کر لیتے ہیں۔ اور ان کی حفاظت میں بھی اپنی تمام سعی و کوشش کو صرف کر دیتے ہیں مگر خود میدان عمل میں ناکام اور غیر فائز المرام نظر آتے ہیں۔ مگر اور لوگ ان سے علوم سیکھ کر شاہراہِ ہدایت پر چل کر قرب الٰہی و رضائے خداوندی حاصل کر لیا کرتے ہیں۔ مگر وہ باوجود اس قدر علوم الٰہی اور ذخائر خداوندی کے مالک ہونے کے کمثل الحمار یحمل اسفارا کا نمونہ بن جاتے ہیں۔

(۳) تیسری قسم کی زمین ان لوگوں سے مشابہت رکھتی ہے جنھوں نے نہ تو علوم الٰہیہ کو اخذ کر کے خود فائدہ اٹھایا۔ اور نہ ان علوم و ہدایات کو جمع کر کے دوسروں تک پہنچانے میں امداد کی۔ یہ مثال مومنین کے لئے بیان کی گئی ہے۔ پہلی مثال میں بھی نار اور ماء کا ذکر کیا گیا مگر وہاں چونکہ منافقین پر اس کا چسپاں کرنا مطلوب تھا۔ تو اس کے ساتھ اس قسم کے امور کا تذکرہ کیا گیا جو منافقین کے حالات سے مناسب تھے۔ سورہ رعد میں یہ مثال ہدایت اور ضلالت کے لئے لائی گئی تھی۔ اس میں ایسے مناسبات جمع کئے گئے جو اس کے ساتھ پوری پوری مناسبت رکھتے تھے۔

پابندیاں

اطالیہ کے خلاف عاید کردہ پابندیاں ناکام رہیں، اس سے ایک تو مجلسِ اقوام کی ہیئتِ لذائی کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ دوم اس سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا معاشی سہولتوں اور تجارتی مال کی خرید و فروخت بند کر دینے سے جنگ رُک سکتی ہے، نیز معاشی دباؤ کن حالات میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

طاقت اور غلبہ دنیا میں ہمیشہ تین قسم کا ہوا کیا ہے، روحانی، عسکری، اور معاشی۔ مذہبی اثرات جوں جوں کم ہوتے گئے روحانی تفوق کی جگہ پروپیگنڈا اور دہشت زدگی نے نے لی اور ان دونوں کا جنگ کی دھمکی اور بھوک سے گہرا تعلق ہے۔ اقتصادی قوت اگرچہ پہلے بھی مفقود نہ تھی لیکن اس کی اہمیت برابر بڑھتی چلی گئی۔ معاشی دباؤ کا حربہ بغیر فوجی قوت کے نہیں لایا جا سکا ہے۔

صنعتی ترقیات کے ساتھ معاشی دباؤ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ چنانچہ اس کے استعمال پر بعض حلقوں میں اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی اور ان کے نزدیک جنگ صنعتی نظام کی دشمن قرار پائی، ان کا خیال تھا کہ لڑائی صرف پیشہ ور سپاہیوں تک محدود رکھی جائے اور اسے تجارتی اور کاروباری معاملات میں دخل انداز نہ ہونا چاہئے۔ بحری راستے جنگ کی حالت میں بھی اسی طرح کھلے رہنے چاہئیں جیسے کہ امن کی حالت میں۔ غرض صنعتی طبقہ کے لوگ کہتے تھے کہ ملکی حکومت نامعقول ہے جو ہماری تجارت پر پابندی عاید کرتی ہے اور اپنے مفاد کی خاطر ہم غریبوں کو سزا دیتی ہے۔

گذشتہ جنگِ عظیم میں مرکزی یورپ کی حکومتوں کے خلاف معاشی دیواریں حائل کی گئیں لیکن ان کی کامیابی کی صرف یہ وجہ تھی کہ اتحادیوں نے بحر و بر دونوں میں اپنی پوری فوجی قوت استعمال کی آجکل معاشی دباؤ کو فوجی قوت سے بالکل الگ کر کے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا خیال پھیل رہا ہے۔ ایسا معاشی دباؤ جنگ کا بدل ہو سکتا ہے اور نہ اسے روکنے والا لیکن آئے دن

ہڑتالیں اور بائیکاٹ ہوتے رہتے ہیں اور ان سے سماج پر جو مصائب نازل ہیں وہ ان معاشی حربوں کی ہمہ گیر قوت کی زندہ شہادت ہیں۔ لڑائی کرنے والے ملک کے خلاف اگر ان معاشی حربوں کا استعمال کیا جائے تو وہ اپنی مفسدانہ حرکات سے باز آجائے گا۔ یا اپنی فتح کے ثمرات سے محروم ہو جائیگا۔

مجلس اقوام کے آئین کی دفعہ ۱۶ کا مفاد یہ ہے کہ جملہ ارکان مجلس جنگ شروع کرنے والے ممالک کے ساتھ ہر قسم کے تجارتی تعلقات فی الفور منقطع کر دیں۔ نیز اس کی رُو سے عہد شکن حکومت اور دیگر حکومتوں کے مابین معاشی آسانیاں جاری رکھنے کی قطعی ممانعت ہے۔ خواہ ایسی حکومتیں لیگ کی رُکن ہوں یا نہ ہوں۔ اٹلی کے خلاف اس دفعہ کا اطلاق موافق حالات میں ہوا۔ معاشی حیثیت سے اٹلی ریاست ہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ، جرمن، فرانس کی برابری نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس کے قدرتی ذرائع محدود ہیں اور آبادی ملکی رقبہ کے لحاظ سے زیادہ ہے، اس کا سرمایہ اور قومی آمدنی کم ہیں۔ یہاں تک کہ موخرالذکر ۲۹ء تک برطانیہ کے مقابلے میں صرف ایک چوتھائی تھی اشیائے خوردنی اور اجناس خام کے لئے اٹلی کا دار و مدار بہت حد تک دوسرے ممالک پر ہے۔ بیشتر چیزیں جو جنگ میں کام آتی ہیں مثلاً کوئلہ، تانبا، لوہا، روئی، سیسہ، اون، تیل باہر سے آتی ہیں۔ وہاں نکل (Chrome) پلاٹینم (Tungsten) ٹین اور ربڑ نہیں پیدا ہوتے۔ اس کا تجارتی توازن ہمیشہ ناموافق رہا ہے، یہاں تک کہ اٹلی کے ملکی بجٹ میں ۳۲-۱۹۳۱ء میں ڈیڑھ کروڑ ڈالر کی کمی تھی جو ۳۳ء میں ڈھائی کروڑ تک پہنچ گئی۔

اسی طرح اٹلی کی جغرافیائی حیثیت بھی کمزور ہے، بحیرہ روم کے اندرونی اور بیرونی راستوں پر برطانیہ قابض ہے، خشکی کی راہ سے مال تجارت مجلس اقوام کے علاقہ سے ہوکر جاتا ہے۔ اٹلی کے قریبی ہمسائے سوئزرلینڈ اور آسٹریا اسے چھیڑنا نہیں چاہتے۔ تاہم سمندر پار کا سامان جو اسے بھیج سکتے تھے اس کا فرانس یا جرمنی کی حدود سے گذرنا ضروری تھا۔ جرمنی کی بین الاقوامی اقتصادی حیثیت اسقدر نازک تھی کہ وہ اٹلی کے مفاد کے لئے اپنے کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہ تھا۔

علاوہ بریں جاپان، برازیل اور امریکہ لیگ کے رُکن نہ تھے۔ جاپان کا معاشی رویہ کوئی

اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے کہ جن چیزوں کی اسے خود ضرورت تھی وہ اٹلی کو کیونکر مہیا کر سکتا تھا۔
امریکہ اٹلی کی اکثر ضروریات پوری کر سکتا تھا بشرطیکہ وہ غیر جانب دار رہکر اختیارات کو استعمال کرنے
پر اصرار کرتا۔ برطانیہ لیگ کا روح رواں ہونے کے باوجود امریکی مال تجارت کو جبرالٹر میں روک نہیں
سکتا تھا لیکن اس صورتِ حال کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ خود امریکہ میں رائے عامہ
اٹلی کے خلاف ہو گئی تھی۔ غیر جانب داری کی صورت بدل دی گئی۔ اسلحہ کی برآمد بند کر دی گئی زیادہ
سے زیادہ اٹلی وہی مقدار منگا سکتا تھا جو جنگ سے پہلے تھی۔

سب سے بڑی بات اٹلی کی تائید میں یہ تھی کہ جنگ مختصر اور چھوٹے پیمانے پر تھی۔ حبشہ کے
پاس میکانکی آلاتِ حرب نہ تھے اس لئے اٹلی کی جنگی ضروریات بھی کم تھیں۔ چند مہینوں کے
اندر اس نے کافی سامانِ حرب جمع کر لیا تھا اور لڑائی میں اگر کمی ہو جاتی تو وہ قلیل آلاتِ جنگ کی
درآمد سے اس کی تلافی کر سکتا تھا۔ ایک اول درجے کی طاقت اور حکومت کے مقابلہ میں اٹلی
کو جس قدر سامانِ حرب درآمد کرنے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی وہ حبشہ کے مقابلہ میں محسوس نہیں
ہوئی۔

مزید برآں اکثر منڈیوں میں کساد بازاری تھی، کارخانہ دار اپنا مال فروخت کرنا چاہتے
تھے باوجودیکہ قیمت ملنا یقینی نہ تھا، ان ملکوں کی حکومتیں دنیا کی گھٹتی ہوئی تجارت دیکھ کر نئے
معاہدات کرنے کے لئے تیار نہ تھیں، اٹلی کی درآمد ۱۹۲۹ء میں ۲۱ء۶ کرور لائیرا سے گھٹ کر
۱۹۳۴ء میں ۷ء۴ کرور لائیرا تک پہنچ گئی۔ اس مالی درآمد کا ۶ء۱۴ فی صدی جرمنی سے آتا تھا
۱۵ فی صدی امریکہ سے، ۹ء۸ فی صدی انگلستان سے اور ۵½ فی صدی فرانس سے۔ اس
تخفیف کی وجہ اٹلی کا شدید (Quota System) تھا نیز یہ کہ وہ اپنی تجارتی قرضہ جات
ادا نہیں کر سکتا تھا۔

معاشی دباؤ کا یہ مقصد کہ مجلس اقوام کے بائیکاٹ کے خدشے سے جنگ رُک جائے گی
حاصل نہ ہو سکا، اٹلی کو اس انقطاعِ تعلق کا ڈر نہ تھا اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس کا رویہ

حق بجانب تھا، اس نے دیکھ لیا تھا کہ جمعیتِ اقوام مانچوریا کے معاملہ میں منصفانہ حیثیت ظاہر کر چکی ہے، یا ممکن ہے اٹلی نے یہ فرض کر لیا ہو کہ نو آبادی حاصل کرنے کے لئے حبشہ جیسے غیر مہذب ملک پر چڑھائی کرنا امنِ عامہ پر حملہ کرنے کا مرادف نہ ہوگا۔ برطانیہ عظمیٰ نے آسٹریلیا کے معاملہ میں سکوت ظاہر کیا اور بعد ازاں حملہ کی صورت میں اپنا آئندہ رویہ بھی نہ بتایا۔ ممکن ہے اٹلی نے اس حالت کو خاموش اغماض سمجھا ہو، زوردار، واضح، غیر مبہم الفاظ میں ۱۱ ستمبر ۱۹۳۵ء تک اعلان نہیں ہوا، جب کہ برطانوی سیاست اخلاقی بلندی کے عروج پر پہنچی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اس پر طرہ یہ کہ مفاہمت کے دوران میں دونوں ملکوں کے لئے اسلحہ کی درآمد روک دی گئی اور یہ فعل حملہ آور کے حملہ کی خاموش تائید تھا، اٹلی جنگ کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا اور مئی ۱۹۳۵ء تک مشرقی افریقہ کی اس مہم پر ۲ کروڑ بیس لاکھ لائیر خرچ ہو چکے تھے۔ اگر اجناسِ خام پر تحدید نہ ہوتی تو اٹلی اپنے اسلحہ خود تیار کر سکتا تھا اور حبشہ کے پاس اسلحہ خریدنے کے لئے نہ تو نقد روپیہ تھا نہ ساکھ کہ جس سے اسلحہ مستعار لے لیتا اور نہ وہ خود اپنے ملک میں ہتھیار بنا سکتا تھا۔ مسٹر ریکٹ نے حبشہ میں جو تیل کی مراعات حاصل کی تھیں اور جن کے معاوضہ میں شاہ حبشہ کو نقد روپیہ جس کی اُسے سخت ضرورت تھی مل سکتا تھا ان پر دباؤ ڈال کر واپس کر دی گئیں۔ یہ بھی اٹلی کی کھلی ہوئی تائید تھی، سب سے آخر یہ کہ حکومت اٹلی کو خوب معلوم تھا کہ حکومتِ فرانس آسٹریا کے مقابلہ میں حبشہ پر اٹلی کا اقتدار گوارا کر لے گی۔

معاشی پابندیاں جنگ کا انسداد کرنے میں ناکام نہیں ہوئیں، کیونکہ وہ اس مقصد کے لئے عاید ہی نہیں کی گئیں کسی سلطنت نے اٹلی کو لیگ کی رکنیت سے خارج کر دینے کی دھمکی نہیں دی باوجودیکہ وہ علانیہ لیگ کی دفعہ نمبر ۱۶ کی خلاف ورزی کر چکا تھا۔ اس پر اٹلی نے یہ قیاس کیا (اور وہ درست بھی تھا) کہ متعلقہ حکومتیں لیگ کے آئین کے احترام کے لئے کونسل کو بھی یہ مشورہ نہ دیں گی کہ اٹلی کے خلاف متفقہ طور پر کوئی بحری، بری اور فضائی کارروائی کی جائے کہ وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے اور لیگ کا وقار قایم رہے۔

۹ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اٹلی کے جارحانہ اقدام کا اعلان کیا گیا اور معاشی پابندیاں عاید کرنے کا فیصلہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ہوا لیکن ان کا نفاذ ۱۸ر نومبر سے پہلے نہیں ہوا۔ پابندیاں فوراً عاید نہیں ہوئیں اور وہ ہر قسم کی تجارت اور کاروباری تعلقات پر حاوی تھیں جو دوسری حکومتوں اور آئین شکن حکومت کے مابین قایم تھے۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو مجلس اقوام کی آرڈی نینس کمیٹی نے اٹلی کے ساتھ جملہ مالی اور کاروباری تعلقات کی ممانعت کر دی۔ اٹلی کی حکومت کے لئے چندہ جمع کرنا۔ بنکوں کا اس سے لین دین کرنا، تجارتی ہنڈیوں کا تبادلہ اور دیگر ہر قسم کے قرضہ جات بند کر دئے گئے۔ یہ مالی قطع تعلق بہت سخت تھا اور اس سے تجارتی حلقوں نے دقت بھی محسوس کی لیکن عملی اعتبار سے اس کی اہمیت صفر کے برابر تھی، کیونکہ اٹلی کی مالیات پہلے ہی روبہ تنزل تھی (اور شاید حبشہ کو ہڑپ کر جانے کی یہ ہی ایک وجہ ہو) اس کا بیرونی قرضہ اتنا کم تھا کہ اسے کوئی دقت نہ ہوتی کسی سلطنت کے عوام یا تاجر پیشہ لوگ اٹلی کو قرضہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ تبادلہ زر پر پورا قبضہ ہونے کے باعث غیر ملکی تاجروں کو سخت مشکلات کا سامنا ہوا۔ کیونکہ ان کو برآمد کردہ مال کا روپیہ نہیں ملتا تھا۔ اگست ۱۹۳۵ء تک برطانوی تاجروں کی دو لاکھ پونڈ کی رقم تقایا تھی، تجارتی بائیکاٹ کے اس سے زیادہ کچھ معنی نہیں تھے کہ اخلاقی فرض کے طور پر مجلس اقوام نے اٹلی کے ساتھ دانشمندانہ کاروباری رویہ اختیار کیا۔

۱۹ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو یہ تجویز پاس ہوئی کہ اٹلی کی پیداوار اور مصنوعات کی درآمد بند کر دی جائے۔ پچاس حکومتوں نے اس پر صاد کیا۔ ان کی مجموعی تجارت اٹلی کے بیشتر مال برآمد پر مشتمل تھی۔ دسمبر ۱۹۳۴ء سے فروری ۱۹۳۵ء تک ہر ماہ کی اوسط برآمد دو کروڑ ڈالر تھی جو ۳۶-۱۹۳۵ء کے انہی مہینوں میں ایک کروڑ بیس لاکھ ہو گئی۔ دسمبر کے بعد ایک کروڑ نوّے لاکھ سے گھٹتے گھٹتے پچاس لاکھ رہ گئی۔ بالفاظ دیگر اٹلی کی قوت خرید بقدر ⅗ کم ہو گئی۔ ایسی درآمد کی دیوار حائل ہو جانے سے ملکی تجارتی تباہی کا اندیشہ ہو چلا تھا۔ امریکہ کی درآمد جنوری ۱۹۳۵ء دو لاکھ ڈالر تھی جو مارچ ۱۹۳۶ء میں ۹۰۰۰ ڈالر رہ گئی۔ فرانس کی درآمد بھی دو لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی لیکن امریکہ نے

مارچ ۱۹۳۶ء میں اٹلی سے اتنا ہی مال خرید ا جتنا کہ جنوری ۱۹۳۵ء میں خرید کیا تھا یعنی ایک لاکھ ساٹھ ہزار ڈالر، جرمنی نے بھی خرید میں کمی کر دی لیکن مارچ ۱۹۳۶ء میں یہ تعداد بڑھ گئی۔ سوئٹزرلینڈ نے اپنی خرید نصف کر دی۔ آسٹریا اور ہنگری دونوں نے اپنی خرید کا تناسب بحال رکھا یا کبھی کچھ زیادہ کر دیا۔ اکسچینج (Exchange) پر قبضہ ہونے کی وجہ سے اٹلی کا روپیہ جرمنی، آسٹریا اور ہنگری کے ذمہ تھا وہ نہیں مل سکتا تھا کہ وہ اس روپے سے دوسرے ممالک سے اپنی ضروریات خرید سکے۔

اٹلی کوئی ایسی چیزیں تیار نہیں کرتا جو دوسرے ذرائع سے دستیاب نہ ہوسکتیں، اٹلی کو الگ کر دیا جائے تو کسی چیز کی کمیابی کا اندیشہ نہیں ہو سکتا لیکن وقت اٹلی کے ان قرض خواہوں کو ہوئی جن کے مطالبات اطالوی مال کی شکل میں ادا کئے جاتے تھے۔

اٹلی کی برآمد پر کامل پابندی بھی عاید کر دی جاتی تو اس کی قوت خرید بالکل تباہ نہ ہو سکتی تھی کیونکہ سونا چاندی اور سکہ جات اس پابندی سے مستثنے قرار دئے گئے تھے۔ گو ان کے ملک سے باہر چلے جانے کی وجہ سے اٹلی کے ذخائر پر ضرب کاری لگی تاہم وہ اس طریقہ سے اپنی ضروریات خریدتا رہا۔ بنک آف اٹلی کا زر مخصوص جو جنوری ۱۹۳۴ء میں ۳۷ کروڑ ڈالر تھا اگست ۱۹۳۴ء میں ۲۷ کروڑ رہ گیا۔ نومبر ۱۹۳۵ء سے مارچ ۱۹۳۶ء تک اٹلی کو آٹھ کروڑ ستر لاکھ ڈالر کا نقصان ہوا لیکن یہ رقم اس قوت خرید کی کمی کو پورا کرنے کے لئے بہت کافی تھی جو برآمد کی تخفیف کے باعث واقع ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ اٹلی نے اپنے باشندوں کی غیر ملکی کفالتیں حاصل کر لیں اور ان کو تبادلہ میں اطالوی تمسکات ۵ فیصدی سود کے اضافہ کے ساتھ دیدئے۔ اس ترکیب سے اٹلی کی حکومت نے اپنی رعایا سے بیس کروڑ ڈالر کے تمسکات حاصل کئے اور اُن کو ممالک غیر میں فروخت کر دیا اس فروخت سے جو روپیہ ملا اس کو اپنی ضروریات کی خرید میں صرف کیا گیا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹلی کی قوتِ خرید پر کوئی قابل اعتبار اثر نہ پڑا۔ اٹلی کی درآمد فوراً بند نہیں کی گئی اور نہ ہی یہ پابندی بجز اسلحہ، تیل، اور آتش گیر مادہ کے لئے مکمل تھی۔ بعد ازاں ممنوع اشیا کی فہرست میں باربرداری کے جانور، ربڑ

(Bauxite) المونیم اور لوہا وغیرہ بھی شامل کر دئے گئے اسی ذریعہ سے اٹلی کی درآمد بہت حد تک کم ہوگئی۔

اس قسم کی معدنی پابندیاں طویل عرصے کی لڑائی میں یقیناً کارگر ہوسکتی ہیں، بشرطیکہ وہ مکمل ہوں اور نیم تیارشدہ چیزوں پر حاوی ہوں۔ اٹلی کی لوہے کی پیداوار سات لاکھ ٹن ہے اور یہ مقدار اس کے لئے کافی نہیں، چنانچہ دو لاکھ ٹن لوہا اسے باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔ لوہے پر پابندی ایک طویل المدت جنگ میں اس کے لئے تکلیف دہ ہوسکتی تھی کیونکہ جو دھاتیں آلات جنگ کی تیاری میں کام آسکتی ہیں ان کے لئے اٹلی کا انحصار دوسرے ممالک پر ہے لیکن چونکہ جنگ بڑے پیمانے پر نہ تھی جس میں جمع کردہ سامانِ حرب جلد ختم ہوجاتا ہے، اٹلی اس کمی کو نیم تیارشدہ چیزوں کی درآمد سے پورا کرسکتا تھا (Pig Iron) اور آہنی سلاخوں کی درآمد کی اسے اجازت تھی۔ جملہ معدنیات کی ماہانہ میزان جو دسمبر ۱۹۳۴ء میں ۷۰۸۰۰۰ ٹن تھی۔ جنوری ۱۹۳۶ء میں ۱۸۰۰۰ اور مارچ ۱۹۳۶ء میں ۱۵۰۰۰ ٹن رہ گئی اور مارچ ۱۹۳۶ء میں پھر ۲۲۰۰۰ ٹن ہوگئی۔ ممنوع فولاد کا سامان جرمنی آسٹریا اور امریکہ سے آتا رہا اور غیر ممنوع چیزیں روس اور فرانس سے آئیں۔ یہاں تک کہ مارچ ۱۹۳۶ء تک اٹلی کی درآمد بہتر حالت میں ہوگئی اور جو سلطنتیں ان پابندیوں میں شریک نہ تھیں ان کو بھی فائدہ ہوا۔ کوئلہ، تیل اور تانبے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اٹلی نے اپنی کوئلہ کی درآمد بہت حد تک کم کردی۔ دسمبر ۱۹۳۴ء اور جنوری ۱۹۳۵ء میں ۱۱ لاکھ ٹن کی درآمد تھی جو مارچ ۱۹۳۶ء میں ۶ لاکھ سترہ ہزار ٹن تک گھٹ گئی۔ سب سے زیادہ نقصان برطانیہ کو اٹھانا پڑا جس کی برآمد ۴ لاکھ ۲۰ ہزار ٹن سے صفر کے برابر ہوگئی۔ جرمنی، بلجیم اور امریکہ نے فائدہ حاصل کیا، پابندیاں عائد کرنے والی سلطنتوں کو اگرچہ تیل بیچنے کی اجازت تھی تاہم اس کی برآمد میں بہت کمی واقع ہوگئی (کروڈ آئیل) دسمبر ۱۹۳۴ء میں ۸ ہزار ۹ سو ۴۸ ٹن سے فروری ۱۹۳۶ء میں تین ہزار تیس ٹن اور مارچ میں ۶ ہزار ۷ سو ۳ ٹن ہوگیا (Moter Sprit .) کی برآمد مارچ ۱۹۳۵ء میں ۲۳ ہزار ۶ سو ۸۰ ٹن تھی جو فروری ۱۹۳۶ء میں ۳ ہزار ۷ سو ۴۷ ٹن رہ گئی اور مارچ ۱۹۳۶ء

میں ۹ ہزار دو سو ۲۳ ٹن ہوگئی گیس آئیل اور ایندھن کی برآمد دسمبر سنہ ۳۴ء میں ۹۹ ہزار چھ سو ۱۰ ٹن سے جنوری سنہ ۳۶ء میں ایک لاکھ ۲۱ ہزار ایک سو چوبیس ٹن ہوگئی اور مارچ سنہ ۳۶ء میں ۱۴۱ ہزار ۵ سو تراسی ٹن تک پہنچ گئی (Lubricating oil) (دُہنیات) کی برآمد دسمبر سنہ ۳۴ء میں ۲۶۸۶۷ ٹن سے گھٹ کر مارچ سنہ ۳۶ء میں صرف ۹۹۹ ٹن رہ گئی۔

پابندیوں کے اثرانداز ہونے سے پہلے ہی اٹلی اپنی ضرورت کے لئے سامان حرب کا بڑا ذخیرہ کرچکا تھا، اس نے اپنی تیل کی ضروریات امریکہ سے خرید نا شروع کردی تھیں جو سنہ ۳۱ء سے سنہ ۳۴ء تک ۶½ فیصدی تیل مہیا کرتا تھا سنہ ۳۵ء میں سال بھر اٹلی امریکہ سے ۱۲½ فی صدی تیل خریدتا رہا اور اسی سال جنگ کے تین مہینوں یعنی اکتوبر، نومبر، دسمبر میں یہ تعداد ۱۷½ فیصدی تک بڑھ گئی۔ جرمنی اٹلی کو کوئلہ بھیجتا رہا اور اس کو برطانیہ عظمیٰ سے بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ امریکہ نے تیل بھیجکر اٹلی کو اس قابل کردیا کہ وہ رومانیہ اور روس سے بدلہ لے سکے، رومانیہ نے اٹلی کو ۲۵ ہزار ٹن گیس اور جلانے کا تیل جنوری سنہ ۳۶ء میں بھیجا اور گیارہ ہزار ۶ سو ٹن مارچ میں لیکن امریکہ کے پٹرول کی برآمد مارچ سنہ ۳۶ء میں دسمبر سنہ ۳۵ء کے مقابلہ میں ایک تہائی رہ گئی، روس کی برآمد ۲۰۰۰۰ ٹن سے گھٹ کر ۵۲۰۰ ٹن ہوگئی۔ پابندیاں عاید کرنے والے ملکوں کی تانبے کی برآمد زیادہ ہوگئی جن میں سے امریکہ سب سے زیادہ تانبہ مہیا کرتا تھا۔ چونکہ ان منڈیوں کا دروازہ اٹلی کے لئے کھلا ہوا تھا اس لئے کوئلہ، تانبا اور تیل پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔

حکومت امریکہ نے اٹلی کو تیل بھیجنا بند نہیں کیا۔ قانونی غیر جانب داری کے ماتحت "آلاتِ جنگ" کی برآمد روک دی گئی تھی لیکن یہ بھی یقینی طور پر واضح نہ تھا کہ بموں کے لئے ایندھن یا بارود آلاتِ جنگ کی تعریف میں شامل ہے۔

مجلس اقوام کی سلطنتوں کے لئے شاید یہ ممکن تھا کہ وہ پابندیوں کی مدافعانہ حکمتِ عملی سے تجاوز کرکے پیش قدمی شروع کردیں تاکہ بائیکاٹ میں حصہ لینے والی حکومتیں ان حکومتوں کا اٹلی میں مال بھیجنا بند کردیں جو بائیکاٹ میں شریک نہ تھیں اور یہ اس طریقہ سے ہوسکتا تھا کہ نہر سویز

اور جبل الطارق پر مال روک لیا جاتا، امریکہ کی رائے عامہ شاید اس کی تاب نہ لاسکتی کیوں کہ غیر جانب داری کا نیا مفہوم جس کا منشا امریکہ کو جنگ سے علیحدہ رکھنا تھا اور جو غیر جانب دار ول کے اختیارات کے استعمال پر نہیں بلکہ فرائض پر زور دیتا تھا، ابھی تک عام طور پر نہیں سمجھا گیا تھا۔ لیکن معاشی پابندیوں کے اطلاق نے حالتِ جنگ فرض کرلی جو حملہ آور طاقت نے لیگ کے تمام ارکان کے خلاف پیدا کردی تھی بین الملی امن کی خاطر مدافعانہ معاشی جنگ لڑنا بین الاقوامی آئین اور امریکن رائے عامہ کے رو سے درست تھا امریکہ کو اس بات پر آمادہ کرنا ممکن تھا کہ وہ مال کی برآمد بند کردے جو بصورتِ دیگر اسے جنگ کی لپیٹ میں لاسکتی تھی۔ امریکہ کی حکومت کا رویہ کسی طرح بھی ایسے تصادم کے خلاف نہ تھا جو امریکی آئین اور موجودہ سیاسی حالات کے ماتحت ممکن تھا۔ کاروباری حلقے اپنے نفع کے خیال سے شاید اسپر معترض ہوتے بالخصوص اس حالت میں کہ ان کو امریکہ کے تیل کے لئے مستقل منڈیاں ہاتھ آرہی تھیں۔ ان کی مخالفت کو اس طریقہ سے دور کیا جاسکتا تھا کہ امریکن کمپنیاں تیل کی وہ مقدار جو اٹلی بھیجی جاتی تھی ان سے خرید لیتیں۔ تیل کی صنعت کے اجارہ دارانہ انتظام میں یہ بات بہت آسان تھی۔ امریکہ سے یہ درخواست کرنا بھی ممکن تھا کہ وہ ربڑ اور نکل ممالکِ غیر سے منگوا کر بھی اٹلی کو مہیا نہ کرے لیگ کی دفعہ نمبر ۱۶ کے ماتحت معاشی پابندیوں کے عاید ہونے سے معاشی جنگ کی حالت پیدا ہوگئی اور معاشی جنگ معاشی دباؤ کی حد تک پہنچے بغیر کامیابی سے نہیں لڑی جاسکتی۔ امریکہ کی حکومت کا رویہ مناسب طور پر جانچا نہیں گیا اگر یہ امر صاف الفاظ میں بیان کر دیا جاتا کہ جنگ کی حالت نہ صرف اٹلی اور حبشہ کے درمیان بلکہ اٹلی اور مجلس اقوام کے مابین قایم ہوچکی ہے تو کیا امریکہ کو تیل، تانبا، ربڑ اور نکل فروخت کرنے پر اصرار ہوسکتا تھا۔

مجلسِ اقوام کی حکمتِ عملی نامکمل تھی، نہ صرف بعض سامانِ حرب مثلاً تیل پر پابندی عاید نہیں ہوئی بلکہ جہازوں کی آمد و رفت، سیاحوں کی تجارت اور تارکانِ وطن کی ترسیلاتِ زر میں بھی مداخلت نہیں کی گئی۔ اٹلی کا رویہ صاف اور واضح تھا کہ ہم تمام پابندیوں کا جب تک کہ وہ ہمیں بہت

سخت نقصان نہ پہنچائیں، مقابلہ کریں گے اور اگر وہ حد سے بڑھ گئیں تو ہم لڑیں گے"۔ اب لیگ کے لئے صرف دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ اٹلی کا چیلنج منظور کر کے اس پر ایسی پابندیاں عاید کرتی کہ اس کے لئے لڑنا ناممکن ہو جاتا یا پھر اس بات کا اعتراف کر لیتی کہ حبشہ کی آزادی عالمگیر جنگ کے مقابلہ میں کچھ قیمت نہیں رکھتی، بہت ممکن تھا کہ ایسی جنگ پیش ہی نہیں آتی لیکن یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پابندیاں ناکام رہیں۔ دباؤ اگر ڈالا ہی نہ گیا ہو تو ناکامی کیسی؟ نہ یہ امر بھی ثابت ہوا ہے کہ معاشی دباؤ ڈالنے سے جنگ کا پیش آنا لازمی تھا۔ اگر اٹلی کی حکومت سے صحیح اور معقول حکمت عملی کی توقع تھی تو حبشہ کی جنگ فتح کرنے کا مناسب طریقہ یہ نہ تھا کہ وہ لیگ سے جنگ مول لے۔ بصورت دیگر یہ حکمت عملی اگر غیر معقول تھی اور اس کی باگ ڈور ایک مخبوط الحواس کے ہاتھ میں تھی جو مضطرب ہو کر ساری دنیا سے ٹکرانا چاہتا تھا تو ابتداً ہی حکومتوں کی اکثریت کو عسکری قوت استعمال کرنا چاہئے تھا۔

لیگ کے اجلاس میں اٹلی کو ظالم قرار دیا گیا کہ اس نے ایک مقدس آئین کی خلاف ورزی کی لیکن ساتھ ہی اس اخلاقی مجرم کو جس نے دانستہ لیگ کے قانون کی دھجیاں بکھیر دیں، درخواست کی گئی کہ وہ باقاعدہ اس کا رکن بنا رہے۔ لیگ کا یہ فعل اسقدر غیر مناسب تھا کہ اگر مادی شکست نہ بھی ہو تو اخلاقی شکست یقینی ہے۔

مانا کہ اٹلی کے ساتھ سیاسی تعلقات قایم رکھنے کے خاص اسباب ہوں اور ایسے تعلقات فیر اکین سے بھی ہیں۔ لیکن اٹلی کو لیگ کا رکن بنائے رکھنا اور اس کو تمام مراعات سے استفادہ کرنے کا موقع دینا باوجودیکہ اس نے بنیادی قانون توڑ دیا، ایک ایسا کھلا مذاق تھا جس سے اٹلی کو اس حد تک پہنچنے کی جسارت ہوئی۔

پابندیوں نے اٹلی کے لئے کافی مشکلات پیدا کر دیں اس کی ضروری اشیاء خوردنی اور اجناس خام کی درآمد چار کروڑ پچاس لاکھ ڈالر سے گھٹ کر مارچ ۱۹۳۶ء تک دو کروڑ ساٹھ لاکھ رہ گئی اور شاید اس دباؤ کی شدت اور بھی تیز ہو گئی ہو۔ سونے کا ذخیرہ ختم ہونے اور غیر ملکی تبادلہ رک جانے

سے قالباً ملک کے اندر قحط رونما ہو جاتا لیکن اس اثنا میں موجودہ ذخیرہ اور جزرسی آڑے آئی نیز سونے کے ذریعے مال کی خرید، غیر ملکی کفالتوں، تارکانِ وطن کی ہنڈیوں اور سیاحوں کے مصارف کی وجہ سے ملک کے اقتصاد پر ناقابل برداشت بوجھ نہیں پڑا تاہم بڑھتی ہوئی گراں باری کا خدشہ موجود تھا اور شاید یہی وجہ ہو کہ اٹلی نے زہریلی گیس کے استعمال کا فیصلہ کر لیا اور اس طرح ایک اور مقدس ضابطے کو توڑ دیا۔

چونکہ دنیا سے تجارت کی حالت بہتر ہو رہی تھی اس لئے پابندیاں عاید ہونے سے بعض ملکوں کی کل میزانِ تجارت پر کوئی زیادہ اثر نہیں پڑا۔ برطانیہ عظمیٰ کی برآمد بجز اٹلی کے ۱۱۸۰۰۰۰۰ (گیارہ کروڑ اسی لاکھ) سے مارچ ۳۶ء میں بارہ کروڑ چالیس لاکھ ہو گئی۔ اٹلی کی برآمد تیس لاکھ سے گھٹ کر ایک لاکھ رہ گئی۔ چنانچہ اٹلی کی منڈیوں میں برطانیہ کو جو نقصان پہنچا اس کی دوسرے ملکوں سے تلافی ہو گئی۔ دوسرے ملک کم خوش قسمت ثابت ہوئے۔ اٹلی کی فرانس سے درآمد مارچ ۳۵ء میں سترہ لاکھ سے مارچ ۳۶ء میں ۳½ لاکھ رہ گئی۔ فرانس کی دوسری اشیا کی برآمد پچاس کروڑ سے انچاس کروڑ ہو گئی۔ رومانیہ کی کل ماہانہ تجارت مارچ ۳۵ء سے مارچ ۳۶ء تک باون لاکھ سے گر کر اڑتالیس لاکھ رہ گئی اور اٹلی کے ساتھ اس کی تجارت آٹھ لاکھ تیس ہزار سے دو لاکھ انیس ہزار رہ گئی۔

ان سلطنتوں کی جنھیں اٹلی کی درآمد بند ہو جانے سے اور اٹلی کی منڈیاں ہاتھ سے چلے جانے کی وجہ سے نقصان کا اندیشہ تھا باہمی امداد و اعانت کی تدابیر سوچی گئیں۔ مشترکہ فنڈ کی تجویز منظور نہ ہوئی لیکن تجارت کی کمی پورا کرنے کے لئے آپس میں ایک دوسرے کو بعض اشیا منتقل کر دینے پر اتفاق ہو گیا۔ لیکن چونکہ غیر مساوی نقصانات کا حادثہ ناگزیر تھا اس لئے بعض قومیں ایک دوسرے پر الزام لگاتی رہیں، اور شاید یہی وجہ تھی کہ اٹلی پر دباؤ کا اثر کم ہوتا گیا، جیسا کہ مارچ ۳۶ء کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔

ظاہر ہے کہ مجلس اقوام کے ارکان کے لئے ایک ضدی قوم کے خلاف یکساں معاشی

حکمتِ عملی کا جاری رکھنا دشوار تھا۔ اِس حالت میں کہ خود ان کے باہمی معاشی اغراض ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ اقتصادیات میں جابرانہ بدنظمی پیدا ہو رہی ہو تو سیاسی حیثیت سے اجتماعی امن قایم نہیں رہ سکتا۔

اہلِ غرض حلقوں میں نقصان کے باعث قدرتاً بے اطمینانی کا اظہار رہوا، اب تک بیرونی لڑائیاں حصولِ منفعت کے لئے بہترین مواقع پیدا کرتی رہیں۔ پابندیوں نے نہ صرف ایسے موقعے کھو دیئے بلکہ بعض مصنوعات کو خاصہ نقصان پہنچایا ممکن ہے بعض نقصانات موہوم ہوں۔ اٹلی کے ہاتھ مال فروخت کرنا آسان تھا لیکن روپیہ اکٹھا کرنا مشکل تھا۔ پابندیوں نے تجارت کی مقدار معین کر دی اور نقد لین دین جاری کر کے رہے سہے کاروبار کو قایم رکھا، بدقسمتی سے پابندیاں عاید کرنے والی حکومتوں نے اپنے اہلِ ملک کے لئے تجارتی نقصان کی تلافی کرنے سے انکار کر دیا اور درحقیقت اِس قسم کے مطالبات کو پورا کرنا آسان بھی نہ تھا لیکن آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ معاشی جنگ وجدل کا بارِ گراں لوگوں کے ایک خاص طبقے کو اٹھانا پڑے؟ مثلاً ایسا کیوں ہے کہ برطانوی کوئلہ فروش خسارہ برداشت کریں حالانکہ برطانوی تیلی فائدہ اٹھا رہے ہوں؟ اگر شروع میں یہ اصول تسلیم کر لیا جاتا کہ خاص خاص حلقوں کی بجائے پوری قوم معاشی جنگ کا بوجھ برداشت کرے تو مخالفت بہت کم ہوتی۔ مزید براں جارحانہ اقدام کرنے والے کو صاف طور پر کہہ دینا چاہئے تھا کہ اس کی وجہ سے تجارت کو جتنا بھی نقصان پہنچے وہ اس کی تلافی کا ذمہ دار ہوگا۔ تاوانِ جنگ بسا اوقات ایک قسم کا ناجائز ٹیکس ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر فاتح اپنے کو عدالت کا منصف قرار دے کر اپنے ہی نقصانات کا تخمینہ لگاتا ہے لیکن لیگ کے ارکان جس کے قواعد ایک بانیِ فساد نے جو خود بھی اس کا رکن تھا توڑ دیئے تھے تلافی کا حق رکھتے تھے۔

پابندیاں اگرچہ ایسی موثر نہ تھیں جیسا کہ ہونا چاہئے تھیں تاہم لیگ نے یہی ایک حربہ اٹلی کے خلاف استعمال کیا اور قبل اِس کے کہ لیگ کے ارکان اور حملہ آور سلطنت میں صلح ہو جائے اِس ہتھیار کو رکھ دینا اِس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ ذمہ دار طاقتیں اِس معاشی حربے کو یا تو استعمال ہی کرنا نہیں چاہتی تھیں یا پھر ان میں اس کے مناسب استعمال کی ہمت نہ تھی۔ ممکن ہے اس کی دونوں وجہیں ہوں۔

پاٹ

(ریڈیو ڈراما)

(صرف آوازیں سنائی دیرہی ہیں)

مقام ——— یوپی کا کوئی شہر

زمانہ ——— موجودہ

کردار جس طرح سامنے آتے ہیں

شیخ جی	ایک جلاہا - جو پیشہ چھوڑ چکا ہے۔
یوسف	شیخ جی کا پوتا عمر ۶ سال نذرو کا بیٹا
شیخانی	شیخ کی بیوی
زلفن	شیخ جی کی لڑکی عمر ۱۵ سال
یوسف کی ماں	نذرو کی بیوی
بفاطن	باورچن ——— آج کل بیکار ہے
رتن لال	ایک وکیل جو "اگاہی[1]" پر روپیہ بانٹتا ہے
منا	رتن لال کی بیوی
راج منی	رتن لال کی خادمہ

---

[1] ایک اگاہی دس روپیہ کی ہوتی ہے۔ ایک اگاہی لینے کے بعد عبر ماہوار سال بھر تک دینا ہوتا ہے۔

داروغہ جی — ایک تھانیدار
نذرو — شیخ جی کا بڑا لڑکا عمر ۲۰ سال میونسپلٹی میں ۱۵ روپیہ ماہوار کا ملازم ہے
یامین — نذرو کا بڑا لڑکا۔
دوکاندار — نخاس میں بیٹھنے والا ایک کباڑی

پہلا ایکٹ ———————— پہلا سین

(نخاس ۔ دور پر آوازیں آرہی ہیں

۱۔ "کیا بولے اس میز کا —— کیا بولے —— کیا بولے اس میز کا۔۔۔۔۔۔۔۔"

۲ "نو آنے ایک —— نو آنے دو —— نو آنے۔۔۔۔۔۔۔"

۳ "ہر مال ملے گا چار آنے کو —— ہر چیز ملے گی چار آنے کو" (دھن میں)

آدمیوں کے چلنے پھرنے، بولنے غل مچانے کا غوغا۔)

(ایک منٹ تک یہی غل وشور سنائی دیتا ہے۔ پھر بالکل قریب سے آواز آتی ہے)

دوکاندار۔ بڑے میاں کیا چاہتے ہو۔ آؤ —— ادھر آؤ ہم دکھائیں

شیخ جی ۔ (دور سے) ذرا اس کونڈے کو دیکھ رہا تھا۔

دوکاندار ۔ آئیے —— دیکھئے —— آئیے نا۔ یہ ؟

شیخ جی ۔ نہیں وہ (بالکل قریب آکر) وہ ———— ادھر ۔ اُں

دوکاندار ۔ " صاحب آپ نے چیز اچھی پسند کی ۔ بالکل نیا پاٹ ہے۔۔۔۔۔"

یوسف ۔ پی ۔ او ۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن ۔ پی ۔ او ۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن

(POT کا تلفظ ٹھیک ادا کرتا ہے) رٹے جاتا ہے

دوکاندار ۔ نہ ٹوٹا نہ پھوٹا۔ ایک ذرا ادھر ٹھیس لگ گئی ہے۔ اں صاحب سچ بولنا چاہئے۔

چاہے کوئی لے ۔ چاہے نہ لے ۔ اور سب ٹھیک ہے

یوسف ۔ پی ۔ او ۔ ٹی پاٹ ۔۔۔۔۔۔ (رٹے جاتا ہے)

دوکاندار "ہاتھ میں لے کر دیکھئے ــــــ ماشے اللہ سے 'شاہب جادے' نے انگریزی خوب بولی ہے"

شیخ جی - بڑا ہسیار ہے۔ اپنے بھائی کو سن سن کر سیکھ گیا۔ اں اور تو سناؤ۔ وہ کیا 'سنن' معنی سورج ــ اور 'ہاٹھاٹ' معنی گرم

یوسف - (نعرہ مارتا ہے) پی - او - ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن - پی - او - ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن (اتنی دیر میں اس نے دھن پیدا کر لی)

شیخ جی - اور بتاؤ "سنن" بتاؤ ــ "ہاٹھاٹ" بتاؤ

یوسف - پی - او - ٹی .... (دکتا ہوا دور چلا جاتا ہے)

شیخ جی - بیوقوف ! دام کیا ہیں ؟

دوکاندار - "جو چاہے آپ دیدیں - اس کا ڈھکنا کھو گیا ورنہ صاحب لوگ کہیں ایسی چیز چھوڑتا ہے 'ردلوں' میں بک جاتی -"

شیخ جی - "بات یہ ہے کہ گھر والی نے کہا تھا کہ ایک اتنا بڑا' اور تین چھوٹے چھوٹے پاٹ (تلفظ غلط ـــ کی طرح ادا کرتا ہے) لیتے آنا - اب اس کے خریدنے میں یہی ہے کہ ان کو پسند آئے - یا نہ آئے"

دوکاندار - "پسند نہ آئے تو واپس - دوکان آپ کی ہے - اور بڑے صاحب ایسی چیز تو گھر میں ہونا چاہیئے - کوئی "فیشانیبل" آجائے - آپ لوگوں کے یہاں تو سب طرح کے لوگ آتے ہوں گے"

شیخ جی - واپس کیا کرنے آئیں گے - بڑی دور رہتے ہیں - محلہ بانس گنج میں مکان ہے

دوکاندار - درست - اچھا صاحب میں ایک دام کہوں گا - بس کچھ کہیئے گا نہیں - میں نے خانساماں سے ۵ر کا خریدا ہے - آپ کو ہر کا دیدوں گا -

شیخ جی - اتنے دام نہیں - کہو تو چار آنے دیدوں -

دوکاندار - "اب گنجائش نہیں"

شیخ جی - "اچھی بات تمھاری چیز ہے - (دور جاکر) ایسف ادھر آ" - (لڑکے کی آواز قریب

آجاتی ہے)۔

دوکاندار۔ "اجی جاتے کہاں ہیں۔ اچھا لیجئے۔ آپ کی بات کیا ٹالوں آپ کی صورت میرے چچا سے ملتی ہوئی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے۔ کہ ——— اب کیا بتاؤں۔ برسوں رہے اور پرانی نہو۔ اچھا اور کیا چاہئے۔ یہ مٹی کے تیل کا چولھا لے لیجئے۔ اچھا یہ دیکھئے ایک لمپ رکھا ہے۔ شادی بیاہ ہو۔ تقریب ہو۔ کوئی آئے جائے۔ اسی سے حیثیت بن جائے گی بستا دیدوں گا اچھا اور کچھ؟"

شیخ جی۔ چھوٹے پاٹ چاہئیں۔

دوکاندار۔ کس کام کے لئے؟

شیخ جی۔ یہی کام کیا۔ عید قریب ہے۔ ذرا سوتیوں اویوں کے لئے ضرورت ہوگی۔

دوکاندار۔ او چھوٹے لال۔ او چھوٹے لال۔ ذرا بڑے میاں کو پیالے دکھانا۔ عمدہ قسم کے ہوں سستے دینا۔ یہ اپنے ہی ہیں ——— شیخ جی چونی تو ذرا کھراب ہے۔ دوسری بدل دیجئے۔

(بھدی آواز سے الاپتا ہے) "من کی آنکھیں کھول پیارے"

پہلا ایکٹ

سین دوسرا

شیخانی۔ "یہ کہاں رہ گئے تھے"

شیخ جی۔ تمہارا سودا کچھ ایسا ویسا ہوتا ہے۔ شہر بھر گھوم کر سب سامان لایا ہوں۔ لالٹین قریب لاؤ تو دکھاؤں۔

شیخانی۔ کیا ہے؟ جس کے لئے اتنی اچاپٹ ہو رہی ہے۔ ادھر لاؤ۔ ذرا کھولوں۔

یوسف (چلانے لگتا ہے) پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ او۔ ٹی پاٹ

یوسف کی ماں۔ چپ۔ کیا بک لگائی ہے۔

یوسف کی ماں			یہ کیسی کونڈالی
شخانی		ایک ساتھ	یہ کیا لائے
زلفن			امو ہو

یوسف۔ (پھر چلانے لگتا ہے) پی۔ او۔ ٹی پاٹ۔ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ او۔ ٹی پاٹ

(دور ہوتا جاتا ہے)

شخانی ۔ یہ کس کام کی۔ اتنی تو بڑی ہے۔ اس سے نکالتے نہیں بنے گا۔ سوئیوں کے کام کی تو نہیں۔

شیخ ۔ اتنا تو اچھا ہے۔ تم کہتی ہو کام کا نہیں۔ (ذرا تیز ہوکر) ایک روپیہ دیا تھا کہ اس میں ایک کونڈالی لاؤ۔ تین پیالے لاؤ۔ چھ چمچے لاؤ۔ ایک طرف پیدل مرو۔ دوسری طرف کا اکہ کا کرایہ اسی روپیہ سے نکالو۔ روپیہ نہوا عمر عیار کی زنبیل ہو گیا۔ خالی کونڈالی روپیہ سے کم کی نہیں ملتی تھی۔ یہ تو ذرا پرانا ہے، اس لئے مل بھی گیا۔

زلفن ۔ اماں اچھی تو ہے۔ اس میں تو پکڑنے کا کنڈھا بھی لگا ہوا ہے۔ یہ اور اچھا ہے ہاتھ نہیں جلے گا۔

یوسف کی ماں ۔ جیسے چار کی پیالی ہو۔ کیسی خوبصورت

شیخ جی ۔ میرا لایا ہوا سودا تو کبھی ان کو بھاتا ہی نہیں۔ دو پہر سے دوڑتے دھوپتے یہ وقت آیا میرا سن اب ایسا نہیں ہے کہ تین میل پیدل چلوں۔ پھر الیسف ساتھ۔

شخانی ۔ یہ ہے کتنے کی؟

شخانی ۔ اب تم ہی بتاؤ کتنے کا آنکتی ہو۔ صاحب لوگوں۔ رئیسوں کے کام کی چیز ہے۔ دوکاندار کہتا تھا اگر اس کا ڈھکنا ہوتا تو جھٹ سے روپوں میں بک جاتی۔

شخانی ۔ ۸ آنے سے زیادہ کی نہیں ہے۔

شیخ جی ۔ چھ آنے کا ہے۔

شخانی ۔ سستی تو ضرور ہے ۔ مگر پرانی چیز ہے ۔

زلفن ۔ (ٹن سے آواز آتی ہے) یہ کیلہے ؟

شیخ ۔ یوں ہی ذرا سی ٹھیس لگ گئی ہے ۔ مگر یہ ایسی چیز ہے کہ برسوں رہے اور پرانی نہو ۔

زلفن ۔ ارے یہ اور زیادہ سفید ہے ۔ دیکھو تو اماں میں نے یہاں ذرا اونگلی سے رگڑا تھا کیسا سفید نکل آیا ۔

یوسف کی ماں ۔ دھولا ۔ دھولا

شخانی ۔ بالکل چار کی پیالی ۔

یوسف ۔ اماں ! اماں ۔ کیا بڑے لوگوں کی چار کی پیالی بڑی ہوتی ہے ۔

(سب قہقہہ مار کر ہنستے ہیں)

یوسف کی ماں ۔ چپ پگلے ۔ کہیں بڑے آدمی ہونے سے ان کی چیزیں بھی بڑی ہوجاتی ہیں

یوسف ۔ واہ راجہ صاحب کا مکان اتنا بڑا ہے کہ کچھ کہنے کو نہیں ۔

شخانی ۔ بات یہ ہے کہ ایسی نئی نئی چیزیں بڑے گھروں میں اچھی لگتی ہیں ۔ اب جو ہمارے یہاں دیکھے گا یہی سمجھے گا کہ کہیں سے اٹھا لائے ۔

لڑکی ۔ (دور سے چلا کر) کیا اماں غریب لوگوں کے دل نہیں ہوتا ۔ اچھی چیزیں سب ہی کو اچھی لگتی ہیں ۔ جس کو میسر آئے وہی ار کھے ۔ تم تو ایسی کہا کرتی ہو ۔

شیخ جی ۔ سچ ہے ۔ گھر میں دو ایک اچھی قسم کی چیزیں بھی ہونا چاہیئے ۔ دو کا ندار تو ایک لمپ بھی دے رہا تھا ۔ کہتا تھا کہ آپ کے یہاں تو سب ہی طرح کے لوگ آتے ہیں ۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ اب تھوڑا تھوڑا کرکے حیثیت کی چیزیں لے آوں گا ۔ نذرو کے دوست ہیں جو سرکار میں نوکر ہیں ۔ وہ آتے ہیں ۔ شاید کبھی نذرو کا صاحب آ جائے ۔ ایک بار درو غہ جی آئے تھے ۔

شخانی ۔ تو کیا جو آئے گا اسی کو یہ کونڈالی دکھاتے پھروگے ؟

شیخ جی ۔ (بگڑ کر) نہیں۔ تم نے نہ جانے کیسی کھوپڑی پائی ہے ۔ اسی طرح کی چیزیں اور لاؤں گا جیسے لمپ ۔

شخانی ۔ مکان ٹھیک کرانے کو روپیہ نہیں ہے ۔ لمپ لائیں گے ۔ لمپا لائیں گے ۔ ۔

شیخ جی ۔ (زیادہ بگڑ کر) لمپ میں کون چھپن ٹکے لگ جائیں گے ۔ جو میں کہتا ہوں تم ہمیشہ اس کی الٹی کہتی ہو ۔

شخانی ۔ بڑے آدمی بنیں گے ۔ یہ منہ اور مسور کی دال ۔

زلفن ۔ کیسی اوجھی اوجھی نکل آئی ۔ دیکھو اماں ۔

یوسف کی ماں ۔ اہاہا ۔ اے خالہ اسے عید کے دن ضرور نکالنا ۔

شیخ جی ۔ سنو دولھن ۔ تم اپنی خالہ کو بکنے دو ۔ عید کو ضرور نکالنا ۔ اور وہ پھولدار چدّر نکالنا ۔ ساری عمر یہی ترستے رہے کہ کچھ حیثیت بنے ۔ مگر ان کی وجہ سے کچھ نہوا ۔

شخانی ۔ (بگڑ کر) میری وجہ سے ؟ اپنی تقدیر کہو ۔ کبھی پیسہ بھی جڑا جو حیثیت بنتی ؟ ۔ اب لڑکا پندرہ روپیہ کا نوکر ہو گیا ہے تو حیثیت بنائیں گے (چمک کر) یہ موئی چار کی پیالی کی ایسی کنڈلیا آئی ہے ۔ عید کو نکالی جائے گی ۔ ایک پھولدار چدّر پڑی ہے وہ نکالی جائے گی ۔ بس ہوگئی حیثیت ۔ چدّر نہیں چدّرا نکلے گا ۔ ابھی لڑکی بیاہنے کو پڑی ہے ۔ چدّر اس کے کام آئے گی ۔ یا بڑھوتی میں ان کی حیثیت بنائے گی ۔

یوسف کی ماں ۔ "خالہ کیا ہرج ہے اگر شیخ جی لمپ لے آئیں گے "

شخانی ۔ تو چپ رہ ۔ بڑی چلی ہے ۔ بیچ میں بولنے والی خصم کیا نوکر ہو گیا سمجھتی ہے کہ میں کچھ ہو گئی ۔ جب تک میں زندہ ہوں تو کیا ہے ۔

یوسف کی ماں ۔ خالہ تم تو ہوا سے لڑتی ہو ۔ میں نے کب کہا میں گھر والی ہوں ۔

شخانی ۔ (آپے سے باہر ہو کر) گھر والی ۔ گھر والی ۔ گھر والی

(پاٹ جو پانی سے بھرا ہوا ہے بعد سے گر پڑتا ہے)

شیخ جی ۔ کیا ہوا ۔ توڑ ڈالا۔
زلفن ۔ ارے یہ یوسف کنڈالی کب اٹھا لے گیا۔
یوسف کی ماں ۔" ابے ادھر آ حرامزادے ۔ کمبخت ۔ خدا تیرا ستیاناس کرے "
یوسف (دور سے) "پانی بھر کر ناؤ تیرا رہے تھے "
یوسف کی ماں ۔ چل ناؤ کے بچے ۔ کمبخت (آواز دور ہوتی جاتی ہے) (دھب دھب مارتی ہے)۔

یوسف (روتا ہوا) اب نہیں کریں گے ۔ اب نہیں
شخانی ۔ (دوڑ کر جاتی ہے) چھوکری تیرے حواس ہیں ۔ (دھب دھب) چھوڑ ۔ چھوڑ ۔ آگ لگے اس کنڈالی کو ۔ میرے بچے کو پیٹ کر رکھدیا ۔ چپ رہ ۔ چپ رہ ۔ لاناؤ کہاں ہے ۔ آ ۔ ابھی پانی بھر کر تیرا تی ہوں ۔
زلفن ۔ ایسف رو نہیں ۔ رو نہیں ۔ اماں لاؤ ۔ یہ کنڈالی مجھے دیدو ۔ ایسف تمہارا کہا نہیں سنتا ۔ اگر چپ نہوگے تو میں لے جاؤں گی ۔
یوسف ۔ (روتا ہوا) لاؤ ۔ لاؤ ہمارا پاٹ لاؤ ۔ پی ۔ او ۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن ۔ پی ۔ او ٹی ۔ پاٹ پاٹ معنی برتن ۔
شخانی ۔ (قریب آکر) وہ تو میں کہتی تھی ۔ کہ یہ بڑے گھروں کی چیزیں ہم لوگوں کو راس نہیں آسکتیں ۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) "جھونپڑیں" میں رہ کر محلوں کا خواب ۔ جس حالت میں ہو پڑے رہو ۔
شیخ جی ۔ " اب تو لے آیا ہوں "
شخانی ۔ ہاں لے تو آئے ہو ۔ (ذرا چپکے سے) تم کہتے ہو کسی صاحب کا مال ہے اب وہ مردہ ہو یا زندہ ۔ مجھے تو یہی ڈر ہے کہ منحوس نہ نکلے ۔ پرانی دھرانی چیزیں میں یہی تو برائی ہوتی ہے ۔ دیکھو وہ بندا جس دن سے آیا، کیسی تباہی آئی ۔ کھانے تک کو نہیں جڑتا تھا ۔ اور جب سے الگ کیا گیا'

خدا کملانے پینے کا سستا ہوا۔

زلفن ۔ اماں بہو جی کوٹھری میں گھس گئی ۔

شخانی ۔ مجھے تیہا دکھاتی ہے ' ایسپھ ' کو دھنک کر ڈالدیا ۔ رہنے دے مردار کو وہیں (نقل کرکے) " میں کب کہتی ہوں کہ میں گھر والی ہوں " تو کہہ کب سکتی ہے ؟ میرے ہوتے ہوئے ۔ میں مالک ہوں گھر کی ؛

شیخ جی ۔ تم تو ہوا سے لڑتی ہو ۔ وہ بچاری تو سیدھی سی بات کہہ رہی تھی کہ لمپ لانے میں کیا برائی ہے؛

شخانی ۔ ہاں جو تمہاری ایسی کہے وہی اچھا ہے ۔

شیخ جی ۔ (ذرا تیز ہوکر) میری ایسی کیا ۔ وہ گھر بنانے والی بات کہہ رہی تھی ۔ تم نے اتنے دنوں میں ذرا سی بھی گرستی نہیں جوڑی ۔

شخانی ۔ (تیز ہوکر) گرستی کیا جوڑتی ۔ پیٹ بھرنے کو نہیں تھا ۔ گرستی جوڑتی ۔ آج تو تم بڑی بڑی باتیں سیکھ کر آئے ہو ۔ اسی مردار نے کان میں ڈالی ہوں گی ۔ گرستی نہیں ہے حیثیت نہیں ہے ۔ ارے خدا کا شکر بھیجو کھانے کو مل جاتا ہے ۔ ہزاروں ایسے گھومتے ہیں جن کو پیٹ بھرنے کو سوکھا ٹکڑا ۔ اور تن ڈھکنے کو چیتھڑا نہیں ۔ آدمی کو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے ۔

شیخ جی ۔ تم تو زندگی اجیرن کئے دیتی ہو ۔ اب تک تو ہم ہی تھے ' اب بیٹھے بٹھائے اس بچاری کے الجھ پڑیں ۔

شخانی ۔ (تنکھار کر) تم تو بڑھاپے میں سمجھ کھو بیٹھے ۔ اگر تم وہ کے سامنے ایسی باتیں کروگے تو اس کا دماغ پھر جائے گا ۔ گھر بار سمیٹ کر ہم لوگوں کو دودھ کی مکھی کی طرح الگ کر دے گی ۔ اس بڑھاپے میں کس کے دروازے جاکر پڑوگے ۔ کنڈالی رہنے دو ۔ جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا عید کے دن ۔

(جوتیوں کی سڑ سڑ کی آواز دور سے آتی ہے)

بفاطن ۔ اے سکھانی کہاں ہیں ؟

شخانی ۔ کیا ہے بفاطن ۔ چھپر کے نیچے آؤ ۔ (چپکے سے) کنڈالی کپڑے سے ڈھانک، کنڈالی کپڑے ڈھانک دو (زور سے) کیسے آنکلیں ؟

(بفاطن جوتیاں سٹر سٹر کرتی ۔ اونگلیوں سے پیالہ بجاتی اندر آتی ہے)

بفاطن (اٹھلا اٹھلا کر کہتی ہے) ہم نے اس وقت چنے کی روٹی پکائی ہے ۔ اسے دیکھ کر منے نے ادھم جوت دیا ۔ کہ دال بھات لاؤ ۔ دال بھات لاؤ ۔ تمھارے یہاں پکا ہو تو ذرا سا لیتی جاؤں ۔ صبح پکاؤں گی تو دے جاؤں گی ۔

شخانی ۔ دال تو ابھی لگ گئی تھی ———— لیتی جاؤ تھوڑی سی ۔

بفاطن ۔ یہ کپڑے سے ڈھانک کر کیا دھرا ہے ؟

(یوسف دور پر چلتا ہے ۔ پی ۔ او ۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن پاٹ معنی برتن)

شخانی (جلدی سے) ادھر نہ جاؤ ۔ اس میں وہ بند ہے ۔ کیا نام وہ ۔ ایسپہ کے لئے ایک چڑیا پکڑی ہے ۔

بفاطن ۔ ہونہہ ۔ اے ایک پنجرا منگوا لو ۔ کیا اُس میں بند کیا ہے ۔ کالا کالا کیا ہے ۔ کنڈھا ۔

شخانی ۔ ہاں منگواؤں گی ۔ ۱۵ روپیہ میں کیا کیا کروں ۔ سب تو سب مردار بندہ کہتی ہے ۔ تم گھر والی بنتی ہو ۔ (چیخ کر) میں گھر والی نہیں، تو کیا وہ بنے گی ۔

بفاطن ۔ ایسا کہتی ہے ؟ بُرا کرتی ہے ۔ اپنا پوت پالا پوسا ۔ اب بڑا ہو کر نوکر چاکر ہوا تو ان کا ہو گیا ۔

بہو ۔ (دور سے) اے مالک ۔ جس نے ایسا کہا ہو اسی کا منہ سٹر جائے ۔ موئی کمبخت اندھی ہو جائے ۔ اس کے بدن سے کوڑھ ٹپکے ۔

شخانی (فتحیاب ہو کر) ادھر جا کر دال لے لو ۔ بھات بھی لے لو ۔

(بفاطن پیالہ بجاتی ۔ سٹر سٹر کرتی جاتی ہے)

شخانی ۔ معنی خیز کنکھارتی ہے۔ کچھ اپنی فتحیابی پر۔ اور کچھ زلفن کو اشارہ دینے کے لئے کہ دال چاول کم کم دے۔ دور سے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ ہلکی ہلکی۔ یوسف کی ماں کی ہچکیوں کی آواز۔ اور بیچ بیچ میں یوسف کی پاٹ معنی برتن پاٹ معنی برتن کی صدا۔ ایک منٹ کے بعد بفاطن سٹر سٹر کرتی آتی ہے)

بفاطن ۔ لودیکھ لو۔ اتنا لئے جاتی ہوں

شخانی ۔ لے جاؤ۔ اس میں دکھانا کیا۔

(بفاطن سٹر سٹر کرتی جاتی ہے)

شخانی (ذرا کڑک کر۔ آواز میں فتحیابی کا اثر موجود ہے) دیکھ زلفن ہاتھ روک کر چیز نکالا کر۔ اتنی ایک دال جو دیدی تو اپنے گھر میں کمی نہ پڑے گی۔ کھانا چلنا دوبھر ہو جائے گا۔

زلفن ۔ میں نے پہلے ذرا سی نکالی تھی۔ اس نے کہا تھوڑی اور دو۔

شخانی ۔ وہ کہے گھر اٹھا کر دیدے تو دیدے گی۔ ارے میں نہ دیکھوں تو یہ گھر اڑ جائے۔ کہتے ہیں تم کو گھر بنانا نہیں آتا۔ گھر بنانا نہیں آتا۔ اور اس موئی زلفن کی مت تو اڑ گئی۔ اچھا اور دیکھ یہ کنڈالی اٹھا کر کوٹھری میں دھر دے جو دیکھے گا یہی کہے گا کہیں سے اٹھا لائے ہیں۔ یا کسی مرے گرے کا مال ہے کل جب نذر و آئے تو نکالنا۔ تب لوگوں سے یہی کہیں گے کہ نذرو کو اس کے صاحب نے دی ہے۔

شیخ جی ۔ مجھے کھانا بھی دو گی۔ لالٹین میرے منہ کے پاس سے ہٹاؤ۔

شخانی ۔ ٹھہرو ———— چولھے پاس چل کر کھا لو ————"

دوسرا ایکٹ — سین پہلا

رتن لال (غصے سے بھرا ہوا) سنتی ہو اپنے پوت کے کرتوت۔ ایسے بدچلن لڑکے کو میں گھر

میں نہیں دیکھ سکتا۔

منا - (ذرا دھیمی آواز سے) کیا ہوا؟

رتن لال - ہوتا کیا؟ اس بدمعاش نے وہی کیا جو تم نے سکھایا۔ اگر یہ لڑکا گھر لوٹ کر ہم دونوں کو ٹکڑوں کا محتاج نہ کر دے تب کہنا۔ میں تو مرددد کو اسی بار پولیس میں دیدیتا جب ہیرالال کی گھڑی چرالایا تھا ـــــ کون گن ہیں جو اس میں نہیں۔ اس سن میں موتی بائی کے.....

منا (ذرا اونچی آواز سے) ارے میں سنوں تو۔ ہوا کیا؟

رتن - ہوتا کیا۔ پاٹ جس کے لئے میں نے نوکروں کو مفت میں مارا پیٹا یہی چرائے گیا تھا اور لے جاکر ایک کباڑی کے یہاں دس روپیہ کو بیچا (پکار کر) اجمی دوڑ جا بیٹھکے میں ایک پاٹ رکھا ہے اٹھالا ـــــــــ ایسے ہی لڑکے باپ کی کمائی منٹوں میں اڑا دیتے ہیں۔

منا - وہ کباڑی تمھارے پاس آیا تھا؟

رتن - اس کو کیا معلوم کہ وہ لڑکا میرا تھا یا کسی ڈاکٹر کا۔ جس دلال سے ہم نے کہا تھا کہ ہمارے پاٹ کا جوڑ ڈھونڈھ لاؤ وہ یہ پاٹ لے کر آیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ایک ہفتہ ہوا کباڑی نے اس کو ایک ۱۷۔۱۸ سال کے لڑکے سے خریدا تھا۔

منا (ذرا تیکھی ہوکر) اور اس لڑکے کا نام سکھولال تھا۔ کیوں نا؟

رتن (جھنجھلا کر) پہلے پوری بات سنو۔ میں نے کہا کہ پاٹ کہیں چوری کا نہو۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ میں نے سب پوچھ گچھ لیا ہے۔ جو لڑکا بیچنے آیا تھا اس کی حیثیت تو ایسی نہیں معلوم ہوتی آگے بھگوان جانے۔ بائسکل پر بیٹھ کر آیا تھا۔ سلک کا سوٹ پہنے تھا۔ سونے کی عینک سونے کی گھڑی لگائے تھا۔ کان میں سونے کا پھول۔

منا - تم سمجھتے ہو کہ دنیا میں اس چہرے مہرے کا اور کوئی نہیں۔

رتن - تمھاری مت نہ جانے کہاں چلی گئی ـــــ پاٹ تو دیکھو ـــــ (دوڑنے کی سی

آواز آتی ہے ۔ قریب آکر رک جاتی ہے) لو پاٹ آگیا ـــــ وہی ہے یا نہیں ۔

منا ۔ میں کیا جانوں ۔ ایک جیسے ہزاروں ہوں گے ۔ بنانے والا ایک بنا کر تھوڑے گیا ہوگا ۔

رتن ۔ ۵ سال سے گھر میں ہے اور پہچان نہیں سکتی ؟ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو ۔

منا ۔ دیکھ رہی ہوں (سنجیدگی سے) یہ میرا پاٹ نہیں ہے ۔

رتن ۔ تمہارا نہیں ہے تو پھر کس کا ہے ۔ ابھی سکھو نے نہیں کسی اور نے چرایا ہوتا تو تمہارا ہو جاتا ۔

منا (ان سنا کر کے) اس جگہ ایک گڈا پڑا ہوا ہے ۔ یہ ایک پتی جھڑ گئی ہے ۔ یہ دیکھو کسی نے چاقو کھرچا ہے ۔ اور میں کہتی ہوں کہ یہ کچھ چھوٹا بھی ہے ۔

رتن ۔ ماں کی آنکھوں سے یہی تو دکھائی دے گا ۔

منا ۔ اچھا اب تم ذرا باپ کی آنکھوں سے دیکھو ۔ تمہارے پاٹ میں کہیں یہ سرخ کلیاں تھیں پتیوں پر اس طرح کے ریشے بنے تھے ۔ اور یہ دیکھو ایسا پھول اس جگہ پر تھا ۔ اور تو اور ۔ یہ مونگھڑ کی بیل دیکھو ۔ اس پاٹ کی مونگھڑ پر کہیں بیل تھی ؟ یہ پاٹ وہ ہے ہی نہیں ۔ کہنے کو جو چاہے وہ کہہ دو ۔

(خاموشی ۱۵ سکنڈ)

کچھ تو فرق معلوم ہوتا ہے ؟ "

رتن (ذرا مطمئن ہو کر کہ اپنے لڑکے کے سر سے الزام ٹل گیا) میں نے کبھی اتنے غور سے دیکھا ہی نہیں تھا ۔ اور دیکھا بھی ہو تو یاد نہیں پھول کیسے تھے ۔ اور ان پھولوں پر سرخ نقطے تھے یا ہرے وہ نقطے گول تھے کہ چوکور ہمیں اتنی فرصت کہاں کہ ان باتوں میں وقت خرچ کریں ـــــ بلکہ مجھ سے تو اگر پوچھو تو یہ بھی نہیں بتا سکتا ہوں کہ جن پیالیوں میں چا پیتا ہوں ان پر کس ڈزائن کے پھول بنے ہیں ۔ یا میرے ٹیبل کلاتھ پر کیا ڈزائن بنا ہے ۔

منا (سخت طعن سے) ہاں اگر جانتے ہو تو اتنا جانتے ہو کہ سکھو ہی پاٹ چرا کرلے گیا ہے ۔

رتن (جھنجھلا کر) ابھی کباڑی کو بلا کر سکھو کا سامنا کراؤں ۔

منا (بگڑ کر) میں کہتی ہوں تم اپنے لڑکے کی عزت آبرو کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ میں بتاؤں کیا کرو وہ کون دروغہ جی ہیں جو تمہارے دوست بھی ہیں۔ اور قرضدار بھی۔ بلاکر ان سے کہو کہ سکھو کو ایک دس سال کے لئے جیل بھجوادیں۔ تمہارے کہنے کو ٹالیں گے ہرگز نہیں۔ بس۔ پھر تو تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ چین سے ٹانگیں پھیلا کر سونا۔ میں بھی دکھیا رو رو کر مر جاؤں گی۔ پھر تمہاری چیزوں کو۔ تمہارے روپیہ پیسے کو تباہ کرنے والا۔ میٹنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ (ذرا ٹھنک کر) آپ ہی میاں در در بار۔ آپ ہی میاں کھیت کھلیان۔

رتن ۔ نہ الٹی مانو نہ سیدھی۔ اگر یہ پاٹ تمہارا نہیں ہے تو پھر کباڑی کو بلا کر سامنا کرانے میں کیا حرج ہے۔

منا ۔ بیچارا سکھو۔ اب غریب کا یہ حال ہو گیا کہ جب تک ایرے غیرے نتھو خیرے آکر گواہی نہ دیں جرم ہٹ ہی نہیں سکتا۔ اس موئے کباڑی کا کیا بگڑتا ہے۔ بلکہ وہ تو اور خوش ہوگا کہ بڑے اشرافوں کے کرتوت کھل رہے ہیں۔ جھٹ سے کہہ دے گا یہی ہیں صاحب! میں نے تو ان کی 'تصبیر' لی تھی کہو کھو گئی ورنہ ابھی دکھا دیتا۔ تب دھری رہ جائے گی وکیل صاحب کی ساری وکالاہٹ۔

رتن (جھنجھلا کر۔ ہارے ہوئے لہجے میں) تم جانتی ہو کہ بک بک سننے کی میری عادت نہیں۔ جو میں کہتا ہوں اس کا سیدھی طرح جواب دو۔ ایک جواب۔ یہ پاٹ تمہارا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو کباڑی کو بلا کر سامنا کرانے میں کیا ہرج۔

منا (بگڑ کر) سو باتوں کی ایک بات کیوں نہیں کہتے۔ سکھو کو کسی نہ کسی بہانے سے جیل بھجوانا ہے۔ تم کو تو اس سے ایک آڑسی ہے۔ چار رام دئے تھے پانچ کیوں کھا گیا۔ چار روپیہ مہینہ دیتا ہوں پانچ کیوں خرچ کئے۔ اور تو اور بائسکل میں پنچر کیوں ہوا۔ موئے پتلون میں کھونچا کیسے لگا۔ اس کے بیٹھکے میں چار دوست آگئے چار پی لی۔ پان کھائے۔ (نقل کر کے) "مجھے یہ لچھن اچھے نہیں لگتے" جو جاہے اس کے ساتھ کرو۔ تم جانو وہ جانے تم باپ وہ پوت۔ اس کو کچھ ہو جائے گا میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہوں گی۔ پچھلے جنم میں بھگوان جانے کون پاپ کئے تھے جو بھوگ رہی ہوں۔

رتن (اکتا کر) ان کی کھوپڑی میں کوئی بات گھستی ہی نہیں۔ میں باپ ہو کر سکھو کا برا چاہوں گا۔

کچھ تو سوچو۔ اندھی نہ بنو۔ کسی بری ڈگر لگ گیا تو تم ہی سر پکڑ کر رو ؤ گی۔ سو مرتبہ بتا چکا ہوں کہ مجھ
م آم کا کچھ نہیں۔ مگر ہر بات ڈھنگ سے ہونا چاہئے۔ جو چیز خرچ ہو، ایک حساب سے خرچ
ہو۔ سکھو کو تو کسی بات کا ڈھنگ نہیں۔ اس کو کیسے کیسے سوٹ بنوائے۔ مگر کبھی کھونچا لگا چلا آرہا ہے
کبھی روشنائی گر گئی ہے۔ تو کبھی کودنے پھاندنے میں مسک گیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ سوٹ میں روپیہ
لگتا ہے۔ کچھ دنوں تو چلے۔ اس کو پہن کر اچکنے کودنے کی کیا پڑی ہے۔

منا ہاں۔ اچھے سوٹ والوں کو جب کودنا ہوتا ہے تو ننگے ہو جاتے ہیں۔

رتن لال۔" اے بھگوان! عورتیں بڑی گدھی ہوتی ہیں۔ اسی لئے تو نے ان کو سمجھ نہیں دی۔"

منا ۔ کہاں جاتے ہو؟ سکھو کو حوالات میں بند کرانے۔

رتن ۔(دور پر) اپنا سر پھوڑنے۔ (وقفہ ۱۵ سکنڈ)

منا (بڑبڑاتی ہے) آگ لگے بیاج کو۔ اس گھر سے پریم اڑ گیا۔ اب جو کچھ ہے روپیہ ہے۔
اگر سکھو کہیں چلا گیا تو دیکھیں بڑھوتی ہی ان کی کون دیکھ بھال کرتا ہے ——— کیا ہے؟ اجمنی (کنجی
پھینک کر) لے جتنا جی چاہے گی نکال لے مجھ سے "اسوخت" نہ بول۔

اجمنی ۔ بات یہ ہے کہ (کنکھار کر) دو پہر کو چھٹی پا کر میں گھر گئی تو بٹیا نے کہا کہ پانی نہیں ہے میں
بہت بکی جھکی کہ تجھ کو یہ دھیان نہیں رہتا کہ تھکی مری چلی آرہی ہوگی، پانی سب اٹھا ڈالا۔ مگر کرتی کیا
گگرا لاد کر نل پر گئی۔ وہاں سے کچھ دور۔ اتنی دور جیسے یہاں سے وہ دیوال، شیخ جی کا لونڈا پاٹ
پاٹ بکتا پھرتا تھا۔ میں نے اپنے جی میں کہا پاٹ تو ہمارے گھر میں تھا جو چوری ہو گیا یہ کیا بکتا پھرتا
ہے۔ میں نے پاس بلا کر چمکار کر پوچھا کیا بکتا ہے۔ وہ چلا کر اور بہت کچھ بکنے لگا۔ کچھ گیت سا تھا
"پی آؤ جی"۔ اور کیا پاٹ معنی برتن۔ اتنے میں بھاطن گھڑا لئے آئی۔ اس دکھیا کے پاس گگرا کہاں
ہے۔ گھڑے میں پانی بھرتی ہے۔ اور مجھ سے چپکے سے کہنے لگی کہ یہ جو شیخ جی ہیں ان کو کہیں سے ایک
برتن مل گیا ہے جس کو یہ لوگ پاٹ کہتے ہیں۔ اور کہنے لگی کہ بات یہ ہے کہ آج سکھانی کے یہاں ال لینے گئی
تو میں دینے گئی۔ انھوں نے میری صورت جو دیکھی تو فوراً پاٹ پر کپڑا ڈھانک دیا۔ مگر میں نے دیکھ لیا

کہ کیا ہے۔ کالا کالا چکدار گول گول برتن تھا۔ اس میں کنڈ ھا بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے سکھانی سے پوچھا کیا ہے۔ سکھانی چلی مجھے اُتو بنانے ۔ کہنے لگی ۔ ایسپھ کے لئے جڑ یا پکڑ کر بند کی ہے ۔ میں ان کے چلتروں میں آنے والی کب۔ میں سمجھ گئی کہ کچھ دال میں کالا ہے ۔ پھر مجھ سے کہنے لگی تجھے گنگا قسم کسی سے کہنا نہیں ۔ (اپنے آپ سے) اے مجھے کیا گرج پڑی ہے جو ہر ایک سے کہتی پھروں۔

منا ۔ بلا تو وکیل صاحب کو دھاؤں سمجھتی تھی کہ نہ تو یہ میرا باٹ ہے ۔ اور نہ وہ کمبخت لڑکا جو بیچنے گیا میرا اسکھو ہے ۔ بلا نا وکیل صاحب کو ۔ یہ مرد بڑے مورکھ ہوتے ہیں جو سنتے ہیں اس پر بھروسا کر لیتے ہیں۔ کچھ سوچیں، کچھ سمجھیں ۔ اُن ہند ــــــــ ذرا یا ندان ادھر بڑھا۔ اور سن وکیل صاحب کو بھیج کر۔ ذرا چلی جانا، اور بغاطن کو بھی بلاتی لانا۔

راج منی ــــــ آ

منا نہیں نہیں تو گھبرا نہیں ۔ میں اپنے ڈھنگ سے پوچھوں گی ۔

ایکٹ دوسرا سین دوسرا

۔ اداب عرض ہے وکیل صاحب

۔ آئیے دروغہ صاحب ۔ تشریف رکھئے آپ کے تو درشن ہی نہیں ہوتے ۔

۔ مجھے آپ کا پرچہ ملا تھا ۔ اور ایک ہفتہ سے اسی سوچ بچار میں تھا کہ کسی سے کچھ روپے کا بندوبست ہو جائے تو آپ کے پاس آؤں ۔ خالی ہاتھ کیا آؤں ۔ بات یہ ہے وکیل صاحب، آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگوں کی آمدنی کا ...... کچھ ایسی ہے کہ ہو گئی تو ہزاروں اور نہ ہوئی تو پھر مہینوں کا کال ہے ۔

۔ ہاں، زمانہ بہت ہو گیا تھا اس لئے آپ کو یاد دلا دیا صاحب میں 'بیوپار' میں ہر چیز صاف رکھتا ہوں ۔ اسی بات پر 'واقف' سے جھگڑا ہوا کرتا ہے ۔ ورنہ آپ تو اپنے ہیں ــــ آج ایک اور بات تھی جس سے آپ کو تکلیف دی ۔ بات یہ ہے کہ میرے پاس ایک اتنا بڑا پاٹ تھا جستے کا یا کلٹ کا بنا ہوا تھا ۔ اس پر چاندی کی بڑی بڑی پھول پتیاں تھیں ان پر دودھ کی ایسی سفید مینا کاری تھی ۔ ان پر دودھ کی ایسی سفید مینا کاری تھی ۔ اسی کمرے میں رکھا رہتا تھا ۔ شاید آپ نے بھی خیال کیا ہو ۔ ادھر رہتا تھا ۔ اچھا لگتا تھا ۔ ایک ہی تھا اس میں پودا، اودا کیا لگاتا ۔ تو ادھر رکھا رہتا تھا ۔ میری وائف نے اس پر کپڑا ڈال دیا کہ میلا نہ ہو جائے ۔ آج آٹھواں دن ہے میں نے کپڑا اٹھا کر جو دیکھا تو اس کے نیچے ایک گما اینٹ رکھی ہوئی تھی ۔

داروغہ جی۔ اچھا ـــــــ ہوں

رتن لال۔ آج میں نے ایک خبر سنی۔ یہاں پڑوس میں ایک جلا ا رہتا ہے۔ شیخ جی شیخ جی اس کو کہتے ہیں۔ اس کے یہاں اسی طرح کا ایک پاٹ ہے۔

داروغہ جی۔ شیخ جی کس حیثیت کے آدمی ہیں۔

رتن لال۔ حیثیت کیا؟ کپڑا بننا چھوڑ چکا ہے۔ اس کا ایک بیٹا ہے وہ کسی دفتر میں ۱۵ روپیہ کا نوکر ہے۔ اسی سے کام چلتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں۔ شیخ جی کے بیوی بچے ہیں۔

داروغہ جی۔ ان میں سے کوئی بدچلن تو نہیں ہے۔ یا کسی کو کوئی لت تو نہیں ہے۔

رتن لال۔ ان باتوں کی تو آپ لوگوں کو خبر ہونا چاہئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ نہ کوئی بدچلن ہے۔ نہ کسی کو کوئی لت ہے۔ مگر ان کے خرچ پر شک ہو سکتا ہے۔ شیخ جی کا لڑکا باہر رہتا ہے۔ اپنے ساتھ اپنے لڑکے کو رکھتا ہے جو اسکول میں پڑھتا ہے بتائیے، اتنا خرچ ۱۵ میں کیسے ہو سکتا ہے۔

داروغہ ۔ کچھ اوپر کی آمدنی بھی ہوگی۔ اچھا کسی طرح یہ پتہ چل سکتا ہے کہ شیخ جی کو ادھر روپیہ کی ضرورت تو نہیں تھی

رتن ۔ (اچھل کر) تھی تو ضرور۔ شخانی میری بیوی کے پاس آئی تھی کہ مجھے پچاس روپیہ دلا دو مکان بنانا ہے میں نے انکار کر دیا۔ ایسے کم حیثیت لوگوں کو روپیہ دینا۔ روپیہ اٹکانا ہے۔ جب آمدنی نہ ہو تو کہاں سے ادا کریں گے۔

داروغہ ۔ اچھا۔ وہ برتن آپ نے کتنے کا خریدا تھا۔

رتن ۔ کتنے کا خریدا تھا۔ یہ تو نہ پوچھئے۔ ایک دن ایک صاحب، جن کو میں پہلے سے جانتا تھا گھبرائے ہوئے آئے کہ صاحب دس روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔ یہ برتن رکھ لیجئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں سو دو سو سے کم کا معاملہ نہیں کرتا، کسی بنئے کے پاس جائیے۔ وہ پریشان بہت تھے آنسو بھر لائے، اور کہنے لگے کہ میں آپ کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ مجھے ترس آگیا، اور برتن بھی کچھ پسند آگیا۔ میں نے دس روپیہ صندوقچہ سے نکال کر دیدئے۔ اس دن سے آج تک ان کی صورت نہیں دکھائی دی۔

داروغہ جی - تو آپ کو گویا دس روپیہ کا پڑا۔

رتن - یہ تو نہ کہئے۔ ہم تو روپیہ کے تاجر ہیں۔ اگر وہ دس روپیہ نقد ہوتے، اور چلتے رہتے تو آج ۵ برس میں کم از کم ۳۰ تو ہو گئے تھے۔ اب اندازہ کر لیجئے کہ برتن کتنے کا پڑا۔

داروغہ - "وہ برتن ۲۰ - ۲۵ کی مالیت ہو سکتا ہے۔" رتن "اس میں کیا شک ہے۔"

داروغہ - شیخ جی۔ یا شخانی کی آپ کے یہاں آمد و رفت رہتی ہے؟

رتن - اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ابھی پچھلی بار جب روپیہ مانگنے آئی ہے تو یہ کمرہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ اور میں کچہری گیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جاتے وقت چپکے سے اندر گھس گئی ہو اور برتن لے کر کپڑوں میں چھپا چلدی ہو۔

داروغہ - آپ تو کہتے ہیں کہ برتن کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا، اور چرانے کے بعد کسی نے اسی جگہ، اینٹ رکھدی۔ اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس میں کسی گھر والے کا ہاتھ ضرور ہے۔ اچھا آپ کو پتہ کیسے چلا کہ شیخ جی کے یہاں برتن ہے۔

رتن - اس محلے میں ایک عورت بغاطن رہتی ہے۔ جو ادھر ادھر پکانے کی نوکری کرتی رہتی ہے شخانی نے اس سے کل دال مانگ بھیجی۔ جب وہ دینے گئی، اور ان لوگوں نے اس کو آتے دیکھا تو کپڑے سے برتن ڈھک دیا۔ مگر وہ کچھ کھلا رہ گیا۔ اس پر بغاطن کی نگاہ پڑ گئی اس نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو شخانی نے اڑن گھائیاں بتائیں۔ بغاطن نے میری مہری سے کہا۔ بغاطن، اس وقت گھر ہی میں ہے؟ کہئے تو بلاؤں ———— (گھنٹی بجاتا ہے) ———— (حکومت سے) گھر میں کہدیا تھا کہ اگر بغاطن آئے تو اس کو روک لینا۔ دیکھو اگر وہ ہو تو اسے یہاں بلا لاؤ۔

داروغہ - شیخ جی کی ایسی حیثیت نہیں کہ ان کے گھر پاٹ ہو، اور پھر شخانی نے بغاطن کو دیکھ کر اس کو ڈھک دیا یہ تو بتاتا ہے کہ ....

رتن - وہ تو میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ لوگ بہت چھوٹی حیثیت کے ہیں۔ پیٹ پالنے کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے اتنا بڑا خاندان ۱۵ روپیہ میں کیسے گذر کرتا ہوگا۔

داروغہ جی۔ مکان ان کا ذاتی ہے

رتن ۔ بھگوان جانے۔ مکان میں دھرا ہی کیا ہے۔ ایک چھپر' ایک کوٹھریا۔ چار دیواری بھی ایک طرف سے گر گئی ہے۔ وہ تو جب روپیہ کا معاملہ ہونے والا تھا میں نے ان باتوں کی دیکھ بھال کی تھی۔

—— داروغہ جی' اس محلے میں دو ایک بھلے مانسوں کے علاوہ سب ٹکڑ گدے بستے ہیں۔ جو آٹھ آنے پیسوں کے لئے جان لے لیں۔ مجھے تو یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کسی دن یہ لوگ آکر مجھے نہ لوٹ لیں۔

وہ تو کہئے آپ لوگوں سے بڑی دوستی ہے اس لئے ذرا دبے رہتے ہیں۔

داروغہ جی۔ آپ سول لائن میں' کوئی مکان کیوں نہیں لے لیتے؟

رتن ۔ کئی دفعہ یہی ارادہ ہوا۔ روپیہ کا تو کچھ خیال نہیں۔ بس یہی ہے کہ رہتے سہتے اس مکان سے ہم لوگوں کو ایک لگاؤ سا ہو گیا ہے۔

داروغہ ۔ اجی اس کی تو نہ کہئے۔ جہاں رہنے لگے وہیں سے لگاؤ ہو جاتا ہے۔ اس حصے میں تو سو برائیاں ہیں۔ گنجان آبادی۔ خراب راستے' ہر طرف گندہ غلیظ۔ اگر بیماری پھیلے تو اسی طرف سے پھیلے۔ دوسری بات یہ ہے چور' اچکے' خونی سب ایسے ٹکڑ گدوں میں تو پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بارہ برس پولیس میں رہ کر میں نے سیکھا ہے۔

رتن ۔ بات تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ نے کیا چوری۔ یہاں رہ کر پھر بھی ان لوگوں سے تھوڑا بہت پیسہ واپس مل جاتا ہے۔ اگر یہاں سے ٹل جاؤں تو سب مٹی میں مل جائے۔

(جوتیوں کے سڑ سڑ کی آواز آتی ہے)

بفاطن ۔ (اطمینان سے زبان اینٹھ کر) سلام وکیل (گھبرا کر سیدھی طرح سے' اور ذرا آہستہ سے) صاحب۔ سلام داروغہ جی سلام۔

داروغہ ۔ ادھر آؤ۔ دیکھو جو کچھ کہنا سچ کہنا' اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔

بفاطن ۔ اے لو' میں کبھی جھوٹ بولتی ہوں جو بولوں گی؟

داروغہ ۔ بات تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

بفاطن ۔نہیں صاحب ۔ پاٹ کہتے تو میں نے اسپچھ کو سنا ۔ ہاں گول گول کالے رنگ کا ایک برتن ضرور آنکھوں سے دیکھا تھا۔

دروغہ ۔ ہاں یہی مطلب

دروغہ ۔ برتن تم سے کتنی دور تھا ؟

بفاطن ۔بس جتنی ہمارے آپ کے بیچ میں دوری ہے ۔

دروغہ ۔کیا وقت ہوگا ؟

بفاطن ۔میں کوئی گھڑی دیکھ کر تھوڑے چلتی ہوں ۔ مجھے کیا معلوم کیا وخت ہوگا ۔ شام ہوئے دیر ہو چکی تھی ۔ آٹھ کا "ٹیم" ہوگا

دروغہ ۔ وہ لوگ کہاں بیٹھے تھے ۔

بفاطن ۔چھپر کے نیچے

دروغہ ۔جب تم وہاں گئیں تو وہ لوگ کیا کر رہے تھے ۔

بفاطن ۔میں گئی تو چھپر کی طرف اندھیرا سا معلوم ہوا ۔تب میں سیدھی چولھے کی طرف چلی ۔میں نے کہا اے سکھانی کہاں ہیں ۔تب سکھانی نے میری آواز سن لی ' اور بولی ادھر آؤ ۔میں جو گئی تو جھٹ انھوں نے برتن پر کپڑا ڈھانک دیا ۔

دروغہ ۔جب وہاں اندھیرا تھا تو تم نے برتن کیسے دیکھ لیا ؟

بفاطن ۔اس کے پاس تو لال ٹین دھری تھی ۔

دروغہ ۔پھر وہاں اندھیرا کیسے تھا ۔

بفاطن ۔(اکتاکر) ایک تو لالٹین موئی ' چندھی چڑی ' تھی ۔ پھر دونوں ' بڑھیا بڑھوے ' بیچ میں برتن کے پاس ' لالٹین ' ٹھونسے ' بیٹھے تھے ' اندھیرا نہو تا ۔

دروغہ ۔برتن کا رنگ کیسا تھا ۔

بفاطن ۔برتن تو ڈھکا ہوا تھا ۔ ذرا سا جو دکھائی دیتا تھا وہ تھا سفید سفید ۔ اور کنڈھا کھلا ہوا تھا

وہ تھا کالا کالا۔

دروغہ ۔ برتن پر کچھ پھول پتیاں بنی تھیں ؟

بفاطن ۔ کنڈے پر کچھ سفید سفید چمکتا ہوا تھا تو ضرور۔ کچھ پھول سا۔ چمکتا تھا جیسے تارا ۔ اور پھول شاید ' کچھ پتیاں بھی ہوں۔

دروغہ ۔ تم واں کس کام کو گئیں تھیں ۔

بفاطن ۔ میں نے کل دن کے ' وخت ' چنے کی روٹی پکائی تھی میر خفو نے وہ نیل مچایا کہ میں دال بھات کھاؤں گا۔ دال بھات کھاؤں گا ۔ لاکھ جتن کئے وہ ' آگ لگا ' نہ مانا تب میں نے کہا لاؤ سکھانی کے ییاں سے تھوڑا سا دال بھات مانگ لاؤں ۔

دروغہ ۔ " تم نے مہری سے تو کہا تھا کہ شخانی نے دال مانگی تھی ۔ اور تم دینے گئیں تھیں "

بفاطن ۔ (اپنے کو گرفت میں پاکر) کہا ہوگا ۔ (ذرا تیزی سے) اے میں نے کب کہا ۔ مہری آکر کہدے میرے سامنے ۔ میں فوراً جھٹلا دوں گی ——— کہدوں گی اس کے منہ پر کہ تو جھوٹی ہے۔ (حسرت سے) ان کا بیٹا ۱۵ روپیہ کا نوکر ہے ۔ دونوں ' وخت ' گھر میں چولھا جلتا ہے۔ وہ بھلا مجھ دکھیا سے دال مانگیں گی۔

دروغہ ۔ اب خوب سوچ کر بتاؤ کہ برتن پر پھول بنے تھے ؟

بفاطن (کچھ سوچ کر) ' شاید ' ہوں گے۔ بڑا سا کوئی پھول ۔ سفید سفید ۔ کیا جانے کپڑا تو اوڑھا ہوا تھا۔ بہیتر کا حال معلوم نہیں پڑتا تھا۔

دروغہ جی ۔ یہ تو تم کو معلوم ہے کہ وکیل صاحب کا پاٹ چوری گیا ہے ۔ اور تمھارے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی پاٹ شیخ جی کے گھر میں ہے ۔

بفاطن ۔ نہیں ——— ہاں وکیلنی مجھ سے کہہ رہی تھیں ۔ میں نے کہا کہو قسم کھا جاؤں جو میں کچھ بھی جانتی ہوں کہ کون موا اٹھالے گیا ۔

دروغہ ۔ اس طرح کام نہیں بنے گا ۔ تم پھنس جاؤگی ۔ ورنہ جو میں کہوں وہ کرو۔

بفاطن میں پھنس جاؤنگی! ایسا اندھیر انہیں! اے میں دیکھنے بھر کی گنہگار ہوں۔ ورنہ مجھ بچاری کو اپنے گھر ہی سے کہاں لا چھٹی جو دوسروں کو چرا چرا کر برتن دیتی پھروں ــــــ اور چراتی تو آپ رکھ لیتی۔ دروغہ جی میں انہیں صاحب کے گھر کام کر چکی ہوں ــــــ ہاں ــــــ ابھی جو کچھ ہوا تو ڈپٹیائی کے پاس چلی جاؤں گی۔

دروغہ جی (ذرا ڈپٹ کر) چپ رہ۔ بک بک مت کر۔ ابھی حوالات میں بند کر کے سڑا ڈالوں گا۔ ساری بکواس نکل جائے گی۔ جب تو نے ایسی چیز شیخ جی کے یہاں دیکھی تھی تو تھانہ میں آکر رپٹ کیوں نہیں لکھائی۔ ڈپٹی صاحب ہوں کہ لاٹ صاحب قانون کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔

بفاطن (گھبرا کر، چلا کر) ہائے مالک میں کیسے 'اجاب' میں پڑ گئی۔ کیوں اس گھڑی وہاں دال لینے گئی تھی۔ مرے یہ کمبخت منا۔ غارت ہوا ــــــ اے لوگوں کیسا اندھیر ہے۔

دروغہ ۔ سن جو ہم کہیں وہ کر تو صاف چھوٹ جائے گی۔ ابھی جا کر شیخ جی کے یہاں دیکھ کہ وہ برتن کس قسم کا ہے اس پر پھول پتیاں بنی ہیں یا نہیں۔ اور اگر نہیں ہیں تو کس وضع کی ہیں۔ کس رنگ کی ہیں۔

بفاطن ۔ سکھانی بڑی چلتی ہوئی ہیں۔ جب انھوں نے اس دن مجھے دیکھتے ہی کپڑا ڈال دیا تو اب کیا دیکھنے دیں گی۔

دروغہ ہم یہ نہیں جانتے۔ کسی نہ کسی طرح دیکھ کر آ ــــــ خبردار ان کو نہ معلوم ہونے پائے کہ تو یہاں بھیجی ہوئی ہے۔ ورنہ کالے پانی بھجواؤں گا۔ کالے پانی۔ یاد رکھنا۔ اچھا جا ــــ ادھر جا کر بیٹھ جب ہم بلائیں تب آنا۔

(سڑ سڑ کرتی بڑبڑاتی ہوئی جاتی ہے)

دروغہ ۔ وکیل صاحب! شبہ کی تو گنجائش ہے۔ اگر کوئی خاص بات نہ ہوتی تو شخانی برتن کپڑے سے کیوں ڈھانک دیتیں۔ مگر اس پگلی سے مخبری کا کام نہیں چل سکتا۔ سیدھی سی تو یہ ترکیب ہے کہ آپ رپٹ لکھا دیجئے کہ ایسا ایسا برتن میرے یہاں سے غائب ہو گیا ہے، اور شیخ جی پر شبہ کیا جا سکتا ہے میں ابھی تلاشی کراتا ہوں۔

(خاموشی ۵ اسکنڈ)

رتن (ٹہلتا ہے۔ آواز دھیمی، اور پھر تیز ہوتی رہتی ہے) کچھ ایسی باتیں ہیں کہ رپٹ لکھانا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میرا پڑوسی غریب ہو یا امیر میں سب کو بھائی سمجھتا ہوں۔ ان کی عزت اپنی عزت سمجھتا ہوں۔ جب تک یقین نہ ہو جائے کہ وہ پاٹ میرا ہی ہے۔ میں اس طرح ان لوگوں کے گھر کی تلاشی کرا کے، ان کو دوسروں کی نظروں میں گرانا نہیں چاہتا۔ اور دوسری بات یہ ہے (ذرا سنبھل سنبھلکر لہجہ بناتا ہے کہ اصل بات یہی ہے) ایک کباڑی نے ایک برتن اسی قسم کا خریدا ہے۔ میں نے تو پہچان لیا کہ وہ میرا نہیں ہے۔ مگر میری بیوی ——— آپ تو جانتے ہیں کہ عورتیں ہر چیز کو سرسری دیکھا کرتی ہیں ——— میری بیوی کو شک ہوتا ہے کہ وہ پاٹ میرا ہی ہے۔ تو روپیہ میں ایک آنہ ایسا ہو سکتا ہے کہ وہی کباڑی والا پاٹ میرا ہو جائے۔ اس لئے اس طرف سے بے فکر نہ ہونا چاہئے اور وہ کباڑی کہتا ہے کہ ——— وہ کباڑی جو ہے ——— وہ میرے باپ کے وقت سے آتا جاتا رہتا ہے وہ ذرا پھنس جائے گا۔

داروغہ ۔ رپٹ لکھانے کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں رہے گی۔

وکیل صاحب ۔ نہیں نہیں رپٹ جانے ہی دیجئے۔ آپ اپنی ہی طرف سے کچھ کارروائی کر لیجئے۔ نہیں تو جانے دیجئے پاٹ کو۔ ایک وجہ ذرا اور ہے ——— آپ تو جانتے ہیں کہ سکھ لال ۱۷۔۱۸ برس کا ہے۔ مگر ہے ابھی بچہ ہی۔ اور آپ بھی کہتے ہیں کہ کسی گھر کے آدمی کا ہاتھ ہو سکتا ہے اور وہ ہے بھی ذرا شریر ——— یعنی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ یوں ہی پتہ چلانے کی کوشش کیجئے۔ فیض جی کو ڈرائیے دھمکائیے۔ اگر بلا رپٹ لکھائے تلاشی ہو سکے تو تلاشی بھی کرا لیجئے۔

داروغہ اچھی بات ہے۔ کوشش کروں گا۔ ذرا بغاطن کو ادھر بھیجدیجئے۔ دیکھئے اگر اس بگلا سے کھا پڑھا کر کام نہ نکالا تو کچھ نہیں کیا۔

ایکٹ دوسرا سین تیسرا

زلفن - اماں دیکھو پجامہ کتنا سفید ہو گیا۔ پاٹ سے ملا کر دیکھوں؟

شخانی - چل گدھی۔ وہ ولایت کا بنا ہوا ہے۔ تیرا پجامہ گھر کا دھلا۔ اس کی کیا برابری کریگا۔

——— ارے یہ تو آگیا۔ نذرو کہاں رہ گیا۔

یامین - (۱۴ برس کا سن) ابا مزدور کے سر پر سامان لا رہے ہیں۔ ہم آگے آگے بھاگ آئے

سلام۔ سلام۔ سلام۔ سلام

شیخ جی جیتے رہو

شخانی جیتے رہو

یامین کی ماں خوش رہو

زلفن اچھے رہو

یوسف - پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ او ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن

یامین - ہا ہا ہا۔ انھوں نے انگریزی شروع کی ہے۔

زلفن - انگریزی کیا شروع کی ہے۔ دادا ایک پاٹ لائے ہیں۔ کل عید ہے۔ جا جم بچھی گی اس پر پاٹ دھرا جائے گا۔ اس میں سوئیاں ہوں گی۔ پیالوں میں نکال نکال کر دی جائے گی سب چمچوں سے کھائیں گے۔

یامین - کیسا پاٹ

زلفن - اتنی بڑی کنڈالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے چار کی پیالی

یوسف کی ماں (بے حد خوش ہو کر) یوسف کہہ رہا تھا کہ اماں کیا بڑے لوگ بڑی پیالیوں میں چار پیتے ہیں (سب قہقہہ لگاتے ہیں) (یوسف کو آواز سے پیار کرتی ہے) یہ بڑا سیانا ہوگا خوب کمائی کرتے جائے گا۔

یوسف ۔ پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ او ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔

شیخ جی (دور سے) پاٹ لاکر تو دکھاؤ۔ ایک جگہ ذرا ٹھیس لگ گئی ہے۔ ورنہ روپوں کا مال ہے (چر چر جوتوں کی آواز آتی ہے۔ کوئی آکر کھٹ سے صندوق رکھتا ہے۔ پھر باہر جاتا ہے اور بستر لاکر بھو سے ڈالتا ہے)

نذرو ۔ لے پائین جاکر پیسے دے آ۔ آداب۔ آداب

شجانی ۔ جیو

شیخ جی ۔ جیو

زلفن ۔ سلام

نذرو ۔ یوسف تجھے سلام کرنا نہیں آتا۔

یوسف ۔ (چپکے چپکے) پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن

نذرو ۔ اچھا۔ انگریزی یاد کی ہے۔ یہ تو بڑا شوکین نکلا۔ واہ وا

شیخ جی ۔ ابھی ٹھہرو۔ ایک چیز تو دیکھو۔ جلفن کہاں ہے؟ پاٹ لا —— ہم ایک پاٹ نخاس سے خرید کر لائے ہیں۔ کیا عمدہ چیز ہے! ۔ پانی اس میں رکھو۔ کپڑا اس میں رنگو۔ ابھی عید کے دن۔ اس میں سوئیاں نکال کر رکھی جائیں گی۔ یہ گنوار پنا ہے کہ پتیلی سے نکال نکال کر دے رہے ہیں۔ ہم نے شیخ مدارو کے گھر دیکھا۔ بڑی سی لگن میں سوئیاں تھیں۔ اور بھاوج بیٹھی سب کو نکال نکال کر دے رہی تھیں۔ آدمی کی حیثیت بنانے سے بنتی ہے۔ تب چار آدمی عزت بھی کرتے ہیں۔

نذرو ۔ (تعجب سے) یہی پاٹ ہے!

شیخ } ساتھ ہی { ہوں
زلفن } ساتھ ہی { جی

نذرو ۔ یہ! ۔ معلوم ہے کہ صاحب لوگ اسے کس کام میں لاتے ہیں؟

شیخ ۔ کس کام میں ؟

نذرو ۔ یہ کونڈے کے کام میں آتا ہے

شیخ جی ۔ (جلدی) اسی لئے تو میں لایا ہوں

نذرو ۔ گول گونڈا ؟ جو بڑے لوگوں کی چوکی کے نیچے رکھا جاتا ہے (وقفہ ۵ سکنڈ)

شیخ جی ۔ پا ——— پتا ———

نذرو ۔ اں (کھینچ کر)

(وقفہ ۲۰ سکنڈ)

شخانی ۔ (ذرا آہستہ سے ۔ لہجہ ایسا ہے گویا اپنے اوپر طعن کر رہی ہے) بناؤ اب حیثیت ۔ ایک رہی سہی نگوڑی ذات تھی وہ بھی گئی ۔

زلفن ۔ اب کیا ہوگا ؟

شیخ جی ۔ ہوگا کیا ۔ بھلا کہیں ممکن ہے کہ ایسی عمدہ نفیس چیز ایسے برے کام میں آتی ہو (بگڑ کر) یہ لونڈے جہاں کسی قابل ہوئے چلے اپنے بڑوں کو وہ بنانے ۔ میں دنیا دیکھ چکا ہوں ۔

نذرو ۔ ابا تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو ۔ میں اور اتنی چھوٹی سی بات نہ جانوں ۔ صاحب لوگوں کے ساتھ رہتا ہوں ۔ سب طور طریق دیکھے ہوئے ہوں ۔ دو ایک بار خانساماں جی سے کہہ کر خود پاٹ پر گیا بھی ہوں ۔

شیخ جی (کھسیانہ غصہ) بس چپ رہ ۔ چلا بڑا 'لقاطوں' بننے ۔ صاحب بہت سمجھ دار ہوتا ہے ۔ (زور سے گویا قائل کرنے والی دلیل مل گئی) وہ یہ کبھی نہیں کر سکتا کہ روپوں کی چیز خریدے اور اس میں پھینک دے ۔ (سمجھا کر) یہ اور بات ہے کہ جو ذرا ٹوٹا پھوٹا ہوتا ہوگا ۔ اسی کام آجاتا ہوگا ۔ چلے ہیں ہم کو بنانے ۔

یامین ۔ نہیں دادا ۔ ہم نے بھی اسکول میں دیکھا ہے ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے لئے جو چوکی ہے اس کے نیچے رکھا رہتا ہے ۔

شیخ جی - چپ کمبخت تیری بھی اب یہ توفیق (بہت بھرپور تلفظ) ہو کہ مجھے وہ کہے - ماروں گا ایک لپڑ منہ ادھر سے ادھر ہو جائے گا۔

شخانی - میں بھی کہتی ہوں کہ ایسی اچھی چیز اس طرح کوں ناس کرے گا۔

نذرو - اماں تم تو جانتی نہیں ہو۔ صاحب لوگ صفائی کو بہت پسند کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ گندے پن سے بیماری پھیلتی ہے۔ اگر تم کبھی وہ جگہ دیکھ لو جہاں یہ بات اور سب سامان لگا ہوتا ہے تو تم کہو گی کہ یہ بہشت ہے کہ کوئی چیز ہے کیا ہے۔ قرآن قسم ہم جب کبھی خانساماں سے کہہ سن کر وہاں گئے تو بس آنے کا جی نہیں چاہتا تھا روز صابن سے تو وہ جگہ 'دوش' کی جاتی ہے۔

شخانی - یہی سے وہ لوگ ایسے موٹے تازے ہوتے ہیں۔ بدن سے خون ٹپکا پڑتا ہے۔

نذرو - وہاں دن بھر صفائی ہوتی رہتی ہے۔ صاحب میم کے ایک جوڑے کے لئے چار چار بیرا ہوتا ہے وہ بھی صاف رہتا ہے۔ یہی سب باتیں ہیں جس کی وجہ سے وہ بادشاہت کرتے ہیں۔

یاسمین (ذرا جوش سے) ابا ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی تو اسی طرح رہتے ہیں۔ ایک اور ماسٹر صاحب ہیں ان کے پاس بھی بیرے ہیں۔

شیخ جی - پھر یہ بولا۔ اس کو تو نذرو نے پاس رکھ کر اور چوپٹ کر دیا۔ چلا ہے تیرا ہیڈ ماسٹر کا بچہ بننے۔

نذرو - ابا تم تو جب سے سٹھیا گئے۔ کچھ خیال نہ 'دیال' کہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا نہیں۔

شخانی - سٹھیا نہ جاتے تو یہ موا کونڈا اٹھا لاتے —— توبہ —— چھی —— وہ تو کہو اس میں کچھ کھایا پیا نہیں (شک کر) حیثیت بنائیں گے۔ حیثیت بنائیں گے۔۔ اگر یہی خدا کو 'منظور' ہوتا تو صاحب لوگ نہ بناؤ تھا۔ وہ تو کہو خدا نے کیا لڑکا ۱۵ روپیہ سے لگ گیا نہیں تو اپنے بھائی کی طرح دردر کی ٹھوکریں کھاتے گھومتے۔

شیخ جی (بڑا افروختہ ہو کر) میرے بھائی کو تو کہتی ہے۔ اور اپنے گھرانے کو نہیں ملاحظہ (ملاحظہ کرتیں جن کو ڈلیا ڈھونے کو نہیں ملتی۔ ابھی دس روز کی بات ہے کہ دو روپیہ مانگنے آئے تھے۔

شخانی (بات کاٹ کر تیزی سے) ان کو کیوں کہوں۔ وہ کیا حیثیت بناتے پھرتے ہیں بے گھر گور کا

میلا بیٹھنے کا برتن نخاس سے اٹھالاتے ہیں ۔ مزدوری سیکڑوں کو نہیں ملتی ۔ لاکھوں بچارے ہیں جہان سے بھی ' جیادہ محتاز ' ہیں ۔ ارے مرا تو وہ گھر ہے ۔ جہاں روپیہ برساہے روپیہ ۔ بچپن میں اس بندی نے پتوں ملائی کھاڈالی ۔ یہ تو تمہارا گھر ہے کہ مہینوں دال روٹی کھائے بیت جاتے ہیں ۔ وہ بھی میرا لڑکا جب سے سرکار میں نوکر ہوا ۔ تب سے یہ بھی جڑنے لگا ۔ ورنہ وہی تھا اس کا سودا لائے تو کچھ مل گیا اس کے سودے سے کچھ نکال لیا ۔ اس کے دام کاٹے ۔ اس کو ٹھگا ۔ ارے ہاں یہی تو تھا جو اتنے دنوں کام چلا ۔ آگ لگے اس گھر کو ۔ ذرا عیش (ثقیل تلفظ) نہ جڑا

شیخ جی (طعن سے) وہ بھول گئیں جو کا مدانی کا دوپٹہ اوڑھا تھا ۔ کھیریں کھایا کرتی تھیں ۔

شخانی (آپے سے باہر ہوکر) لے مالک ۔ ایک دفعہ کا مدانی کا دوپٹہ کیا اوڑھ لیا جنم بھر کو ٹھیکہ ہوگیا ارے میں بھی ' جوان جہاں ' تھی ۔ اتنی ارمان بھی نہ نکالتی (چٹک کر) ارے وہ تو کہو میری کوئی اور بندی ہوتی تو وہ تگنی کا ناچ نچاتی ۔ دوپٹہ اوڑھا تھا ۔ کھیریں کھایا کرتی تھی ۔ دودھ میں چاول گھونٹ کر پکاتے کہ منہ میں چلے جائیں کچھ نگل لوں ' وہ کھیر ہوگئی ــــــــــــــــــ

نذرو ۔ اے اماں خدا کے لئے چپ رہو ۔ پڑوس کے لوگ کیا کہیں گے ۔ ہائے اللہ میرا بھی کیا نصیب ہے گھر آیا تھا کہ ذرا خوشی میسر ہو ۔ آتے ہی یہ طوفان مچ گیا ۔

شیخ جی ۔ (بے تکی اونچی آواز سے) بالکل جھوٹ ۔ یہ تم دونوں ماں بیٹیوں کی کارستانی ہے یہ باٹ ' وہ کونڈا نہیں ہو سکتا ۔ زلفن ادھر لا میرا باٹ

یوسف ۔ پی ۔ او ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن ۔ پی ۔ اُو

شیخ جی (حد سے زیادہ اونچی آواز سے) چپ

شخانی } ایک ساتھ { چپ ۔ چپ
یوسف کی ماں } ایک ساتھ { چپ ۔ چپ

یوسف رونے لگتا ہے

شخانی ۔ اچھی بہو ملی ۔ ساس بیٹھی ہوتی ہے ۔ اور خصم کے سامنے ٹرٹر کرتی ہے ـــــــ تو

کیوں روتا ہے یوسف۔

شیخ جی (ڈانٹ کر) چپ چپ

نذرو ۔ چپ یوسف (یوسف کی ماں یوسف کو دھب دھب مارتی ہے) ہائیں ہائیں۔ اے مارتی کیوں ہے، ارے مارتی کیوں ہے ؟

(شنانی دوڑ کر جاتی ہے)

چھوڑ۔ مردار۔ چھوڑ۔ یہ بہو بھی ایسی ملی کہ ہمیشہ معصوم بچے پر جھانجھ اتارتی ہے آگ لگے اس بات پر۔ جب آیا تو یہی تھکا فضیحتی ہوئی۔ اور آج جو موئے کی وہ ـــــ کھلی تو یہی ـــــ اسے یہ تو ہم لوگوں کے نصیب میں لکھا ہے۔ حیثیت حیثیت جو یہ تمھارے رٹتے تھے تو خدا کو برا لگا کہ ہم کو پیدا کیا کیچڑ میں اور یہ چاہیں ہیں کہ بیٹھیں جاجم پر

شیخ جی (ہاری مانتے ہوئے) اور وہ جو تم کہتی تھیں کہ لڑکی کی کہیں سے اچھی بات نہیں آتی جب تک اپنی حیثیت نہو اچھی بات کیسے آئے گی۔ میں نے تو تمھارے بھلے کی سوچی تھی (ذرا زور پکڑ کر) اور اب بھی پیسہ ہو تو جاکر لمپ لے آؤں۔ (یوسف رونا بند کر دیتا ہے)

شنانی (اس جگہ پہنچتی ہے) اس کے نصیب میں ہوگا۔ چھپر پھاڑ کر اچھی بات آئے گی۔ ہوتا ہی ہے۔ اگلے زمانے میں بادشاہوں نے غریبوں کے گھر شادیاں کیں تو کیسے کیں۔

نذرو ۔ اماں خدا کے لئے۔ اس جھک جھک بک بک کو ختم کرو۔ ہائے اللہ اس سے تو اچھا تھا کہ میں نہ آتا۔

یامین ۔ چلو ابا چلیں

شیخ جی ۔ پھر بولا۔ اس کا تو بولنا مجھے زہر لگتا ہے۔

نذرو ۔ (تڑاق سے تھپڑ دیتا ہے) ملعون !

شنانی ۔ اے لو۔ اور لو بیوی نے ایک کو مارا تھا۔ تو میاں اپنی لیاقت (نقل) کیوں نہ بگھاریں

نذرو ۔ یا اللہ میرا تو جی ہے کہ نکل جاؤں۔ یا کچھ کھا کے سو رہوں۔ دفتر میں چپراسیوں کی خوشامد کرو

پاؤں کی جھڑکیاں سہو۔ وہاں سے مرتے ہوئے آؤ اور کھانا پکاؤ۔ تب دوزخ سپٹے۔ اوپر سے بڑی مصیبت بنٹے کا تقاضا۔ نہ موقع دیکھے نہ محل۔ سر پر کھڑا ہوا ہے منشی جی لاؤ روپیہ لاؤ۔ لو پکی آمدنی جو دو ایک روپیہ ہو جاتی تھی وہ الگ بند۔ کیا زندگی ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ مزدور ہوتا شام کو ڈلیا ڈھو کر آتا۔ اور مزے سے ٹانگیں پسار کر پڑ رہتا۔

شخانی ۔ تو یہ آج کھلا اوپر کی آمدنی بھی تھی۔ جو سینت کر اپنی چھبیلی کو لا کر دیتے ہوں گے۔

نذرو ۔ بچتا کیا ہے جو اس کمبخت کو دوں۔ دو دو آدمیوں کا کھانا۔ ارے اماں اب یامین بھی برابر کا کھانے والا ہو گیا ہے۔ ایک روپیہ مہینہ کمرے کا دینا ہوتا ہے۔ یامین کی آدھی فیس پر کتابیں خریدنا ہوتی ہیں۔ اے اماں ذرا سمجھو تو اگر کچھ بچتا تو بنٹے کا قرضہ کیوں رکھتا جس نے زندگی اجیرن کر دی ہے

شخانی (بڑبڑاتی ہے) باپ بیٹے دونوں کی ایک بناوٹ ہے

شیخ جی (ذرا شیر ہو کر) ہاں ہم دونوں کی تو ایک بناوٹ ہے۔ سب 'منحوسیت' تو تمھاری ہے تمھاری منحوسیت سے اچھا خاصا 'پاٹ' کونڈا نکل گیا۔

نذرو ۔ اے ابا ہاتھ جوڑوں۔ پیر پڑوں' اب اس کمبخت کا ذکر جانے دو۔ یہ بھی سمجھ لو کہ اگر برادری میں بات نکل گئی تو بیٹھے بٹھائے حقہ پانی بند ہو جائے گا۔ خوشامد درآمد کر کے اگر پنچوں نے 'جرمانے' ہی پر بات ختم کر دی تو بھی اتنا بھی تو نہیں ہے کہ دس روپیہ کہیں سے لا کر دوں۔ اگر ہوتے تو گھر کی مرمت نہ ہو جاتی ——— یامین صندوق تو اٹھا لانا۔ ابا ——— دیکھو تم لوگوں کے لئے چپٹیاں لایا ہوں۔

(صندوق کھلنے کی آواز آتی ہے۔ چپٹیوں کی کھڑکھڑ سنائی دیتی ہے۔ خاموشی ایک منٹ)

نذرو ۔ اب دیکھ لو کون کس کے پاؤں میں ٹھیک آتی ہے۔

شیخ جی (ایک چپٹی پہن کر کھٹ کھٹ چلتے ہیں) بالکل ٹھیک' بالکل ٹھیک۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے ہی پاؤں کے لئے لی تھیں۔ (کھٹ کھٹ)

زلفن ۔ یہ میرے پاؤں میں ٹھیک ہو گی۔

شخانی ۔ابھی نہیں ۔ پہلے ان چاروں کو لے جاکر اپنی بھابی کو دکھا ۔ ان کو کون پسند ہے ۔

(زلفن کھٹ کھٹ کرتی جاتی ہے)

شخانی (اونچی آواز سے) ارے ابھی ان کو جھوٹی نہ کر ۔ پہلے بہو کو دکھا لے ۔

شیخ جی (بدستور ٹہلتے ہوئے) بڑا آرام ملتا ہے ۔ ہمارے جوتوں سے اچھی ہیں ۔ اب یہی پہن کر بزار جایا کروں گا (وقفہ ۵ اسکنڈ) یوسف ایک جوتی پہننے کو دے رہا ہے اور بہت خوشی میں گا رہا ہے

پی ۔ او ۔ ٹی ۔ پاٹ ۔ پاٹ معنی "برتن")

شخانی ۔ یہ ہمارے "لائق" ہے ۔

زلفن (کھٹ کھٹ کرتی آتی ہے) بھابی کو یہ رنگ برنگی پٹی والی اچھی لگتی ہے ۔

(چپکے سے) اماں یہ تو ہم لیتے

شخانی ۔ نخ ۔

(سڑ سڑ کی آواز آتی ہے ۔ اور بفاطن آتی ہے)

بفاطن ۔ اے سلام ۔ سلام ۔ سلام ۔ سلام ۔ اے میاں کب آئے —— اچھے رہے —— توبہ (گھبرا کر) میں کہتی کہ یہی بات ہے جس کے لئے ایسا اودھم جوت رکھا ہے ۔

بندرو (چوکنا ہو کر) کیسا اودھم ؟

شیخ ۔ اودھم کیسا باتیں کر رہے تھے ۔ اپنے گھر میں بھی زور زور باتیں نہ کریں ۔

شخانی ۔ ٹھہرو ۔ بات تو سمجھنے دو ۔ کیا بات ہے بفاطن ۔ بیٹھ تو جاؤ ۔

بفاطن ۔ اے کیا بتاؤں سکھانی ۔ کہنے والی بات ہو تو کہوں ۔ توبہ —— میں تو کہتی ہوں کہ بات نہ بات ۔ سوا اٹھنہ —— کیا بتاؤں یہ جو نہیں ہیں ۔ وکیل صاحب ۔ اے وکلائن کے میاں بیاج پر روپیہ چلتا ہے ۔ پیسہ والے ہیں ۔ انھوں نے آج درو گہ جی کو بلایا اور کمرے میں بیٹھ کر ان سے خوب باتیں کیں ۔

شخانی ۔ کیا باتیں کیں ۔

بفاطن ۔ وہ وردگہ جی مجھے بلاکر لگے ڈرانے دھمکانے ۔ میں نے کہا میں کیا جانوں کیسا پاٹ اور کون لے گیا ۔ میں نے نہ تمہارا پاٹ دیکھا ، اور نہ سیکھ جی کا ۔

مدرو (گھبرا کر) کیا مطلب ؟

بفاطن ۔ اے وہی ان کے یہاں کوئی پاٹ تھا ۔ وہ کوئی اٹھالے گیا ۔ کاہے کا ؟ ——— لوہا کہ جستے کا کالا کا لابنا ہوا ۔ کہتے ہیں اس پر چاندی کے پھول پتیاں تھیں ۔ اس پر چونے کا ایسا سفید رنگ پھرا تھا ۔ کہاں یہ پاٹ ، اور کہاں وہ

شخانی ۔ اے کمبخت لکھا ۔ تو اب اس پاٹ کے کارن ہم پر چوری لگے گی ۔

بفاطن ۔ وہ تو میں پہلے ہی سمجھی تھی ۔ وردگہ جی نے ایسا ڈرایا دھمکایا کہ نچاؤں گی تو یہ (جھٹکے سے) کروں گا ۔ وہ کروں گا ۔

شخانی (تلملا کر) تو تم کھبری کرنے آئی ہو ؟ کھبری ؟ مرو تم ۔ اور تمہارے وکیل اور وکلائن اور وردگہ جی ۔ حرامزادی ۔ ہم کو چور بنائے گی ۔ اب ہم ایسے گئے گذرے ہوئے کہ تیرے میرے گھر کے میلا اٹھانے کے کونڈے چراتے پھریں گے ۔ ارے وہ تو اگر ہیرے ٹکے ہوں تو بھی ایسی گھنونی چیز میں ہاتھ نہ لگاؤں ۔ بڑی بنی ہیں وکیلن اور وکیل ۔ ان کی عزت آبرو ہے ہماری عزت آبرو ہی نہیں ۔ ہم لوگ بھنگی ٹھہرے ۔ اے لوگوں پیسہ پاکر لوگوں کا کیسا سر پھر جاتا ہے ۔ بہاج کھانے والے ۔ قصائی کہیں کے ۔ آگ لگے ان کے گھر میں ۔ ستیاناس ہو جائیں وہ ——— اور تو حرامزادی ۔ نکل ابھی گھر سے ۔ ابھی نکل ۔ اور لے جا یہ 'میلے کا کونڈا' ان دونوں کے سر پہ پٹک دینا (دھڑ سے پاٹ پھینک دیتی ہے) چل مردار ابھی لے جاکر ان 'کیڑے پڑوں' کو دکھا ۔ نہیں تو ابھی مار کر دفن کر دوں گی ——— اٹھاتی ہے ؟

(بفاطن جلدی جلدی سڑسڑ کرتی جاتی ہے)

شخانی (بڑبڑاتی ہے) کیا آگ لگا کونڈا آیا تھا ——— چہ آنے کا نقصان ہوا ۔

مدرو ۔ پہلے تو میں سمجھا کہ بچوں کو ۔

شیخ جی (بات کاٹ کر) چار آلے کا۔ (چپکے سے) روزے میں پیدل مرتے ہوئے کیسے جلتے ——— وہ کون ساعت تھی جو میں نے اس پاٹ کو دیکھا تھا۔

یوسف (چپکے چپکے) پی۔ او۔ ٹی۔ پاٹ پاٹ معنی ———————————

ڈراپ

غزل

شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

جس قدر افسانۂ ہستی کو دہراتا ہوں میں
اور بھی بیگانۂ ہستی ہوا جاتا ہوں میں

تا کجا ضبطِ محبت تا کجا دردِ فراق
رحم کر مجھ پر کہ تیرا راز کہلاتا ہوں میں

میری ہمت دیکھنا میری طبیعت دیکھنا
جو سلجھ جاتی ہے گتھی پھر سے الجھاتا ہوں میں

یاد آیا ہے کہ ہر ہر سانس تھا لبریزِ عشق
اب تو نامِ آرزو بھی سن کے تھراتا ہوں میں

میں نہیں رہتا ہوں میں جب پاس آتا ہے وہ شوخ
دل نہیں رہتا ہے دل جب سامنے جاتا ہوں میں

یا کسی کے قہر پر بھی مسکرا دیتا تھا دل
یا نگاہِ لطف سے بھی آہ شرماتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گذرا چلا جاتا ہوں میں

تیری محفل تیرے جلوے پھر تقاضا کیا ضرور
لے اٹھا جاتا ہوں ظالم لے چلا جاتا ہوں میں

ہائے ری مجبوریاں ترکِ محبت کے لئے
مجھ کو سمجھاتے ہیں وہ اور ان کو سمجھاتا ہوں میں

تیرے اِک آنکھوں کا ساغر تیرے اِک رُخ کی بہار
یہ میسر ہوں تو ہر جنت کو ٹھکراتا ہوں میں

دل مجسم شعر و نغمہ وہ سراپا رنگ و بو
کیا فضائیں ہیں کہ جن میں حل ہوا جاتا ہوں میں

ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگر
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

ترکِ مے کو مدتیں گذریں مگر اب تک جگر
دیکھ کر جامِ تہی کچھ اشک بھر لاتا ہوں میں

احسن الکلام

کروں کیا مجھ سے تیرا سنگِ در چھوڑا نہیں جاتا
اٹھاتا ہوں قدم، لیکن دلِ شیدا نہیں جاتا

خوشی کیا آج کی ہو جب غمِ فردا نہیں جاتا
جئیں کیا بے خلش، جب موت کا کھٹکا نہیں جاتا

مریضِ عشق رہتا ہے جہانِ کس مپرسی میں
جسے پوچھا نہیں جاتا جسے دیکھا نہیں جاتا

یہ محویت ہے دل کی یا تری محفل کی دلچسپی
یہاں ہم بیٹھ جاتے ہیں تو پھر اُٹھا نہیں جاتا

خطا پر جو نہ ہو نادم، عطا کا مستحق کیا ہو
جسے لینا نہیں آتا اُسے بخشا نہیں جاتا

ترے جلوے کو ہم اے جلوہ گر سمجھیں نہ کیوں پردہ
دکھایا جا رہا ہے وہ مگر دیکھا نہیں جاتا

وہاں لب پر کبھی آتا نہیں ذکرِ دلِ محزوں
یہاں دل سے خیالِ حسنِ بے پروا نہیں جاتا

بلو جب تک نہ تم کیونکر مریضِ ہجر ہو اچھا
دوا جس کی نہیں ہوتی مرض اُس کا نہیں جاتا

شکستِ عہد پر ہر وقت وہ آمادہ رہتے ہیں
مگر ٹوٹے ہوئے دل کو کبھی جوڑا نہیں جاتا

جب آیا اُن کا پیکاں لے گیا تاب و تواں دل کی
یہ مہماں میزباں کے پاس سے تنہا نہیں جاتا

سمجھ لیتی جو عقل اُس کو تو یوں عاجز نہ ہو جاتی
کہ وہ سمجھا رہی ہے اور سمجھایا نہیں جاتا

جنونِ عشقِ صادق جانِ عاشق بن کے رہتا ہے
قضا جب تک نہیں آتی ہے یہ سودا نہیں جاتا

وہ احسن جس کا عالم آشنا تھا عشق سے پہلے
اسے دیکھے تو اب کوئی کہ پہچانا نہیں جاتا

(احسن مارہروی)

کلام آزاد

اب نہ وہ ارباب الفت کا لحاظ
اب نہ وہ مہر و محبت کا لحاظ

اب نہ وہ باہم وگر ملت کی شرم
اب نہ وہ صاحب سلامت کا لحاظ

کچھ مرے حقہائے الفت پر نظر
کچھ مری دیرینہ خدمت کا لحاظ

اب نہ ذہ قصد گنہ آساں نہیں
دل ہے اور اس کی معیت کا لحاظ

اب نہ وہ دن رات شغل نا و نوش
اب نہ وہ اوقات فرصت کا لحاظ

اب نہ وہ شوق طرب کا احترام
اب نہ وہ ذوق طبیعت کا لحاظ

اب نہ وہ ارماں بہجت کا ادب
اب نہ وہ سودائے عشرت کا لحاظ

اب نہ ظاہر پر نہ باطن پر نظر
اب نہ صورت کا نہ سیرت کا لحاظ

اب نہ تنگی کا نہ وسعت کا خیال
اب نہ کثرت کا نہ قلت کا لحاظ

جائیے بس شیخ صاحب جائیے
ہو چکا حضرت سلامت کا لحاظ

تم کو اپنے حلقۂ بیعت کی شرم
ہم کو اپنے اہل صحبت کا لحاظ

حضرت آزاد آخر تا کجا
ایک یار بے مروت کا لحاظ

✓ کچھ آثار رخ سے عیاں اور بھی ہیں
کچھ اسرار دل میں نہاں اور بھی ہیں

فقط وجہ قرب خدا ہی نہ سمجھو
مفادات عشق بتاں اور بھی ہیں

حرم میں پناہیں نہ پا سکنے والو!
مقامات امن و اماں اور بھی ہیں

ابھی ظرف قابل ہی جانچا گیا ہے
ابھی سیکڑوں امتحاں اور بھی ہیں

وہ اپنی وفا کو وفا ہی نہ سمجھیں — کہ ان کی وفا پر گماں اور بھی ہیں

زباں گرم اظہارِ الفت ہے لیکن — نظر سے ارادے عیاں اور بھی ہیں

سن اے یار اندازہ دانِ وفا سن — وفا کے کچھ اندازہ داں اور بھی ہیں

بتوں ہی سے ان بن کا خطرہ نہیں ہے — سجودِ خدا میں زیاں اور بھی ہیں

جو اہلِ حرم درپئے دشمنی ہیں — تو پروا نہیں آستاں اور بھی ہیں

کبھی مے کبھی دُردِ مے کے علاوہ — مراعاتِ پیرِ مغاں اور بھی ہیں

نذرِ قتلِ عالم روا رکھنے والو — تدابیرِ فتحِ جہاں اور بھی ہیں

غلامانہ خو اتفاقی ہے ورنہ

روایاتِ ہندوستاں اور بھی ہیں

شکوۂ غم بجا نہیں نہ سہی — حکمِ چون و چرا نہیں نہ سہی

انتہائے جفا نہیں نہ سہی — رحم کھانا روا نہیں نہ سہی

سیکڑوں خوبیوں کے مالک ہو — ایک صاحبِ وفا نہیں نہ سہی

آپ نے دردِ سن لیا ہوتا — درد کی کچھ دوا نہیں نہ سہی

دل ازل سے ترا آشنا سا ہے — آنکھ شکل آشنا نہیں نہ سہی

میں بھی سرکار ہی کا بندہ ہوں — لائقِ اعتنا نہیں نہ سہی

تو ہو اور تیری زلف اے رسا — میری قسمت رسا نہیں نہ سہی

الفتِ معنوی بھی کیا کم ہے — پرسشِ برملا نہیں نہ سہی

باطنی قرب اصل عزت ہے — ظاہری واسطا نہیں نہ سہی

دولتِ دردِ دل تو حاصل ہے — دولتِ دوسرا نہیں نہ سہی

آپ کا تو پتہ لگا ہی لیا — اب جو میرا پتہ نہیں نہ سہی

شکرِ غم پرملال کا کیا کام — قدرِ نعمت بجا نہیں نہ سہی

تم کہ دردِ جہاں کے درماں ہو
میرے دکھ کی دوا نہیں نہ سہی

آپ حکمِ سزا سنا بھی دیں
قصدِ عفوِ خطا نہیں نہ سہی

صبر کی تاب تو عطا فرما
جبر کی انتہا نہیں نہ سہی

میں تو اظہارِ درد کرتا ہوں
کوئی درد آشنا نہیں نہ سہی

ترکِ حاجت بھی ممکنات سے ہے
کوئی حاجت روا نہیں نہ سہی

رند ہوں اور رندِ پاک نہاد
متقی پارسا نہیں نہ سہی

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیرادارت۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

جلد [illegible]	مارچ سنہ ۱۹۳۷ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ — فی پرچہ ہر

پروفیسر محمد مجیب۔ بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ابن الوقت

مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کے بعد یہ نذیر احمد کی تیسری معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ یہ کتاب اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ وضع ظاہر، لباس اور تمدن میں انگریزوں کی تقلید نہ کرنا چاہیئے، اس سے نقصانات عظیم پہنچتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو اس سے سختی سے احتراز لازم ہے۔ اس قصے کا ہیرو ابن الوقت ہے، یہ ایک بڑے خاندان کا رکن اور نواب "معشوق محل" کا داروغہ تھا۔ غدر کے زمانے میں اس نے ایک انگریز نوبل صاحب کی جان بچائی۔ اس کے صلے میں اسے ایک پورا گاؤں سرکار انگلشیہ کی طرف سے عطا کیا گیا، اور غدر کے مقامات کی تفتیش کے لئے نوبل صاحب کی اسسٹنٹی بھی ملی۔ ابن الوقت کو جو انگریزوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، تو لگا ان کی ریس کرنے۔ دماغ میں صاحبیت اس طرح سمائی کہ انگریزی کپڑے وضع قطع معاشرت سب اس نے اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے اس کے کفر کا فتویٰ دے دیا اور اسے اپنا مقابل سمجھ کے جلنے لگے۔ اس سلسلے میں جو تدریجاً ابن الوقت کے خیالات نے مشرقیت ترک کرکے مغربیت کا رنگ اختیار کیا ہے اور نوبل صاحب کے چلے جانے کے بعد جو اسے مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آئی ہیں وہ سب بیان کی گئی ہیں۔

اشخاص قصہ ابن الوقت، اس کی پھوپھی، نوبل صاحب، ابن الوقت کا ملازم، شارپ صاحب، اور حجۃ الاسلام ہیں۔

ابن الوقت | مصنف نے اس کی سیرت کا ارتقا بہت ہی خوب دکھایا ہے۔ اسے ابتدائے عمر سے تاریخ سے محبت تھی، بڑی محنت سے اس مضمون کو پڑھتا، دہلی کے کھنڈروں میں گھومتا، اور جو لوگ تجارت و سیاحت کے بہانے دلی میں آجاتے ان سے مل مل کے ان کے شہروں اور ملکوں کے حالات و کیفیات وضع قطع معاشرت کی تفتیش کرتا تھا، وہ دنیا کی قوموں اور ذاتوں اور رسموں کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔ مذہب کے بارے میں اس کی معلومات "کتاب الملل والنحل" سے کہیں زیادہ

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شایع کی ہیں، جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں ازراہِ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں

(۱) **مطبوعات جامعہ**۔ جامعہ کی شایع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۲) **ناشرین اُردو**۔ جامعہ کے علاوہ اُردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

(۳) **مصنفین اُردو**۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مؤلفین اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۴) **بچوں کی کتابیں**۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۵) **عورتوں کی کتابیں**۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابوں کی فہرست۔

(۶) **مختصر فہرست کتب**۔ کتب اُردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست۔

(۷) **ادبی کتابیں**۔ تاریخ و تنقید ادب، مقالات و انشاء، ناول، افسانہ، نظم، ڈرامہ، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۸) **مذہبی کتابیں**۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

(۹) **تاریخی کتابیں**۔ پانچسو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست۔

(۱۰) اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبیعات، کیمیا، طب، حفظان صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اُردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیرِ طبع ہے، عنقریب شایع ہوگی۔

مکتبہ جامعہ دہلی

ابن الوقت

مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کے بعد یہ نذیر احمد کی تیسری معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ یہ کتاب اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ وضع ظاہر، لباس اور تمدن میں انگریزوں کی تقلید نہ کرنا چاہئے، اس سے نقصانات عظیم پہنچتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو اس سے سختی سے احتراز لازم ہے۔ اس قصے کا ہیرو ابن الوقت ہے، یہ ایک بڑے خاندان کا رکن اور نواب "معشوق محل" کا داروغہ تھا۔ غدر کے زمانے میں اس نے ایک انگریز نوبل صاحب کی جان بچائی۔ اس کے صلے میں اسے ایک پورا گاؤں سرکار انگلشیہ کی طرف سے عطا کیا گیا۔ اور غدر کے مقدمات کی تفتیش کے لئے نوبل صاحب کی اسسٹنٹی بھی ملی۔ ابن الوقت کو جو انگریزوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تو لگا ان کی ریس کرنے۔ دماغ میں صاحبیت اس طرح سمائی کہ انگریزی کپڑے وضع قطع معاشرت سب اس نے اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے اس کے کفر کا فتویٰ دے دیا اور اسے اپنا مقابل سمجھ کے جلنے لگے۔ اس سلسلے میں جو تدریجاً ابن الوقت کے خیالات نے مشرقیت ترک کرکے مغربیت کا رنگ اختیار کیا ہے اور نوبل صاحب کے چلے جانے کے بعد جو اسے مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آئی ہیں وہ سب بیان کی گئی ہیں،

اشخاص قصہ ابن الوقت، اس کی پھوپھی، نوبل صاحب، ابن الوقت کا ملازم، شارپ صاحب، اور حجۃ الاسلام ہیں۔

ابن الوقت مصنف نے اس کی سیرت کا ارتقا بہت ہی خوب دکھایا ہے اسے ابتدائے عمر سے تاریخ سے محبت تھی، بڑی محنت سے اس مضمون کو پڑھتا، دہلی کے کھنڈروں میں گھومتا، اور جو لوگ تجارت و سیاحت کے بہانے دلی میں آجاتے ان سے مل مل کے ان کے شہروں اور ملکوں کے حالات و کیفیات وضع قطع معاشرت کی تفتیش کرتا تھا، وہ دنیا کی قوموں اور ذاتوں اور رسموں کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔ مذہب کے بارے میں اس کی معلومات "کتاب الملل والنحل" سے کہیں زیادہ

تھیں جب کوئی نئی کتاب جماعت میں شروع ہوتی، اس کا پہلا سوال یہ تھا کہ اس کا مصنف کون تھا کہاں کا رہنے والا تھا، کس سے اس نے پڑھا۔ اس کے معاصر کون کون تھے۔ اس کے وقائع عمری میں کون کون سی بات قابل یادگار ہے؟

خودداری اس کے مزاج میں اس درجہ تھی کہ لوگ اسے مغرور خیال کرتے تھے۔ دوسرے کا احسان اٹھانے میں اس کو سخت عار تھی، ابن الوقت اپنی رائے بہ دیر قائم کرتا تھا۔ مگر جب ایک بار قائم کر لیتا اس کے بدلنے کی گویا اسکو قسم تھی، اس کی یہ رائے کسی سے مخفی نہ تھی کہ کسی قوم میں سلطنت کا ہونا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ اس قوم کے مراسم، عادات، خیالات، افعال، اقوال، حرکات، سکنات، یعنی کل حالات، فرداً فرداً نہیں تو مجموعاً ضرور بہتر ہیں۔ وہ نہایت وثوق کے ساتھ کھلم کھلا کہا کرتا تھا کہ سلطنت ایک ضروری اور لازمی نتیجہ ہے قوم کی برتری کا۔

غرض اسے انگریزوں کے سارے عادات، مراسم، معاشرت کے کل طریقے، ہندوستانی تہذیب و تمدن سے کہیں بہتر برتر معلوم ہوتے تھے، اب جو نوبل صاحب کو غدر میں اپنے مکان میں مہینوں لاکے چھپا کر رکھا تو اسے اُن سے گفتگو اور مبادلۂ خیالات کا اور بھی موقع مل گیا۔ غدر کے بعد انگریزی سلطنت کی طرف سے عزت جو ملی اور اس پر نوبل صاحب کا یہ اصرار کہ تم مسلمانوں کے ریفارمر بن کے انھیں انگریزی معاشرت اور انگریزی طور طریقے سکھاؤ۔ بس اب کیا تھا ابن الوقت بالکل صاحب بن بیٹھے، مکان کی جگہ بنگلے میں رہنا شروع کیا، ہندوستانی لباس کے ساتھ غذا بھی ترک کی، بالکل صاحبوں کی طرح کالے آدمیوں سے ملنا بھی چھوڑ دیا۔ ادھر کفر کے فتووں کا زور بندھا، ابن الوقت، دھن کا پکا تو تھا ہی۔ مزاج میں ضد بھی پیدا ہو گئی۔ منہ سے اپنے کو تو مسلمان مسلمان کہتا رہا مگر نماز روزہ سب کچھ چھوڑ بیٹھا، اور لگا اسلامی احکام کا تمسخر کرنے۔ اتنے میں نوبل صاحب ولایت تشریف لے گئے تو شارپ صاحب کلکٹر ضلع کے عملے والوں نے کان بھر دیے۔ وہ خود ہی کسی ہندوستانی کو انگریزی وضع میں دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ شکایتوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ صاحب بگڑ بیٹھے، ابن الوقت سے شنتی کے کام نکال لئے، اور اُن کو بے دست و پا کر دیا۔ اب ذرا ابن الوقت کو بھی ہوش آیا۔

مگر کسے کیا خاموش بیٹھے سب کچھ دیکھ رہے تھے، کہ حجۃ الاسلام آ پہنچے۔ انھوں نے شارپ صاحب سے مل کر اُن کا دل صاف کرایا اور ابن الوقت سے مختلف اوقات میں بحثیں کر کے انھیں انگریزی معاشرت ترک کرنے اور ہندوستانی معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ جب اس مزاج اور شہرت کا آدمی کسی انگریز کے ساتھ برسوں رہے گا اور اتنے بڑے غدر کو شمی بھر انگریزوں کو اس استقلال و جرأت سے فرو کرتے دیکھے گا تو اس کے دل میں ان کی برتری کے خیالات کیوں نہ راسخ ہو جائیں گے؟ ان تمام امور پر مزید سرکار انگلشیہ کی عطائیں ہوئیں۔ پھر دلی کے تمام افسروں کا اس سے ملنے کی خواہش کرنا اور خود نوبل صاحب سے فہمیدہ باشعر اور ابن الوقت کے بہی خواہ انگریز کا اسے مسلمانوں کا ریفارمر اور مصلح بننے پر زور دینا۔ اگر اس کے قصد کو عزم بالجزم کے مرتبے پر پہنچا دیں تو کون سی جائے عجب ہے؟

مصنف نے ابن الوقت کے خیالات میں آہستہ آہستہ جس خوبی سے یہ تبدیلی دکھائی ہے۔ اور انگریزی معاشرت اختیار کرنے کے بعد جس طرح سے آہستہ آہستہ بے دینی کی طرف جاتے ہوئے لکھا ہے وہ اُن کے ماہر علم النفس ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ ابن الوقت اس سے پہلے نماز کا پابند تھا، بلکہ مصنف نے اس بیان کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے یوں لکھا ہے کہ:۔

"ہم ان لوگوں سے سنی ہوئی کہتے ہیں جن کو ابن الوقت کے ساتھ رات دن کی نشست برخاست ہمسائگی اور قرابت قریبہ کے تعلقات تھے کہ اٹھارہ بیس برس کی عمر تک ابن الوقت کا یہ رنگ رہا کہ جیسے عابد متشرع مسلمان ہوتے ہیں وہ نوافل اور مستحبات کا اس قدر اہتمام رکھتا تھا کہ ایسا اہتمام فرض و واجب کا شاید ہم کو نصیب کرے۔ پانچوں وقت جامع مسجد کی اول جماعت کی تکبیر تحریمہ ناغہ نہیں ہونے پاتی تھی اور تہجد اور اشراق کے علاوہ تحیۃ المسجد، صلوٰۃ التسبیح منزل قبل، دلائل الخیرات، حزب البحر اور خدا جانے کتنے اوراد و وظائف جمعہ کے دن کبھی اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو پہر دن چڑھے سے نماز جمعہ کی تیاری ہو رہی ہے۔ ایام بیض کے روزے داخل معمولات تھے پھر مدت تک ترک حیوانات اور چلہ کشی وغیرہ مذہبی ریاضتوں کی زحمت اٹھاتا رہا۔ انھیں دنوں لوگ خیال کرتے تھے کہ شاید وہ شاہ حقانی صاحب سے بیعت کرنے والا ہے۔ پھر ایک زمانے میں اس کو ہندو جوگیوں

اور سناسیوں کی طرف میلان رہا پھر جو سنبھلا تو اہل حدیث میں جا شامل ہوا جن کو لوگ تعنتاً وہابی کہتے ہیں۔ غدر سے چند روز پہلے وہ پادریوں کا ایسا گرویدہ تھا کہ بس کچھ پوچھو نہیں، نوبل صاحب کی صحبت میں اس کے مذہبی خیالات نے دوسرا رنگ پکڑا یہاں تک کہ انگریزوں میں جا ملا۔ اس سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے مذہبی خیالات میں ایک طرح کا تزلزل ضرور تھا مگر تبدیل وضع تک ضروریات دین میں اس سے کمی سرزد نہیں ہوتی، بلکہ تبدیل وضع کے بعد بھی لوگوں نے اس کو مسجد میں جماعت سے تو نہیں، بارہا اکیلے نماز پڑھتے دیکھا، یہاں تک کہ شروع شروع میں جن دنوں اس کو نماز روزے کی بہت پرچول تھی، کچہری کے عملے ہندو مسلمان سب قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ کیسے ہی کام میں مصروف ہوں، اور سویر کی تو کبھی نہیں جاتی، مگر نماز ابھی تک تو چھوڑی نہیں، ہم تو ہر روز پرائیوٹ روم میں ظہر کی بلکہ جس دن دیر تک کچہری رہتی ہے عصر کی بھی نماز پڑھتے دیکھتے ہیں، لیکن انگریزی وضع کے ساتھ نماز روزے کا نبھنا ذرا تھا مشکل، کوٹ تو خیر اتار الگ کھونٹی پر لٹکا دیا، کمبخت پتلون کی بڑی مصیبت تھی کہ کسی طرح بیٹھنے کا حکم نہیں۔ اتارنا اور پھر پہننا بھی وقت سے خالی نہ تھا۔ اس سے کہیں زیادہ وقت طہارت کی تھی، جو نماز کی شرط ضروری ہے، پھر اکثر اتفاق پیش آجاتا تھا، کہ ابن الوقت اپنے پرائیوٹ روم میں نماز پڑھ رہا ہے اور کوئی صاحب اس کی کچہری میں آنکلے اور اجلاس خالی دیکھ کر واپس چلے گئے، یا نماز کا وقت ہے اور انگریزوں نے آگھیرا ہے، ان کو چھوڑ کر جا نہیں سکتے، یا کوئی صاحب کچہری برخاست کر کے جانے لگا۔ تو ابن الوقت کے پاس سے ہو کر نکلا "کیوں مسٹر ابن الوقت ہوا خوری کو چلتے ہو، یار چلو ذرا اتشا کھیلیں" یہ اور اس طرح کے دوسرے اتفاقات ہر روز پیش آتے تھے، اور نماز کا التزام ممکن نہ تھا، کہ باقی رہ سکے۔ ایک بڑی قباحت یہ تھی کہ اکثر انگریز مطلق پابندی مذہب کو حمق اور سخافت سمجھتے تھے، غرض نماز پر تو انگریزی سوسائٹی کا اثر یہ دیکھا کہ پہلے وقت سے بے وقت ہوئی پھر نوافل پھر سنن جا کر نرے فرض رہے۔ وہ بھی پانچوں وقت پہلی رکعت میں سورۂ عصر تو دوسری میں سورۂ کوثر پھر جمع بین العصرین والمغربین، شروع ہوا پھر قضائے فائت، پھر بالکل چٹ۔ کھانے پینے میں احتیاط کے باقی رہنے کا کوئی محل ہی نہ تھا۔ ابن الوقت کو انگریزوں کے ہو جانے کی پڑی تھی، اور وہ بے شراب کے پرچ نہیں سکتے تھے، ابن الوقت نے

کونسی بات اٹھا رکھی تھی، کہ وہ شراب خواری کے الزام سے ڈرتا مگر ہم کو تحقیق معلوم ہے کہ وہ شراب سے جو پاس مذہب اسلام محترز تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ ڈاکٹر نے اس کو ڈرایا تھا کہ اگر تم شراب پیو گے، تو کوڑھی ہو جاؤ گے۔ اس پر بھی بہت سے انگریزی کھانے ہیں کہ شراب ان کے مسالے میں داخل ہے بہتری دوائیں ہیں کہ بدون شراب کے نہیں بن سکتیں۔ بلکہ ان لوگوں کی طب میں شراب خود دوا ہے کثیر الاستعمال انگریزی تمدن اختیار کرنا اور شراب سے پرہیز رکھنا ایسا ہے کہ کوئی شخص کو یلوں کی دوکان میں رہے اور منہ کالا نہ کرے رہے انگریزی سوسائٹی کے بڑے معزز ممبر کتنے کیوں کر ممکن تھا کہ جان نثار جو ابن الوقت کی تبدیل وضع میں مشاطہ کا کام دے رہا تھا۔ انگریزیت کی شرط ضروری کو بھول جاتا اس نے پہلے ہی سے ابن الوقت کے لئے کئی قسم کے کتے بہم پہنچا رکھے تھے، ان میں بعض ایسے بھی تھے کہ ہر وقت ہمزاد کی طرح ابن الوقت کے ساتھ لگے رہتے تھے، غرض تبدیل وضع سے ایک ہی مہینے کے اندر اندر ظاہر اسلام کا کوئی اثر ابن الوقت اور اس کے متعلقات میں باقی نہ تھا۔" —[1]

اسی تبدیل معاشرت کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ مالی مشکلوں میں پھنس کے قرض دار ہوگیا، مگر اسے اس کی مطلقاً پروا نہ تھی، بقول مصنف "یہ تو اپنے ان خیالات میں مست تھا کہ صاحب کمشنر مجھ کو مائی ڈیر ابن الوقت اور اپنے تئیں 'یور سنسیرلی' لکھتے ہیں۔ چیف کمشنر نے سالانہ رپورٹ میں میری کارگزاری کا شکریہ ادا کیا ہے جوڈیشنل کمشنر نے ایک فیصلے میں میری نسبت لکھا ہے کہ اس کی طبیعت کو قانون سے فطری مناسبت ہے فائنشل کمشنر نے فلاں سرکلر کا مسودہ مجھ سے طلب کیا تھا، ان کی چٹھی موجود ہے۔ اب جو چھپ کر آیا تو میں دیکھتا ہوں کہ ایک لفظ کا رد و بدل نہیں کیا، قانون شہادت کی فلاں دفعہ میرے اصرار سے بڑھائی گئی۔ لیجس لیٹو کونسل کے لیگل ممبر نے مجھ کو چٹھی میں اطلاع دی مگر نہیں معلوم اپنی اسپیچ میں میرا تذکرہ کیوں نہیں کیا یا رپورٹر کی فروگذاشت ہے یا ممبر صاحب کو اس وقت خیال نہ رہا ہوگا، فلاں صاحب نے ولایت سے میرا فوٹوگراف منگوایا ہے اور لکھتے ہیں کہ میم صاحبہ متقاضی ہیں۔ اور وہ مس جوزفا، جو ہمارے ڈرائنگ روم کی تصویروں کو بہت پسند کرتی تھی اور گھنٹوں ہمارے کتوں سے کھیلا کرتی تھی۔ ابھی ولایت کی ڈاک میں اس کی ماں کی چٹھی آئی ہے ایک

بڑے سوداگر کے ساتھ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ میجر صاحب نے آئیس کریم (ملائی کی برف) جلنے کے لیے ہمارے آدمی کو بلا بھیجا ہے۔ یہاں سے برف ہی جمواکر نہ بھیج دی جائے۔ کرنیل صاحب کا اسباب نیلام ہوگا، تو دو گھوڑے ہم ضرور لیں گے، کیوں کہ ہم نے خوب خیال کر کے دیکھا تو ہمارے دو گھوڑے ہمیشہ صاحب لوگوں کی سواری میں رہتے ہیں اور چڑیوں اور پھولوں کے گملوں کو تو ہم اُن سے زیادہ کہہ چکے ہیں۔ پرسوں کیا اتفاق ہوا کہ میں ٹھنڈی سڑک پر جا رہا تھا۔ کپتان صاحب اور ان کی میم صاحب کے ہاتھ میں ایک پھول تھا۔ انھوں نے میری طرف پھینک دیا۔ کپتان صاحب بولے "مسٹر ابن الوقت میرے پاس کوئی پھول نہیں کہ تم کو دیتا۔ میں نے کہا آپ کے پاس تو نہایت خوب صورت گلدستہ ہے۔ میم صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دونوں میاں بیوی ہنستے ہوئے برابر سے نکل گئے۔ فرنڈ آف انڈیا نے ایک آرٹیکل میں مجھ کو مسلمانوں کا رفارمر لکھا ہے۔

"غرض جس طرح ایک آدمی کو کسی بات کی رٹ نہیں لگ جاتی، بس ابن الوقت کو انگریز بننے کی رٹ تھی، شروع شروع میں تو اس کو مسلمانوں کے حال پر بھی ایک طرح کی نظر تھی لیکن چند روز کے بعد اس کی ساری رفارم اسی میں منحصر ہوگئی تھی کہ انگریزی اوضاع و اطوار میں سے کوئی وضع اور کوئی طور چھوٹنے نہ پائے۔ کمبخت آپ بھی برباد ہو رہا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی ایسی ہوا چلی کہ مسلمانوں کے نوجوان لڑکے خصوصاً جنھوں نے ذری سی انگریزی پڑھی تھی یا جو گھر سے کسی قدر آسودہ تھے۔ تباہی کے لچھن سیکھتے جاتے تھے۔" نتیجہ اس کا ظاہر بظاہر تو یہ ضرور تھا کہ وہ انگریزوں سے میل ملاپ میں سب سے آگے دکھائی دیتا تھا مگر اصل میں یہ سب کچھ نوبل صاحب کی سرپرستی کا نتیجہ تھا، جیسے ہی وہ انگلستان سدھارے کمانڈنگ افسر نے وبا کا بہانہ کر کے ہرمنٹو کو چھاؤنی چھوڑ دینے کا حکم دے دیا اس جزئی حکم کی بدولت یہ بھی اپنے نئے خاندان سے نکالے گئے، یہ ابھی نقل مکان ہی میں گرفتار تھے کہ سررشتہ دار نے صاحب کلکٹر کے کان بھرے اور ان سے محکمۂ بغاوت کا کام بھی نکال لیا گیا۔ شامتِ اعمال شام کی ہوا خوری کے سلسلے میں گاڑی پر سوار نکلے، اور صاحب بہادر پیدل اس نے گاڑی روک کے صاحب سلامت کی، وہ اسے گستاخی سمجھے اور باقاعدہ جواب مانگ بھیجا۔ جب انھوں نے ایک

جنٹ کے ذریعے ملنے کی درخواست کی تو صاحب نے بہ اکراہ پنسل سے جواباً لکھ بھیجا کہ وہ کسی نیٹو سے
اپنی کوٹھی پر انگریزی لباس میں نہیں ملنا چاہتا۔ غرض ہر طرف سے ابن الوقت کی پریشانی اور ذلت
کے سامان ہونے لگے، اس سلسلے میں مالی مشکلات بھی بڑھیں مگر لالہ کوڑی سا کھا کر گیا اور اس نے سارے
قرضداروں کا حساب صاف کر کے ابن الوقت پر اپنے قرضے کے علاوہ اپنے احسان کا بھی بار لاد دیا۔
یہ اسی مصیبت میں گرفتار پھرتے تھے کہ ان کی تقدیر نے حجتہ الاسلام کو اُن کی مدد کے لئے بھیج دیا،
وہ ایک پرانے مولوی ٹائپ کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ انھوں نے شارپ صاحب سے ملاقات کر کے اُن
کے معاملات صاف کئے اور اُن سے بحث و مباحثہ کر کے انھیں انگریزی وضع ترک کرنے اور ہندوستانی
ہی لباس و معاشرت کے اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

ابن الوقت کی سیرت میں خودداری قابل تعریف ہے۔ وہ کسی افسر سے جھک کے ملنا پسند
نہیں کرتے ہیں۔ جہاں تک فرائض کا تعلق ہے وہ افسر کو افسر ماننے سے انکار نہیں کرتے مگر جہاں
سے سماجی اور نجی تعلقات شروع ہو جاتے ہیں، وہ صاحب کلکٹر کو اپنا ہم مرتبہ جنٹلمین سمجھتے ہیں انھوں
نے جتنی دعوتیں دوسروں کے یہاں کھائیں اس سے زائد خود کھلائیں۔ انھوں نے انگریزوں سے ملنا
جلنا یا ان کی وضع و اطوار کسی خوشامد کی وجہ سے اختیار نہیں کئے تھے بلکہ محض اس لئے کہ ان کے
اوضاع کو ہندوستانی اطوار سے بہتر جانتے تھے، اس لئے انھوں نے انگریزی معاشرت
اختیار کرنے کے بعد بھی نوبل صاحب کے علاوہ کسی سے یارانہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی وہ بڑے
سخت اصولی آدمی تھے، اور ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ اُن کا سا آدمی نوبل صاحب کے جاتے ہی اس
طرح کی آفتوں میں گرفتار ہو گیا، حق یہ ہے کہ گو مصنف نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے
کہ یہ ساری خرابیاں انگریزی وضع کی پیدا کی ہوئی ہیں مگر ہمیں تو ان سب کی اولین وجہ ہندوستانی
فطرت کا حسد و رشک محسوس ہوتی ہے۔

ہم ہندوستانیوں میں کچھ اس طرح کی عادت ہے کہ ہم اپنے معاملات سے زیادہ دوسروں
کے معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں اور اگر ہم کسی کو اوضاع و اطوار میں اپنے سے مخالف پاتے ہیں،

توہیں بلا وجہ اس سے دشمنی ہو جاتی ہے۔ ہم موقع بے موقع اس کا تمسخر کرتے ہیں اور اسے ذلیل و
سبک کرنے کے در پے رہتے ہیں۔

پھر ہیں یہ بھی نہیں بھاتا کہ افسروں کی نظر میں ہمارا کوئی بھائی باعزت بن کر رہے، سررشتہ دار
کو ابن الوقت نے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، اور نہ ان لوگوں کو جنھوں نے مختلف طریقوں
سے صاحب کلکٹر کے کان بھرے۔ مگر شکایت کرنے والوں کو اس سے کیا مطلب، وہ تو یہ
دیکھ رہے تھے کہ ان کا ایک بھائی ترقی کر رہا ہے۔ بہت عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے
نہ اُن کی تقلید کرتا ہے اور نہ صاحبوں کی خوشامد، بس اتنا کافی تھا، بری طبیعتوں نے نقصان
پہنچانے میں اپنی بُرائی سمجھی پر ابن الوقت کو خودداری نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ ان لوگوں
کے ہاں دوڑ دھوپ کرے اور اُن کی خوشامدیں کر کے وہ انھیں رام کرتا اور اُن کے ذریعے صاحب
کلکٹر کو، یہ سب کچھ ہو سکتا تھا مگر اس کی غیرت و حمیت اسے جھکنے نہیں دیتی تھی، اگر واقعی وہ ابن الوقت
ہوتا تو اسے ان تمام ہتھکنڈوں میں برق ہونا چاہیے تھا، انگریزی وضع اس نے محض انگریزوں
کو ریس میں اختیار نہیں کی تھی بلکہ واقعی طور پر اسے ہندوستانی وضع سے بہتر سمجھ کر۔ اس کی یہ
رائے غلط ہو یا صحیح اس سے ہمیں بحث نہیں، ہمیں جو کچھ بھی دیکھنا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے یہ سب
کچھ محض صاحبیت کے شوق میں نہیں کیا تھا بلکہ سوچ سمجھ کے وہ اپنے نزدیک ان کی حمایت میں معقول
دلائل رکھتا تھا، مگر محض اتنے سے گناہ پر اسے خدا جانے کن کن طرح کے مصائب میں گرفتار
ہونا پڑا۔ اس افراط و مبالغے کی پردہ پوشی شارپ صاحب کی عجیب شخصیت نے کر دی ہے انھیں
خواہ مخواہ ایسے ہندوستانیوں سے چڑ تھی، جو نیٹو ہونے پر انگریزی وضع اختیار کرتے تھے
پھر کان کے بھی ایسے کچے تھے کہ اہل محلہ کی لگائی بجھائی پر یقین کر لیتے تھے، ابن الوقت کے کردار کا
استقلال بھی قابل تعریف ہے، مصنف خود بھی اس کے قائل ہیں: "ابن الوقت پرلے درجے کا
مستقل مزاج آدمی تھا، مشکلات کو دیکھ کر اور دلیر ہوتا، وہ رنجیدہ ہوتا، افسوس کرتا، اس کو
غصہ بھی آتا، مگر کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں ہوا کہ جو وضع اختیار کی ہے اس کو چھوڑ دوں

یا جس رفارم کا بیڑا اُٹھا چکا ہوں اس کے رواج دینے میں کوتاہی کروں۔"

ابن الوقت کے کردار میں ایک اور خصوصیت اس کا تدبر ہے، وہ معمولی قابلیت کا ہندوستانی نہ تھا۔ بلکہ اس نے پہلے ہی ڈنر کے بعد جو کئی گھنٹے تقریر کی ہے، اس میں حاکم و محکوم کے سارے تعلقات سے بحث کر ڈالی ہے اور اسی سلسلے میں برٹش گورنمنٹ اور اس کے افسروں کو ان اصول سے آگاہ کیا ہے جن پر کاربند ہونے کی صورت ہی میں انھیں ہندوستان کی حکومت پر کامیابی حاصل ہو سکتی ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے ریاستوں کے مسئلے پر بھی جس نے آج اتنی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ بہت کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس تقریر کا وہ حصہ صد درجہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہو

"اگر کوئی مجھ سے پوچھے، تو میں اس بات کو بڑے شد و مد سے پیش کروں کہ اگر گورنمنٹ اپنے تعلقات اندرونی ایشیائی گورنمنٹوں کے ساتھ درست کرے، یہ ہندوستانی ریاستیں جن کا مجموعہ، کیا رقبہ، کیا مردم شماری، کیا محاصل کسی اعتبار سے انگریزی سلطنت سے کم نہیں باستثنائے معدودے چند، اس قدر بیٹھ بھر کر خراب ہو رہی ہیں کہ ان کی حالت نہ صرف انھیں کے حق میں خطرناک ہے بلکہ انگریزی طرز نظام، انگریزی رعایا سبھی کے حق میں، اور جب تک ان ریاستوں کی پوری پوری اصلاح نہ ہو۔ انگریزی گورنمنٹ کو اپنے انتظام کی طرف سے مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ اُن میں سے ایک ایک ریاست، اگر اس کے انتظام میں فساد ہے انگریزی گورنمنٹ کے حق میں بغلی گھونسہ ہے، فساد انتظام سے میری مراد یہی نہیں کہ رئیس اپنے تئیں سرکار انگریزی کا مدمقابل سمجھتا ہو، یا نافرمانی یا عدول حکمی سے گورنمنٹ کا استخفاف کرتا ہو۔ میں اس بات کو پکار کے کہتا ہوں کہ ہندوستانی رئیس ہندو ہو یا مسلمان آرام طلب ہوگا، کاہل ہوگا، احمق ہوگا، جاہل ہوگا، عیاش ہوگا، غافل، مسرف ہوگا۔ خرچ آمدنی سے فاضل ہوگا۔ غرض اس میں سب طرح کے جنون ہوں گے، مگر نہیں ہوگا تو ایک جنون بغاوت سرکار نے اپنی فوجی طاقت کو ہندوستان میں خصوصاً بعد غدر ایسے زور سے ثابت کر دیا ہے جیسے آگ نے جلانے کی خاصیت کو بس ہندوستانی رئیسوں کی طرف ایسا خیال بالکل لغو اور محض بے اصل

ہے، لیکن جس روز سے گورنمنٹ انگریزی کو ہندوستانی رئیس اپنی چند در چند نالائقیوں اور گونا گوں بدکرداریوں کی وجہ سے ایسی خرابیاں کر رہے ہیں کہ اول تو خود انھیں کی رعایائے نا مہذب نا شائستہ سے گورنمنٹ کو ہمیشہ خائف رہنا چاہیئے۔ دوسرے ان ریاستوں کے بُرے نمونے دیکھ کر رعایائے انگریزی کی طبیعتیں بگڑی چلی جاتی ہیں۔ جسد سلطنت میں یہ ریاستیں گویا برص کے چھٹے ہیں۔ کیوں کر اطمینان ہو سکتا ہے کہ ان چھٹوں کا فساد دوسرے اعضائے صحیح تک متعدی نہیں ہوگا اگر میری تقریر سے ایسا مستنبط ہوا ہو کہ میں ان ریاستوں کے ضبط کرنے کی رائے رکھتا ہوں، تو مجھ سے بڑھ کر قوم و ملک کا کوئی دشمن نہیں، لیکن یہ میری رائے ضرور ہے کہ ان ریاستوں کا نا منتظم حالتوں میں رہنے دینا ویسا ہی ظلم ہے جیسا ان کا ضبط کرنا، جب کہ انگریزی گورنمنٹ اپنے تئیں ان شخصی گورنمنٹوں کا مربی و حامی اور محافظ سمجھتی ہے اور واقع میں وہ ہے بھی تو ان کی اصلاح اُن کا فرض لازمی ہے۔ لیکن انگریزی گورنمنٹ نے اس فرض کے ادا کرنے میں کما حقہٗ اہتمام نہیں کیا ہے بے شبہ سرکار کی طرف سے ایجنٹ یا ریزیڈنٹ کے نام سے ایک عہدہ دار ایک ہندوستانی ریاست پر مسلط ہے۔ لیکن اس کو ریاست کے اندرونی انتظام میں حکماً کوئی مداخلت نہیں۔ وہ اتنی ہی بات کی نگرانی رکھتا ہے کہ ریاست میں سرکار انگریزی کا رعب داب اچھی طرح قائم رہے، اور کوئی عام بدنظمی نہ ہو اگر ایک باپ اولاد کے ساتھ وہ کرے جو انگریزی گورنمنٹ نے ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ اب تک کیا ہے۔ تو ہم ایسے باپ کی مدح نہیں کر سکتے۔ جتنا اس نے کیا اچھا کیا، مگر اس کو اس سے بہت زیادہ کرنا چاہیئے تھا،

مہذب دنیا کی نظر میں انگریزی گورنمنٹ کبھی من حیث المجموع منتظم گورنمنٹ نہیں سمجھی جائے گی، تاوقتیکہ اس کی تمام شخصی گورنمنٹیں اسی طرح منتظم نہ ہوں جیسے اس کا اپنا علاقہ، انگریزی گورنمنٹ کبھی بیرونی دشمنوں کے خدشے سے خالی نہیں رہتی اور اس کو خالی رہنا چاہیئے بھی نہیں بلکہ تعجب کی بات ہے کہ میں اس کو شخصی ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے کبھی خدشہ کرتے ہوئے نہیں پاتا حالانکہ اگر یہ ریاستیں نا منتظم رہیں جیسی کہ اب ہیں تو یہ اندرونی دشمن بیرونی دشمن سے بہت

زیادہ خطرناک ہیں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ علامہ نذیر احمد کے دماغ نے ابن الوقت کو وہ بات سمجھادی ہے جو آج سیاسی نظام میں فیڈریشن کے نام سے موجود دکھائی دیتی ہے۔

اگر شروع سے گورنمنٹ نے اس کا خیال کیا ہوتا تو آج کو یہی ہندوستانی رئیس جن کو ننگ ہندوستان کہتے ہیں، یہاں کی کونسل تو خیر ولایت کے پارلیمنٹ کے قابل ہوتے، لیکن گورنمنٹ نے ان ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں بڑی غلطی کی، ان کو شتر بے مہار کی طرح مطلق العنان چھوڑ دیا کہ بہت بھر بگڑ گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کہ ان ریاستوں کی خرابی کو گورنمنٹ انگریزی اپنے استحکام کا موجب سمجھتی ہے اب فرض کیجئے کہ ہم ان ریاستوں کو کونسل میں بٹھانے لگیں، تو شروع شروع میں ان کی کارروائی ضرور ایسی ہوگی جیسی تھوڑی دیر ہوئی میں نے بیان کی، لیکن ہم چندے صبر کریں، تو آخر ان رئیسوں کو کبھی تو غیرت آئے گی، کبھی تو شرمائیں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہاں کے کالج اور کہاں کے مدرسے، رئیسوں کے حق میں تو یہی کونسل کافی ہے علی سبیل البدیہہ سب کو کونسلوں میں بٹھایا جائے اور پھر ایک ایسا حکم بندے کہ مثلاً ہر پانچویں برس کونسل میں حاضر ہونے پر مجبور کئے جائیں۔ پھر دوسری ہی نوبت میں دیکھئے کہ اُن کی حالت میں کس قدر ترقی ہوتی ہے غرض گورنمنٹ کا یہ ننگ کہ وہ ملک کا انتظام رعایا کی رائے پر کرنا چاہتی ہے۔ ہندوستان کی گورنمنٹ میں تو ہے نہیں، ہندوستانیوں کی قسمت کی جو (اسپاٹک تر (شخصی خودمختار) گورنمنٹ سدا سے تھی، اب بھی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اپنی گورنمنٹ تھی اب اس پر پیاجنبی مسلط ہیں۔

ابن الوقت کے تدبر فہم وفراست، قابلیت ولیاقت ان تمام امور کے لئے یہی ایک تقریر کافی ہے اگر اس کی بابت کسی اور ثبوت کی ضرورت ہو تو وہ بحث جو اس سے اور حجۃ الاسلام سے تقدیر کے مسئلہ پر ہوئی ہے بہت زیادہ کافی ہے، اور حق تو یہی ہے کہ گو مصنف نے اپنے مسلک کے مطابق حجۃ الاسلام کو اس مباحثے میں جتا دیا ہے مگر حقیقت میں جیتا ابن الوقت ہی ہے، بہرنوع ابن الوقت کی سیرت میں اس پوری بحث کے بعد کیا انقلاب ہوا اس کا ہمیں قصے سے کہیں پتہ نہیں چلتا، یہ ظاہر

مولانا کا ارادہ تھا کہ وہ ناول کے دوسرے حصے میں ان تمام امور کو دکھائیں گے۔ مگر شاید انھیں اس ارادے کو پورا کرنے کی فرصت نہ مل سکی اور اس طرح یہ قصہ نامکمل رہ گیا۔

حجۃ الاسلام اس قصے کے دوسرے نمایاں کردار حجۃ الاسلام ہیں یہ بالکل نذیر احمد کے دل کے آدمی ہیں۔ باوجود ڈپٹی کلکٹر ہونے کے اس طرح کے کٹر مسلمان ہیں کہ ابن الوقت کی کوٹھی پر گاڑی سے اُترے ہیں تو خدمت گار وضو کا آفتابہ لئے ہوئے ساتھ ساتھ تھا، گویا یہ پہلے سے یقین تھا کہ ایک بھائی اور مسلمان کے ہاں نہ تو وضو کا سامان ہو سکتا ہے اور نہ نماز کا کوئی انتظام، یا تو ظن خیر کا پتہ نہیں یا پھر شک و احتیاط کی انتہا ہے پھر شروع سے آخر تک جتنی باتیں کی ہیں، وہ سب قل اعوذ بنی ہیں۔ بات بات پر حدیثیں، آیتیں، عربی کے اقوال، سب کچھ موجود ہیں جو گویا واقعی حجۃ الاسلام بن کے آئے ہیں۔ اصول حفظان صحت کے منکر ہیں، طب اور ڈاکٹری کو بیکار جانتے ہیں اور تدبیر کو بالکل ہی عبث اور فضول، کوٹھی میں کتوں کی موجودگی سے نالاں ہیں، کمروں میں تصویروں کے آویزاں ہونے سے خفا اور اس بات پر مصر ہیں کہ ہر شخص کے لئے انھیں کی طرح صرف ایک دالان اور ایک حجرہ زندگی بسر کرنے کے لئے کافی ہونا چاہئے، بالآخر خفا ہو کے چل دیئے۔ اور گو ابن الوقت نے قیام کے لئے بہت اصرار کیا۔ مگر نہ اس کے یہاں ٹھیرے اور نہ انھوں نے اس کے یہاں کچھ کھایا پیا۔ اسی کے ساتھ ان کی صفائی میں یہ کہنا ضروری ہے کہ

وہ ان مولویوں میں نہ تھے، جنھوں نے ابن الوقت کو کفر کے فتوے دے رکھے تھے وہ اس پر یقین رکھتے تھے، کہ ابن الوقت مسلمان ہے۔ چنانچہ ساس سے اپنی روداد بیان کرتے وقت انھوں نے بڑے شد و مد سے کہا "بھائی ابن الوقت اپنے تئیں چوری چھپے بھی نہیں کھلے خزانے پکار پکار کر مسلمان کہتے ہیں اور مسلمان ہیں بھی" اور اسی لئے وہ محض بھائی کا معاملہ ٹھیک کرنے کے لئے اور اس سے اور شارپ صاحب سے صفائی کرانے کے لئے مخصوص طور پر چٹھی لے کر آتے تھے

انھوں نے جس طرح اس معاملے کو انجام دیا ہے اور جس خوب صورتی سے ابن الوقت کی صفائی شارپ صاحب کے سامنے پیش کی ہے وہ ان کی ذہانت اور قابلیت پر دال ہے۔ یہ

انھیں کی سمجھانے والی طبیعت اور انداز بیان کا اثر تھا کہ شارپ صاحب کا سا بگڑے دل انگریز ابن الوقت کی طرف سے صاف ہوگیا، اور انھیں ان کے اختیارات اور کام واپس دے دئے ان کی یہ گفتگو اس بات پر بھی دال ہے کہ وہ برابر پر خود غور و فکر کرنے کے عادی تھے، اور انھوں نے ابن الوقت کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ مگر ان کی سیرت میں بھی خودداری اور غیرت بڑی حد تک تھی، انھوں نے پوری گفتگو میں شارپ صاحب کی بے جا خوشامد نہیں کی بلکہ بہت ہی آزادی سے دلائل اور براہین پیش کرتے رہے اس خودداری کا ثبوت ان کا وہ بیان بھی ہے جو انھوں نے ابن الوقت سے اس سے پہلے ملاقات میں کلکٹر ضلع سے ملنے کے سلسلے میں دیا ہے، گو ٹکڑا طویل ہے مگر اس وقت کے حاکم اعلیٰ اور ماتحت کے تعلقات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے نقل کیا جاتا ہے۔

انگریزوں سے ملاقات کا گذشتہ طریقہ

عجب نہیں کہ جو اس میں ہلکی سی چاشنی ملی ہے، وہ مرغوب خاطر ثابت ہو:-

جاڑا ہو، پانی برستا ہو، کڑاکے کی دھوپ ہو۔ لوہیں چلتی ہوں۔ ہندوستانی ڈپٹی نہیں، ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو، اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑوں کی بگی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو کلکٹر جنٹ اسسٹنٹ کی بڑی بارگاہیں ہیں، اگر یورپین ڈپٹی کلکٹر سے ملنے گیا ہو (اور نہ جے تو رہے کہاں) تو احاطے کے باہر اترنا ضرور اور احاطے بھی شیطان کی انتڑی کہ ہم جیسے پرانی فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں اور اگر صاحب کہیں اس حالت میں دیکھ پائیں، تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے، نوکری نظر کرآئے، اسی دن رپورٹ ہوتی دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا، پس ڈپٹی ضرور ہے، کم از کم ڈاک کے ہرکارے کی طرح ایک چوکی تک پوری نہیں تو ڈیکی پیشی کا لبسنہ لے کر بھاگ سکے، پس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا ہی گانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے ہی سے چکو تھا کرادی ہیں تو باورچی خانہ یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے آدھ گھنٹے کھڑے کھڑے دم لیا، اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگا تو رومال سے منہ ہاتھ پوچھا۔ ہاتھ سے ڈاڑھی موچھ کو سنوار آہستہ سے عمامہ کو

کو دیا اور جالیا، بچنے کے دامن سمیٹے اور بڑے مودب متقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچی نظریں کئے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے۔ خدمت گار اور اردلی کے چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر سے تاڑ لیا تھا، کہ کوٹھی کے پاس آتے، دیکھ قصداً ادھر ادھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر نیچے زینے کے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے، اوپر چڑھنے کا قصد کریں، چلنے کی، باتوں کی، اور چیزوں کے رکھنے اٹھانے کی آوازیں ہیں، کہ چلی آتی ہیں، مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے، کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں، کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں، لوٹ چلیں، پھر خیال آیا ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں، شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کے اردلی لوگوں کا حال معلوم ہوگا وہ لپک کے ایک دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا، اور ادھر کو رخ بھی نہ کیا۔ غرض کوئی آدھے گھنٹے (اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہوا دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لئے ہوئے نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض سے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے، حیا اور غیرت بالائے طاق آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا کیوں "جمعدار" کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر، مگر میں جانتا ہوں کہ ڈر اور ادب تو خاک بھی نہیں صرف اتنی بات کا لحاظ کر شہر کی فوجداری سپرد ہے، خدا جانے کب موقع آ پڑے، چارو ناچار اُچکتا ہوا سلام کر کے، جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہے اس کو کہنا پڑا کہ "آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے، ملاقات تو شاید ہی ہو۔ لیکن آپ بیٹھئے، ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں" یہ کہہ کر وہ اندر کو جانے لگا، تو آخر نہ رہا گیا، اور زبان سے نکلا کہ کہاں بیٹھوں؟ اپنے سر پر، تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، تحیہ اور ایک بازو ندارد گویا بید کی تپائی لا کر ڈال دی، اس کے بعد جب جب کوئی چپراسی یا خدمتگار باہر آتا یہی معلوم ہوتا کہ صاحب ابھی غسل خانے سے نہیں نکلے (الٰہی کیا غسل میت ہے) اب کپڑے بدل رہے ہیں، اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں، اب چٹھی لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کو معلوم

ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا۔ کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہوگی، ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں، آنا تو ٹھہرے ہی گا۔ دوسرے دن کا کیا بھروسا، اتنی محنت کیوں ضائع کی۔ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ اور صبر کرو بڑی دیر بعد چپراسی یہ حکم لے کر نکلا کہ سررشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لئے بلایا ہے۔ اب رہی سہی امید اور بھی گئی گذری ہوئی تب تو اپنا سا منہ لے کر چپراسی سے یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ "خیر میں تو اب جاتا ہوں۔ صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا" تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا "میں دو بار آپ کی اطلاع کر چکا ہوں، کچھ بولے نہیں۔ اب پھر کہے دیتا ہوں خفا ہوں گے تو آپ میرے آدھ سیر آٹے کی فکر کرنا غرض بلائے گئے، صاحب کو دیکھا کہ پائپ منہ میں لئے ٹہل رہے ہیں۔ بس معلوم ہو گیا کہ مطلق ملاقات نہیں ہو سکتی، سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں، اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر ان کو خبر کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں اور کیا معلوم ہے شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو، بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کے بہت دیر پہلے سے ان کو خبر تھی۔ چپراسی نے شاید نہ بھی کہا ہو، مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ میں سامنے کے دروازے سے آیا درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا۔ پھر بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا۔ کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی ان کی نظر نہ پڑی ہوگی، ضرور پڑی ہوگی، خیر آخر آپ ہی سر اٹھایا، "اور ڈپٹی صاحب" حاکم بالا دست ہو کر جو اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہ کی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل میز کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر کرسیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا لیکن میں تو اپنے سے زیادہ زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر الصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسی پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا، کہنے کو تو کرسی پر بیٹھا۔ مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹکے ہوں، تو جیسی چاہو قسم لو، تم خدا کے بندے ہو یقین مانو بس ڈنڈے پر الگ تھلگ جیسے اڈے پر گلام ا کرسی پر بیٹھنا ہی تھا کہ کمبخت چپراسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا "خداوند، سررشتہ دار حاضر ہیں" صاحب ہیں کہ میری طرف دیکھتے جاتے ہیں، اور

چپراسی سے فرما رہے ہیں "اچھا آنے بولو" یعنی اچھا سررشتہ دار سے کہو چلے آئیں۔ سبحان اللہ، سات برس اسسٹنٹ رہے نو برس کے قریب جنٹ اور اس سولہ برس میں صرف ایک بار ڈیڑھ برس کے لئے ولایت گئے تھے۔ بارہ برس دلی میں رہے اور بھاڑ جھونکا، چودہ برس میں حضرت نے اردو میں کیا حاصل کیا ہے "اچھا آنے بولو" اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب دوں، اور سررشتہ دار مردود آگے آگے آپ، پیچھے بستہ قلم دان لئے ہوئے چپراسی آہی گھسا، سررشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں" دل صاحب گرمی لوٹ"

میں اگر دوں جھکا کر۔ ہاں خداوند گرمی کے تو دن ہی ہیں۔ میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا، لُو سے بھی کئی آدمی مرے" صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں اور دل میں یہ کہہ رہا ہوں گرمی کا حال تو معلوم تھا ارے ظالم تجھ کو یہ بھی خدا کا ترس آیا کہ ایک بندۂ خدا کو جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملتی ہے۔ ناظر اپنی بدذاتی سے تین برس کے پیانے خس کو بنوا دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان، اور جس کو گھر پر بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے اور جو واقع میں گرمی بھر اپنے گھر ٹٹی میں رہتا ہے کتنی دیر سے برآمدے پر پڑا بھن رہا ہے، لاؤ سلام لے کر اس کو آزاد کردوں میں تو سمجھا تھا کہ آدمیوں کا لو سے مرنا سُن کر چونک پڑے گا، اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی، کتنے آدمی کب مرے، لُو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں، اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ کو بھی آئی یا نہیں، غرض آدمی کا دل لوٹنے اور بات کرنے کو چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں۔ پر صاحب تو کچھ پی سی گئے۔ نہیں معلوم دھیان سے نہیں سنا یا سمجھے نہیں، یا کالے آدمیوں کے مرنے کی پروا نہیں کی، اب سررشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کا غذ پھیلا رہا ہے اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں چُپ، جب سررشتہ دار کا غذ پھیلانے لگا۔ صاحب کا منہ دیکھئے تو صاحب فرماتے ہیں" آپ کچھ کچھ.........." یعنی آپ کو کچھ کہنا ہے۔ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ" نہیں میں تو صرف سلام کے لئے حاضر ہوا تھا، بہت دن ہو گئے تھے، جی ملنے کو چاہتا تھا پھر حاضر ہوں گا میری اس آخیر بات میں اور باتیں ہی ایسی کون سی ہوئی تھیں کہ اس کو آخیر کہوں، بلکہ دوسری

بات میں جی ملنے کو چاہتا تھا، بالکل جھوٹ تھا۔ کس مسخرے کا جی ملنے کو چاہتا تھا۔ اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے "

انگریزی سیرتیں انگریزی سیرتیں ایک دوسرے کے بالکل متضاد پیش کی گئی ہیں۔ نوبل صاحب نیک سیرت، نیک طبیعت، وفادار، احسان ماننے والے، شریف و رذیل میں فرق کرنے والے، ابن الوقت کے سرپرست، انھوں نے جان بچانے کے عوض ابن الوقت کو اپنا اسسٹنٹ بنوایا، گاؤں دلوایا، عزت دلوائی اور انگریزوں سے ملوایا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہر موقع پر اُن کے لئے سینہ سپر رہے اور بڑے اصرار سے ابن الوقت کو اس امر پر مستعد کیا کہ وہ انگریزی معاشرت اور تمدن اختیار کرے اور مسلمانوں کا ریفارمر بنے، اُن کے نزدیک ہندوستان کی آئندہ ترقی کے لئے یہ ضروری تھا کہ "جہاں تک ممکن ہو ہندوستانیوں کو انگریز بنایا جائے، خوراک میں، پوشاک میں، زبان میں، عادات میں، طرز تمدن میں، خیالات میں، ہر ایک چیز میں" اور جب ابن الوقت مددگار رہنے کا وعدہ چاہتا ہے تو شد و مد سے کہتے ہیں "ورنہ صرف میں بلکہ تمام کمیونٹی اور سرکار........"

ہمیں نوبل صاحب کے خیالات سے اتفاق ہو یا اختلاف، مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ وہ واقعی نوبل اور شریف تھے۔

برخلاف اس کے شارپ صاحب کی سیرت ہے۔ وہ نہ تو نیک طبیعت تھے اور نہ نیک فطرت انھیں سب سے زیادہ اسی امر کا خیال تھا کہ کوئی ہندوستانی کسی صورت سے کسی انگریز کی برابری نہ کر سکے اُن کے نزدیک انگریزی کپڑے پہننا ہی انگریز کی توہین کرنا تھی۔ ابن الوقت سے وہ اسی وجہ سے جلتے تھے، پھر کان کے کچے بھی ایسے تھے کہ سررشتہ دار نے کہا، ابن الوقت کام نہیں کرتے، محکمہ غدر کی حالت بالکل ابتر ہے۔ بس اس سے کام نکال لیا، اتنا ہی نہیں شام کی سیر کے سلسلے میں خود پیدل تھے ابن الوقت گاڑی پر سوار تھا، خفا ہو گئے کہ ہم کو دیکھتے ہی گاڑی سے کیوں نہ اتر پڑا۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر حضور حضور کیوں نہ کہا۔ باقاعدہ جواب طلب کر بیٹھے۔ ان کی عجیب و غریب ذہنیت اس گفتگو میں خوب واضح ہوتی ہے جو اُن سے اور حجۃ الاسلام سے ہوئی دیکھئے فرماتے ہیں۔

"آپ کے بھائی ہندوستانی ہوکر صاحب لوگ بننا چاہتے ہیں اور چاہے گستاخی کے ارادے سے نہ ہو مگر ہم لوگوں کو ان کی تمام باتوں پر گستاخی کا احتمال ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے ہم کو دوسرے ہندوستانیوں سے ملنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ یہ لباس ہمارا قومی شعار ہے۔ اور اگر کوئی ہندوستانی ہمارے جیسے کپڑے پہنے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نقل کرتا ہے، یا ہم کو چھیڑتا ہے اور چڑھاتا ہے۔ کوئی ہندوستانی ہمارے لباس کو جس میں اس کو کسی طرح کی آسائش نہیں ہے بے وجہ اختیار نہیں کرے گا۔ اور سوائے اس کے کہ اس کے دل میں ہمارے ساتھ برابری کا داعیہ ہو اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ ساری تدبیر انگریزوں کو ذلیل اور ان کی حکومت کو ضعیف اور اُن کے رعب کو بے قدر کرنے کی ہے؛ آپ لوگ بھی اپنے سے کم درجے والے کو برابری کی حالت میں نہیں دیکھنا چاہتے، تو ہم اپنی رعیت کو جسے ہم نے بزور شمشیر زیر کیا ہے کیوں اپنی برابری کرنے دیں گے آج کو تو ابن الوقت صاحب ہیں کل کو ایک محرر، پھر ایک چپراسی، پھر ایک قلی، سب ہماری نقل کریں گے۔ اس کے یہ معنی کہ ہم سلطنت سے دست بردار ہو کر ولایت کا راستہ لیں، نہیں، نہیں، ایسا نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ . . . . "

باوجود ان باتوں کے دل کا برا نہ تھا۔ حجۃ الاسلام سے ساری روداد سنی تو ابن الوقت کے پاس پھر سے مقدمات بھیج دئے "روبکاریں استمالت کے الفاظ جس سے ایک طرح کی معذرت بھی مترشح ہوتی ہے، لکھوا دئے اور ابن الوقت کے نام ایک چٹھی الگ لکھی" مگر مرغ کی ایک ٹانگ انگریزی وضع ترک کرنے پر اس میں بھی شدید اصرار ہے ملاحظہ ہو۔

"آپ کے بھائی حجۃ الاسلام سے جو میں نے آپ کے حالات سنے میرے سارے شکوک دفع ہوگئے۔ اور میں آپ سے اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں اور اگر آپ اپنے بھائی حجۃ الاسلام کی سی وضع اختیار کریں جو آپ کی قومی وضع ہے اور جس میں آپ نے بھی اپنی عمر کا بڑا حصہ بسر کیا ہے، اور جو ایک ہندوستانی شریف کے لئے زیبا اور راحت بخش ہے۔ تو مجھ میں اور آپ میں ایسی دوستی قائم ہوگی جس کو میں ساری عمر نباہوں گا"

ایک غیر فانی زنانی سیرت

خدا جانے نذیر صاحب اس خاکے کے بارے میں کیا کہتے! عورتوں میں صرف ایک سیرت ابن الوقت کی پھوپھی کی دکھائی گئی ہے، ان سے قصے کے پلاٹ میں کوئی خاص کام نہیں لیا گیا ہے۔ گفتگو جو حجۃ الاسلام سے انھوں نے ابن الوقت کے انگریزی وضع اختیار کرنے اور نوبل صاحب کو ان کو بہکا کر فرنگی بنا لینے کے بارے میں کی ہے وہ بہت ہی پرلطف ہے۔ حجۃ الاسلام سے یہ بڑی بی فرماتی ہیں:-

"ملے ہے غدر کے دنوں میں کچھ ایسی گھڑی کا پیرا اس موئے فرنگی (نوبل صاحب کی خاطر کی گئی ہے) کا آیا تھا کہ بچے (یہ مسٹر ابن الوقت سے اظہار محبت ہے) کی مت پھیر دی۔ ہم نے تو ایسا چھپایا، ایسا چھپایا کہ دن کو گورے شہر میں گھسے اور رات کو ہم نے جانا کہ سارے غدر ہمارے گھر میں فرنگی چھپا رہا۔ جس وقت فرنگی کو لائے تھے اگر ذرا بھی مجھ کو معلوم ہوتا میں اس کو گھڑا پانی نہ پینے دوں۔ خدا جانے کم بخت کہاں سے ہمارے گھر آ پڑا تھا، نہ آتا نہ بچہ ہاتھ سے جاتا۔ آخر میرا صبر پڑا، پر پڑا، کسی کی آہ لینی اچھی نہیں ہوتی۔ خدا نے اس کے پیچھے ایسا روگ لگایا کہ سارے سارے دن، اٹوانٹی، کھٹوانٹی لئے پڑا رہتا تھا، آخر کو جاتے ہی بن پڑی، کالا منہ! خدا کرے پھر آنا نصیب نہ ہو!"

جب داماد نے یہ سمجھایا کہ نوبل صاحب نے ابن الوقت کے ساتھ بھلائی ہی بھلائی کی اور کوئی برائی نہیں کی تو اس پر مصر ہیں کہ تم ان کی "بادشاہزادی کو لکھو کہ ان لوگوں نے میرے بچے پر جادو کر کے اس کی مت پھیر دی ہے، ذرا اس گفتگو کو سنئے۔ کس سادگی سے فرماتی ہیں۔

ساس:- اچھا تو تم اُن کی بادشاہزادی کو لکھو۔

داماد۔ کیا؟

ساس:- یہی کہ تمھارے فرنگیوں نے ایسا ظلم کر رکھا ہے کہ ہمارے آدمی کو بہکا کر فرنگی بنا لیا ہے۔ اگر وہ سچ مچ کی بادشاہزادی ہے تو ضرور ہماری فریاد لے گی، لیکن بعض آدمی کہتے ہیں کہ بادشاہزادی کو مت لکھواؤ، کمپنی کو لکھواؤ، کمپنی اس کی بیٹی ہے اور بادشاہزادی نے یہ ملک

بیٹی کے جہیز میں دے ڈالا ہے۔ اب کمپنی کا حکم چلتا ہے سو تم کو تو اصل حال معلوم ہوگا، کسی ایسے کو کبھو کریں دیکھنے کے ساتھ ہی حکم کر دے، بھلا کہیں خدا کی خدائی میں ایسا بھی اندھیر ہوا ہے کہ آپ ہی تو فرنگیوں نے بلایا، اپنے میں ملایا، اور دوسرا فرنگی ایسا ظالم آیا کہ آتے کے ساتھ لگا دشمنی کرنے، دیکھنا تم بادشاہزادی کو یہ ساری باتیں لکھوانا، بھول نا مت، خدا یہاں کے فرنگیوں کی بھی تو حقیقت کھلے کہ کسی بھلے آدمی کو دھوکہ دینا ایسا ہوتا ہے۔ بادشاہی کیا گئی سارے فرنگی بے سرے ہوگئے!"

خواہ آپ ان بڑی بی کی طرح فرنگیوں کے "جادوگیر" ہونے کے قائل ہوں یا مجنۃ الاسلام کی طرح محض اُن کی عقل کے سحر کو مانیں۔ مگر آپ کو ہر حال میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ڈاکٹر نذیر احمد بلا کے جادو نگار تھے کہ انھوں نے اس مختصر سی گفتگو میں اس پوری ذہنیت و سیرت کی مرقع کشی کر دی ہے جو ہماری غیر تعلیم یافتہ بڑی بوڑھیوں کی اب تک خصوصیت ہے! حقیقت امر یہ ہے کہ زنانی سیرت و ذہنیت اور نسوانی طرز گفتگو کی جیسی مکمل تصویریں نذیر احمد نے باوجود مولوی ہونے کے اپنے ناولوں میں کھینچی ہیں ویسے کسی دوسرے اردو ناولسٹ سے ممکن نہ ہو سکیں! اور وہ اسی لئے بقائے دوام کے دربار میں کرسی مرصع اور تاج زر نگار کے مستحق ہیں۔

اقبال کا فلسفۂ حیات

علامہ اقبال جہاں ایک بلند فکر فلسفی ہیں، وہاں ان کا درجہ شاعری میں بھی اس حد تک پہنچا ہے، جب شاعر پر "شاعری جزو لیست از پیغمبری" کا اطلاق ہوتا ہو۔ شاعر کے متعلق ہر زمانے میں ایک جماعت غلط فہمیوں میں مبتلا رہی ہے اور بڑے بڑے مفکر اور مصلح اس سے بدظن رہے ہیں اور ان کے نزدیک شاعر کا وجود دنیا کے لئے مضر ہے وہ جماعت کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے اور دلوں میں افسردگی اور اضمحلال پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی ذات سے جماعت کے نظام میں خلل پڑ جاتا ہے اور وہ بچوں کی طرح ہر نئی چیز کو بجاتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ غالباً اسی خیال سے متاثر ہو کر افلاطون نے اپنی عینی ریاست میں شاعر کو مردود قرار دیا ہے بلکہ خود قرآن کریم نے اس کو گمراہوں کا مرشد ٹھہرایا ہے[1]۔ شاعر کی مذمت کے لئے ان اقوال سے زیادہ مستند قول اور زور دار عبارت اور کیا ہوگی ... . لیکن اگر ان اقوال کی مصلحت اور اُن کے سیاق و سباق سے بحث نہ کی جائے تو ہمارا موضوع بحث ہی غلط ہو جاتا ہے اور اس کے متعلق کچھ کہنا محض تضیع اوقات۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل موضوع پر بحث کرنے سے پیشتر شاعر کی ہستی پر تمہید کے طور پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

یہ عقیدہ ذرا غور کرنے سے بہ آسانی حل ہو جاتا ہے کہ شاعر کے نصیبے میں یہ ذلت و رسوائی اور راندے جانے کی سزا کیوں آئی۔ افلاطون نے اپنی ریاست کی بنیاد جماعت پر رکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شاعر کبھی اپنے اوپر کسی قسم کی پابندی نہیں لے سکتا۔ فرد کو جماعت کے اندر رہ کر اس کی خرابیاں نظر نہیں آسکتیں، وہ جب تک آزادہ روی اور بے نیازی اختیار نہ کرے کسی چیز کے متعلق بے لاگ رائے نہیں دے سکتا۔ شاعر ہمیشہ جماعت سے الگ رہتا ہے اور دنیا سے بے پروا۔ اسی لئے اس کی نظریں

---

[1] وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ

باتوں کی تہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ پھر شاعر کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ایک چیز کو دیکھے اور خاموش رہے وہ بولے بغیر رہ نہیں سکتا، اور جب بولتا ہے تو سننے والوں پر جادو کر دیتا ہے۔ اس چیز سے بڑھ کر جماعت میں انتشار اور بے چینی کا محرک اور کیا ہوگا؟ افلاطون ان حقائق سے آگاہ تھا۔ وہ اپنے نظام میں اس قسم کے عناصر کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اور جب یہ صورت ہو تو اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ وہ شاعروں کو اپنی ریاست میں داخل ہی نہ ہونے دے کہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

مگر افلاطون نے ہر چند شاعری کی مذمت کی ہے اور اسے اپنے نظام ریاست سے جلا وطن تک کر دیا ہے۔ تاہم وہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا، وہ خود ایک رنگین رقم ادیب تھا۔ اس کا تخیل بھی آسمانوں ہی میں رہتا تھا۔ اس نے شاعری کی مدح میں اپنی کتاب "ریاست" کے ایک باب کا بہت بڑا حصہ صرف کیا ہے[۱] ایک جگہ لکھتا ہے کہ "ہم میں سے بہترین شخص جب ہومر یا کسی اور الم نگار شاعر کا کلام سنتا ہے جس میں کوئی اپنے دکھ درد کی داستانِ طولانی دہرا رہا ہو، رو دھو رہا ہو، یا آہ و زاری اور سینہ کوبی میں مصروف ہو تو تم جانو اچھے سے اچھے کا دل پسیج جاتا ہے اور ہم اس شاعر کی خوبی پر سب سے زیادہ عش عش کرنے لگتے ہیں جو ہمارے جذبات کو سب سے زیادہ محرک کر دے[۲]۔

وہ محض جماعت کی خاطر اپنے سب سے عزیز دوست (شاعر) کی قربانی کرتا ہے اور سینے پر پتھر رکھ کر اسے تیاگ دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ اس کی "ریاست" میں جلا وطن شاعر کا مقدمہ پیش ہو اور وہ مسندِ عدالت پر آنے سے پہلے اپنے ایک دوست سے اپنا دردِ دل یوں بیان کرتا ہے "اگر اس کا عذر ناکام رہا تو پھر محبِ عزیز! ہر اس شخص کی طرح جو ایک چیز کا دل دادہ ہے لیکن چونکہ اس کی آرزو اس کے اغراض کے منافی ہے لہٰذا اپنے اوپر جبر کرتا ہے۔ ہم بھی کہ دل دادگانِ شعر ہیں، اُسے چھوڑ دیں گے، اگرچہ بلا کشمکش تو نہیں، ہم میں بھی تو آخر محبتِ شعر کی وہ روح موجود ہے جو شریف

---

[۱] "ریاست" باب ۳ کے صفحات ۱۱۰ تا ۱۱۲ محض شاعر کی ساحری اور اس کی اہمیت کے اعتراف کیلئے وقف ہیں

[۲] "ریاست" باب ۳ صفحہ ۱۱۰

ریاستوں کی تعلیم نے ہمارے اندر پہونچی ہے!"[۵۱] ریاست میں جہاں افلاطون نے شاعر کو مردود قرار دیا ہے وہاں اس سے اپنی وابستگی کا اظہار بھی خوب دل کھول کر کیا ہے۔ اس کے ان متضاد خیالات ‌ؔآرا سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شاعر بذاتہٖ ایسا نہیں کہ اسے جماعت سے خارج کر دیا جائے۔ بلکہ شاعری کی وہ گمراہ کن اور ضرر رساں قسم ہے جو ہادیوں اور مصلحوں کی مساعی تعمیر کو بیکار کر دیتی ہے اور اس کے سبب جماعتوں کو اطمینان و سکون کی زندگی نصیب نہیں ہوتی خود افلاطون بھی اس شاعر کو جس کا موضوع دیوتاؤں کی تسبیح اور مشاہیر کی مدح ہو، مذموم یا ضرر رساں قرار نہیں دیتا اور اسے اپنی ریاست میں داخل ہونے کی اجازت بھی دیتا ہے مگر وہ اس سے آگے ایک قدم بھی نہیں رکھنا چاہتا، اس لئے کہ جہاں روائی یا غنائی شکل میں شعر کی شکر یں دیوی کو ریاست میں داخل ہونے کی اجازت ہوئی کہ بس، بجائے عقل و قانون کی فرماں روائی کے جنھیں اجماع عالم نے بہترین حکمران تسلیم کیا ہے خفا و کرب اور مسرت و الم کا دور دورہ ہو گا"[۵۲]

قرآن کریم نے بھی کم و بیش انھیں اسباب کی بنا پر شاعر کو مردود ٹھہرایا۔ تنزیل قرآن کے وقت اسلام کے سامنے جماعت انسانی کی تشکیل تھی۔ عربوں کی شاعری سے قبیلوں کی باہمی جنگوں میں جتنی خوں ریزیاں ہوئی ہیں ان سے کون ناواقف ہے؟ اس وقت اگر ان شعراء کی مذمت نہ کی جاتی تو شاید اخوت و مساوات کا وہ زریں اصول محض بے کار ثابت ہوتا جو اسلام کی تعلیم کو دوسری تعلیم سے ممتاز کرتا ہے۔

یہاں ایک چیز اور تشریح طلب ہے۔ قرآن کے طرز بیان سے اس کے قول کی عمومیت ثابت نہیں ہوتی، اس نے "والشعراء" کہا ہے جس سے شعراء کا کوئی خاص طبقہ مراد ہے نہ کہ شاعر بحیثیت شاعر۔ یہیں یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ شاعر بذاتہٖ مردود نہیں بلکہ اس قوم کا ایک خاص

---

[۵۱] "ریاست" باب ۱۰ صفحہ ۶۰۹

[۵۲] "ریاست" باب ۱۰ صفحہ ۶۱۳

معذب ہوا ہے جو اپنے خداداد کمال سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہو۔ جماعت میں فتنہ پھیلاتا ہو انسانوں میں امتیاز کا جذبہ پیدا کرکے ایک دوسرے کا دشمن بناتا ہے۔ جماعت کے شیرازے کو منتشر کرنے کی فکر میں رہتا ہے غرض ہر وہ کوشش جس سے جماعت کی ترقی رک جاتی ہے اس کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اس معتوب شاعر کا شعار ہوتا ہے، اس تاویل کی تائید خود قرآن کریم کی بعد کی آیت اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا سے ہوتی ہے جس میں اس نے شاعر کے دونوں طبقوں کے درمیان حد فاصل قائم کر دی ہے اور معتوب طبقے سے مومنوں کو مستثنیٰ کر دیا ہے" یعنی مومن اگر شعر بھی کہے تو وہ ان باتوں کا مصداق نہیں ہوتا بلکہ کسی امر حق کا اظہار اشعار میں کرتا ہے وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا میں اشارہ ہو کہ جب انھیں بہت برا کہا جاتا ہے تو وہ کبھی کبھی مدافعت کے طور پر ظالم کے عیوب کا ذکر اشعار میں کر دیتے ہیں .... اس سے معلوم ہوا کہ شعر کہنا منع نہیں اور مومن بھی شاعر ہو سکتا ہے مگر اس کی شاعری عام شاعروں کی بیہودگیوں سے پاک ہوتی ہے[۵۱]۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی ذات سے بڑھ کر قرآن کی اور جامع تفسیر نہیں ہو سکتی شاعروں کو حکمت و دانش سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کے پیش نظر اگر نفس شاعری کی تردید و تجویز ہوتی تو شاید رسول اللہ کے حلقۂ نشینوں میں حسان بن ثابت جیسے جادو نگار شعرا کو جگہ نہ ملتی اور زبان مبارک سے اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً وَاِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا نہ نکلتا

ہم شاعر کی ذات سے جو اس درجہ بدظن ہو گئے ہیں اور اس کے وجود کو قوم کی افسردگیوں اور پس ماندگیوں کا باعث ٹھہرانے لگے ہیں اس میں خود ہماری فہم کا قصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سامنے اتفاق سے تصویر کا وہی رخ ہے جو ایک زندگی طلب قوم کے لئے یقیناً مہلک ہے لیکن اگر ذرا صبر سے کام لیا جائے اور کوشش کی جائے (مگر یہ کوشش اس قدر صبر آزما ہے کہ ہم اس

---

[۵۱] بیان القرآن جلد نمبر ۲ صفحہ ۱۴۰۰ (حاشیہ)

کے تصور سے بھی گھبرا اٹھتے ہیں، کہ تصویر کا دوسرا پہلو بھی نظر کے سامنے آجائے تو شاید یہ غلط فہمی نہ رہے۔ اور جماعت میں شاعر کے وجود کی اہمیت سمجھ میں آجائے۔

شاعر کی ذات کے متعلق ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ وہ طبعاً محتاج اور حریص ہوتا ہے یا بے نیاز اور مستغنی۔ اس ذیل میں مولانا حالی کی رائے ہے کہ جس طرح خوشامد اور نذر بھینٹ کا چٹخارہ رفتہ رفتہ ایک متلون اور راست باز جج کی نیت میں خلل ڈال دیتا ہے اسی طرح دربار کی واہ وا اور صلے کی چاٹ ایک آزاد خیال اور جذبیلے شاعر کو چپکے ہی چپکے بھٹی، جھوٹ اور خوشامد یا ہزل و تمسخر پر اس طرح ڈالتی ہے کہ وہ اس کو کمال شاعری سمجھنے لگتا ہے[1]۔ مولانا حالی جیسے نکتہ رس اور حقیقت شناس کی رائے سے کیسے انکار ہو سکتا ہے اور وہ بھی جب ان کی تائید متقدمین اردو کی زندگیوں سے ہوتی ہو۔ مگر یہ بھی اسی طرح استثنا کا محتاج ہے جس طرح خود شاعر کی ذات۔ واقعات شاہد ہیں کہ یہ رائے شعرا کے اسی طبقے پر صادق آتی ہے جسے افلاطون اور قرآن کریم نے مردود قرار دیا ہے جو شعر کو وجدان سے متاثر ہو کر نہیں کہتے بلکہ مخصوص واقعات کو کسی مصلحت کے پیش نظر نظم کر دیتے ہیں۔ اور اس کے لئے داد و تحسین کے منتظر رہتے ہیں۔ حالی کی رائے کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بھی "دربار" کے لفظ سے استثنا ثابت ہو جاتا ہے اور اس خیال کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ یہ رائے انھوں نے اردو کے ان شعراء کو نظر میں رکھ کر قائم کی ہے جن کا شعار بادشاہوں اور نوابوں کو اپنے اشعار سے خوش کر کے ان کی ادب نوازی سے مادی فائدے اٹھانا رہا ہے۔ مثال کے لئے انشا کا تمام دیوان پڑھ جائیے۔ بھرتی کے شعروں سے پڑ ہے۔ پھر اس شعر کو بھی پڑھئے جو انھوں نے دربار سے نکلنے کے بعد اپنی تنگ دستی سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی　　تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

اقبال کی حیثیت ان شاعروں سے بہت ممتاز اور بلند تر ہے۔ وہ طبیعت کی اس افتاد

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری

کا پابند نہیں اس کی شاعری کا مقصد راستے سے بھٹکے ہوؤں کو راہ پر لگانا ہے۔ ان میں ل جانا نہیں اس کے تصور میں شاعر ابراہیمی شان رکھتا ہے جس کے کلام سے آتش کدۂ آذر سرد ہو کر رہ جاتا ہے

شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

آخر کیوں کر کہا جائے کہ اقبال بھی انھیں کاسہ لیس اور خود فروش شعرا کے زمرے میں آتا ہے جن کی طرف مولانا حالی کا اشارہ ہے .... اقبال جس کا مسلک ہے کہ

ناز شہاں نمی کشم زخمِ کرم نمی خورم
در نگجہلے ہوس فریب ہمت این گدائے را

اور جس کے نزدیک استغنا خدا کے پاس بندوں کا شانِ امتیازی ہے اور زندگی کی محافظ و نگہبان۔

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر مضبوط رکھتی ہے تو استغنار

پھر اپنی درویشی پر فخر ہے۔

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

جن شاعروں کو سامنے رکھ کر حالی نے اپنی رائے قائم کی ہے۔ اقبال ان کی صف میں نہیں آتا۔ "انسان" اقبال کا ممدوح ضرور ہے مگر بہ حیثیت فرد یا بہ شکل طبقہ و ملت نہیں بلکہ بحیثیت مخلوق اس کا مذہب انسانوں میں رنگ نسل کے امتیاز کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس کا پیغام کسی ایک قوم یا جماعت کے لئے نہیں بلکہ نوع انسان کے لئے ہے۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام ست
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

مگر اس کے کلام کا بیشتر حصہ اسلام کی تعلیم کی روح کو نمایاں کرتا ہے اور ہر جگہ اس کا خطاب اور اشارہ مسلمانوں ہی سے ہے۔ اس کے کلام کی اسی خصوصیت کو دیکھ کر یورپ کے ایک مستشرق مسٹر نکلسن نے اس پر الزام لگایا تھا کہ اقبال کا فلسفہ یوں تو کسی خاص ملت یا جماعت کی حمایت نہیں کرتا۔ مگر اس کی تمام تر تعلیم مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص ہے اور وہ خطاب

بھی ان ہی سے کرتا ہے[51] لیکن یہ رائے نتیجہ ہے۔ مسٹر ڈکنسن کی سطح بینی اور اقبال کے فلسفے کے سرسری مطالعے کا۔ اقبال نے خود۔ اُن کے اس الزام کا جواب دیا ہے کہ" میرے نزدیک اسلام ہی میرے فلسفۂ انسانیت کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ میں اسلام کو عرب و حجاز یا عراق و عجم کا مذہب تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ انسان کا دین ہے اور جب میں اسلام سے خطاب کرتا ہوں تو میرے ذہن میں مسلمان نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسان ہوتے ہیں[52]۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ اقبال کا فلسفہ کوئی نیا فلسفہ نہیں۔ وہی اسلامی فلسفہ ہے جو تمام و کمال قرآن کریم کی الہامی زبان میں موجود ہے۔ اقبال اس کا محض مفسر ہے اور پھر اسے اصلی صورت میں لانا چاہتا ہے جو مسلمانوں کی کور باطنی کی وجہ سے بالکل مسخ ہو گئی ہے

مسلمانوں نے قرآن کو اسلام کے محض ابتدائی دور میں صحیح طور پر سمجھا تھا اور اس ماحول کا اثر زیادہ سے زیادہ خلافت راشدہ تک ہا۔ لیکن جب سے انھوں نے فتوحات اور ملک گیری کو اپنا مقصد بنا لیا اور سمجھے کہ اُن کا منتہائے سفر یہی منزل ہے۔ تبھی سے اسلامی فلسفے کی روح مضمحل ہونی شروع ہوئی۔ اطمینان و راحت کی زندگی نصیب ہوئی۔ شاہانہ ٹھاٹھ ہونے لگے تو توسنِ فکر کی جولانی کی باری آئی۔ دلوں سے ایمان کی تازگی رخصت ہوئی اور ان کی جگہ عقل و تدبر کی الجھنوں نے لے لی اور پھر مسلمان اس میں ایسے پھنسے کہ جو کچھ پہلے سمجھ چکے تھے وہ بھی بھول گئے۔ اقبال نے بھی اسی حقیقت کی وضاحت اپنے ایک انگریز دوست کے خط کے جواب میں کی ہے اسلام کو جہاں ستانی اور کشور ستانی میں جو کامیابی ہوئی۔ میرے نزدیک وہ اس کے مقاصد حق میں بے حد مضر تھی، اس طرح وہ اقتصادی اور جمہوری اصول نشو و نما نہ پا سکے۔ جن کا ذکر قرآن کریم اور احادیث نبوی میں جا بجا آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم

---

۵۱ اقبال کا ایک خط، مطبوعہ نیرنگ خیال۔ اقبال نمبر

۵۲ نیرنگ خیال، اقبال نمبر

کرلی۔ لیکن ساتھ ہی اُن کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا اور انھوں نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں کہ اسلامی اصولوں کی گیرائی کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔[۵۳] مسلمانوں کو اقبال سے یہی شکایت ہے اور اپنے شعروں میں وہ اسی شکوے کو مختلف پیرایوں میں دہراتا ہے۔ کبھی ان کے سامنے روتا ہے تو کبھی انھیں کوستا ہے۔ کبھی گڑگڑاتا ہے تو کبھی دعوت پیکار بھی دیتا ہے۔ کبھی مٹانے پر آتا ہے تو سراپا نیاز ہو جاتا ہے اور جب کبھی خود درد سے گھبراتا جاتا ہے تو اپنی شعلہ نوائی سے آگ لگا دیتا ہے۔

آسٹریا کے نومسلم عالم مسٹر محمد اسد نے بھی مسلمانوں کی موجودہ پستی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب (ISLAM ON THE CROSSROAD) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے

> حقیقت یہ ہے کہ موجودہ اسلامی زندگی اور اسلام کی حقیقی تعلیم میں بہت بڑا بعد ہوگیا ہے اسلام کا عمل پیہم اور حرکت دوام کا زرّیں اصول جمود و تعطل اور راحت طلبی میں تبدیل ہوگیا۔ اور مسلمانوں نے وسیع القلبی اور جذبہ ایثار کو چھوڑ کر کوتاہ نظری اور خود غرضی کو شعار بنالیا ہے۔[۵۴]

غرض مسلمان وہ مسلمان نہ رہے جن کا ذکر قرآن میں بارہا آیا ہے اور جس کا نمونہ رسول اللہ نے اپنی زندگی میں عملی طور پر پیش کیا تھا، اُن کی رگوں میں وہ خون اور خون میں وہ حرارت باقی نہ رہی جو مسلمان کو مسلمان بناتی ہے۔ جہاد تحفظ حق کے لئے بنا تھا۔ مگر اس سے ذاتی اغراض کی تکمیل میں کام لیا گیا، قرآن کو جو نہایت واضح اور صاف زبان میں نازل ہوا تھا کھینچ تان کر اپنے اغراض کے مطابق بنایا گیا۔ ایمان کی جگہ عقل اور حق وصداقت کی بجائے تدبر وسیاست کو اصول زندگی بنایا گیا اور وہی لوگ جو دنیا کو امن وآشتی، محبت خلوص، اور ایثار و قربانی کا سبق دینے کے لئے اٹھے تھے۔ خود باہمی جنگ وپیکار، بغض وعناد اور خود بینی

---

[۵۴] دیباچہ (ISLAM ON THE CROSS ROAD)

وخود ستائی میں مبتلا ہو گئے .... اقبال انھیں چیزوں کو مسلمانوں کی پستی اور زوال کی وجہ قرار دیتا ہے اور اس کے علاج کے لئے وہ نسخہ تجویز کرتا ہے جس کے اجزائے ترکیبی ایمان خودی، عمل پیہم، سخت کوشی اور ذوق طلب ہیں۔ وہ جس زندگی کا پیغام دیتا ہے اس میں سکون کی جگہ تڑپ، قناعت کی جگہ طلب، تن آسانی کی جگہ سخت کوشی، عقل کی جگہ ایمان اور تقلید کی جگہ خودی ہے۔ اس کے سفر کا مقصود لطیف منزل نہیں۔ بلکہ ذوق خرام اور خلش آبلہ پائی ہے۔

مگو از مدعائے زندگانی ۔۔۔ ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست
من از ذوق اثر آنگونہ مستم ۔۔۔ کہ منزل پیش من جز سنگ رہ نیست

اور تماشا یہ ہے کہ راہ نہایت پرخطر اور اندیشہ ناک اختیار کرتا ہے۔ جن قافلوں نے پرسکون اور راحت بخش شاہراہیں منتخب کی ہیں انھیں وہ نگاہ میں نہیں لاتا۔ اور ان کی پست ہمتی پر افسوس کرتا ہے۔

وائے آن قافلہ کز دونی ہمت می خواست ۔۔۔ رہگذارے کہ دروہیچ خطر پیدا نیست

اور پھر اپنے قافلے کے راہ گیروں کی علو ہمتی پر فخر کرتا ہے جو قصداً اس راستے کو چھوڑ دیتے ہیں جس میں کسی کشمکش کا امکان نہیں، اور ایسی راہ تلاش کرتے ہیں جس میں قدم قدم پر مشکلات سے الجھنا اور خطرات سے لڑنا پڑے۔

مرد ہمت آں رہرو م کہ پا نہ گذاشت ۔۔۔ بہ جادہ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست

زندگی کے چار رخ

اقبال کے پیش نظر ایک مکمل انسان کی تعمیر و تخلیق ہے جو دنیا کو پیغام صلح وامن دے۔ حق کی حمایت میں باطل سے برسرپیکار ہو، اخوت و مساوات کا سبق دے اور فطرت انسانی سے جذبۂ امتیاز کو مٹادے۔ اس کا ایمان۔ اس کی طاقت، اس کی جان، اس کا مال اور اس کی ساری زندگی اپنی ذات کے لئے نہ ہو، بلکہ انسانیت کی نگہبانی، حق کا تحفظ، صلح وامن کی کوشش، اس کا شعار زندگی ہو۔ اس کی شخصیت

اس قدر نمایاں ہو کہ دنیا جب اپنی عقل کی زندگی کی الجھنوں سے اور بدمزگیوں سے گھبرا جائے تو خودبخود اس کی طرف جھکے، اور اس سے اپنے درد کا درماں طلب کرے

بازدر عالم بیار ایام صلح　　　　جنگ جویاں را بدہ پیغام صلح

وہ اپنے مکمل "انسان" کی زندگی کے چار اصول مقرر کرتا ہے۔ ایمان، خودی سخت کوشی و عمل، عالم گیر اخوت، اور یہی اس کے فلسفۂ حیات کی روح ہے۔ انسان زندگی میں اسی اصول پر کاربند ہو کر دنیا میں کامیاب اور آخرت میں سرخرو ہو سکتا ہے۔ اقبال کے شعروں نے جس قدر قالب اختیار کئے ہیں .... مدح، ہجو، فخر، نسیب، طنز .... ہر ایک میں یہی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ تصوف اور معرفت اس کے کلام کا مخصوص رنگ ہے۔ مگر یہاں پہنچ کر بھی اس کے دردمند دل کو قرار نہیں ملتا، اور اسکی سکون ناآشنا فطرت بے چین ہی رہتی ہے۔ مگر یوں کہنا چاہئے کہ اس نے تصوف کو ذریعہ بنایا ہے بارگاہِ ایزدی کی باریابی کا جہاں جاکر وہ "مسند نشین بارگاہ" سے "شکوہ" کرتا ہے اور قوم کے لئے زندگی عمل کی بھیک مانگتا ہے

ایمان کامل اقبال زندگی کی بے کیفی اور زبوں حالی کی بنیادی وجہ ایمان پر "عقل" کے غلبے کو قرار دیتا ہے اس کے نزدیک عقل قلب و روح کی پژمردگی کا باعث ہے، اس باب میں اقبال مولانا جلال الدین رومیؒ کا مرید ہے اور ان ہی سے یقین و ایمان کا سبق لے کر عقل کو خدا حافظ کہتا ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا ایمان نے اسے وہ درجہ عطا کیا جو عقل کی رہنمائی میں حاصل نہ ہوتا۔ کہتا ہے :-

سفالم را مے او جام جم کرد　　　　درون قطرہ ام پوشیدہ یم کرد

خرد اندر سرم بت خانہ ریخت　　　　خلیل عشق دیرم را حرم کرد

وہ جب کسی مسئلے کو عقل کی روشنی میں حل کرنا چاہتا ہے تو الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اپنی ایک نظم موسوم بہ جلال و ھیگل میں اس نے اپنی اس کمزوری کا نہایت خلوص سے اعتراف کیا ہے

نظم کا خلاصہ ہے کہ " ایک شب میں ہیگل کے فلسفوں پر غور کر رہا تھا جوں جوں میرے خیالات کی پرواز بڑھتی جاتی تھی۔ میں الجھنوں اور کشمکشوں میں پھنستا جاتا تھا۔ اسی محویت کے عالم میں یکایک مرشد روم کی زیارت ہوئی حضرت نے میری بے لبسی پہ ترس کھا کر مجھے تنبیہہ کی فرمایا :-

گفت با من چہ خفتہ بر خیز
به سرائے سفینہ می رانی ؟

بہ خرد راہ عشق می پوئی
بہ چراغ آفتاب می جوئی ؟

عقل حقیقت کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتی۔ بلکہ انسان کو ہمیشہ دھوکے میں رکھتی ہے " بہ سرائے سفینہ می رانی ؟ " کی معنویت ملاحظہ ہو۔ تشنہ کام حقیقت کو اس سے ہمیشہ دھوکا ہوتا ہے اس کی تشنگی کبھی بجھ نہیں سکتی بلکہ وہ اضطراب کی حالت میں مارا مارا پھرے گا۔ اور ایک وقت آئے گا کہ وہ اپنی حالت میں ناکام و نامراد چل بسے گا۔ اقبال کو عقل و خرد سے بھی اندیشہ تھا۔ اسے حقیقت کی جستجو تھی۔ مگر جب عقل کے پھیر میں پڑ کر اپنی آرزو کو ناکام ہوتے دیکھا تو گھبرا کر پکار اٹھا

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لا یحزنوں کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

عقل کی روشنی میں حقیقت کی تلاش بالکل ایسی ہی ہے جیسے شیطان کے نقش قدم پر چل کر جنت کی طلب اس لئے کہ عقل ابلیسی فطرت کی خصوصیت ہے۔ اس کا پایہ پکڑنا سراسر شیطان کی مریدی ہے۔ حضرت رومی کا ارشاد ہے۔

داند آں کو نیک بخت و محرم ست
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم ست

ایمان کی کمزوری انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ وہ دین میں حقیقت سے دور ہوتا ہے اور دنیا میں ناکام و ذلیل۔ دین میں تو یہ چیز بنیاد ہے حق و صداقت کی اور اس کے بغیر کوئی اس منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتا جس پر پیغمبر اور نبی اسے لے جانا چاہتے ہیں۔ دنیا میں بھی اگر یقین کی کارفرمائی نہ ہو تو اس کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ انسان ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور اس کی بے دینی

کی زندگی بھی عذاب ہو جائے۔ اس لئے کہ انسان کے ہر کام کا محرک یقین ہوتا ہے اور وہ اپنی سمجھ میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا جس کے صلے کے حصول میں اسے تذبذب معلوم ہوتا ہو یہی یقین جب عشق کی حد تک پہنچ جاتا ہے (جسے تصوف کی اصطلاح میں "جذب" کہتے ہیں) تو طالب سراپا مطلوب ہو جاتا ہے۔ جو کامیابی کی انتہائی منزل ہے۔ یہیں اگر انسان حضرت باری میں باریاب ہوتا ہے۔ خواہ اس کی لگن کفر سے ہو یا اسلام سے، اس کے بالمقابل تذبذب اور تشکیک انسان کو کہیں کا نہیں رکھتے اسلام ایسے شخص کو خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو منافق کہتا ہے اور دنیا اور عقبیٰ دونوں میں اس کی تذلیل کا حکم لگاتا ہے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

ایمان کامل کا جیتا جاگتا نمونہ حضرت ابراہیم کی سیرت پاک میں موجود ہے۔ حضرت جس ماحول میں تھے اس میں ان کی توحید کفر تھی، مگر اس "کفر" کی فدائیت ملاحظہ ہو کہ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے اُن کے یقین و ایمان کی گرمی کی تاب لانے سے قاصر رہتے ہیں اور آتش کدۂ آذر سرد ہو جاتا ہے اس فدائیت اور سوز عشق کے مقابلے میں دورِ حاضر کی عقلیت ہے۔ جس نے اہل دنیا کو تذبذب اور بے یقینی کی لعنت میں گرفتار کر کے جیتے جی عذاب میں ڈال رکھا ہے۔

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

حضرت امام فخر الدین رازیؒ نے قرآن کو فلسفے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن فہمی میں بے انتہا پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ حضرت رازی حکمت و فلسفے کے امام تھے اور انھوں نے بہت سے مسائل کو سلجھایا، اور ان کا حل تجویز کیا ہے مگر اقبال کو اُن سے کوئی عقیدت نہیں اُن کے مقابلے میں وہ فقر حیدری کا سپاس گزار ہے جس کے نزدیک اسلام عقل کا پابند نہیں بلکہ ایمان پر مبنی ہے۔ اقبال عقل کو زوالِ عشق سے تعبیر کرتا ہے جس سے دلوں میں افسردگی اور روح میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔

کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر　　　زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

اپنے جوشِ ایماں کے آگے امام رازی کی پرواز خرد کو نگاہ میں نہیں لاتا اور اعلان کر دیتا ہے

زرازی معنیٔ قرآن چہ پرسی　　　ضمیرِ ما بآیاتش دلیل ست
خرد آتش فروزد دل بسوزد　　　ہمیں تفسیرِ نمرود و خلیل ست

عقل کی رہنمائی کی ایک خاص حد ہے جس کے آگے کا رستہ اس کا دیکھا ہوا نہیں۔ عقل کی رہنمائی میں اس حد تک پہنچ کر بھی اگر راہرو آگے بھی اسی کی رہنمائی میں چلنا چاہے تو یقیناً وہ بیچ میں بھٹک کر رہ جائے گا اور اس کی یہ مسافت رائیگاں جائے گی۔ اس حد پر پہنچ کر دوسرا ہادی ملتا ہے جو راہرو سے ہادیٔ خرد کی طرح یقینِ راہ کے متعلق بحث نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلا آئے۔ یہ ہادی ایمان ہے۔ راہرو اپنے پہلے سفر کے رہنما (عقل) کی باتوں کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اس لئے اکثر وہ دوسرے ہادی کی خاموش رہنمائی سے گھبرا اٹھتا ہے۔ اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور پھر اسی نور کی طرف لپکتا ہے جس کی روشنی میں اس نے اب تک سفر کیا تھا۔ اقبال اس کھوئے ہوئے اور گم کردہ راہ مسافر کی تنبیہ کرتا ہے۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　　چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل کی شمع باہر روشنی ضرور کرتی ہے۔ مگر اندرونِ منزل اس کی شعاعیں نہیں پہنچ سکتیں نہ وہاں کے ہنگاموں کی اسے خبر ہوتی ہے۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے　　　خرد کیا ہے چراغِ رہ گذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا　　　چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

ایمان کی لازوال دولت کو چھوڑ کر جن لوگوں نے عقل و خرد پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھی ہو اقبال کو ان سے کوئی وابستگی نہیں۔ اس کے حلقۂ درس میں طالبِ شوق کو جو درجہ حاصل ہے طالبِ خرد کو نہیں وہ ان عقل پرستوں سے قطع تعلق کر لیتا ہے

گرفتم ایں کہ کتابِ خرد فرو خواندی　　　حدیثِ شوق نہ فہمیدہ دریغ از تو

اور دل دادگان شوق کو درس عشق دیتا ہے۔

مسلمانان مرا عرضیست در دل | کہ روشن تر ز جان جبرئیل ست
نہانش دارم از آذر نہادان | کہ ایں سترے ز اسرار خلیل ست۔

بچشم عشق نگر تا سراغ او گیری | جہان بچشم خرد سیمیا و نیرنگ ست

ز عشق درس عمل گیر و ہر چہ خواہی کن | کہ عشق جوہر ہوش ست و جان فرہنگ ست

خودی انسانی اخلاق کی بنیاد اقبال فلسفۂ خودی پر رکھتا ہے۔ چنانچہ مثنوی اسرار و رموز زندگی کے انھیں دو عناصر (خودی اور بے خودی) کے لئے وقف ہے اس کے علاوہ اس کی دوسری تصانیف میں بھی یہی فلسفہ نمایاں ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ انسان کی طاقت کی بے پناہی کا راز۔ حساس خودی میں مضمر ہے۔ اور اس کا یہی جوہر اسے فرشتوں سے بھی ممتاز کرتا ہے۔ انسان بہ لحاظ تخلیق فرشتوں سے کمتر ہے۔ وہ نوری ہیں، یہ خاکی۔ وہ ہمہ تن نور ہیں، یہ سراپا ظلمت، مگر انسان کے خاکی پیکر میں خودی کے نور سے روشنی ہے جس میں وہ گرمی اور حرارت ہے کہ فرشتوں کو باوجود ان کی نوری تخلیق کے حاصل نہیں، اقبال کو اپنے اس امتیاز پر کس قدر ناز ہے۔ ملاحظہ ہو

یہ نوریاں ز من پا بہ گِل پیامے گوئے | حذر ز مشت غبارے کہ خویشتن نگرست

یہی امتیازی شان انسان کا سرمایۂ حیات ہے۔ اقبال اسی نغمے سے مست ہے۔ دوسروں کے راگ اسے ایک نظر نہیں بھاتے۔

برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب گِل تُست | اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

واقعہ تو یہ ہے کہ انسانی سیرت کے جانچنے کا اصلی معیار خودی ہے۔ ہزار کوئی متقی ہو، پرہیزگار ہو، حقیقت کی تلاش میں سرگرداں اور حصول معرفت کے پیچھے در بدر مارا پھرے، مگر خودی کی دولت ہے

محروم ہے تو اس کی یہ تمام خوبیاں ہیچ ہیں۔

طواف کعبہ زدی گرد دیر گردیدی ۔۔۔ نظر بخویش نہ پیچیدہ ، دریغ از تو

اصل زندگی اپنی ذات پر بھروسا کرنا ہے۔ دوسروں پر تکیہ کرنا موت سے بھی بدتر ہے۔ اس جد و جہد میں انسان پر مصیبتیں بھی ضرور آتی ہیں۔ مگر یہی اس کی زندگی کی کسوٹی ہے جس پر وہ پرکھا جاتا ہے۔

خطر تاب و تواں را امتحان است ۔۔۔ عیار ممکنات جسم و جان است

مصیبتیں جھیل کر انسان انسان بنتا ہے۔ لوہا جب خوب تپایا جاتا ہے۔ تب کہیں جا کر اسے شمشیر براں بننے کا شرف حاصل ہوتا ہے اور آلہ جہاد ہونے کی ازلی راحت۔

انسان جب اپنی خود قدر کرتا ہے تو خدا اور تقدیر بھی اس کی مدد دیتے ہیں۔ جن کے پاس اپنا کچھ نہیں دنیا بھی اسے ٹھکرا دیتی ہے اور خدا بھی اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ انسان کی کامیابی کے اس راز کو قرآن نے کس قدر موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ
اقبال نے اس باب میں جتنے اشعار کہے ہیں سب اسی آیت کریمہ کی تفسیریں ہیں مولانا حالی فرماتے ہیں۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی ۔۔۔ نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

انجیل مقدس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دو لڑکوں کی تمثیل بیان کرکے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ

"پس جس کے پاس ہے اسے اور دیا جائے گا ، اور جس کے پاس خود کچھ نہیں۔

اس سے وہ بھی لے لیا جائے گا جو اسے دیا گیا تھا"

گویا یہ قانون فطرت ہے جو غیر شعوری طور پر انسانی زندگی میں کارفرما ہے۔ جس نے اس سے روگردانی کی اس کی سزا قانون فطرت کے مطابق موت ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ پستی اور زبوں حالی کا سب سے بڑا سبب ترک خودی ہے۔ جب تک ان میں یہ جوہر موجود تھا وہ دنیا پر چھائے ہوئے تھے اسے کھو دیا تو اب ذلت و پستی ، تنگ نظری ، غلامی ، غربت و افلاس ، کم حوصلگی کی لعنتوں میں گرفتار ہیں۔

بزم مسلم از چراغ غیر سوخت ۔۔۔ مسجد او از شرار غیر سوخت

از سوادِ کعبہ چوں آہو رمید　　ناوک صیاد پہلوکش درید

اقبال ان کی اس کس مپرسی اور زبوں حالی سے دل تنگ ہو، اگر جو لوگ کبھی موت کو نگاہ میں نہیں لاتے تھے اب وہی اس کے خوف سے پیلے پڑے جا رہے ہیں اس لئے کہ اپنی حقیقت کو بھول گئے۔ وہ انھیں خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر موت ہی کا خوف ہے تو اس سے نجات کی صورت یہ ہے،

بخود باز آ، خودی را پختہ تر گیر　　اگر گیری، پس از مردن نہ میری

اور پھر مشورہ دیتا ہے کہ خود کو چھوڑ کر دوسروں پر بھروسا نہ کرو۔ احسان مندی اور منت کشی جیتے جی کا عذاب ہے۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش　　براہِ دیگراں رفتن عذاب است

تم نے اپنی بلند حوصلگی کھو دی تمھیں اپنے اوپر بھروسہ نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جنھوں نے تمھارے سامنے سر تسلیم خم کیا تھا، آج تم ان کے خوف سے لرزاں ہو۔ اپنی شیر افگن فطرت ترک کر دی۔ اور اب بکریوں سے ڈرنے لگے ہو۔ خود اعتمادی کی جگہ اب تمھارے دلوں میں اندیشۂ زیاں لے لی ورنہ تم اس نوبت کو نہ پہنچتے۔

دلِ بے باک را ضرغام رنگ است　　دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است
(شیر　بکری)
اگر بیمے نداری بحر صحرا است　　اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

مسلمانوں کی زر طلبی پر لعنت اور ان کو سیم و زر کی حقیقت سے آشنا کرتا ہے کہ جس کو تمھاری ذات سے شرف حاصل ہوا، تم خود اس کے مرید ہونا چاہتے ہو؟

اگر کردی نگہ بر پارۂ سنگ　　زفیضِ آرزوئے تو گہر شد
بزر خود را مسنج اے بندۂ زر　　کہ زر از گوشۂ چشمِ تو زر شد

کائنات میں جیسی اور چیزیں تھیں، وہاں ذرا چمکتا ہوا پتھر کا ایک ٹکڑا یہ لعل بھی تھا جسے انسان کی نگاہ قدر شناس نے لعل بنایا اور اس کی قدر تسلیم کی، مگر انقلاب دیکھئے کہ یہی حقیر سا ٹکڑا اب خود انسان کو انسان بنانے کا مدعی ہے، کچھ نہیں انسان نے جب اپنی قدر کھو دی تو لازمی طور پر اسے دوسروں کا

محتاج ہوناپڑے

توقدر خویش نہ دانی ، بہار تو گیرد — دگرنہ لعل درخشندہ پارہ سنگ است

اقبال کے نزدیک شیوۂ مردانہ اپنی دنیا آپ تعمیر کرنا ہے۔ غیروں کی ہمت و مردانگی پہ اچھلنا کم حوصلگی ہے۔ پھر دوسروں کا ٹھکانا ہی کیا۔ آج کوئی دوست ہے۔ ممکن ہے کل نہ رہے۔ شمع کی گرمی سے حرارت زندگی آخر کب تک۔ جس کی کل زندگی ایک رات سے سوا نہیں۔ پروانے کو دیکھئے رات بھر خوب اچھلتا کودتا ہے صبح کو جب شمع بجھ جاتی ہے تو اس کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ زندگی کی خواہش ہو تو خود جلنا سیکھئے اور اپنے سوز دروں سے حرارت حاصل کیجئے۔ کہ یہ گرمی اپنی حیات تک نو رہے۔

دلا نارائی پروانہ تا کے — نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را بسوز خویشتن سوز — طواف آتش بیگانہ تا کے

بطوف شمع چو پروانہ زیستن تا کے — زخویش اے ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

ایک دوسری جگہ چاند کی روشنی سے اپنی تاریک رات کو روشن کرنے کو معیوب قرار دیتا ہے یہاں بھی غیر کا اعتبار نہیں، کہ چند دن ہے، پھر نہیں۔

اگر آگاہی از کیف و کم خویش — یکے تعمیر کن از شبنم خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے — شب خود را برافروز از دم خویش

خود شناسی جہاں دنیاوی زندگی کی کامیابی کا راز ہے وہاں حصول معرفت کا بھی واحد ذریعہ ہے اس نکتے کو تو اقبال ہی نے نہیں۔ دوسرے شعرا نے بھی واضح کیا ہے۔ سرمد و منصور کے جذب کو موضوع بنا کر جتنے بھی شعرا ردو فارسی میں کہے گئے ہیں سب اسی حقیقت کے ترجمان ہیں۔ فرق اتنا نظر آتا ہو کہ ان لوگوں کے یہاں حصول معرفت کا ذریعہ ترک خودی ہے اور اقبال کے نزدیک احساس خودی۔ مگر حقیقت دونوں نظریوں کی ایک ہے اس لئے کہ احساس خودی کے بغیر کسی کو ترک خودی کا خیال نہیں آسکتا ،

حضرت جگر کا ارشاد ہے :-

ہزار جاں گرامی فدا بر ایں نسبت — کہ میری ذات سے اپنا پتہ دیا تو نے

شاعر کی زبان سے یہ شعر اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک وہ اپنی ذات سے آشنا نہ ہو جائے۔

اصل میں طالب و مطلوب کے درمیان جو چیز حائل ہوتی ہے "ہوش و خرد ہے" اقبال کو ہر جگہ اس سے شکایت ہے۔ وہ حجاب جلوہ کا باعث کبھی احساس خودی کو نہیں ٹھہراتا، وہ نالاں ہے اور پناہ مانگتا ہے تو عقل سے

مراز دیدۂ بینا، شکایت دگر ست — کہ چوں بہ جلوہ درآئی حجاب من نظر ست

رہ عاقلی رہا کن کہ باو تواں رسیدن — بہ دل نیاز مندے بہ نگاہ پاک بازے

ایک دوسری جگہ اسی نظریے کو کہ عین معرفت تلاش خودی ہے۔ ترک خودی نہیں۔ نہایت صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی — کہ او پیداست تو زیر نقابی

تلاش او کنی جز خود نہ بینی — تلاش خود کنی جز او نہ یابی

اتنا ہی نہیں بلکہ وہ حصول معرفت کو علامت قرار دیتا ہے احساس خودی کی

نظر بخویش فرو بستہ را نشاں این ست — وگر سخن نہ سراید ز غائب و موجود

اپنی ذات کو سمجھ لینا عین معرفت ہے۔ اپنی ذات کو سمجھے بغیر اس کی تمنا کرنا گداگری ہے۔ سائل اگر بے نیاز نہیں، تو اس کے سوال کی تکمیل کا انحصار معطی کی رضا پر ہوتا ہے۔ لیکن ایک درویش جو اپنی ذات پر قانع ہے اور دوسروں سے بے نیاز تو اسے در بدر بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لوگ اس کے یہاں خود جا کر نذریں پیش کرتے ہیں۔ اقبال حضرت موسیٰ کو ان کی اسی گدایانہ آرزوئے دید پر طعنہ دیتا ہے اور انسان کی معیاری سیرت کو چند الفاظ میں واضح کر دیتا ہے۔

گدائے جلوہ رفتی بر سر طور — کہ جان تو ز خود نا محرمے ہست

قدم در جستجوئے آدمے زن — خدا ہم در تلاش آدمے ہست

فلسفۂ حیات کے اسلامی پہلو کو "خدا ہم در تلاش آدمے ہست" میں کس خوبی سے واضح کیا ہے یہیں اعلیٰ

فلسفۂ زندگی کی روح لا رہبانیت بھی نمایاں ہو جاتی ہے ۔ عین عبادت دنیا و ما فیہا سے بے نیازی نہیں بلکہ وابستگی ہے اسی اجمال کی تفسیر ایک دوسرے شعر میں کی ہے ۔

خودی تعمیر کن در پیکر خویش   چو ابراہیم معمار حرم شو

سخت کوشی و عمل

اقبال فلسفۂ سخت کوشی کا پیغمبر ہے اور اسے وہ انسان کی ذہنی ، سماجی ، فوجی تہذیبی اور ان تمام چیزوں کی نشو و ارتقا کا باعث ٹھہراتا ہے ۔ جو موجودہ دور کو متمدن بناتی ہیں ۔ اپنے ایک انگریز دوست کے خط کے جواب میں لکھتا ہے " تصادم انسان کی بقائے شخصی اور زندگی کے علو و ارتقا کے لئے نہایت ضروری چیز ہے ۔ اسی لئے میں عمل کی تمام صور مختلف کو جس میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے ضروری سمجھتا ہوں [۵۱] " یہاں سوال یہ اٹھتا ہے جیسا کہ یورپ کے ایک عالم مسٹر ڈکنسن کا خیال ہے کہ کیا اقبال کے نزدیک دور حاضر کی وہ تمام مادی جد و جہد مستحسن ہے جس نے دنیا کو عرصہ محشر بنا رکھا ہے ؟ اس سوال کا جواب اقبال کے شعروں میں تو موجود ہی ہے کہ انسان کی جد وجہد اسلامی تخیل حیات کی پابند ہونی چاہیئے ۔ مزید وضاحت کے لئے خود اسی کا جواب سن لیجئے ۔

" مسٹر ڈکنس کے نزدیک میں نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے اعمال قرار دیا ہے ۔ افسوس اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے ۔ میں روحانی قوت کا قائل ہوں لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو [۵۲] "

اس کے پیام کے چند شعر ملاحظہ ہوں جو شاعر مشرق نے مغرب کو دیا ہے ۔ اس میں اس نے یورپ کی تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے

---

۵۱ نیرنگ خیال اقبال نمبر

۵۲ نیرنگ خیال اقبال نمبر صفحہ ۵۵

یورپ نے اپنی جاہلیت سے نجات پانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ قدرت تک کو تو اپنے قبضے میں کر لیا مگر اس کے لئے اس کے درد کا درمان کر سکے؟ اقبال کے نزدیک اس کی زندگی تاریک سے تاریک تر ہوگئی اور اس کی تمام تدبیریں باطل اور بے سود

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری — عجب این ست کہ بیمار تو بیمار ترست

یورپ کی تمام جدوجہد کا حاصل یہ ہوا۔

عشق گردید ہوس پیشہ و ہر بند گسست — آدم از فتنۂ او صورت ماہی در شست

رزم بر بزم پسندید و سپاہے آراست — تیغ او جز بہ سر و سینۂ یاراں ننشست

رہزنی را کہ بنا کرد جہانبانی گفت — ستم خواجگی او کمر بندہ شکست

بے حجابانہ بہ بانگ دف و نے می رقصد — جامے از خون عزیزان تنک مایہ بدست

مگر جدوجہد، عمل اور زندگی کا مقصد اقبال کے نزدیک وہ نہیں جو یورپ نے سمجھا ہے۔ بلکہ وہ انسان میں صولت اور شاہیں جگری اس لئے دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے فرض منصبی کی تکمیل کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس کا فرض کیا ہے۔ سنیئے۔

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

وقت آنست کہ آئین دگر تازہ کنیم — لوح دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

دل از منزل تہی کن پا بہ راہ دار — نگہ را پاک مثل مہر و مہ دار

متاع عقل و دیں با دیگراں بخش — غم عشق از بدست افتد نگہ دار

بیا اے عشق اے رمز دل ما — بیا اے کشت ما، اے حاصل ما

کہن گشتند این خاکی نہاداں — دگر آدم بنا کن از گل ما

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا — لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اور اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر وہ مختلف پیرایوں میں زندگی کے اس اصول کو واضح کرتا ہے اس باب میں وہ ابلیس کے نظریے کو مستحسن قرار دیتا ہے۔ جس نے جنت کی بے عمل زندگی کے مقابلے میں دنیا کی پرخطر

زندگی کو ترجیح دی اور آدم کو بھی اسی راستے پر لایا۔ اقبال نے حقیقی زندگی کے اصولوں کو اس کی زبان میں کس خوش اسلوبی سے باندھا ہے

زندگی سوز و ساز بہ ز سکون دوام　　　فاختہ شاہیں شود از تپش دوام
ہیچ نیاید ز تو غیر سجود و نیاز　　　خیز چو سرو بلند اے بعمل نرم گام
کوثر و تسنیم برد از تو نشاط عمل　　　گیر ز مینائے تاک بادۂ آئینہ فام
زشت و نیکو زادۂ وہم خداوند تست　　　لذت کردار گیر گام بنہ جوئے کام
خیز کہ بنمایمت مملکت تازۂ　　　چشم جہاں بیں کشا بہر تماشا خرام
قطرۂ بے مایۂ گوہر تابندہ شو　　　از سر گردوں بیفت گیر بدریا مقام
تیغ درخشندہ شو جان جہانے گسل　　　جوہر خود را نما آے بروں از نیام
بازوئے شاہین کشا خون تدرواں بریز　　　مرگ بود باز را زیستن اندر کنام
تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل　　　چیست حیات دوام سوختن ناتمام

مگر ابلیس کا نظریہ بہرحال ابلیس کا نظریہ ہے۔ جس کا مقصد زندگی فریب وریاکاری ہو اس لئے اقبال زندگی کی اس بے پناہ قوت کے ساتھ " راہ صواب" کو شرط قرار دیتا ہے کہ غلط راستے پر پڑ کر انسان کے بھی ابلیس بن جانے کا امکان ہے۔ حضرت آدم نے حضور باری میں اپنی اسی غلطی (بے راہ روی) کا اعتراف کیا تھا۔ جو شیطان کی فریب دہی کا نتیجہ تھی۔

گرچہ فسونش مرا برد ز راہ صواب　　　از غلطم درگذر عذر گناہم پذیر

اور پھر مدد کے لئے دعا مانگی تھی۔

رام نگردد جہاں تا نہ فسونش خوریم　　　جز بکمند نیاز ناز نہ گردد اسیر
تا شود از آہ گرم ایں بت سنگیں گداز　　　بستن زنار او بود مرا ناگزیر

جس زندگی میں محض راحت ہی راحت ہو۔ مشکلوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اقبال اس زندگی کو بے کیف اور اس دنیا کو زندان کہتا ہے۔

مزی اندر جہانے کور ذوقے — کہ انساں وارد و شیطاں نہ دارد

چنانچہ جنت کی بے عمل زندگی اسے نہیں بھاتی جہاں غم کی خلش مفقود ہے۔

دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے — نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

اس لئے کہ اس کا "دل ناصبور" صبر و قرار نہیں چاہتا کہ یہ اس کے لئے موت ہے۔

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نسازد — دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے — تپد آں زماں دل من پئے خوبتر نگارے

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے — سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

طلبم نہایت آں کہ نہایتے نہ دارد — بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امیدوارے

اس ذیل میں بھی اقبال فرشتوں پر تشکیک کرتا ہے جنھیں "وصل" کا سکون حاصل ہے مگر وہ نہیں جانتے کہ اس سکون کی قدر و قیمت کیا ہے کہ اس کا معیار "ہجر" اُن کے یہاں نہیں۔

بگو جبریل را از من پیامے — مرا آں پیکر نوری ندادند

ولے تاب و تب ایں خاکیاں بیں — بنوری ذوق مہجوری ندادند

اسی طرح خضر کے مقابلے میں سکندر کی زندگی کو ترجیح دیتا ہے جس کی تمام زندگی خطرات کے مقابلے میں گذری جو لطف اس زندگی میں سکندر کو حاصل تھا۔ خضر کو کہاں نصیب!

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت — شریک سوز و ساز بحر و بر شو

تو ایں جنگ از کنار عرصہ بینی — بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

سخت کوشی اور خودی کا اصول اقبال کو عقاب کی زندگی میں اپنی اصل صورت میں نظر آتا ہے اور اس نے عقاب کی زندگی کو اپنی آئیڈیل زندگی سے ہم آہنگ دیکھ کر اسے بلبل کی جگہ اپنی شاعری کا ہیرو بنایا ہے اور جہاں زندگی و عمل کا مجسم نمونہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ وہاں عقاب کو مثال میں پیش کرتا ہے۔ جس کے نزدیک زندگی کا معیار یہ ہے

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام — سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر — وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

تن نرم و نازک بہ تیہو گذار — رگ سخت چوں شاخ آہو بیار

نصیب جہاں انچہ از خرمی ست — ز سنگینی و محنت پر دمی ست

چہ خوش گفت فرزند خود را عقاب — کہ یک قطرہ خوں بہتر از لعل ناب

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم — ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری — جواں مرد کی ضربت غازیانہ

یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا — مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں — کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اور اس زندگی کا عکس یہ ہے۔

تنش از سایۂ بالِ تدروے لرزہ می گیرد — چو شاہیں زادۂ اندر قفس با دانہ می سازد

اس استعارے میں مسلمان کی اصل زندگی اور اس کی موجودہ زندگی کی کیسی زندہ تصویر کھینچی ہے زندگی حکمت و فلسفہ اور غور و فکر میں نہیں ملتی، بلکہ اس کا اصل ماخذ سوز و تپش ہے، کتاب کے ایک کیڑے اور پروانے کا ایک مکالمہ ہے جس میں اس حقیقت کو نہایت موثر انداز میں ادا کیا ہے۔

شنیدم شبے در کتب خانۂ من — بہ پروانہ می گفت کرم کتابی

بہ اوراق سینا نشیمن گرفتم — بسے دیدم از نسخۂ فاریابی

نہ فہمیدہ ام نکتۂ زندگی را — ہماں تیرہ روزم ز بے آفتابی

نکو گفت پروانۂ نیم سوزے — کہ ایں نکتہ را در کتابے نیابی

تپش می کند زندہ تر زندگی را — تپش می دہد بال و پر زندگی را

طلب اگر حقیقی ہو تو انسان جہاں جائے اور جس چیز کو دیکھے اسی میں مطلب نظر آتا ہے۔ اقبال زندگی کا طالب ہے، اُسے کائنات کے ذرے ذرے میں زندگی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو موج دریا

سے زندگی کا سبق کس طرح اخذ کرتا ہے۔

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

اور پھر وہی سبق انسان کو دیتا ہے جس کی زندگی اس کی سکوں طلبی سے بے کیف ہو گئی ہے

بیا با ہمدم بہ ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است
بہ دریا غلط و با موجش در آویز حیات جاوداں اندر ستیز است
[illegible] چو ماہی جز تپش بر ما حرام ست
مجو ساحل کہ در آغوش ساحل تپیدیک دم و مرگِ دوام ست

میدانِ عمل میں حصولِ جزا، افسردگی اور بے عملی کا محرک ہوتا ہے۔ اس سے انسان میں عمل کی وہ گرمی اور جستجو کی وہ تپش باقی نہیں رہتی جو زندگی میں تحریک پیدا کرتی ہے۔ بلکہ سکون اس کی بالیدگی کو روک دیتا ہے۔

دریں گلشن پریشاں مثلِ بوئم نمی دانم چہ می خواہم چہ جوئم
برآید آرزو یا بر نیاید شہیدِ سوز و سازِ آرزوئم

یہی حال سفر کا ہے کہ منزل ذوقِ خرام کو پامال کر دیتی ہے۔ مگر طلبِ منزل ہی سفر کی نشاط آوری کی محرک ہوتی ہے۔ اس لئے اسے بحال رکھنے کے لئے اقبال قصداً ایسا رستہ اختیار کرتا ہے جو منزل کو جاتا ہی نہیں۔

مرا صاحب دلے خوش نکتۂ گفت ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

زیارتِ کعبہ کا شوق کسے نہیں ہوگا؟ مگر اقبال کو کیا کہئے کہ وہ اس سعادت کو اپنی جفا طلب فطرت پر قربان کر دیتا ہے۔ محض اس لئے کہ اس راہ میں خطرہ نہیں، جس سے الجھنا زندہ دلوں کا کیش ہے

بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی ست سفر بہ کعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر ست

وہ سخت کوشی اور سوز دوام کی اسی نعمت غیر مترقبہ پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور خوش ہے

شادم کہ عاشقاں را سوز دوام دادی — درماں نیافریدی آزار جستجو را

اور پھر اسی لازوال دولت کے لئے حضور باری میں دست بدعا ہے۔

کاشانہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو — یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

اصول انسانیت

آیت کریمہ الملک للہ وہ ابدی قانون ہے جس کی روگردانی سے کشت و خون، فتنہ و فساد، بغض، عناد، غرض ہر دو لعنت پھوٹ نکلتی ہے جو جماعت انسانی کے لئے ننگ ہے۔ تاریخ نے ہر دور میں اس تلخ حقیقت پر خون کے آنسو بہائے ہیں اور دنیا کو آج بھی جب کہ اسے علم و حکمت اور "تہذیب و تمدن" کی معراج حاصل ہے اس مہلک مرض سے نجات نہیں، اور زندگی کے ہر مرحلے میں جنگ و جدال کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

اسی طرح انسان نے اسلام کے نظریۂ جماعت کُلُّ النَّاسِ مِنْ اَبْنَاءِ آدَمَ و آدم من طین کو بھی جس کی وضاحت معلم اخلاق حضرت سعدی نے "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کے بلیغ الفاظ میں کی تھی، بھلا دیا۔ ارض اللہ کی تقسیم کے ساتھ ساتھ انسانوں میں بھی رنگ و نسل کے امتیازات پیدا ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان باہم ہی نہیں، بھائی بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور یہ رنگ کچھ ایسا گہرا ہوا کہ ایک جماعت میں بھی آپس میں تنازعے شروع ہو گئے اور اب رنگ و نسل کی بجائے معیار امتیاز لباس اور طرز زندگی قرار پایا۔ اقبال اپنے "مکمل انسان" کی سیرت میں ایک ہمہ گیر نظریہ انسانیت (HUMANITY) کو بھی کارفرما دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے بغیر اس کی نظر میں وسعت اور اس کے فیصلوں میں انصاف کا امکان پیدا نہیں ہوتا وہ وطنیت کے جذبات سے مبرا ہے اور نہایت صاف صاف الفاظ میں اپنی رائے کا اعلان کرتا ہے۔

ہنوز از بند آب و گل نہ رستی — تو گوئی رومی و افغانیم من

من اول آدم بے رنگ و بویم — ازاں پس ہندی و تورانیم من

اس کی شریعت میں رنگ و بو کا امتیاز نہیں ہے۔ ایک گہوارے کے پلے ہوؤں میں باہم امتیاز کیسا!

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

مسلمان کو کہ اس کا مذہب کسی "مسلمانستان" کا مذہب نہیں۔ بلکہ بنی نوع انسان کا مذہب ہے امتیاز نسل و نسب زیب نہیں دیتا۔ اقبال ایسے مسلمان کو کودک فش کہتا ہے۔ اور اسے بتاتا ہے کہ "تیرا عربی و حجازی بننا خود عرب و حجاز کے لئے باعث شرم ہے۔ تیرا مسلک تو مسلمان بننا ہے۔

تو اے کودک منش خود را ادب کن — مسلمان زادۂ ترکِ نسب کن

بہ رنگ احمر و خون و رگ و پوست — عرب نازد اگر ترکِ عرب کن

اقبال یورپ کی موجودہ مادی ترقیوں کا اسی وجہ سے مخالف ہے کہ اُن کے یہاں انسان بہ حیثیت انسان نہیں مانا جاتا۔ بلکہ بہ حیثیت قوم و وطن تسلیم کیا جاتا ہے۔ دوسری جگہوں کے انسان کو وہ انسان نہیں سمجھتے اور انھیں غلام اور مطیع کرنے میں انھیں قطعاً دریغ نہیں ہوتا وہ جمعیت اقوام کو جسے آج کل دنیا میں نظریہ انسانیت کی تبلیغ و اشاعت کا مشن کہا جاتا ہے۔ کفن چوروں کی ایک انجمن سمجھتا ہے جو مُردوں کو قبر میں بھی سانس نہیں لینے دیتے۔

برفتد تا روشِ رزم دریں بزم کہن — دردمندانِ جہان طرح نو انداختہ اند

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند — بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

ایک جگہ جماعت کے اسلامی تخیل اور مغربی نظریہ کو یوں ادا کیا ہے

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے — حرم کا راز توحید امم ہے

تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب — کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

یہ ہیں زندگی کے چار اصول جن پر اقبال انسان کی سیرت کی بنیاد رکھتا ہے اور اسے یقین ہے کہ اسی اصول پر چل کر انسان دنیا کو گوناگوں مصائب سے نجات دلا سکتا ہے۔ جن کے پرچم عمل پر لکھا ہو گا۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال پیغمبر حیات ہے۔ اور حرمان و یاس سے ناآشنا۔

ناامید از آرزوئے پیہم ست　　　ناامیدی زندگانی را سم ست

زندگی را یاس خواب آور بود　　　ایں دلیل سستی عنصر بود

مگر ہے انسان اور وہ بھی ایک غلام قوم کا فرد۔ اس لئے امت کی غفلت شعاریوں سے کبھی کبھی مایوس بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہندوستان کے متعلق کہتا ہے۔

بہ خاک ہند نوائے حیات بے اثر ست　　　کہ مردہ زندہ نہ گردد ز نغمۂ داؤد

مگر اس وقت امید اس کی دستگیری کرتی ہے وہ پھر تازہ دم ہو جاتا ہے اور یوں گویا ہوتا ہے۔

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے　　　ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی

امثالُ القرآن

گذشتہ سے پیوستہ

الم تر کیف ضرب اللّٰہ مثلاً کلمۃً طیبۃً کشجرۃٍ طیبۃٍ اصلھا ثابتٌ وفرعھا فی السماء تؤتی اکلھا کل حینٍ باذن ربھا ویضرب اللّٰہ الامثال للناس لعلھم یتذکرون۔ (سورہ ابراہیم پارہ ۱۳)

تم نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح پاک کلمہ کی مثال بیان کرتا ہے؟ اس کی مثال اس پاک درخت کی سی ہے جس کی جڑ مضبوط و پائدار ہو اور اسکی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسی طرح لوگوں کیلئے مثالیں بیان کرتا ہے کہ وہ عبرت و نصیحت حاصل کریں

آیہ مذکورہ بالا میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے کلمہ طیبہ کو شجرہ طیبہ کے ساتھ تشبیہ دی جیسے شجرہ طیبہ سے ثمرات نافعہ پیدا ہوتے ہیں اسی طرح کلمہ طیبہ سے اعمال صالحہ کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ کلمہ طیبہ جب کسی انسان کے دل میں متمکن و جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ کو بھی بارگاہ الٰہی میں درجہ قبولیت و منظوری حاصل ہوتا ہے۔ اگر کلمہ طیبہ پر اعتقاد و یقین نہ ہو تو کسی عمل صالحہ کو بھی درجہ قبولیت حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایمان ایک شجرہ کی مثل ہے۔ اخلاص اور للّٰہیت نے اس کی جڑوں کو قلب مومن میں راسخ اور مضبوط کر دیا ہے۔ اس کی شاخیں توحید، رضا، تسلیم، صبر و شکر وغیرہ ثمرات آسمان تک پہنچ رہے ہیں۔ انسانی عقائد چونکہ یکساں درجے پر نہیں ہوتے حسب قوت و ضعف ایمان و مشاہدہ براہین و دلائل سے ان میں تفاوت ہونا ازبس ضروری ہے۔ اس تفاوت اعتقادی کے باعث اعمال بنی آدم بھی متفاوت ہوں گے۔ اسی تفاوت کے باعث بروز قیامت اور دنیا میں اہل ایمان متفاوت درجے پر نمودار ہوتے ہیں اور ہوں گے جیسے درخت کی تکمیل کے لئے جڑوں۔ تنے۔ شاخوں۔ پتوں۔ پھولوں اور پھلوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی

ایمان کے لئے بھی ان سب چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایمان کی جڑ علم، معرفت اور یقین ہے اور اس کا تنا اخلاص و للّٰہیت اور اس کی شاخیں اور فروع اعمال صالحہ ہیں اور اس کے ثمرات وہ اخلاقِ حسنہ اور صفات حمیدہ ہیں جو علم اخلاق میں مفصل طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔ جیسے شجرہ کے بقا کے لئے ایسے مادے کی ضرورت ہے جو اس کے تغذیہ اور تنمیہ میں مد ہو۔ ایسے ہی شجرۂ ایمان کے لئے بھی علم نافع عمل صالح اور ذکر و فکر کی دائماً ضرورت ہوتی ہے۔

شجر ایمان کے شیریں ثمر | اگر درخت سے اس کے مدحیات مادہ تنمیہ اور تغذیہ کو ہٹا دیا جائے تو وہ درخت کسی نہ کسی وقت خشک اور مردہ ہو جایا کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی شکل بظاہر درختوں سی نظر آتی ہے مگر جن عوائد و فوائد کی اس سے توقع رکھی جاتی تھی وہ سب کے سب نیست و نابود ہو گئے۔ ایسا درخت سوا جلانے اور بھاڑ میں جھونکنے کے کسی کام میں نہیں لایا جا سکتا۔ شجرۂ اسلام سے اگر علم نافع کی تجدید اور عمل صالح کی تعمیل اور ذکر اور فکر کا مشغلہ ہٹا دیا جائے تو وہ شجرۂ ایمان بالکل اس مردہ درخت کی طرح بے سود ہو جائے گا۔ مسند امام احمد حنبلؒ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک روایت مروی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے ان الایمان یخلق فی القلب کما یخلق الثوب فجددوا ایمانکم۔ باغبان اور کھیتی والا اپنی کھیتی کی حفاظت اور نگہبانی نہ کرے تو وہ آفات ارضیہ و سماویہ سے تباہ و برباد ہو جائیں گی۔ مومن قانت کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہمیشہ اپنے ایمان اور اسلام کے درخت کو آفات موذیہ اور مفسدہ سے بچاتا رہے۔ جب کوئی باغیچہ لگایا جاتا ہے، یا کھیتی نافع کو بویا جاتا ہے تو عادت اللہ کے مطابق بہت سے گھاس پات اور غیر مفید بوٹیاں اور درخت اس کے ارد گرد اس سے غذا بانٹنے کے لئے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر باغبان اور زمیندار کھیتی کی نگرانی اور صفائی نہ کرے گا اور غیر ضروری بوٹیوں اور درختوں کو نہ کاٹے گا تو غیر مفید درختوں اور گھاسوں کا غلبہ ہو جائے گا اور اس کا شجرۂ مقصود اور زرع مطلوب کمزور کالعدم یا بالکل ہی معدوم ہو جائے گا جیسا کہ کھیتی اور باغیچہ کی حفاظت اور بقا کے لئے دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ کہ ان تک ان کے مادۂ حیات کو

پہنچایا جائے اور اجنبی درختوں اور گھاس پات کو نکال کر زمین کو صاف کیا جائے اسی طرح ایمان اور اسلام کے شجرہ کے گرد اگرد قلب مومن کی زمین میں مختلف قسم کی خواہشات اور گوناگوں گناہوں اور قسم قسم کے وساوس اور شبہات بھی پیدا ہوجایا کرتے ہیں۔ مومن کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اس قسم کے خیالات باطلہ وفاسدہ کے قلع قمع میں ساعی اور کوشاں رہے تاکہ یہ چیزیں اسکے ایمان کو نقصان پہنچاکر برباد نہ کردیں۔

ایمان کے نتائج | جس قدر زمین زیادہ صاف ہوتی ہے اور اس کو زیادہ نرم کیا جاتا ہے اور بہترین پانی سے اس کو سیراب کرکے اچھا تخم بویا جاتا ہے۔ اسی قدر پھل اور فصل عمدہ حاصل ہوتے ہیں اسی طرح قلب مومن کی حالت ہے کہ وہ ہمیشہ امداد اعمال اور تدبر وتفکر کے استمرار کرنے سے اعلیٰ ثمرات ایمانی ومنافع اسلامی حاصل کرتا رہتا ہے۔ اور اس پر کوئی ایسا وقت نہیں گزرتا کہ جس میں اس شجرۂ ایمان پر ثمرات مفیدہ نمودار نہ ہوتے ہوں صحابہ کرامؓ کی سیرت اور ان کے حالات کو جب پڑھا جاتا ہے تو ان کے ایمان کی تکمیل ثمرات ونتائج سے بخوبی روشن وہویدا ہوجاتی ہے۔ وہ لوگ بدعات اور وساوس وخطرات نفسانی سے کس قدر گریز ونفرت کیا کرتے تھے۔ جن چیزوں کو آج ہم معمولی خیال کرتے ہیں اور ہماری توجہ بھی ان کی اصلاح کی طرف منعطف نہیں ہوتی، انھوں نے ایسی چیزوں پر اس شدومد سے انکار کیا۔ جیسا آج کل کفر پر بھی کوئی اس درجہ انکار نہیں کرتا۔ انہیں شجرۂ ایمانی کی حفاظت اور اثرات مخالفہ سے اس کو بچانا ازحد مطلوب تھا۔ تاکہ حقیقی ایمان اور اسلام کے ساتھ متصف رہیں۔ مگر رفتہ رفتہ زمانے کی نیرنگی نے یہ وقت دکھایا کہ جب ہم اپنے شجرۂ ایمانی کی طرف نظر کرتے ہیں۔ تو بعض اوقات اجزا ہی سرے سے مفقود نظر آتے ہیں گویا اصلھا ثابتٌ ہی نہیں رہا۔ محض ظاہرداری اور نمائش پر کام چلائے جاتے ہیں۔ فرعھا فی السماء کا بھی کہیں پتہ نہیں۔ کیونکہ اعمال صالحہ کا نباہنا اور اس کی پابندی ہمارے لئے باعث تکلیف وکسرشان ہے۔ توتی اکلھا کل حین کا تو ذکر ہی کیا۔ مدت العمر ہم صورت اعمال کی مشق اور ورزش کرتے رہتے ہیں اور جن منافع کی ان اعمال سے توقع کی جاتی تھی انکا

کوئی بھی اثر ہم میں نمودار نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم نے ایمان کو ایسا اہم اور ضروری نہیں سمجھا جیسا کہ سمجھنا چاہیئے تھا۔ اندریں حالات نہ تو ہماری نمازوں میں وہ رنگ رہا جو ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشآء والمنکر میں مذکور ہے اور نہ ہمارے حج و زکوٰۃ و روزے میں وہ کیفیت رہی جو کیوم ولدتہ امہ کا مصداق ٹھہرے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے اعمال کو بھی بے نتیجہ و بے ثمر دیکھتے رہتے ہیں۔ بھلا جس عمل کو ہم اپنی خواہش و ہوس کے مطابق ادا کریں اس پر کوئی شرعی اثر کیونکر مرتب ہوگا۔

کلمۂ خبیثہ سے مراد ازاں بعد اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے کلمۂ خبیثہ کا ذکر فرمایا جس کو شجرۂ خبیثہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی جس کی جڑ نہ تو زمین میں قائم ہے نہ تنا نہ شاخیں نہ سایہ نہ ثمر ایسا ہی کلمۂ خبیثہ شرک۔ بدعت بداعمالیوں کا حال ہے۔ نہ تو اس پر کوئی اثر مفید مرتب ہوتا ہے اور نہ کسی بھلی بات کی طرف وہ رہنمائی کرتا ہے اور نہ ہی اس سے کسی خیر و منفعت و برکت کی امید کی جا سکتی ہے۔

کلمۂ خبیثہ سے مراد یہاں شرک ہے جس کو شجرۂ خبیثہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی شرک کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ تمام عالم میں نظر دوڑائیے۔ زمین آسمان کا مطالعہ کیجئے۔ بر و بحر کے حالات کو دیکھئے۔ سورج چاند ستاروں کی حرکتوں کو ملاحظہ کیجئے۔ اختلاف لیل و نہار کا معائنہ کیجئے کیفیات ترقی حیوانات و نباتات کا غور سے مطالعہ کیجئے غرضکہ جس طرف بھی آپ دھیان یا توجہ کریں، بزبان حال لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کا نقارہ بج رہا ہے پھر شرک کی دلیل ہو ہی کیسے سکتی ہے جو اسے جائز و صحیح قرار دے۔ مشرکین کے اعمال پر کوئی صحیح نتیجہ مرتب نہ ہوگا۔ وَقَدِمْنَا اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰہُ ھَبَآءً مَّنْثُوْرًا مشرک کا کوئی بھی عمل صالح مابعد الموت اس کے لئے مفید و ممد نہ ہوگا۔ من کان یرید الحیوٰۃ الدنیا و زینتھا نوفِ الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون۔ اولٰئک الذین لیس لھم فی الاخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیھا وَبَاطِلٌ مَا کانوا یعملون کے مطابق انکے

سارے اعمال آخرت میں بیکار ثابت ہوں گے۔

شرک کے لئے عقلی دلیل تو ہو ہی نہیں سکتی۔ نقلاً بھی شرک کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ تمام انبیاءؑ کی طرف توحید کی وحی کی گئی۔ وَلقد اوحیَ الیكَ والی الذین من قبلكَ لئن اشرکت لَیحبطنَّ عملُكَ وَلتکونن من الخاسرین۔ اس پر شاہد ناطق ہے۔

(۵) اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی الزجاجہ الزجاجۃ کانھا کوکب دریٌّ یوقد من شجرۃٍ مبارکۃٍ زیتونۃٍ لاشرقیۃٍ وَلاغربیۃٍ یکاد زیتھا یضیئُ وَلولم تمسسہُ نار۔ نورٌ علیٰ نور یھدی اللہ وَلنورہٖ من یشاءُ وَلیضرب اللہ الامثال للناس وَاللہ بکل شیٔ علیم۔

اس مثل کی تشریح میں لوگوں نے از حد کوشش کی اور اپنے اپنے خیال کے مطابق جو کچھ کسی کی سمجھ میں آیا لکھ دیا۔ بہت سے لوگوں نے تو اُسے تشبیہ مرکب کے ذیل میں درج کیا اور بعض نے تشبیہ مفرد میں داخل کیا۔ جس قدر تفاسیر میری نظر سے گذری ہیں کسی میں کوئی ایسی معتدبہ ومفید شے نظر نہیں آئی جس پر طبیعتِ متجسّس قانع ہوسکے۔ بڑے بڑے ائمہ جب اس مثل کی تشریح پر پہنچتے ہیں۔ تو اپنے قلم کو روک لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ کی تمثیلات کی پوری تشریح کے کرنے کے باوجود اس مثل کو ادھورا ہی چھوڑ کر کوئی دوسرا مضمون شروع کردیتے ہیں۔ ان کے اقوال کو اگر یہاں بالاستیعاب ذکر کیا جائے تو ایک پوری کتاب کی شکل بن جائے گی، لہٰذا جو کچھ میرے ناقص فہم میں آتا ہے عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر غلط ہو تو ارباب فضل وکمال سے اس کی تصحیح کی امید کی جاتی ہے۔

قرآن حکیم میں دو ایسی سورتیں پائی جاتی ہیں جن کا نہایت ہی جبروت وسطوت سے عنوان سے آغاز ہوا ہے۔ اول سورہ نور۔ سورۃٌ انزلناھا وفرضناھا۔ دوسری سورہ توبہ۔ برائۃ من اللہ ورسولہ الخ

اس شان جلالی وہیبت الٰہی کو دیکھتے ہوئے انسان کو خوف اور ڈر طاری ہوجاتا ہے،

کہ نہایت ہی شاہی شان سے حکم دیا گیا ہے۔ جس کا طرز دوسری سورتوں سے بالکل ہی جداگانہ و نرالا ہے۔ اس شانِ جلالی کو شانِ جمالی سے آمیزش کرنے کی غرض سے واللہ اعلم بالصواب ہر دو سورہ میں ایک ایسی آیت نازل فرمائی گئی ہے جو اس ہیبت اور خوف کو کچھ کم کر دے۔ اور بشارت کا ایک اعلیٰ نمونہ دکھا کر جلال کے ساتھ جمال کو بھی ملا دے۔ توبہ میں لقد جاءکم رسول من انفسکم الخ کو لایا گیا۔ نور میں اللہ نور السموات والارض الخ کو نازل فرمایا گیا۔ انسان جب اپنے اخلاق و اعمال کو درست اور مہذب کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا نور اور تجلیات الٰہی اس کے سامنے نہایت ہی ہویدا اور آشکارا طور پر متجلی اور جلوہ افروز ہونے لگتی ہیں۔ اس کے نور کی دنیا کے اندر کوئی نظیر یا مثال حقیقی طور پہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ مگر بغرض افہام و تقریب الی العقل کے لئے چند اشارے پیش کئے جاتے ہیں یعنی اگر ایک طاقچہ فرض کیا جائے جس میں ایک بتی رکھی جائے بتی شیشے کے اندر ہو اور شیشہ خود ہی ایسا روشن اور منور اور صاف ہو جیسے آسمان کا روشن ستارہ اور اس بتی کو زیتون کے اس درخت کے تیل سے جلایا جائے جو نہ پہاڑ سے مشرقی جانب ہو اور نہ مغربی جانب۔ کیونکہ مغربی جانب والے کو صبح کے وقت سورج کی گرمی نہیں پہنچ سکتی اس لئے اس کے پھل ناقص اور ناتمام رہتے ہیں اور مشرقی جانب والے کو بعد از دوپہر سایہ آجاتا ہے۔ سایہ کے باعث اس کے پھلوں کو پورے طور پر نشوونما اور پختگی حاصل نہیں ہوتی۔ جب عین پہاڑ کے وسط میں کوئی زیتون کا درخت ہوگا۔ تو تمام دن اسے باقاعدہ سورج کی گرمی اور مناسب ہوا پہنچتی رہے گی اور پہاڑ سے جانب شرق و غرب ہونے کے باعث جو حرارت کی حدت و شدت زمین کے اجزا کی آمیزش کی وجہ سے اسکو پہنچا کرتی تھی اس سے بھی وہ محفوظ رہے گا۔ ایسے درخت کا جب تیل نکالا جائے گا تو بغیر اس کے کہ اسے آگ سے سلگایا جائے خود بخود ہی روشنی کرنے پر آمادہ اور قابل ہوتا ہے۔ اگر اس کو آگ سے سلگایا جائے تو نور علیٰ نور کا کام دے گا جیسا منور چراغ ہر ذی بصر کو راہ دکھانے میں مدد دیتا ہے اور بھولنے بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا نور اور اس کی تجلیات مینا

کو رہنمائی اور ہدایت کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اجزائے مثل کو ممثل بہ کے اجزاء سے تطبیق دینے کی ضرورت نہیں اسے بطور تمثیل مرکب سمجھنا چاہیئے۔ جن لوگوں نے اس تکلیف میں پڑکر قسم قسم کی توجیہیں اور تاویلیں کیں ان کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہر ایک مثال کے لئے ممثل بہ مخصوص کی تلاش کرنا بے سود ہے۔ غرض مثل کی طرف توجہ کرنے کی ازبس ضرورت ہے بعض اوقات انسان اس الجھن میں پڑکر اصلی مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔ اہل تصوّف نے اس کی تشریح میں اپنے مسائل صوفیانہ کو کام میں لیا اور فلاسفہ نے مراتب نفس ناطقہ کی تشریح کو اس آیت سے ثابت کیا۔ جو غالباً کلام الہیٰ کا مقتضاء اور منشاء نہ ہوگا۔ نورٌ علےٰ نورٍ۔ کی تفسیر میں قرآن اور ایمان کا جو ذکر کیا گیا ہے اگرچہ وہ واقعہ کے بالکل موافق اور مطابق ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ نورٌ علیٰ نورٍ۔ میں یہی مراد ہو۔ بہرحال اس کے اختلاف اور اشکال میں کسی کو کلام نہیں۔ ہر کسی نے اپنے فہم کے مطابق جو کچھ سمجھ میں آیا بیان کر دیا۔ ہر شخص ہماری دعا اور ذکر بالخیر کا مستوجب و مستحق ہے۔

(۶) والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعۃ یحسبہُ الظلمٰان ماءً حتّیٰ اذا جاءہٗ لم یجدہُ شیئاً و وجد اللہَ عندہٗ فوفٰہُ حسابہٗ واللہُ سریعُ الحساب او کظلمات فی بحرٍ لجی یغشاہ موج من فوقہٖ موج من فوقہٖ سحاب بعضھا فوق بعض اذا اخرج یدہٗ لم یکد یرٰھا و من لم یجعل اللہُ لہٗ نوراً فما لہٗ من نورٍ۔

مذکورہ بالا آیات میں حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے کافروں کے اعمال کے لئے دو مثالیں بیان فرمائیں ایک مثال بالسراب اور دوسری مثال ظلمات المتراکمہ کیونکہ جو کافر ہدایت اور صراط مستقیم سے روگرداں ہوتے ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ جو اس خیال میں مبتلا ہیں کہ ہم ایک صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔ اور جو ہمارا مسلک ہے یہی مقصد تک موصل ہوگا لیکن جب حقیقت الامر کا انکشاف ہوتا ہے اور اشیا اپنے اصل رنگ میں نمایاں ہونے لگتی ہیں تو

انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم ایک غیر صحیح راستہ پر چل رہے تھے جو ہمارے مقصد اور غرض تک پہنچانے میں ہمیں مغالطہ میں ڈال رہا تھا جیسے کہ آجکل عام طور پر یہی حال ہے۔ اصحاب بدعت اور ہوا پرست لوگ اسی خیال میں مبتلا ہیں کہ ہم علم اور ہدایت کے طریق پر جادہ پیا ہیں مگر حقیقت کے انکشاف کے وقت انھیں یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ وہ کسی صحیح راستہ پر نہیں تھے اور ان کے اعمال وعقائد کی بعینہ یہی حالت ہوگی جیسے کسی چٹیل میدان میں کوئی پیاسا سراب کو دیکھ کر پانی خیال کرتا ہے اور اسی کو اپنا مادہ حیات اور زندگی تصور کرتا ہے۔ اور اسی تک پہنچنے کی سعی بلیغ کرتا ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ خیال غلط اور بالکل غیر مطابق واقعہ ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اسی طرح جو اعمال لغیر اللہ یا علیٰ غیر اللہ کئے جاتے ہیں عامل کے خیال میں وہ نافع اور مفید معلوم ہوتے ہیں حالانکہ وہ ایسے نہیں۔ ایسے ہی اعمال کے متعلق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

وَقَدِمْنَا اِلٰی مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰہُ ھَبَآءً مَّنْثُوْرًا

عمل کی قبولیت کے لئے دو شرطیں ہیں

(۱) اخلاص یعنی جو کام کیا جائے اس سے محض رضامندی وخوشنودی خداوندی مقصود ہو۔ ریا وسمعہ مقصود نہ ہو۔ غیر اللہ کی رضامندی وغیرہ کا خیال نہ ہو۔

(۲) وہ کام مطابق لامر اللہ وموافق شرع شریف ہو اہل بدعۃ والجہل نے جو اعمال اپنے خیال ناقص میں صحیح سمجھے اور ان پر عمل پیرا ہوئے وہ رضائے الٰہی اور شریعت حقہ کے ماتحت نہ آسکے۔ لہٰذا ان کی وہ ہی مثال ہوئی جیسے کسی پیاسے نے سراب کو پانی تصور کر لیا۔ کفار دنیا میں اپنے مذاق کے مطابق عمل کرکے اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ہمیں بعد از مرگ اپنے اعمال کی جزائے حسن ملے گی۔ مگر قیامت کے دن یا عالم برزخ میں نتیجہ بالکل اس کے برعکس برآمد ہوگا۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہنم کو مخلوق کے سامنے لایا جائے گا۔ اس کی شکل بالکل سراب سی ہوگی۔ یہودیوں کے لئے کہا جائے گا۔ تم کس چیز کی پرستش کیا کرتے تھے وہ کہیں گے ہم عزیر ابن اللہ کی پوجا کیا کرتے تھے۔

جناب باری تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوگا تم جھوٹ بولتے ہو اللہ کے لئے نہ کوئی بیوی ہے نہ کوئی اولاد ہے۔ پھر تم کیا چاہتے ہو وہ کہیں گے ہمیں پانی پلاؤ۔ پھر انھیں کہا جائے گا کہ پانی پی لو، تو وہ سب کے سب جہنم میں پانی کے خیال سے کود پڑیں گے۔ یہی حال عیسائیوں کے ساتھ بھی ہوگا۔ بعینہ اہل باطل کے اعمال بھی انھیں عین موقع پر دھوکا دے جائیں گے۔ جب اپنے اعمال کی پاداش کی انھیں اشد ضرورت ہوگی۔

(۳) دوسری مثال میں کفار کے اعمال کو ظلمات متراکمہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے حق اور ہدایت کو پہچانا۔ صحیح اور غلط راستے میں امتیاز کیا۔ باوجود واقفیت اور معرفت کے باطل راستے کو اختیار کیا۔ اس پر کئی قسم کے ظلمات چھا گئے۔ ظلمت طبع ظلمت جہل ظلمت نفوس۔ ظلمت رسوم چاروں طرف سے انھیں تاریکیوں نے آکر گھیر لیا اور ہدایت کے راستے ان پر مسدود و بند کر دیئے گئے۔ جیسے کوئی شخص ایسے سمندر کی گہرائی میں ہو جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اور اوپر سے اسے آکر موجوں نے دبوچا ہو۔ اور پھر علاوہ اس کے اوپر سے بادلوں نے بھی تاریکی کے اضافہ کرنے میں امداد دی ہو۔ یہی حال ان کفار کا ہے جو جان بوجھ کر راہ خدا کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اور انھوں نے راہ ضلالت پر چل کر جو کام کیا وہ بغیر سرمایۂ حیات کے باطل کرنے کے کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔ کفار کی سابقہ دو قسموں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے اعمال کو جان بوجھ کر غیر صحیح طریق پر کرتا ہے یا بطور جہالت غیر صحیح اعمال کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسکے اعمال اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچائینگے۔

سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے گذشتہ مثال میں اپنے نور سے مستفیض ہونے کے لئے اصلاح اخلاق کا ایک نمونہ پیش فرمایا ہے۔ انسان بے انتہا اور بے پایان کمالات اور اخلاق کا منبع اور مخزن ہے اس کے اخلاق سے ایک خلق عفت بھی ہے اس خلق کی تکمیل کے لئے سورہ نور میں تمام قوانین اور ضوابط بیان فرمائے ہیں جن مواقع سے انسان کی عفت کو نقصان یا صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ بطریق کمال ان کی بندش کر دی گئی۔ جیسا اس خلق کی تکمیل بطور نمونہ بیان

کی گئی ہے۔ اسی طرح جب انسان اپنے تمام اخلاق کو مکمل کر لیتا ہے۔ تو وہ اس قابل اور لائق ہو جاتا ہے کہ اب وہ نورِ الٰہی کے ساتھ اپنے تعلقات کو استوار کرے۔ خدا کے نور کی مثال اللہ نور السموات والارض الخ میں مومنین کے استبشار کے لئے پیش کی گئی ہے۔ جب نورِ الٰہی سے تعلق قائم ہو جاتا ہے تو اس وقت انسان میں یہ قابلیت پائی جاتی ہے کہ اسے خلافتِ الٰہیہ سے سرفراز کیا جائے۔ اسی مناسبت کے باعث اللہ تعالیٰ نے اسی سورہ نور میں فرمایا ہے

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا ومن کفر بعد ذالک فاولئک ھم الفاسقون۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں نے اپنے اخلاق کی درستی اور تکمیل سے جب بے اعتنائی کی خصوصاً خلق عفت اور اس کی حفاظت کو خیرباد کہہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی نعمت عظمیٰ، خلافت ارضی کو ان سے چھین لیا۔ باوجود اس مصیبت غلامی کے مسلمانوں کو تاحال اس کا انتباہ بھی نہیں ہوا۔ کہ وہ اپنے اخلاق کی درستی کی طرف متوجہ ہوں۔ وہ الٹا آزادی کی رو میں بہ کر یورپ کے عادات و اطوار میں اندھا دھند حصہ لے رہے ہیں جو دن بدن ان کو شاہراہ ترقی سے ہٹا کر قعر مذلت و غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رہا ہے۔ اگر مسلمان صرف سورۂ نور ہی کے احکام اوامر و نواہی کے پابند ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرما کر انھیں خلیفۃ اللہ فی الارض سے سرفراز فرماتا۔ افسوس کہ ہمیں اپنی کھوئی ہوئی عظمت و اقتدار کا احساس بھی نہیں رہا اور نہ اس ذلت کے اسبابوں میں ہم نے کبھی غور کیا۔ جب مریض اپنے مرض سے تکلیف کو محسوس نہیں کرتا اور اسباب مرض کے زائل کرنے کا اسے خیال نہیں پیدا ہوتا۔ یا کسی ڈاکٹر و حکیم سے تشخیص مرض کے بعد نسخہ مناسبہ نہیں لیتا تو ایسے مریض کی صحت کا خدا ہی حافظ ہے۔ دنیا کے عقلمند ایسے نادان مریض کو کیا کہیں گے اور اسے کس لقب سے پکاریں گے۔ ہمارے پاس بھی

ایک نسخۂ کیمیائی موجود ہے جس کو استعمال کر کے ہمارے اسلاف نے صحت کاملہ اور شفائے عاجلہ حاصل کر کے منازل ترقی کے ذُروۂ اعلےٰ پر پہنچ کر اقوام عالم کو حیران و متعجب کر دیا۔ ایک ہم ہیں کہ وہی نسخہ ہمارے پاس موجود ہے اس کا استعمال کرنا تو بجائے خود رہا۔ اس کے پڑھنے سے بھی جی چراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرما کر ہمیں اپنے عیوب پر متنبہ فرما کر اصلاح کی توفیق بخشے۔

(۷) یاایھا الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم و لا تجسسوا و لا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ واتقوا اللہ ان اللہ تواب الرحیم۔ (سورہ حجرات پارہ ۲۶)

قیاس تمثیلی کی یہ بہترین مثال ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی ہتک عزت کر رہا ہے اور اس کی غیر حاضری میں اس کے متعلق ناپسندیدہ باتیں کر رہا ہے اور اس کے بھائی کو اس کا علم بھی نہیں کہ میرے بارے میں کیا کیا کہا گیا۔ اور وہ اپنی عزت بچانے کے لئے کوئی تدبیر کام میں نہیں لا سکتا۔ اس کی بعینہ یہی مثال ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا شروع کر دے۔ میّت کو نہ تو اپنے اجزاء کے کاٹے جانے کی خبر ہوتی ہے اور اگر بالفرض اسے علم بھی ہو تو وہ مدافعت پر قادر نہیں۔

اَخ کا لفظ بظاہر ترحم و مہربانی کو چاہتا ہے مگر گلہ کرنے والے نے اخوت کے مفہوم کو نہ سمجھا اور بے تحاشا درندوں کی طرح اپنے عزیز ترین رشتہ دار کو کاٹنا شروع کر دیا۔

لحم کے لفظ سے خاص بات کی طرف اشارہ ہے۔ عربوں کو لحم کے ساتھ بہ نسبت دوسری قوموں کے زیادہ محبت ہے۔ چنانچہ سَیِّدُ الطَّعامِ اللَّحم کا مقولہ اس پر شاہد ناطق ہے۔ مغتاب بھی غیبت کو نہایت ہی لذیذ اور دل پسند سمجھ کر اس کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے اس کے منہ میں کوئی لذیذ اور شیریں چیز ڈال دی ہے۔ جوں جوں غیبت میں بڑھتا جاتا ہے توں توں وہ گھل گھل کر اس کے پیٹ میں جاتی ہے۔

اور اس کی زبان اس سے چاشنی لیتی ہے۔ اگر مغتاب کو غیبت سے روکا جائے تو ایسا ہی اس کو بُرا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ کوئی شخص رنگارنگ کے مزے دار کھانوں سے ایسے وقت اٹھا دیا جائے جبکہ وہ اس کھانے سے سیر نہ ہوا ہو اور ابھی اس کی اشتہا باقی ہو۔ اس مثال میں غیبت کی کراہیت کو سامعین کے ذہن میں بٹھانا مقصود ہے۔ ایک محسوس مکروہ شے کو مشبہ بہ قرار دے کر غیر محسوس مُبصر کی کراہت کو ثابت کیا گیا۔ مشبہ بہ عام طور پر مسلم بین المتکلم والمخاطب ہوا کرتا ہے۔ یہاں پر بھی مردہ بھائی کا گوشت کھانا ایسا کریہہ اور ناپسندیدہ ہے جس میں کسی ذی فہم کو اختلاف نہ ہوگا۔

چونکہ غیبت ایک معمولی چیز سمجھی جاتی ہے۔ لوگ اسے کچھ بھی بُرا نہیں جانتے اگر روکا جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ جو بات ہم فلاں شخص کی بابت کہہ رہے ہیں وہ واقعی اس میں موجود ہے وہ غیبت کا مصداق نہیں بن سکتی حالانکہ غیبت تو یہی ہے۔ اَنْ تَذْکُرَ اَخَاکَ وَرَاءَ الظھر وھو یکرھُہٗ۔

اگر وہ شے اس میں نہ پائی جائے تو اس کو شریعت میں بہتان کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس عام غلطی کے ازالے کے لئے اللہ سبحانہ وتعالےٰ نے اس مثل کو ذکر فرمایا کہ اس کی کراہیت بھی مخاطبین کے ذہن میں بیٹھ جاوے۔

مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کا مسئلہ اگرچہ بظاہر غیبت کے رنگ میں ایک تمثیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا مگر ارباب بصیرت کے نزدیک تو یہ خود گوشت کی شکل میں حقیقۃً متشکل ہو جایا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرتؐ کے پاس دو عورتیں آئیں آپؐ نے فرمایا کہ تم سے گوشت کی بو آرہی ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہم روزہ دار ہیں ہم نے گوشت نہیں کھایا۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا کہ تم نے ضرور گوشت کھایا ہے۔ آپؐ نے اُن سے جب قے کرائی تو ان کے پیٹ سے گوشت کی بوٹیاں نکلیں۔ بغرض مُسلم کو جب انھوں نے تناول کیا تو وہ باتیں عالم مثال میں بصورت لحم متشکل ہو گئیں۔

جب کسی کے پاس صرف یہ تمثیل پیش کی جاسے۔ تو اس کی غیبت کی کراہیت کا اعتقاد ہو جاتا ہے اگر کسی کو اس کا بھی یقین ہو جائے کہ عالم مثال میں یہ صورت بھی اختیار کرے گی تو وہ اعتقاد بالضرور حق الیقین کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔

(۸) ضرب اللہ مثلاً للذین کفروا امرأۃ نوح وامرأۃ لوط کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین فخانتاھما فلم یغنیا عنہما من اللہ شیئاً وقیل ادخلا النار مع الداخلین وضرب اللہ مثلاً للذین آمنوا امرأۃ فرعون اذ قالت رب ابن لی عندک بیتاً فی الجنۃ ونجنی من فرعون وعملہ ونجنی من القوم الظالمین ومریم ابنۃ عمران التی احصنت فرجہا فنفخنا فیہ من روحنا وصدقت بکلمات ربہا وکتبہ وکانت من القانتین۔ (سورہ تحریم پارہ ۲۸)

کافروں کے لئے اللہ تعالیٰ نوح اور لوط (علیہما السلام) کی عورتوں کی مثال بیان کرتا ہے۔ یہ دونوں، ہمارے دو نیک بندوں کے تحت میں تھیں پس انھوں نے خیانت کی اور کسی چیز نے ان کو اللہ کی گرفت سے نہ بچایا اور ان سے کہا گیا کہ آگ میں داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی داخل ہو جاؤ۔ اسی طرح ایمان والوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ فرعون کی عورت کی مثال بیان کرتا ہے کہ اس نے کہا اے میرے پروردگار! تو اپنے فضل سے جنت میں میرا گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کی بدکرداریوں سے نجات دے اور ظالموں سے مجھے بچا۔ اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا پس ہم نے اس کو اپنی روح عنایت کی اور اس نے اپنے رب کے کلمات اور کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزاروں میں سے تھی۔

آیات مذکورۂ بالا میں تین مثالیں ذکر فرمائی گئی ہیں۔ ایک کفار کے لئے اور دو مومنین کے لئے۔ کفار کی مثال سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ کفار تو اپنے کفر باللہ و بالرسول اور اس کے دوستوں سے عداوت رکھنے کے باعث بہرحال معذب اور سزایاب ہوں گے۔ انکا مومنین کے ساتھ اگر کوئی رشتہ یا پیوند یا ناطہ داری کا کوئی تعلق ہو تو وہ بروز قیامت کوئی فائدہ نہ دیگا۔

اگر رشتے ناطے کے تعلقات یا نکاح کا پیوند باوجود عدم ایمان مفید ہوتا تو نوح علیہ السلام، اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کو ضرور نفع پہنچتا۔ جب ان اولوالعزم نبیوں کے ساتھ تعلق ہوتے ہوئے انھیں کوئی نفع نہ پہنچ سکا تو کسی دوسرے کو کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ کسی بزرگ یا کسی رشتہ دار کے نیک ہونے پر اعتماد کر کے اپنی اصلاح اور بہبودی کو فراموش کر دے کہ مجھے اعمال صالحہ یا اصلاح کی ضرورت نہیں کیونکہ میرے اسلاف اور متعلقین خیرات مبرات یا اعمال صالح کے بہت سے ذخائر پیش کر چکے ہیں۔ ان حالات میں اپنی رشتہ داری کے تعلقات کے باعث مجھے نجات دلائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مثال سے اس امید خام کو غلط اور غیر درست قرار دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے اس کو غرق ہوتے دیکھا شفقت پدری کے باعث جذبۂ فطرتی سے متاثر ہو کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے سوال بھی کیا مگر وہاں سے صاف جواب ملا إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ متعدد آیات میں مضمون فرمایا گیا۔

لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم الی یوم القیامۃ یفصل بینکم یوم لا تملک نفس لنفس شیئا واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا واخشو یوما لا یجزی والد عن ولدہ ولا مولود ھو جاز عن والدہ شیئا۔

مومنین کے لئے دو مثالیں | ان تمام مذکورہ بالا آیات نے مشرکین کی ان باطل طمعوں کا قلع قمع کر دیا جو ہمیشہ ان کے دلوں میں موجزن رہا کرتی تھیں، کہ ہم بزرگوں کی اولاد ہیں ہمیں ان کی شفاعت دین و دنیا و آخرت میں نجات دلا دے گی جس طرح ان مشرکین میں وہ طمع پائی جاتی تھی کہ ہمارے اسلاف ہمیں نجات دلا دیں گے اسی طرح موجودہ زمانے میں سادات اور بزرگوں کی اولادیں اس قسم کے زعم باطل پائے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں انبیاء سابقین کے قصے بیان فرما کر ہمیں متنبہ فرمایا کہ اس قسم کے بیہودہ خیالات اور اعتقادات سے اپنے دل و دماغ کو پاک صاف رکھو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ارشاد فرمایا اغنی عنک من اللہ شیئا انقذی نفسک من النار۔

مومنین کے لئے بھی دو مثالیں ذکر فرمائی گئیں۔ پہلی امرأۃ فرعون کی جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ مومن کا اتصال بالکافر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا بشرطیکہ وہ اس کے کفر اور عمل غیر صالح سے بعید اور مفارق رہے۔ دوسرے کے گناہ سے آخرت میں کوئی

مضرت اور نقصان نہ پائے گا۔ اور مثل ثانوی میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر نہ ہو۔ نہ مسلم نہ غیر مسلم۔ تو اندریں حالات وہ خود نیک اور پارسا ہو تو اسے عدم تعلق کوئی مضر نہیں ہوتا۔ عقلی طور پر عورتوں کی چار قسمیں بن سکتی ہیں۔

اوّل عورت مسلمہ اور شوہر کافر جیسے کہ امرأۃ فرعون۔ اور فرعون کے اس تعلق نے بصورت افتراق و بیزاری عورت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

دوم عورت غیر مسلمہ اور مرد صالح پارسا بلکہ نبی جیسے امرأۃ نوح اور امرأۃ لوط۔ عدم اسلام کی صورت میں اس تعلق نے ان کو کوئی نفع نہ پہنچایا۔

سوم۔ عورت ایم غیر ذات زوج۔ عدم تعلق زوجیت نے اسے اپنی صلاحیت کی صورت میں کوئی نقصان نہ دیا جیسے مریمؑ بنت عمران۔

چہارم۔ عورت مسلمہ قانتہ اور مرد بھی مسلم اس کے کامیاب اور فائز المرام ہونے میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں۔ امرأۃ نوح و لوط علیہما السلام کی مثال ذکر کرنے سے واللہ اعلم بالصواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات کو تنبیہ مقصود ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تظاہر نہ کریں۔ اور اس خیال میں نہ پڑ جائیں کہ ہمارا تعلق سید الاولین والآخرین خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ قائم ہے۔ ہمیں کوئی فرو گزاشت نقصان نہ پہنچائیگی بطور اشارہ تنبیہ کی گئی کہ امرأۃ نوح و لوط علیہما السلام سے عبرت حاصل کرو۔

مثل کی حقیقت اور فقہی حیثیت تب منکشف ہو سکتی ہے۔ جب قیاس کے معنی اور حجت کی تشریح اور استدلال کے اقسام پورے طور پر بیان کئے جائیں۔ کیونکہ جس قدر بھی امثال ہیں ساری کی ساری قیاسات عقلیہ میں داخل ہیں۔ قرآن حکیم میں پچاس کے قریب امثال ذکر کی گئی ہیں سب میں یہ امر مشترک پایا جاتا ہے کہ ایک شے کو اس کی نظیر کے ساتھ تشبیہ دے کر دونوں پر ایک حکم لگایا گیا ہے جو وصف علۃ للحکم ایک شے میں پائی جاتی تھی۔ وہی وصف موجب للحکم دوسری شے میں بھی موجود ہے۔ اب دونوں کا حکم ایک ہوگا۔ یا دو چیزوں میں کسی

مثل کے ذریعے فرق ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور دونوں کے حکم میں بھی اختلاف دکھایا جاتا ہے جو وصف علۃ للحکم ایک میں موجود تھی جب وہ دوسری میں منتفی ہے تو اتحاد حکم کیونکر متصور ہو سکتا ہے عقلاً محال سمجھا جاتا ہے۔ کہ دو متضاد چیزیں ایک حکم کی مقتضی ہوں اسی بنا پر ارشاد ہوا۔

وتلک الامثال نضربها للناس وما یعقلها الا العالمون۔

امثال کے مفید منتج ہونے پر تمام امم کا اتفاق ہے۔ کسی فرقہ اسلامی نے مثل کے فائدے یا صحت سے انکار نہیں کیا۔ مثل درحقیقت ایک قسم کا قیاس ہے۔ تو لازمی طور پر قیاس کو دلیل شرعی ماننا پڑے گا۔ ہاں شرائط وغیرہ میں اگر علمائے مجتہدین کا باہم کوئی اختلاف ہو تو اس سے قیاس کے علم ہونے میں کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا۔ قیاس کے دلیل شرعی ہونے پر قریباً تمام صحابہ کا اجماع واتفاق تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے اس مکتوب گرامی سے جو انھوں نے ابوموسےٰ اشعریؓ کے نام روانہ فرمایا تھا، یہی مفہوم ہوتا ہے۔

خط کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

ثم الفہم الفہم فیما ادلی الیک مما ورد علیک مما لیس فی قرآن ولا سنۃ ثم قایس بین الامور عند ذالک واعرف الامثال ثم اعمد فیما تری الیٰ احبها الی اللہ واشبهها بالحق۔

اس خط پر کسی صحابی سے انکار یا اختلاف منقول نہیں۔ اصول شرعیہ میں سے قیاس بھی ایک بھاری اصل ہے۔ کوئی فقیہہ اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اسے جا بجا استعمال فرمایا ہے اور بطور حجت خصم پر پیش کیا ہے منکرین احکام پر تمثیلات اور قیاسات سے ان کے شبہات کا ازالہ کرنا صراحۃً اس امر پر دال ہے کہ قیاس ایک حجت مسلمہ اور اصل شرعی ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے اعذار کو امثال و ادلہ کے ذریعے زائل کرنے کی تکلیف گوارا نہ فرماتا۔ بطور تمثیل چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں مخالفین کو بذریعہ قیاس قائل کرنا مقصود ہے۔ جو لوگ موجودہ زندگی کے قائل ہیں اور نشأۃ ثانیہ کے منکر ہیں، اُن پر

امکان اور وقوع زندگی اول سے امکان حیاتِ ثانیہ پر بطور حجت پیش کیا گیا ہے۔ قیاس میں درحقیقت چار چیزیں ہونی ضروری ہیں۔

اول مقیس۔ دوم مقیس علیہ۔ سوم وصف موثر۔ چہارم علم۔

زندگی اول مقیس علیہ نشأۃ ثانیہ مقیس۔ امکان وصف موثر۔ وجود تحقق حکم۔

آیت ذیل میں نشأۃ اولی پر نشأۃ ثانیہ کو قیاس کیا گیا ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ۔ اور کسی جگہ حیات بعد الموت کو یقظہ بعد النوم پر قیاس کیا گیا ہے کیونکہ نیند اور موت دونوں کو لفظ توفی کے ساتھ قرآن کریم میں تعبیر کیا گیا ہے۔ هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ سے مراد نوم ہے۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا سے مراد اختتام زندگی ہے اور کسی موقع پر خلق السموات والارض کو ذکر فرما کر سمجھایا گیا کہ جس طرح زمین آسمان جیسی بڑی ہستی کو پیدا کرنے پر اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے اسی طرح مردوں کو زندہ کرنے پر بھی وہ قادر ہے اور کہیں احیاءِ موتیٰ کے ثبوت کے لئے زمین مردہ کے زندہ کرنے کو بطور دلیل پیش کیا گیا۔ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ۔

اس قسم کی جتنی مثالیں قرآن حکیم میں مذکور ہیں یا احادیث صحیحہ میں مروی ہیں تمام قیاسات عقلیہ کی مثالیں ہیں۔ سب کا خلاصہ اور لب لباب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دو چیزوں میں ایک وصف مشترک پایا جاتا ہے جس پر حکم کا مدار ہے اور اسے علت للحکم کہنا جائز ہے وہی وصف موجب للحکم جب کسی دوسری شے میں پایا جاتا ہے تو لامحالہ دونوں کا حکم ایک ہی ہوگا۔ یا دو چیزوں میں اشتراک وصف موثر فی الحکم نہیں پایا جاتا تو ان کے احکام میں بھی اختلاف ہوگا۔ تو اب استدلال کا مدار تسویہ بین المتماثلین وفرق بین المختلفین پر ہوا۔ کوئی دانشمند اس بات کو قبول نہیں کر سکتا کہ علت مشترکہ پائے جانے کے باوجود اتحاد حکم نہ ہو یا اختلافِ اوصاف موثرہ کے ہوتے ہوئے حکم کا اتحاد ہو۔ استدلال کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں یا تو ایک معین شے سے دوسری

معین شے پر دلیل پیش کی جاتی ہے۔ یا معین سے عام پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔ یا عام سے معین پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔ یا عام سے دوسرے عام پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔

استدلال بالمعین علے المعین کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔ استدلال بوجود الملزوم علے وجود اللازم۔ اس لئے کہ ہر ملزوم اپنے لازم کے وجود کے لئے دلیل ہوا کرتا ہے۔ اگر تلازم جانبین سے ہو تو ہر ایک دونوں میں سے دلیل اور مدلول بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اقسام ثلاثہ یہ ہیں :۔

(۱) استدلال بالموثر علے الاثر۔

(۲) استدلال بالاثر علے الموثر۔

(۳) استدلال باحد الاثرین علے الآخر۔

پہلے کی مثال جیسے آگ سے جلانے پر دلیل قائم کی جائے۔ دوسری کی مثال جیسے جلانے کو آگ پر دلیل بنایا جائے۔ تیسری جیسے جلانے سے دھوئیں وغیرہ آثار نار پر دلیل قائم کی جائے۔

اگر اس سلسلۂ استدلال کا انکار کیا جائے تو کسی شے کے وجود پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوسکتی۔ مدار استدلال تلازم اور تسویہ بین المتماثلین پر ہے۔ جیسے کہ ایک اثر سے دوسرے اثر پر دلیل قائم کی جائے۔ یا قیاس فرق پایا جائے۔ جس کی مدار ایک اثر کے انتفاء سے دوسرے کے انتفاء پر استدلال کیا جائے۔ یا انتفاء لازم سے انتفاء ملزوم پر حجت قائم کی جائے۔

استدلال بالمعین علے العام اسی صورت میں ہوسکتا ہے، جب ہر دو متماثلین میں مساوات مانی جائے۔ ورنہ معین کا عام پر دلیل ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ قرآن حکیم میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں معین سے عام پر استدلال کیا گیا ہے۔ سورۂ قمر میں امم سابقہ کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا گیا۔ (اکفارکم خیرٌ من اولٰئکم ام لکم براءۃٌ فی الزبر۔

اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جس علت کے باعث امم سابقہ کو سزا

دی گئی۔ وہی علت اگر کسی دوسرے گروہ یا جماعت میں پائی جائے گی تو وہ بھی لامحالہ اسی سزا کی مستوجب و مستحق ہوگی اسی طرح سورۂ احقاف میں قوم عاد کا تذکرہ فرمایا گیا کہ انھیں باد صرصر سے تباہ کیا گیا۔ فقالوا ھذا عارض ممطرنا بل ھو ما استعجلتم بہ ریح فیھا عذاب الیم تدمر کل شئ بامر ربھا فاصبحوا لا یریٰ الا مساکنھم کذالک نجزی القوم المجرمین ولقد مکنٰھم فیما ان مکنکم فیہ وجعلنا لھم سمعاً وابصاراً وافئدۃ فما اغنیٰ عنھم سمعھم ولا ابصارھم ولا افئدتھم من شئ اذ کانوا یجحدون بآیات اللہ وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزءون۔

آیت مسطورہ بالا میں غور کرنے کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا اور ان کا حکم ایک ہے۔ انھوں نے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی۔ سامان تعیش کی فراوانی اور کثرت نے انھیں خدائی عذاب سے بچانے میں کسی قسم کی امداد نہ دی۔ اگر تم بھی سامان عیش و عشرت کے بہم پہنچنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف رہو گے تو تم بھی ویسے ہی سزا کے مستوجب ہو گے جیسے کہ وہ تھے۔ قرآن کریم میں متعدد آیات میں سیروا فی الارض کا حکم دیا گیا اور ان کی توجہ مکذبین کے انجام کو سوچنے کی طرف منعطف کرائی گئی جس کا مقتضا یہ ہے کہ ہم ان کی تباہی و بربادی کو دیکھ کر عبرت و نصیحت حاصل کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بھی انھیں کی روش کو اختیار کرنے کے بعد سزا کے مستوجب بنیں جیسے کہ وہ سزایاب ہوئے۔ سیر سے مراد صرف سیر علی الاقدام ہی نہیں بلکہ سیر قدمی اور سیر فکری و اعتبار معنوی کو بھی شامل ہے اگر ایک نظیر کا حکم دوسری نظیر جیسا نہ ہوتا تو عقلمندوں کو سیر فی الارض پر نتائج اخذ کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ جیسے تسویہ بین المتماثلین کا حکم دیا گیا ویسے ہی تفریق بین المختلفین کے لئے بھی ہدایت فرمائی گئی۔ فطرت انسانی ہرگز اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ باوجود اختلاف اوصاف موثرہ دونوں چیزوں پر ایک حکم کیا جائے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون۔ (سورہ نٓ پارہ ۲۹)

سورہ جاثیہ میں بھی اسی مضمون کو زیادہ توضیح سے بیان فرمایا گیا۔ ام حسب الذین اجترحوا السیات ان نجعلھم کالذین اٰمنوا وعملوا الصالحات سواءً محیاھم ومماتھم ساء ما یحکمون۔

اور سورہ ص میں ارشاد ہوا ہے۔ ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار۔

ہر سہ مذکورہ بالا آیات سے اللہ تعالیٰ نے عقلمندوں کو متنبہ فرمایا کہ شے اور اسکے مخالف کا حکم ایک نہیں ہوتا۔ مجرموں کی سزا کی بنا جرم پر تھی مسلم۔ مومن متقی میں چونکہ جرم کا فقدان تھا۔ اب وہ مجرم یا مفسد کی سزا کے کیونکر مستوجب ہو سکتے ہیں۔ اسی کا نام میزان ہے جیسے کہ میزان حسی موزونات مادیہ میں مساوات یا عدم مساوات کو ظاہر کرتی ہے۔ ویسا ہی میزان قیاسی متماثلین میں اتحاد و مساوات فی الحکم کا اظہار کرتی ہے اور مختلفین فی الاوصاف میں اختلاف فی الاحکام کو بیان کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے کتاب نازل فرمائی ویسے ہی اس کے ساتھ میزان کو بھی نازل فرمایا۔ جیسا سورہ شوریٰ کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے اللہ الذی انزل الکتٰب بالحق والمیزان۔ اور سورہ حدید کی آیت مندرجہ ذیل میں اس کو زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔

سورہ رحمٰن کے آغاز میں الرحمٰن علم القرآن کا ذکر فرمانے کے بعد والسماء رفعھا ووضع المیزان کا بھی امتنان فرمایا۔ میزان سے مراد انصاف اور وہ ترازو ہے جس کے ذریعے انصاف اور ظلم میں تمیز کی جا سکے۔ قیاس صحیح اور میزان کا مفہوم دراصل ایک ہی ہے بجائے قیاس کے اگر میزان کا لفظ استعمال کیا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ میزان ہر جگہ پر ممدوح سمجھا گیا ہے اور قابل ستائش موقع پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ مذکورہ بالا ہر دو آیات میں کتاب کی تنزیل کے ساتھ میزان کے نازل کرنے کا بھی امتنان ظاہر فرمایا گیا ہے اور

قیاس کسی جگہ صحیح اور کسی جگہ فاسد بھی ہوتا ہے۔ صحیح کو تو لفظ میزان شامل ہے اور قیاس فاسد کی اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہوں پر مذمت فرمائی۔ چنانچہ کفار نے جب انما البیع مثل الربوٰ کہا تو اللہ تعالیٰ نے احل اللہ البیع وحرم الربوٰ و یمحق اللہ الربوٰ و یربی الصدقات فرماکر ان کے خیال باطل کی تردید فرمائی۔ ایسا ہی کفار نے میتہ اور مذبوحہ کو یکساں قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی تردید فرمائی۔ حرمت علیکم المیتۃ الخ و لا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ نازل فرماکر ان کی تردید کی۔

سلف صالحین سے جن لوگوں نے قیاس کی مذمت یا برائی بیان فرمائی ہے ان کا ہرگز یہ مدعا نہ تھا کہ وہ قیاس صحیح کو غلط قرار دیں بلکہ انھوں نے غلط قیاس کے مذموم ہونے کے وجوہات بیان کئے اور اس کے استعمال سے لوگوں کو منع کیا۔ صحیح قیاس کی تردید کسی عقلمند یا اہل علم سے متصور نہیں ہو سکتی۔ فطرت انسانی و وجدان نفسانی و آیات قرآنی و احادیث نبویہ علے صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ اس کے ثبوت کے لئے لاتعد ولا تحصے موجود ہیں۔ اندریں حالات کسی اہل علم یا عقلمند سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس کی تردید کرے جن لوگوں کی طرف قیاس کی تردید منسوب کی جاتی ہے وہ خود اپنی تصنیفات میں قیاس کا استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے یا تو اس قیاس کی تردید کی ہے، جو نص کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے، یا مورد نص میں قیاس کے غیر مفید یا غیر معتدبہ ہونے کا ذکر کیا ہوگا، ورنہ صحیح قیاس کی کون تردید کر سکتا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قیاس کی قسمیں ذکر کرکے صحیح اور غیر صحیح کا امتیاز کر دیا جائے۔ عموماً قیاس کا استعمال تین طرح پر آیا کرتا ہے۔

(۱) قیاس علت (۲) قیاس دلالت (۳) قیاس شبہ

ان ہر سہ اقسام کا ذکر قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔ خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط تفصیل آئندہ سے پتہ چل جائے گا۔ قیاس علت کو قرآن حکیم میں کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ قیاس صحیح کا مدار چار چیزوں پر ہے۔

اصل[۱] . فرع[۲] . علت مشترکہ[۳] وحکم[۴]

مثال میں جاری کرنے کے بعد اس کی پوری حقیقت ذہن نشین ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ۔ (سورہ آل عمران پارہ سوم)

عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کے بطن سے بلا اب پیدا کیا۔ ان کی انوکھی پیدائش کے باعث بعض جہال کو ان کی الوہیت یا ثالث ثلاثہ ہونے کا گمان ہوا۔ ان کی تعظیم میں انھوں نے غلو سے کام لیا۔ ان کے مقابل میں ایک دوسری جماعت خلاف معتاد پیدائش پر نکتہ چینی کرنے لگی۔ حضرت مریمؑ صدیقہ کے شان میں انھوں نے افترا پردازی تک نوبت پہنچائی۔ ہر دو فریقین کی تردید کے لئے اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرما کر عیسےٰؑ کی حقیقت کو اور حضرت مریمؑ کی پاک دامنی کو واضح کر دیا۔ آدمؑ کو جب اللہ تعالیٰ بلا اب و اُم پیدا کرنے پر قادر ہے تو عیسےٰؑ کو بلا اب پیدا کرنے میں کونسی دشواری اور استحالہ پیش آتا ہے۔ مٹی میں نہ تو حیات تھی، نہ حس و حرکت اس سے آدمؑ کی پیدائش کو مان کر عیسےٰؑ کی پیدائش پہ بیہودہ نکتہ چینی کرنے کا کونسا موقع ہے۔ آدمؑ مقیس علیہ۔ عیسےٰ مقیس اور امکان اور مشیئت الٰہی کے احاطہ کے اندر ہونا وصف مشترک اب جو حکم مقیس علیہ کا ہوگا وہی مقیس کے لئے ماننا پڑے گا۔ یہ تو تفریط والوں کی تردید ہوئی اور جن لوگوں نے افراط و غلو کیا تھا ان کی تردید اگرچہ ہمارے موضوع مقالہ سے من وجہ خارج ہے مگر من وجہ اصل مقصود کے ساتھ اس کا ارتباط پیدا ہو سکتا ہے چند الفاظ اس کے متعلق بھی لکھے جاتے ہیں۔ عیسیٰؑ کی خلاف قانون پیدائش کی بنا پر تم ان کی الوہیت یا ثالث ثلاثہ ہونے کے قائل ہو گئے۔ اگر خرق عادت کی پیدائش اس منصب کے لئے مقتضی ہے تو آدمؑ کو بطریق اولےٰ یہ درجہ ملنا چاہیئے تھا۔ جب خارق در خارق میں الوہیت کا شائبہ نہیں تو خلاف عادت مخلوق کو کیونکر الٰہ کہہ سکتے ہو۔ معلوم ہوا کہ وہ معبود یا الٰہ نہیں۔ یہاں بھی قیاس علت اسی طرح جاری ہو سکتا ہے۔

قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین۔ (آل عمران پارہ چہارم)

تم سے پہلے تمہارے جیسی کئی امتیں دنیا میں گزریں۔ ان کے برے انجام کی طرف توجہ کرو اور سوچو کہ ان کی ہلاکت و تباہی کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے آیات الٰہی کی تکذیب کی۔ اور رسولوں کو جھٹلایا۔ یہاں پر بھی وہی چاروں چیزیں پائی جاتی ہیں جن پر قیاس علت کا مدار تھا امم سابقہ اصل مخاطبین فرع علت جامع تکذیب اور حکم ہلاکت۔ علت موثرہ ایک جگہ جب موجب للحکم بن چکی ہے تو لامحالہ جہاں کہیں بھی وہ پائی جائے گی حکم کا ترتب اس پر لازمی و ضروری ہوگا۔ ورنہ علت علت نہ رہے گی۔ اذا وجدت العلة وجد المعلول۔ جب امم سابقہ کو تکذیب کے بعد برے نتائج اور انتقام الٰہی سے نجات نہ ملی تو تم موجودہ اشخاص یا اقوام باوجود تکذیب بآیات اللہ و رسلہ انتقام الٰہی سے کیونکر بچ سکو گے۔ اکفارکم خیر من اولٰئکم ام لکم براءة فی الزبر۔

ایک اور موقع پر یوں ارشاد ہوتا ہے الم یروا کم اھلکنا من قبلھم من قرن مکنا ھم فی الارض مالم نمکن لکم وارسلنا السماء علیھم مدرارا وجعلنا الانھار تجری من تحتھم فاھلکنا ھم بذنوبھم وانشانا من بعد ھم قرنا اخرین۔ (سورہ انعام پارہ ۷)

جناب باری تعالیٰ نے قرون سابقہ کے اہلاک کا ذکر فرمایا اور اس کی علت بھی ذکر فرمائی کہ وہ گناہگار تھے۔ امم سابقہ کو اصل سمجھو اور مخاطبین کو فرع اور ذنوب علت جامع اور اہلاک حکم قیاس کی تکمیل تو اتنی بات سے ہوجاتی تھی مگر مزید تاکید و استحکام قیاس کے لئے ایک اور اضافہ کردیا گیا کہ امم سابقہ تم سے زیادہ قوی اور توانا تھیں۔ انکی قوت اور زور آوری نے علت ہلاکت کے موجود ہونے کے وقت عذاب کے ٹالنے میں انھیں کچھ امداد نہ دی باوجودیکہ وہ کہا کرتے تھے من اشد منا قوة ایسے توانا و قوی لوگ جب نہنگ ہلاکت کا لقمہ بن چکے

تو ہمارے جیسے کمزوروں کی کیا بساط کہ ہم اس سے محفوظ رہ سکیں۔

اسی عنوان کے ماتحت آیت ذیل بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ کالذین من قبلکم کانوا اشد منکم قوۃً واکثر اموالاً واولادا فاستمتعوا بخلاقھم فاستمتعتم بخلاقکم کما استمتع الذین من قبلکم بخلاقھم وخضتم کالذی خاضوا اولٰئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والاٰخرۃ واولٰئک ھم الخاسرون۔ (سورہ توبہ پارہ ۱۰)

امم سابقہ کو اصل اور مخاطبین کو فرع علت حکم استمتاع بالنصیب والحظ اور حکم حبط اعمال وخسارہ فی الدارین۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو جو قوائے فطرتی یا ملکات اکتسابی عطا فرمائے تھے انھوں نے اُنسے حسب مقسوم فائدہ اٹھایا۔ یہی قوائے وملکات اگر وہ حصول آخرت کے لئے استعمال کرتے۔ تو فائز فی الدنیا والاٰخرہ ہو جاتے۔ مگر ان کی بدنصیبی وبدبختی نے انھیں ہوا وہوس کا پیرو بنا کر اکتساب دنیا اور منفعت حیات عاجلہ کی طرف لگا دیا۔ مفاد اُخروی سے وہ بالکل محروم ہوگئے۔ ان کی قوت کی زیادتی اور اموال واولاد کی کثرت نے انھیں کوئی نفع نہ پہنچایا بلکہ بحکم آیہ شریفہ فلا تعجبک اموالھم ولا اولادھم انما یرید اللہ لیعذبھم بھا فی الحیوۃ الدنیا وتزھق انفسھم وھم کٰفرون (سورہ توبہ پارہ ۱۰)

بجائے اس کے کہ یہ اموال واولاد ان کو مفید پڑتے الٹے ان کو دنیا کی الجھن میں پھنسا کر خدا سے غافل کردیا اور آخرت کی بہتری کو وہ فراموش کر بیٹھے۔ اسی طور پر جو لوگ اس قسم کے سامان معیشت وکثرت تعداد پہ غرہ ہو کر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اور آخرت کی تیاری کے واسطے کوئی کوشش نہیں کرتے تمامتر ہی خواہشات نفسانی میں منہمک ہو جاتے ہیں وہ بھی عذاب الٰہی کی زد سے بچ نہیں سکتے۔ ان ھالکین میں دو امر موجب تباہی تھے (۱) استمتاع بالخلاق (۲) خوض بالباطل۔ ہمیشہ یہی دو امر موجب ہلاکت ہوا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ (۱) قوت علمی۔ (۲) قوت عملی۔

استمتاع بالخلاق سے انھوں نے اپنی قوت عملی کو غیر موزوں طریق و موقع پر استعمال کیا اور خوض بالباطل سے قوت علمی کو بھی برباد کر دیا۔ انسان جب اپنی تمام مایۂ حیات کو غیر مفید موقع پر صرف کر دے تو وہ ہلاکت سے کب نجات پا سکتا ہے۔ یہ اسباب جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے ان کے نتائج ضرور ہی مرتب ہو کر رہیں گے۔

استمتاع بخلاق اور خوض بالباطل تمام مفاسد کا منبع اور تباہیوں کا موجب ہے احادیث اور آیات میں ان دو چیزوں کو مختلف طریقوں پر مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے جن اقوام نے انبیاؑ کی مخالفت کی ان میں یہی دو مرض عام طور پر پائے جاتے تھے۔ ان دو فتنوں کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر رکعت میں حکم دیا گیا کہ ان سے بچنے کے لئے جناب الٰہی میں اپنی استدعا پیش کریں۔ المغضوب علیھم وہی لوگ ہیں جو حق کو جان کر اس کے خلاف عمل کرتے ہیں الضالین سے وہ لوگ مراد لئے جاتے ہیں جنھوں نے صحیح علم حاصل کرنے میں غلطی کی۔ انسان کا اعتقاد جب خراب ہوتا ہے تو وہ خوض بالباطل سے اور جب عمل خراب ہوتے ہیں تو وہ استمتاع بالخلاق۔ ایک کو بدعت کہا جاتا ہے اور دوسرے کو اتباع ہوا۔ سلف صالحین فرمایا کرتے تھے احذروا من الناس صنفین صاحب ھوآء فتنہ ھواہ وصاحب دنیا اعجبتہ دنیاہ احذروا فتنۃ عالم الفاجر والعابد الجاھل فان فتنتھما فتنۃ لکل مفتون جن لوگوں نے ان دونوں چیزوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا انھیں ائمۃ المتقین کا خطاب دیا گیا۔ وجعلنا ھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا وکانوا بآیاتنا یوقنون۔ صبر سے انھوں نے ترک شہوات کا مقابلہ کیا اور یقین سے شبہات کو دفع کیا۔ مذکورہ بالا آیات وشواہد سے بالتصریح معلوم ہو چکا کہ شریعت اسلامی نے قیاس علت کو ایک نہایت ہی مستند دلیل قرار دیا ہے۔ اس کے نظائر و شواہد قرآن حکیم واحادیث میں کثرت سے ملتے ہیں جن کا بالاستیعاب یہاں ذکر کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے مشتے نمونہ از خروارے مذکورہ شواہد پر اکتفا کی جاتی ہے۔

(۲) قیاس دلالت۔ قیاس دلالت کا مدار اس امر پر ہے کہ اصل اور فرع کو دلیل علت

تما جمع کیا جائے۔ قیاس علت میں اصل فرع کی ایک علت ہوا کرتی تھی۔ یہاں علت ایک نہیں۔ مگر دلیل علت دونوں میں مشترک ہے۔ اس کے باعث دونوں کا حکم بھی ایک ہی ہوگا اس کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل ایک علت سے معلول ہے اور فرع بھی ایک دوسری علت سے معلول ہے اور دونوں علتوں کی دلیل ایک ہے۔ جس کے باعث دونوں کا حکم ایک ماننا پڑے گا۔

آیت ذیل سے اس کی تشریح و توضیح ہو سکتی ہے۔ ومن آیاتہ انک تری الارض خاشعۃ فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت وربت ان الذی احیاھا لمحی الموتیٰ انہ علی کل شیٔ قدیر۔

اس آیت میں دو زندگیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) زمین کی زندگی جب قحط سالی ہوتی ہے اور باران رحمت کا نزول رک جاتا ہے تو اس وقت زمین خشک بے رونق ہو جایا کرتی ہے۔ کسی قسم کا سبزہ و تازگی اس پر نمودار نہیں ہوتی اس وقت زمین کو مردہ کہا جاتا ہے۔ جب باران رحمت کا نزول ہوتا ہے اور زمین کے قوائے مولدہ و نامیہ اپنے مواد محفوظ میں کام کرنے کے بعد زمین کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں تو یہ زمین کی زندگی ہے۔

دوسری زندگی ان لوگوں کی ہے جو اس عالم سے فانی ہو کر عالم برزخ میں جا پہنچے ان کی پہلی زندگی تو ہر شخص تسلیم کرتا ہے مگر کفار کو دوسری زندگی سے انکار ہے۔ اب ان کے سمجھانے کے لئے کھرنے کے بعد تم دوسری زندگی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا حساب کتاب دو گے اور ہر نفس کے روبرو اس کے کارنامے پیش ہوں گے۔ حسنات کی زیادتی کی صورت میں وہ مستوجب رحمت و جنت ہوں گے۔ اور سیئات کے زیادہ ہونے کی بنا پر انھیں جہنم رسید کیا جائے گا۔ احیاء ارض کی علت نزول باراں تھی اور احیائے موتیٰ کی علت ارادۂ الٰہی۔ اب دونوں کے درمیان جو امر مشترک ہے وہ عموم قدرت و کمال قدرت ہے جو احیائے ارض کی علت و احیائے موتیٰ کی

علت دونوں کو شامل ہے۔

قیاس دلالت کو اور بھی کئی موقعوں پر استعمال فرما کر ہماری رہنمائی فرمائی گئی۔ آیۂ ذیل کا مطالعہ اسی قاعدے کے ماتحت کیا جائے۔

یا ایھا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقناکم من تراب ثم من نطفۃ ثم من علقۃ ثم من مضغۃ مخلقۃ وغیر مخلقۃ لنبین لکم ونقر فی الارحام ما نشاء الیٰ اجل مسمی۔ ثم نخرجکم طفلاً ثم لتبلغوا اشدکم ومنکم من یتوفیٰ ومنکم من یرد الیٰ ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئاً الخ (سورہ حج پارہ ۱۷)

اگر تمہیں قیامت کے بارے میں تردد و شک ہے تو اپنے مخلوق ہونے میں اور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے میں اور درجۂ کمال تک پہنچکر سن شیخوخت تک پہنچکر مرنے میں تو تردد نہیں۔ بعث بعد الموت بھی اسی زندگی کی نظیر ہے کیونکہ دونوں ممکن الوقوع ہیں۔ اگر نشأۃ اولیٰ ممکن نہ ہوتی تو انسان کبھی زندگی کا جامہ نہ پہنتا۔ اس نشأۃ کے ختم ہونے کے بعد کوئی ایسا استحالۂ عقلی قائم نہیں ہوا جو دوبارہ زندگی کو روک دے۔ جس طرح ایک کاریگر کسی چیز کو بناتا ہے دوبارہ اس کا بنانا بہ نسبت پہلے کے زیادہ آسان اور سہل ہوا کرتا ہے۔ پیدائش اولین کے مشاہدہ کرنے کے بعد احیائے ثانوی سے تم کیونکر منکر ہو سکتے ہو اس کی قدرت ہمیشہ یکساں ہے۔ جیسے کہ اس کی ذات لازوال و غیر متغیر ہے ایسے ہی اسکے صفات بھی غیر متبدل و غیر زوال پذیر ہیں۔ احیائے اول اپنے اسباب اور علل سے متحقق ہوتا ہے، اور احیائے ثانی کا تحقق بھی اپنے علل و اسباب سے ہو گا مگر ہر دو نشأتوں کی علت العلل امکانِ قابل وقوع دونوں میں مشترک ہے۔ لہٰذا دونوں کا حکم بھی مشترک ہو گا۔

قولہٗ وضرب لنا مثلاً ونسی خلقہ قال من یحی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم ن الذی جعل لکم من الشجر الاخضر

ناراً فاذا انتم منہ توقدون اولیس الذی خلق السموات بقادر علیٰ ان یخلق مثلھم بلیٰ وھو الخلاق العلیم۔ انما امرہٗ اذا اراد شیئاً ان یقول لہٗ کن فیکون فسبحٰن الذی بیدہٖ ملکوت کل شیٔ والیہ ترجعون۔ بھی اسی سلسلے میں مندرج ہیں۔ ان آیات میں احیاء بعد الموت پر کئی وجوہ سے روشنی ڈالی گئی ہے جو حسب ذیل ہے۔

(۱) اول اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰہُ سے انسان کو اس کا مبداءِ خلقت یاد دلا کر نشأۃ ثانیہ کا قائل کیا جاتا ہے۔ پھر

(۲) دوم۔ ضرب لنا مثلاً ونسی خلقہ میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کیا منکر احیائے ثانی کو اللہ تعالیٰ کی پہلی نعمتِ حیات جس سے وہ اس عالم میں مستفید و متمتع ہو رہا ہے۔ فراموش ہو گئی۔ اگر وہ اس زندگی کے حالات اور اس کے اطوار کو اپنی قوت حافظہ میں محفوظ رکھتا تو کبھی بھی اسے جرأت نہ ہوتی کہ احیاءِ بعد الموت کا انکار کرتا۔

(۳) سوم۔ قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ میں اس کے اعتراض من یحیي العظام وھی رمیم کا صراحتہً حکم فرمایا گیا۔ جس ذات نے اسے پہلے پیدا کیا تھا۔ اب بھی وہ اس کے پیدا کرنے پر قادر ہے اور قادر رہے گی۔

(۴) چہارم۔ وھو بکل خلق علیم سے اپنی عمومِ قدرت اور وسعت علم کو بطور دلیل پیش کر کے منکر کے شک کو زائل کیا گیا ہے۔ کیونکہ اعادہ موتیٰ کا تعذر دو امروں پر مبنی ہو سکتا ہے۔ قصورِ علم یا قصورِ قدرت۔ وھو بکل خلق علیم سے ہر دو کا ثبوت پیش کیا گیا۔ اس کی قدرت کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ تمام مقتدر ہستیوں سے اس کی ہستی بالاتر ہے خلق السموات والارض اس کی قدرت کے لئے ہر دم شہادت دے رہے ہیں۔ کسی معدوم کے اعادہ کے لئے اسے چنداں سامان و اسباب مہیا کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف کلمہ کُنْ سے جس چیز کو چاہے فوراً اسے بیشتر پیدا کر سکتا ہے۔ ہر شے پر اس کو حکمرانی حاصل ہے۔ احیائے موتیٰ کا خلق السموات والارض کے ساتھ اگر مقابلہ کیا جائے تو ایک معمولی سا کام معلوم ہوتا ہے۔

اندریں حالات منکرین کی عقلوں پر کیوں پتھر پڑ گئے۔

(۵) پنجم۔ اللہ تعالیٰ نے احیاء اموات پر ایک ایسی دلیل قاطع بیان فرمائی جس کے سمجھنے کے بعد کوئی ذی عقل زندگی ثانی کا منکر نہیں رہ سکتا۔ الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور اخراج الاموات من القبور پر صراحۃً دال ہے اور منکرین کے اس شبہ کا بھی جواب ہے جو نشاۃ ثانیہ کے انکار کے لئے پیش کیا کرتے ہیں۔ موت کی طبیعت باردہ یابس ہے اور طبع حیات حار رطب۔ بارد یابس اور حار رطب کے درمیان تقابل تضاد ہے جب ان میں سے ایک چیز کسی محل میں حلول کر جائے تو دوسری کا آنا محال ہے۔ ورنہ تضاد قائم نہ رہے گا۔

اس کی یوں تردید کی گئی۔ شجر اخضر بھی حار رطب ہے اور نار حار یابس۔ جب ایک حار یابس کا حار رطب سے پیدا ہونا ممکن ہے تو بعد الموت زندگی کا آنا کیوں محال اور ممنوع ہے۔ روزمرہ ہم دیکھتے ہیں کہ درختوں سے آگ نکلتی ہے۔ درختوں کی رطوبت حار یابس کے وجود کو فنا نہیں کر سکتی۔ اسی طور پر یُبسِ موت اور رطوبت حیات میں بھی کوئی رکاوٹ اور بندش نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ متضادین کا ایک وقت ایک محل میں ایک حیثیت سے جمع ہونا محال ہے۔ اور متضادین کا علےسبیل التبادل ایک محل میں آنا ممنوع نہیں جس طرح عدم ملکہ میں محل عدمی کا وجودی کے لئے قابل ہونا ضروری ہے اسی طرح تقابل تضاد میں ہر ایک کا محل دوسرے کی قابلیت رکھتا ہے بصورتِ متنازعہ فیہ میں موت و حیات کو ایک محل میں جمع نہیں کیا گیا بلکہ بعد از زوال حیات موت آجاتی ہے اور موت کے ارتفاع کے بعد اسی مادّے میں حیات کا ظہور ہو جاتا ہے لہٰذا کوئی اعتراض ہی نہ رہا۔ ان وجوہات خمسہ کے علاوہ اس آیت سے اور بھی کئی طریقوں سے استدلال کیا جا سکتا ہے مگر سردست ان ہی پانچوں پر انحصار کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

(۳) سوم۔ قیاس شبہ۔ اس کا اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں بھی قرآن کریم میں ذکر فرمایا ہے کسی قابل مدح صورت میں اسکو بیان نہیں فرمایا۔ قیاس شبہ کا استعمال کرنے والے عام طور پر مبطل اور کاذب

ہوتے ہیں۔ سورۂ یوسف میں وارد ہے اِنْ یسرق فقد سرق اخٌ لہٗ من قبل۔ یہاں اصل فرع میں کوئی علت جامع بیان نہیں کی گئی اور نہ ہی دلیل علت میں اجتماع ہے۔ بغیر کسی علت جامع اصل فرع کا حکم ایک گردانا گیا جو کسی عقلمند کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ اس کی صورت تو صورت قیاس کی ہے مگر معنیٔ قیاس سے خالی ہے اس قسم کے قیاسات کو قیاس فاسد کے ساتھ ملقب کیا جاتا ہے ایک شخص کا دوسرے کے لئے بھائی ہونا اس امر کو نہیں چاہتا کہ جو وصف کمال یا نقص ایک میں پایا جائے وہ خواہ مخواہ دوسرے میں بھی موجود ہو۔ یوسفؑ اور بن یمین کا باہم بھائی ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ جو نقص و کمال ایک میں پایا جائے دوسرے میں بھی موجود ہو۔ اسی قیاس شبہ کی بنا پر کفار نے انبیاء کو یہ کہہ دیا مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا۔ بمجرد صورت انسانی اور شکل آدمیت میں شرکت کے باعث انکی نبوت و رسالت کے منکر بن گئے۔ کیا روزمرہ کے مشاہدات میں اس قسم کے نظائر و امثال کا مشاہدہ نہیں کیا جاتا۔ کہ ایک ہی گروہ اور فرقے کے بعض لوگ نہایت ہی باکمال ہو کر بام ترقی پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور بعض ناقص الفہم کمزور عدیم الاستطاعت نہایت ہی بیکار اور ردّی ہوتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نوع انسانی میں سے کسی فرد کو خلعتِ خلّت سے مشرف فرما کر باعث ہدایت بنائے تو اس میں کون استحالہ و استعجاب ہے۔

ایسا ہی کفار کا دوسرا قول اسی قیاس شبہ کی مثال بن سکتا ہے۔ وقال الذین کفروا وکذبوا بلقاء الاٰخرۃ واترفنٰھم فی الحیٰوۃ الدنیا ما ھٰذا الا بشرٌ مثلکم یاکل مِمّا تاکلون منہُ ویشرب مما تشربون۔

کفار نے صرف مساوات فی البشریت وخواص بشریت کو مشاہدہ کرتے ہوئے انبیاء کی نبوت و رسالت کا انکار کر دیا۔ ان کی نبوت و رسالت اس امر کو نہیں چاہتی کہ ان سے بشریت و خواصِ بشریت زائل ہو جائیں۔ نبوت ایک مخصوص تعلق باللہ کا نام ہے۔ جو انسانوں میں سے کسی خاص فرد کے لئے بطور خلعت انعامی طور پر مرحمت فرمایا جاتا ہے۔ کسبؔ اکتساب سے اسکو کوئی تعلق نہیں نبی کی زندگی تمام لوگوں کی زندگی سے نہایت اعلیٰ وارفع اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس کی تعلیم میں جاذبیت خاصہ پائی جاتی ہے۔ جو کسی دوسرے بشر کی تعلیم میں نہیں ہوتی۔ اس کے اخلاق

نہایت ہی پسندیدہ اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس کے افعال اور معاملات و امور معاشرتی کا معیار دوسرے لوگوں سے نہایت ہی بلند ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی صورت صورتِ بشری ہے اور خواص بشری سے بھی وہ متصف ہے مگر اس کے روحانی کمالات و باطنی ترقیات کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ ظاہر میں لوگوں نے صرف قیاس شبہ کی بنا پر ان کی نبوت کا انکار کر دیا۔ جہاں کہیں بھی قرآن کریم میں قیاس شبہ کا استعمال ہوا ہے مذموم رنگ میں اسے پیش کیا گیا ہے۔ فی الحقیقت قیاس کی پہلی دو قسمیں قابل توجہ و التفات ہیں۔ ہمارے علمائے اصول نے اثبات قیاس کیلئے قرآن حکیم کی صرف ایک آیت کو پیش کیا ہے فاعتبروا یا اولی الابصار۔ اگر صرف اسی آیت پر نظر ڈالی جائے، تو بھی قیاس کا اثبات تو ہو سکتا ہے مگر قیاس کی جس قدر اہمیت اور ضرورت ہے وہ ضرور اس بات کی مقتضی ہے کہ اسے متعدد آیات اور مختلف مثالوں سے واضح کیا جائے۔
آیاتِ امثال جس قدر بھی قرآن حکیم میں آئی ہیں یا امم سابقہ کی تخریب تعمیر کے متعلق جو قصص مذکور ہوئے ہیں وہ سارے کے سارے قیاس کے ثبوت کے لئے شواہد صادقہ و ادلۂ قطعیہ ہیں۔
باوجود اس قدر دلائل پائے جانے کے جن لوگوں نے قیاس صحیح کا انکار کیا ہے انھوں نے غالباً قرآن کریم کی ان آیات یا امثال کو کما ینبغی مطالعہ نہیں فرمایا۔ اس موضوع پر جس قدر بھی لکھا جائے کم ہے۔ مگر بغرض کفایت و خوفِ ملامتِ سامعین اس وقت اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔ جس طرح امثال کے چند نمونے قرآن حکیم سے پیش کئے گئے ہیں اور بہت سے باقی ہیں اسی طرح احادیث صحیحہ میں بھی امثال کا استعمال فرمایا گیا ہے۔ بلکہ تعبیر رویا بھی فن امثال کا ایک شعبہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق مرحمت فرمائی تو کسی دوسرے مقالہ میں امثال احادیث و تعبیر رویائے کے متعلق انشاء اللہ ایک مقالہ لکھا جائے گا۔

وَاٰخر دعوٰنا ان الحمدُ لِلّٰہِ ربِّ العٰلمین وَصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خَلْقِہٖ سَیِّدِنا و مولٰنا محمّد وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن۔

پولینڈ کی خارجی حکمت عملی

صلحنامہ ورسائی نے مشرقی یورپ میں ریاستوں کا جو نظام بنا کر کھڑا کیا وہ ایک محراب ہے جس کی ڈاٹ پولینڈ ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اگر ہم یورپ کے نقشے کو ذرا پلٹ دیں اور شمال کے بجائے مشرق کو اوپر کی طرف رکھیں۔ تب ہم دیکھیں گے کہ ایک طرف اسکینڈینیوین سلطنتیں اور جرمالٹک کے ساحل کی جمہوری ریاستیں اور دوسری طرف چیکوسلواکیہ، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کی ریاستیں مل کر ایک محراب بناتی ہیں جو سوویٹ روس کا سارا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور جرمنی کو دبائے بھی ہے۔ اس محراب میں مرکزی حیثیت پولینڈ کی ہے، اور یہ ڈاٹ ایسی ہے کہ اگر کسی قوت نے اسے اپنی جگہ سے ذرا بھی سرکا دیا تو ساری عمارت گر جائے گی۔ اگر پولینڈ کو ملک کی حیثیت سے دیکھئے تو وہ نہ مشرق کی طرف محفوظ ہے نہ مغرب کی طرف اور اس کے پڑوسی اس کو اپنا میدان جنگ بنانا چاہیں تو ان کے رستے میں کوئی قدرتی رکاوٹ حائل نہ ہوگی۔

اس معاملے میں تو بحث کی گنجائش نہیں کہ پولینڈ والے ہر حالت میں اور ہر صورت سے اپنی آزادی اور خود مختاری قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس لئے ملک کے جغرافیہ اور یورپ کی سیاسیات کو دیکھتے ہوئے پولینڈ کی خارجی حکمت عملی مندرجہ ذیل اصولوں کی پابندی پر مجبور ہے:۔

(۱) چاہے جو کچھ ہو جائے، روس اور جرمنی پولینڈ کے خلاف متحد نہ ہونے پائیں۔

(۲) پولینڈ روس اور جرمنی کے درمیان توازن قائم رکھے، یعنی کسی ایک کے اثر کو بہت زیادہ نہ بڑھنے دے۔

(۳) پولینڈ کی اپنی طاقت اتنی ہو کہ اس کے پڑوسی اسے اپنی جنگوں کا میدان نہ بنا سکیں۔ جن لوگوں کو امیدوں اور حوصلوں پر اعتبار نہیں ہوتا وہ اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پولینڈ کو بس اس کا اختیار ہے کہ وہ اپنی قسمت کو روس یا جرمنی کے ساتھ وابستہ کر دے، لیکن اس تدبیر پر

عمل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ پولینڈ اپنی آزادی محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اور اگر وہ کسی فریق کے ساتھ مل کر جنگ میں کامیاب بھی ہوا تو اس کا انجام یقیناً یہ ہوگا کہ اس کا زبردست دوست اسے ہڑپ کر جائے گا۔

مندرجہ بالا تین اصولوں میں ایک چوتھے اصول کا اضافہ کرنا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ پولینڈ کبھی "زمین بند" ہونا گوارا نہ کرے گا۔

صلح نامہ ورسائی نے پولینڈ کو اس کا قدیمی صوبہ پومورز، جو بحر بالٹک کے کنارے پر تھا، اسے واپس دیدیا۔ یہی وہ "پولینڈ کا برآمدہ ہے" جس پر جرمنی لالچ کی نظریں ڈال رہا ہے۔ پولینڈ والے کبھی اس سے دست بردار نہ ہوں گے، اس لئے کہ سمندر کا یہ رستہ، جو ان کے ملک کو دنیا کی بڑی تجارتی شاہراہوں سے ملا دیتا ہے ان کی معاشی آزادی ہی نہیں بلکہ ان کی سیاسی آزادی کی علامت اور اس کا ضامن ہے۔

ہم نے جو اصول بیان کئے ہیں وہ اس درجہ اہم ہیں کہ پولینڈ کے مدبران سے ہٹ نہیں سکتے، اور انفرادی طور پر بعض غیر اہم تفصیلات میں اپنی شخصیت اور خیالات کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ان کی پالیسی پر فرداً فرداً بحث کی جائے۔ پولینڈ کی قومی پالیسی ایک ہی ہو سکتی ہے، اور اس میں رد و بدل کی گنجائش نہیں۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں روس اور جرمنی کے درمیان ریپالو کا صلح نامہ ہوا تو پولینڈ کے لئے بڑا خطرہ پیدا ہو گیا، کیونکہ اس میں اس اتحاد کے آثار تھے جو پولینڈ کے لئے یقیناً مہلک ہوگا۔ ایک سال پہلے روسی فوجیں وارسا کے دروازوں تک پہنچ گئی تھیں، اور مشرقی پرشیا کے جرمن "برآمدے" کے بنائے جانے سے اتنے خفا تھے کہ وہ روسیوں کا خیر مقدم کرنے کو تیار تھے۔ پولینڈ کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت جرمنی کی فوج لڑنے کے قابل نہیں تھی، اور مارشل پلسودسکی نے بالشویک حملہ آوروں کو سخت شکست بھی دیدی۔ بعد کو جب روس کے وزیر خارجہ لتوی نوف اور جرمنی کے وزیر راتھے ناؤ نے ریپالو کا معاہدہ کیا تو فرانسیسی فوجیں جرمنی کو ڈرائے دبائے ہوئے تھیں، اور پولینڈ کو فرانس کی دوستی میں بڑا سہارا اور اطمینان ملا۔ لیکن "برآمدے" کے خلاف جرمن پروپیگنڈا کر کے پولینڈ والوں کو ستاتے رہے۔

جرمنی کی سرکاری فوج اور بالشویک سپاہ کا اتحاد عمل اور دوسری طرف رائن کے علاقے میں فرانسیسی فوجوں کی قوت میں کمی پولینڈ کی مختاری کے لئے ایک بڑھتا ہوا خطرہ تھا جب قسمت نے ہٹلر کو برسر اقتدار کر دیا۔ ہٹلر کو بالشویکوں سے جو نفرت تھی اس کو اس نے قومی مذہب بنا دیا، اور ادھر روس نے جرمنی کو قومی دشمن نمبر ۱ کا مرتبہ دیدیا۔ پولینڈ والوں کی جان میں جان آگئی۔ اب بس اتنی فکر باقی تھی کہ جرمنی اور روس کی قوت کا توازن قائم رہے۔

پولینڈ کے نزدیک اس کے دونوں پڑوسی ایک سی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان میں اور روسیوں میں مشترک خصوصیات کم ہیں، اور گذشتہ زمانے میں دونوں کے درمیان گہری عداوت ہی رہی ہے۔ لیکن اس وقت ان میں سے کوئی دوسرے پر حملہ کرنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ اس کے برخلاف پولینڈ اور جرمنی سرکاری طور پر ایک دوسرے کے ساتھ چاہے جتنی خیر خواہی کا اظہار کریں، پولینڈ والوں کے دل

میں جرمنی کا مشرق کی طرف بڑھنے کا حوصلہ کدورت پیدا کرتا رہتا ہے، اور خود جرمن بھی اس کا ذکر چھیڑ کر کہ انھیں اوکرائن (یعنی مغربی روس) پر قبضہ کرنا چاہئے بے چینی اور فکر کو بڑھاتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈانٹزگ میں نازی پارٹی کے لوگ مسلسل کوشش کرتے رہے ہیں کہ اس شہر کو بین الاقوامی اتحاد کے اثر سے نکالیں، اور پولینڈ والے جانتے ہیں کہ چاہے اس وقت بین الاقوامی اتحاد کی مخالفت کی جا رہی ہو، آخر میں نقصان خود ہی اٹھائیں گے۔

پولینڈ والے یہ نہیں چاہتے کہ وہ اور روسی ایک دوسرے سے نمٹنے کے لئے چھوڑ دئے جائیں، لیکن جرمنی کو گھیرے رہنے کی تدبیریں کی جاتی ہیں اور پولینڈ اگر جرمنی کے خلاف کسی کے ساتھ شریک نہ ہو تو اسے حق ہے کہ وہ اس غیر جانب داری کے پورے پورے دام وصول کرے۔ ۱۹۳۴ء میں جب پولینڈ کی فوج جرمنی کی سرکاری فوج سے بہتر حالت میں تھی اور اس کا بھی ڈر نہیں تھا کہ روسی پشت ماریں گے تو مارشل پلسودسکی کو اس سلسلے میں ایک کارروائی کرنے کا موقع ملا۔ ڈانٹزگ کے آزاد شہر میں نازی اپنی قوت کا بیجا مظاہرہ کر رہے تھے اور نازی حکومت نے ان کی بیجا ہمت افزائی کی۔ نازی اس کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک علاقے پر جو صلح نامے کے ذریعے سے پولینڈ کے سامان جنگ وغیرہ جمع رکھنے کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے قبضہ کر لیں۔ مارشل پلسودسکی نے ایک دستہ اس علاقے میں بھیج دیا، سرحد پر ایک فوج کھڑی کر دی، اور سفیر کے توسط سے ہٹلر سے دریافت کیا کہ وہ صلح چاہتا ہے یا جنگ۔ لڑنا اس وقت ہٹلر کے بس کی بات نہ تھی، اس وجہ سے اس نے ایک معاہدہ پیش کیا جس میں "برآمدہ" کے خلاف دس برس کے لئے ہر قسم کا پروپگنڈا اور ڈانٹزگ میں پولینڈ کے خلاف کارروائیاں بند کرنے کی تجویز تھی اور اس کے ساتھ یہ شرط کہ دونوں فریق میں سے کوئی بھی دوسرے سے جنگ نہ چھیڑے۔ یورپ میں سب کو خیال ہوا کہ جرمنی اور پولینڈ کے درمیان اتحاد ہوا ہے۔ لیکن خود مارشل پلسودسکی کو کسی طرح کی غلط فہمی نہیں تھی، وہ جرمنی کی کمزوری سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

خاص پولینڈ کے مفاد کو دیکھا جائے تو مارشل پلسودسکی کی چال کامیاب ثابت ہوئی، اور جرمنی جو

دباؤ پولینڈ پر ڈال رہا تھا وہ ہر طرف کم پڑ گیا۔ اس کے بجائے جرمنی نے آسٹریا کی طرف رجوع کیا۔
وہاں کے معاملات سے ہمیں بحث نہیں، لیکن جرمنی کے طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی، انگلستان
اور فرانس نے شٹریزا میں گفت گو کر کے جرمنی کی مخالفت کا ارادہ کیا۔ پولینڈ کے لئے جرمنی کا
جنوب کی طرف بڑھنا مضر نہیں تھا، مگر جو رکاوٹ جرمنی کے لئے آسٹریا میں شٹریزا کے اتحاد نے
پیدا کی وہ دوسری طرف چکوسلواکیا اور روس کے اتحاد کی صورت میں پہلے سے موجود تھی۔ لہٰذا
یورپ کو جرمن جنگجوئی سے محفوظ رکھنے کے لئے اٹلی اور روس میں سمجھوتے کی کسر رہ گئی۔

جنوب اور جنوب مشرق میں مورچہ بندی ہو جانے کا یہ نتیجہ ہو سکتا تھا کہ جرمنی مشرق کی
طرف پھٹ پڑے لیکن پھر جینیوا میں حبش کے معاملے پر جھگڑا ہو گیا، اور اٹلی پر جو معاشی پابندیاں
عاید کیں انھوں نے شٹریزا میں قایم کئے ہوئے اتحاد کو توڑ دیا۔ جرمنی نے اٹلی کی آڑے وقت میں
دست گیری کی اور اتحاد بین الاقوامی کی نمائندہ قوتوں نے جو معاشی ناکہ بندی کی تھی اس کا
مقابلہ کرنے میں مدد کی۔ انگلستان اور فرانس میں اس بات پر جوتی پیزار چل رہی تھی کہ اٹلی کے
معاملے کا فیصلہ کیوں کر کیا جائے، جرمنی کو اپنے پھیلاؤ کا سارا زور مغرب کی طرف منتقل کرنے کا
موقع مل گیا، اور ۷ مارچ ۱۹۳۶ء کو جرمن فوج رہائن کے اس علاقے میں داخل ہو گئی جہاں
صلح نامہ ورسائی کے رو سے فوج رکھنے کی ممانعت تھی۔ انگریزی فرانسیسی اتحاد کی طرف سے اس
چال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا، جرمنی ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا رہا اور اٹلی اس منظر کو
الگ سے ایک تماشا سمجھ کر دیکھتا رہا۔

جرمنی کا دباؤ مغرب کی طرف منتقل ہو جانے پر پولینڈ کی سیاست خارجہ کو پھر ہاتھ پیر ہلانے کی
آزادی مل گئی۔ اب پولینڈ کا پوزیشن اس وجہ سے اور بھی مضبوط ہو گیا تھا کہ فرانس کو اس فوجی اتحاد
کو تازہ کرنے کی فکر تھی جو پہلے ان دونوں قوتوں کے درمیان ہوا تھا، اور پولینڈ کو اس طرح جنگی
سامان کی تجدید کے لئے وہ سرمایہ مل گیا جو وہ ایک مدت سے مانگ رہا تھا۔ جرمنی اس کارروائی کو
تیکھی نظروں سے دیکھتا رہا۔ مگر کچھ کر نہ پایا۔ کیونکہ ہٹلر نے نورن برگ میں بولشویکوں کے خلاف جس

جہاد کا ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا تھا وہ کوئی عملی صورت اختیار نہ کرسکا تھا، اور پولینڈ پر یہ جتانے کی ذمہ داری نہ رہی تھی کہ جرمنی اور روس میں چل گئی تو وہ کس کا ساتھ دے گا۔ پولینڈ کی خارجی حکمت عملی کے مقاصد کو دیکھتے ہوئے پچھلے سال خزاں میں کرنل بک نے لندن کا جو سفر کیا وہ بہت کامیاب ہوا۔ اس وقت پھر اس مسئلے پر بحث کی جاسکتی تھی کہ پولینڈ فرانسیسی انگریزی اتحاد میں شامل ہو جائے پولینڈ یہ ظاہر کرکے کہ یورپ میں وہ کسی کی طرفداری نہ کرے گا انگریزی پالیسی سے قریب تر ہو گیا اور اس کا بھی اسے بہت جلد ایک موقع مل گیا کہ اس معاملے میں اپنا خلوص بھی ثابت کردے۔ جب جرمنی اور جاپان کے درمیان معاہدہ ہوا تو جرمنی کی طرف سے یہ دریافت کیا گیا کہ پولینڈ بولشویکوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کی دعوت قبول کرے گا یا نہیں، اور پولینڈ نے یہ واضح کر دیا کہ وہ کسی ایسی فرقہ بندی میں شریک نہ ہوگا۔ اس انکار پر انگلستان میں بہت اطمینان ظاہر کیا گیا، سٹاک ایکسچینج کا نرخ بڑھ گیا کیونکہ سب یہ جانتے ہیں کہ جب تک پولینڈ کسی ایک فریق کے ساتھ مل نہ جائے ہٹلر اور ستالن ایک دوسرے کو چلا چلا کر گالیاں چاہے دیتے رہیں سچ مچ لڑنا نہیں شروع کرسکیں گے۔

بین الاقوامی سیاست کا یہ مختصر خاکہ یہ دکھانے کی غرض سے پیش کیا گیا ہے کہ پولینڈ کی حکمت عملی کا یہ بنیادی اصول ہے کہ جرمنی اور روس کے درمیان توازن قائم رکھے۔ لیکن اس پر وہ اس طرح عمل نہیں کرسکتا کہ شبہے اور شک کی گنجائش نہ ہو۔ اس کا سبب چند رکاوٹیں ہیں جن میں سے بعض خود پولینڈ والوں نے اور بعض موجودہ حالات نے پیدا کی ہیں۔

یہ تو سمجھنے کی بات ہے کہ ضرورت کے وقت جرمنی کے خلاف روس کی مدد کرنے کی دھمکی پولینڈ کے لئے موجودہ سیاسی بازی کی ترپ چال ہے، لیکن روس میں ایک طرح کی دوئی ہے جو اس چال کو مشکل کرتی رہتی ہے۔ ستالن ایک مطلق العنان قومی سردار بنتا جاتا ہے، لیکن وہ اس انقلابی بولشوزم کا صدر پروہت بھی ہے جو دنیا میں اپنا مذہب پھیلانا چاہتی ہے، لتوی نوف کی قومی پالیسی میں بین الاقوامی کومیونسٹ اتحاد کی اغراض دخل دیتی رہتی ہیں، اور ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنا دشوار ہو جایا کرتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ پولینڈ کے موجودہ رہبر مارشل پلسودسکی کے پیرو ہیں، پچھلی جنگ میں

وہ روسیوں کے خلاف لڑے تھے اور روسیوں کو پولینڈ کے جانی دشمن سمجھنا ان کی گھٹی میں ملا ہے۔
۱۹۲۰ء میں بولشویک فوجوں سے سخت جنگ ہوئی تھی اور قوم کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ ان سب باتوں نے ایک عداوت پیدا کر دی ہے جو حق بجانب ہے، مارشل پلسوڈسکی روسیوں کو ناپسند کرتا تھا، مگر قومی اغراض اور مفاد کو پہچاننے کی اس میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ عداوت کے اس جذبے کو دبا سکا۔ اس کے وارث بھی یہی سبق سیکھ رہے ہیں، مگر اسے ذہن نشین کرنے میں انہیں ابھی کچھ دیر لگے گی۔

پھر چیکوسلوواکیا کا معاملہ ہے۔ پولینڈ اور چیکوسلوواکیا کا اصل مفاد دوستانہ تعلقات قائم رکھنے میں ہے، لیکن ان کے درمیان تیشن کے علاقے کا جھگڑا صلح ورسائی کے زمانے سے بگاڑ پیدا کرتا چلا آرہا ہے۔ اس کا ذمہ دار دونوں ملکوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں، مگر اس کو کیا کہیئے کہ ابھی حال تک دونوں نے سفارت کے لئے ایسے نمائندوں کا انتخاب کیا جو تیز مزاج اور طبیعتاً تعلقات کو خراب کرنے کی طرف زیادہ مائل تھے۔ (تلخیص Slavonic Review)

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

جلد ۲۸	اپریل ۱۹۳۷ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ | فی پرچہ ۸ر

پرنٹر پبلیشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

جلد ۲۸ | اپریل ۱۹۳۷ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ | فی پرچہ ۸ر

پرنٹر پبلیشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ہمارے مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم

اس زمانے کے ایک مشہور فلسفی مورخ کروچے کا خیال ہے کہ ماضی کی تاریخ بڑی حد تک حال کی تاریخ سے عبارت ہوتی ہے۔ اسی خیال کو ہمارے الہامی شاعر غالب نے کس خوبی اور لطف سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

بجام و آئینہ حرف جم و سکندر چیست
کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

یہ تاریخی حقایق کو سمجھنے کا خالص موضوعی (SUBJECTIVE) نقطۂ نظر ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کی حیثیت محض آرٹ کی رہ جاتی ہے جسے معروضی (OBJECTIVE) حقایق سے زیادہ ذہن انسانی کی کارفرمائی سے تعلق ہے۔ لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ معروضی حقایق کی طرف سے آنکھ بند کر کے تاریخ کو افسانوی حیثیت دیدی جائے۔ دراصل تاریخ کی تحقیق میں موضوعی اور معروضی دونوں طریقے استعمال ہونے چاہئیں۔ جس طرح ماضی حال سے بالکل علیحدہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے اندر مضمر رہتا ہے اسی طرح مورخ مجرد حقایق کا تصور بغیر اپنی ذہنی کیفیات کے دخل کے نہیں کر سکتا۔ لیکن باوجود آرٹ ہونے کے تاریخ بعض اٹل قوانین کی پابند ہوتی ہے۔ وہ قوانین ویسے ہی اٹل ہوتے ہیں جیسے طبعیات کے قوانین چونکہ تاریخ کا موضوع بحث انسانی اجتماعی زندگی کا نشیب و فراز ہے اسواسطے اس کے قوانین بھی انسانی اور اخلاقی حیثیت رکھتے ہیں۔ قوموں کا عروج و زوال، بعض گروہوں کا ابھرنا اور بڑھنا اور دوسروں کا گرنا اور گھٹنا ایسے اجتماعی مظاہر ہیں جن کی توجیہ اخلاقی قوانین کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ یوں ہی بغیر کسی سبب کے ہے کہ بعض اقوام کو تمدن کی سربراہی اور سرفرازی ملتی ہے اور دوسرے ان کا تتبع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں؟ ۔ نہیں، ان اجتماعی مظاہر کے قوانین ہونے چاہئیں اور ہیں۔ مورخ کا فرض ہے کہ ان کی

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شائع کی ہیں جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں، از راہ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) مطبوعات جامعہ۔ جامعہ کی شائع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۲) ناشرین اُردو۔ جامعہ کے علاوہ اُردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

(۳) مصنفین اُردو۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مولفین اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۴) بچوں کی کتابیں۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۵) عورتوں کی کتابیں۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں۔

(۶) مختصر فہرست کتب۔ کتب اُردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست۔

(۷) ادبی کتابیں۔ تاریخ و تنقید ادب، مقالات و انشا، ناول، افسانہ، نظم، ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۸) مذہبی کتابیں۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

(۹) تاریخی کتابیں۔ پانچسو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست۔

(۱۰) اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبیعیات، کیمیا، طب، حفظان صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اُردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیر طبع ہے۔ عنقریب شائع ہوگی۔

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

تحقیق کرے اور انہیں اجاگر کرے۔ موضوعی اور استخراجی طریق تحقیق کے یہ معنی ہرگز نہ سمجھے جائیں کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے واقعات کی توجیہ کرے۔ اس کے لئے بھی بعض کلیات کی پابندی ضرور ہوگی ورنہ ذہنی نراج کا خطرہ ہے۔

واقعات کی توجیہ اور ان کی چھان بین نہایت مشکل کام ہے جس کے لئے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے۔ مورخ کو اس میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ وہ واقعات کے انبار میں سے کیا چنے اور کیا چھوڑے اور کس واقعہ کو زیادہ اہمیت دے اور کس کو کم۔ بالخصوص ہندوستان جیسے ملک کی تاریخ میں یہ کام اور زیادہ دشوار ہو جاتا ہے اس لئے کہ یہاں کی تاریخ مختلف نسلوں، قبیلوں، مذہبوں اور تہذیبوں کے باہمی تصادم و تعاون کا نتیجہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ ہند میں ہم اہم اور غیر اہم کا فیصلہ کس اصول پر کریں؟ ظاہر ہے کہ اس اصول کے انتخاب میں مورخ کی ذاتی رائے اور اس کے ذہنی رجحان کا رنگ غالب آجائے گا۔ ہمارے نزدیک اشخاص کو زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہئے یا مجرد واقعات کو؟ یہ سوال بھی بہت مشکل ہے۔ تاریخ ہند کا ہر محقق جانتا ہے کہ اس ملک کے نشو و نما میں بادشاہوں، سرداروں، مدبروں اور مہاتماؤں سب ہی نے حصہ لیا ہے۔ اس لئے مجرد واقعات کو بغیر اشخاص کے حالات معلوم کئے سمجھنا ناممکن ہے۔ تاریخی واقعات اشخاص ہی کی تخلیقی کوششوں سے پیدا ہوتے ہیں، ان ہی کی مساعی سے زمانہ کی رفتار بدلتی ہے اور اجتماعی جسم میں اشخاص ہی کا نفس گرم زندگی کی نئی روح پھونکتا ہے۔ میں روح عصر کا منکر نہیں جو اشخاص کو اپنے مقاصد کا آلۂ کار بناتی ہے لیکن اس کے تسلیم کرنے سے خود اشخاص کی اہمیت مورخ کے لئے کسی طرح بھی کم نہیں ہو جاتی۔ اشخاص تاریخ میں نشان منزل کا کام دیتے ہیں۔ بغیر ان کے تاریخی واقعات کا انبار طالب علم کے لئے بے معنی چیز ہے۔

بعض اوقات جماعتیں اور گروہ اپنے مخصوص مفاد کے تحفظ کے لئے غلط واقعات کو حقایق تسلیم کر کے ان کی توجیہ سے اپنی اغراض وابستہ کر لیتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے مدارس میں انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخیں پڑھائی جاتی تھیں جو حکمراں طبقہ کے مخصوص نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھیں۔ مثلاً ہماری

تاریخوں میں کلکتہ کی "کالی کوٹھری" کا واقعہ عام طور پر ملتا ہے۔ جدید معروضی تحقیق نے پورے طور پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ واقعہ غلط ہے۔ لیکن ابتدائی انگریزی استعماریت کو اس ملک میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے اس قسم کے افسانوں کو باور کرانا اور ان کی نشر و اشاعت کرنا ضروری تھا تاکہ ہندوستان آنے والے انگریزوں کی قومی عصبیت کمزور نہ ہونے پائے۔ اسی طرح انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی کشیدگی کو بہ نسبت ہم آہنگی کے زیادہ اجاگر کر کے دکھایا گیا ہے۔ یہ بات بھی محض اتفاقیہ نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں سیاسی مقاصد کام کر رہے ہیں۔ غرضکہ تاریخ ہند میں ان سب باتوں نے اس لئے راہ پائی کہ معروضی حقایق سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کی گئی اور رائے یا خواہش کو حقیقت سمجھ لیا گیا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ تاریخ ہند لکھنے والے کو، دنیا کے کسی دوسرے ملک کی تاریخ لکھنے والے کی طرح، یہ دشواری پیش آتی ہے کہ ایک واقعہ کی اس کو مختلف شہادتیں ملتی ہیں جو آپس میں متضاد ہوتی ہیں۔ اس وقت اس کا یہ فرض ہے کہ نہایت دیانتداری کے ساتھ چھان بین سے کام لے اور عام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے حتی المقدور معروضی حقایق کی بنا پر اپنے نتائج اخذ کرے۔ تاریخ کا بہترین طریقہ تحقیق وہ ہے جس میں معروضی اور موضوعی دونوں طریقوں سے کام لیا جائے۔ جس طرح موضوعی تاریخ میں خیالی واقعات کے راہ پانے کا اندیشہ ہے وہاں معروضی تاریخ میں یہ خطرہ مضمر رہتا ہے کہ خشک اور ایک دوسرے سے بے تعلق واقعات ساری بحث کو بے معنی نہ بنا دیں جن میں زندگی کا ربط و اتحاد نام کو نہ ہو۔ بلاشبہ تاریخ کی بنیاد معروضی حقایق ہیں جو عالم وجود میں آچکے ہیں لیکن ان کی تاویل و توجیہ میں موضوعی طریقہ تحقیق سے کام لئے بغیر چارہ نہیں۔ انسانی حقایق کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جبکہ انھیں کسی نقطہ نظر سے خاص تصورات کے تحت سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یا یوں کہئے کہ تاریخ میں کوئی نہ کوئی انسانی مقصد پوشیدہ رہنا چاہیئے۔

بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر واقعات و سنین کا ایک بے ربط انبار ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ طالب علم ہر واقعہ کو اس کے پس منظر سے علیحدہ کر کے اپنے تصور میں جگہ دیتا ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ بتائے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف

واقعات میں ایک طرح کا ربطِ پنہانی پایا جاتا ہے۔ ان کے اسباب و علل پر اگر غور کیا جائے تو وہ سب ایک زنجیر کی کڑیاں نظر آئیں گی۔ ان ہی واقعات کے تار و پود سے جسدِ قومی کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی زندگی میں رخنوں کو راہ دے رہے ہیں۔

تاریخ ہند کی ہندو، مسلم اور برطانوی عہدوں میں جو تقسیم کی گئی ہے وہ جدید تاریخی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں۔ اس کے بجائے قدیم، متوسط اور عہد جدید کی تقسیم بہتر ہے تاکہ طالب علم کے ذہن میں زمانے کا تصور فرقہ وارانہ یا نسلی تعصب کے ساتھ نہ پیدا ہو۔ زمانے کی ادوار میں تقسیم مورخ کی خود اختیاری ہوتی ہے اس واسطے کہ قطعی تقسیم تو محال ہے۔ مثلاً آپ کوئی لمحہ یا تاریخ ایسی نہیں بتا سکتے جس وقت سے کہ ہندوستان میں انگریزی راج شروع ہوا۔ بالعموم ۱۷۵۸ء کی جنگ پلاسی یا ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر کے بعد سے برطانوی عہد کو شروع کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ یہ دونوں متذکرہ بالا تاریخی واقعات اس تاریخی رجحان کے مظاہر ہیں جو بہت پہلے سے ہندوستان میں موجود تھا اور جو ان واقعات کے بعد سے زیادہ شدید اور قوی ہوگیا۔ اسی طرح اسلامی عہد کی تاریخ کا آغاز محمود غزنوی کے حملوں سے ہونا چاہئے یا ۱۲۰۶ء سے جبکہ قطب الدین ایبک نے دہلی میں ایک مرکزی حکومت کی بنا ڈالی اور اسلامی ہند کی سیاست کو عملی حیثیت سے بیرونی اثرات سے آزاد کرا لیا۔ بہر حال زمانے کی تقسیم سے مطالعہ میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے اس واسطے کہ ماضی کی گرفت کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے ٹکڑے کر دئے جائیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں معاً ایک ایسا جامع تصور آجاتا ہے جو اس زمانے کی پوری حیاتِ اجتماعی پر حاوی ہوتا ہے۔ جاگیر داری، کلیسا اور تمدن و معاشرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر زندگی کے سارے خط و خال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ادوار کی تقسیم دراصل تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی میں یکایک تغیرات پیدا نہیں ہوتے۔ ہاں، اہم رجحانات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کی نشان دہی طالب علم کو کرانا ضروری ہے تاکہ وہ واقعات کے تانے بانے کا کھوج لگا سکے۔ جس طرح انفرادی تجربات کے نقوش انسان کے حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں اسی طرح اجتماعی اعمال کے نقوش زمانے کے موقلم سے قرطاس تاریخ پر بنائے جاتے ہیں۔ ایک طرف

اجتماعی زندگی کے رجحان اور دوسری طرف اشخاص کی قوت ارادی کی کارفرمائی ان نقوش کے لئے رنگ و روغن کا کام دیتے ہیں۔

ہر زمانے کی تاریخ نویسی کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ آج کل تاریخ کا مطمح نظر محلات کی سازشوں، جانشینی کے جھگڑوں اور لشکروں کی نقل و حرکت کی تفصیلات کے ماسوا اور بھی کچھ ہے۔ اب شکر گاہوں کی شان و شوکت سے زیادہ عوام الناس کی زندگی کی طرف مورخ توجہ کرتا ہے اس لئے کہ اسے سمجھے بغیر کسی گروہ کی سیاست، معاشرت یا اقتصادی نظام کا آپ پتہ نہیں لگا سکتے۔ تاریخ ہند میں بھی اس کی ضرورت ہے کہ قومی نظم و تربیت اور تہذیب و تمدن کو بہ نسبت قلعوں اور لشکر کشیوں کے زیادہ اہمیت دی جائے۔ دراصل اس وقت ہم تاریخ کو جس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں چند صدی قبل کا مورخ اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ ہمارے اخلاقی اور ذہنی معیار بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ ہم اگلے زمانے کی تاریخ نویسوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بہت ہی معمولی اور جزوی باتوں پر تو صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتے ہیں لیکن اپنے زمانے کے طور طریقوں، صنائع اور فنون اور تمدن و معاشرت کے متعلق کچھ نہیں لکھتے۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو کہ ہم جن واقعات کی تفصیل کی پرانے مورخوں سے توقع کرتے ہیں وہ بیجا ہے۔ دراصل ہماری یہ توقع عکس ہے ہماری اپنی زندگی کا۔ ہمارے زمانے میں اجتماعی زندگی نے انفرادی زندگی پر بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ آج معاشرہ کو خود اپنے وجود کا احساس ہو گیا ہے۔ آج کسی ایک فرد کی زندگی، چاہے وہ فرد کتنا ہی ذی مرتبہ کیوں نہ ہو قومی تاریخ سے عبارت نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ قومی تاریخ کے ایک کسی گوشہ کو وہ اجاگر کر سکتی ہے۔

ہمارے مدارس کی مروجہ تاریخوں میں تصادم اور جنگوں کا اس کثرت سے ذکر ہوتا ہے کہ طالبعلم کے ذہن و حافظہ میں سوائے ان کے اور کوئی نقوش مشکل ہی سے باقی رہ سکتے ہیں۔ ہماری تاریخوں سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ امن کے مشاغل گویا اس ملک میں کبھی پنپے ہی نہیں۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ جنگ اگرچہ ایک تلخ اور ناگزیر حقیقت ہے لیکن تاریخ صرف اسی سے عبارت نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ میں سوائے جنگوں کے اور کچھ

طالب علم کو بتایا ہی نہیں جاتا۔ بلاشبہ مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات حاصل کیں۔ لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ اس کی خاطر اپنا خون بہایا۔ اس ملک کے عام نراج میں ایک مستحکم مرکزی حکومت قایم کی۔ یہ سب حال ہمیں مروجہ تاریخوں میں نہیں ملتا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اشوک اعظم کے بعد مسلمانوں ہی کی بدولت ہندوستان کو سیاسی وحدت نصیب ہوئی۔ انھوں نے یہاں ایک بین ہندی تمدن کی بنا ڈالی اور ایک بین ہندی زبان انھی کے آغوش میں نشو و نما پائی جو آج ہماری قومی زبان کہلاتی ہے۔ نظم و نسق اور فنون و صنائع کے ہر شعبہ میں ان کی وجہ سے ترقی ہوئی۔ ان کی بدولت اس ملک کی اجتماعی زندگی کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور ہندوستان دنیا کے اہل علم و کمال کا مرکز بن گیا ان ہی کے توسط سے ہندوستان نے دنیا کے اور دوسرے ممالک کے ساتھ روابط استوار کئے۔ یہ سب باتیں ہمارے طالب علم کو معلوم ہونی چاہئیں لیکن ہماری تاریخوں میں ان کا ذکر یا تو بالکل نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو نہایت اجمال سے۔

میں نے ابھی اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہماری تاریخ ایک بے مقصد تاریخ ہے۔ اس بے مقصدی کی وجہ سے ہماری تاریخ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اکھڑی اکھڑی باتیں کرے جن میں کوئی ربط نہ ہو اور یہ بھی پتہ نہ چلے کہ آخر گفتگو کرنے والا کہنا کیا چاہتا ہے۔ یورپ کے مدارس میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی اجتماعی مقصد ضرور پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ تاریخ کے ذریعہ سے ہوشمند ملکتیں اپنی آئندہ نسلوں کو قومی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرتی ہیں۔ اگر حقایق کو پس پشت نہ ڈالا جائے تو میرے خیال میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آپ اپنے نوجوانوں کے سامنے قومی ضروریات اور مصالح کے تحت ایک خاص مطمح نظر پیش کریں۔ دراصل ہمارے ملک کی تاریخ میں متحدہ قومیت کا تخیل پیش کرنا مورخ کے لئے بہت ضروری ہے۔ اتحاد و یکجہتی کے جو رجحان ہماری ازمنۂ وسطیٰ اور زمانۂ حال کی تاریخ میں ملتے ہیں ان کو اجاگر کرکے دکھانا چاہئے۔ لیکن یہ کام نہایت دشوار ہے اور اس کے لئے بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ تاریخ کا کام یہ نہیں کہ وہ کسی خاص مسلک یا نقطۂ نظر کا پروپیگنڈا کرے۔ اپنے خیال کو پیش کرنے میں اسی لئے مورخ کو بڑی احتیاط لازم ہے۔ جتنی زیادہ اس کی نظر وسیع ہوگی اتنا ہی اس کو

اس کا سلیقہ حاصل ہوگا کہ وہ تعمیری تصورات کو جو قومی زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور اس کو فروغ دینے میں ممد و معاون ہوتے ہیں، نوجوانوں کے سامنے پیش کر سکے۔

ہندوستان کی تاریخ میں مرکز پسند اور مرکز گریز قوتوں کا تعامل ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دونوں قوتیں ہماری اجتماعی زندگی میں شروع سے آج تک برابر کارفرما رہی ہیں اور دونوں کے پیش نظر بعض نہایت اہم مقاصد رہے ہیں۔ ان قوتوں کی توجیہ کے ذریعہ ہم بعض نہایت پیچیدہ تاریخی مسائل کو علمی حیثیت سے سلجھا سکتے ہیں۔ مثلاً اشوک اعظم کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے سیاسی حیثیت سے مرکز گریز قوتوں کو کمزور کر کے سارے ہندوستان کو سیاسی وحدت میں منسلک کیا اور اس کے ساتھ بدھ مت کے ذریعہ مذہب و معاشرت کی مرکز گریز قوتوں کا خاتمہ کیا۔ معاشری اعتبار سے برہمنیت ایک مرکز گریز قوت ہے اس لئے کہ وہ معاشرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے اور ذاتوں میں اس کو تقسیم کر دیتی ہے۔ بدھ مت کے انسانی مساوات کے اصول کو ہم مرکز پسند قوت سے تعبیر کریں گے۔ مسلمانوں کے زمانے میں سیاسی حیثیت سے مرکز پسند قوتوں کو فروغ حاصل ہوا لیکن چونکہ انھوں نے اس ملک کے لوگوں کے مذہبی و معاشری معاملات میں دخل اندازی نہیں کی اس لئے معاشری اعتبار سے مرکز گریز قوتوں کو نشو و نما پانے کا پورا موقع ملا۔ کم و بیش ہمارے عہد جدید کی تاریخ میں بھی آپ یہی حالت پائیں گے۔ اگرچہ مسلمانوں کے زمانے میں ہندو سماج میں بعض ایسی معاشری تحریکیں وجود میں آئیں جو سماج میں ہم آہنگی قائم کرنا چاہتی تھیں لیکن پورے طور پر انھیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

تاریخ ہند میں آپ نے اکثر پڑھا ہوگا کہ اورنگ زیب اچھا حکمراں نہیں تھا یا یہ کہ سیواجی اچھا شخص تھا یا برا حکمراں تھا لیکن اس قسم کی رائے کا اظہار میرے خیال میں ذہنی تنگ نظری پر دلالت کرتا ہے۔ ہم اپنی رائے کے اظہار میں اکثر اپنے تعصب کو راہ دیدیتے ہیں۔ اس خصوص میں اگر ہم واقعات کا علمی تجزیہ کریں تو دیکھیں گے کہ ہماری قومی زندگی کی وسعت اورنگ زیب اور سیواجی دونوں کو امتیازی اور موزوں جگہ دینے کو تیار ہے۔ اورنگ زیب نے سوائے اس کے کیا کیا کہ اس نے سارے

ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت کے تحت لانے کے لئے اپنی پوری عمر صرف کردی۔ وہ ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے اس پرانے مرض کا علاج کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے ہمارے ملک کو صدیوں دوسروں کی غلامی برداشت کرنا پڑی۔ ہندوستان کو وہ اسی قدر اپنا وطن سمجھتا تھا جتنا کہ کوئی دوسرا سمجھ سکتا ہے۔ اس کی سرحدی حکمت عملی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان کی حفاظت کے لئے جو تدابیر اختیار کیں وہ کس قدر دور اندیشی پر مبنی تھیں۔ اس نے یوسف زئیوں کی بغاوت کو اسی سختی سے فرو کیا جس طرح وہ دکن کی مرکز گریز مرہٹہ قوت کے ساتھ پیش آیا۔ اس باب میں اس نے ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہیں کیا۔

جغرافی حیثیت سے ہمارے ملک کے لئے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ ہم ایک سیاسی وحدت کے سایہ میں زندگی بسر کریں۔ ہماری تاریخ میں عروج کا زمانہ وہی ہوا ہے جبکہ ایک سیاسی مرکزی نظام ملک کے مختلف گوشوں میں یکسانیت کے ساتھ موثر ہوا۔ اس اعتبار سے اورنگ زیب کو ہماری تاریخ میں وہی رتبہ ملنا چاہیے جس کا وہ مستحق ہے۔ اگر ہم تاریخی شواہد کی روشنی میں اس کی سیرت کے خط و خال کو دیکھیں تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اس پر تعصب کا الزام ایک غلط اور بے بنیاد اتہام ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو مملکت کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کر لیتے ہیں اور اس کے مفاد کی راہ میں جو روڑا آئے اُسے بلا تامل ہٹا دیتے ہیں اس میں یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی راہ میں آنے والا کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور نہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اجنبی ہے یا قرابت دار۔ اس نے راجپوتانہ کے راجاؤں کا مقابلہ اسی طرح کیا جبکہ وہ مرکزی حکومت سے اپنا رشتہ توڑ لینا چاہتے تھے جس طرح دکن کے سلاطین کا۔ اس کے سامنے بس ایک نقطۂ نظر تھا وہ سب کچھ کرنے میں مطلق پس و پیش نہ کیا جسے عام طور پر مروجہ اخلاق کے معیار کے خلاف تصور کیا جائے گا لیکن وہ جن کے ہاتھوں میں قوموں کی زندگی کی باگ ہوتی ہے ان کا اخلاق ایک شخصی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور ان کے نصب العین کو مروجہ معیار سے جانچنا درست نہیں۔ اس کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے مقاصد میں کس بلا کا انہماک تھا۔ اس کی زندگی بے لوثی، سادگی اور پاکبازی کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی ہے جس کے متعلق ہمارے نوجوانوں کو علم ہونا چاہیے۔

اسی طرح سے سیواجی کی زندگی بھی ایک خاص مقصد کی ترجمان تھی۔ جس طرح ہماری قومی زندگی میں یہ ضروری ہے کہ سیاسی مرکزیت کا نصب العین ہمارے سامنے رہے اس طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری مقامی آزادیاں برقرار رہیں۔ سیاسی مرکزیت مشترک مفاد کے لئے ہونی چاہیئے اور اس کے ساتھ مقامی گروہوں کو اپنی زندگی کی تشکیل کی پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ سیواجی نے مقامی آزادی کے نصب العین کی ترجمانی کی اور مقامی خصوصیات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ در اصل اس ملک کا مفاد یہی ہے کہ مرکز گریز اور مرکز پسند قوتوں کے باہمی تعامل و امتزاج سے ایک ایسی معتدل صورت حال پیدا ہو جو اس ملک کی اجتماعی زندگی کے لئے قابل قبول ہو۔ ہمارا ملک یورپ کے ممالک کی طرح اتنا چھوٹا نہیں کہ یہاں کی مقامی خصوصیات کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ یہ دراصل ایک بر اعظم ہے۔ اور باوجود اس امر کے کہ جغرافی اور تہذیبی عناصر اس ملک کے ہر گوشہ کو ایک مرکز کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے ہیں لیکن مقامی خصائص قومی زندگی کے تانے بانے میں ایسے پیوست ہیں کہ انہیں دبانا ناممکن ہے۔

تاریخ ہند کے مختلف ادوار میں جن گروہوں نے فوقیت حاصل کی اس کی توجیہ اس طور پر کرنا چاہیئے کہ ہماری آبادی کے مختلف عناصر میں سے کسی کو وہ ناگوار نہ گذرے۔ ہماری قومی زندگی میں مختلف گروہوں کے توسط سے نیا خون مختلف زمانوں میں آتا رہا۔ ان گروہوں کی فوقیت کے اسباب تاریخی قوانین کے تحت بیان ہونے چاہئیں۔ گروہوں کی فوقیت کے اسباب میں سے ایک سبب ان کے طریق جنگ کی برتری ہوتا ہے۔ آپ قدیم زمانے سے آج تک کی تاریخ پر ایک نظر ڈال جائیے اس حقیقت کے بہت سے ثبوت آپ کو ملیں گے۔ سکندر اور پورس کی جنگ میں اور اسی طرح عہد اسلامی اور عہد جدید کی جنگوں میں آپ دیکھیں گے کہ کامیاب گروہ کا طریق جنگ مفتوح کے طریق جنگ کے مقابلے میں اعلیٰ اور زیادہ سائنٹفک تھا عہد عالیہ اور عہد متوسط کی بعض جنگوں کی تفصیلات ہمارے پاس موجود ہیں۔ ۱۵۷۰ء میں عادل شاہیوں اور نظام شاہیوں کی متحدہ دو لاکھ کی جمعیت نے گوا کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ دس مہینے تک برابر جاری رہا۔ لیکن صرف چار ہزار پرتگالیوں نے اس بڑے لشکر کی ایک نہ چلنے دی اور بالآخر اس پر مجبور کیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ اس محاصرہ میں جدید فوجی نظم و انضباط کا مقابلہ قدیم طرز کی افواج سے ہوا اور دس ماہ کی

کوشش اور تعداد سپاہ کی زیادتی کے باوجود قدیم کو جدید پر کامیابی نہیں ہوئی ۔ یہ واقعہ ہمارے اس زمانے
کے فرمانرواؤں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا۔ پرتگالی لوگ بھی انسان تھے اس ملک میں اجنبی تھے
اور محصور ہونے کے باوجود اپنے طریق جنگ کی برتری کے سبب سے کامیاب رہے ۔ میں اپنے مطلب کو
ایک اور دوسری مثال سے واضح کردوں ۔ کرناٹک کے نواب انورالدین خاں اور فرانسیسیوں میں ۱۷۴۶ء
میں جب ناچاقی ہوئی تو نواب موصوف نے اپنے بڑے لڑکے محفوظ علی خاں کی ماتحتی میں ۱۰ ہزار کا لشکر
ساز و سامان سے آراستہ کرکے فرانسیسیوں کے خلاف روانہ کیا۔ فرانسیسی فوج کی تعداد بہت کم تھی لیکن
باوجود اس کے اس نے نواب کی فوج کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کیا۔
اس کامیابی سے ڈوپلے کو چند باتیں معلوم ہوئیں ۔ ایک تو یہ کہ اگر یورپین فوج تھوڑی سی بھی ہو اور جدید
نظم و انضباط کے اصولوں سے واقف ہو تو ہندوستانیوں کے ٹڈی دَل لشکر پر بھاری رہے گی۔ اس سے
بھی بڑھ کر اس نے یہ بات معلوم کی کہ اہلِ ہند کو اگر یورپین طریق جنگ کی مشق کرائی جائے تو کچھ عرصے میں
اپنی ذہانت سے یہ لوگ خود اہل یورپ کے مثل جنگ کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں ۔ ان دونوں باتوں سے
بڑھ کر اس کو یہ معلوم ہوا کہ اہل ہند کا کوئی اصول وفاداری نہیں ۔ انھیں بدیسی قوت سے تعاون عمل کرکے خود
اپنے اہل وطن کے خلاف تلوار اٹھانے میں کوئی باک نہیں ۔ اس پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ ایک اجنبی شخص
نے ہماری نفسیاتی حالت کو ہم سے بہتر سمجھا ۔ ہماری تاریخ کا یہ وہ زمانہ ہے جبکہ زندگی کی تمام اعلیٰ
قدریں نامرادی کے ہاتھوں مسمار ہو چکی تھیں ۔ کسی قسم کی وفاداری کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں باقی نہیں رہا
تھا۔ ملک کے ہر گوشہ میں بدامنی اور نراج کا دور دورہ تھا۔ زبردست کمزوروں پر ظلم کرنے اور استحصال و زیادہ
ستانی میں مطلق تامل نہیں کرتے تھے ۔ وفاداری کا نرم و نازک پودا وہیں نشوونما پاتا ہے جہاں عدل و انصاف
کی سازگار فضا اسے میسر آئے ۔ جس مملکت میں انصاف نہیں وہاں وفاداری کی توقع کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔
آپ ایک ایسے شخص سے وفاداری کی کیا توقع کرتے ہیں جو شہری زندگی کے معمولی حقوق تک سے محروم ہو،
جسے آپ اپنے قریب سے گذرنے بھی نہ دیں، جسے یہ اجازت بھی نہ ہو کہ وہ اپنے لئے اسی کنوے سے پانی
بھرے جہاں سے آپ کے لئے پانی آتا ہے اور اگر اس کا سایہ کبھی اتفاق سے آپ پر پڑ جائے تو آپ

اپنے تئیں ناپاک تصور کریں اسی طرح آپ کسی ایسے گروہ سے وفاداری کی توقع نہیں رکھ سکتے جو جہد اپنی کا شکار ہو، جس کی فلاح و بہبود کا مملکت کو خیال نہ ہو اور جس کے ساتھ مملکت صرف اتنا تعلق قایم رکھنا گوارا کرے کہ اس کی گاڑھی کمائی میں سے ایک بڑا حصہ اپنے لئے حاصل کرے۔ آپ ان لوگوں سے کیسے وفاداری کی توقع کر سکتے ہیں جن کے پسینہ کی گاڑھی کمائی کی حفاظت کا آپ ضامن نہیں ہو سکتے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت ہمارے بدنصیب ملک کی یہی حالت تھی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی فوجوں میں خود ہمارے اہل وطن جوق در جوق بھرتی ہو گئے اور اپنے نئے آقاؤں کے لئے اپنے ملک کو فتح کیا۔

ہندوستان کی تاریخ کے یہ واقعات ہماری آئندہ نسلوں کے لئے سبق آموز ہیں۔ عہد قدیم سے آپ دیکھیں گے کہ عوام الناس نے بیرونی فاتحوں کا ساتھ اس وقت دیا جبکہ وہ اپنے ملک میں عدل و انصاف سے محروم ہو گئے۔ اسلامی سلطنت کے آغاز اور انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں یہ حقیقت نہایت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ تاریخ کے ذریعہ ہمیں اپنے نوجوان شہریوں کو بتانا چاہیے کہ اجتماعی نظام بغیر اخلاقی محرکات کے قایم نہیں رہ سکتا۔ جب تک کہ مملکت اور سماج کے ساتھ عوام الناس کو جذباتی تعلق نہ پیدا ہو اس وقت تک دونوں کی بنیادیں کمزور رہتی ہیں۔ یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ عام مفاد مملکت کا نصب العین ہو۔ اگر ہم اپنی نصابی تاریخوں کے ذریعہ اپنے نوجوان شہریوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دیں تو سمجھئے کہ ہم نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

روسو

روسو ۱۷۱۲ء میں شہر جنیوا میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک غریب گھڑی ساز تھا جس کا دل ہر وقت عالم خیال کی سیر میں محو رہتا تھا۔ روسو جب پانچ چھ برس کا ہو گیا تو باپ بیٹے دونوں رات کو لیٹ کر موم بتی کی روشنی میں ناول پڑھا کرتے تھے، اور یہ معمول اتنے دنوں تک جاری رہا کہ بیٹا بھی باپ کی طرح تخیل پرست ہو گیا۔ یہ صفت بجائے خود بہت مبارک تھی، مگر اس نے روسو کی سیرت کے توازن کو بچپن ہی سے بگاڑ دیا۔ باپ اسے بہت جلد چھوڑ کر بھاگ گیا اور اس کے فرار ہونے کے بعد روسو کی پرورش عزیزوں اور ہمسایوں کے ذمے رہی۔ ان لوگوں میں اس کی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اس کی طبیعت کی افتاد معلوم کر کے اس کے مطابق اسے تعلیم دیں، اور ان میں یہ صلاحیت ہوتی بھی تو روسو میں بظاہر کوئی ایسی صفت نہیں تھی کہ وہ خاص توجہ کا مستحق سمجھا جاتا۔ پہلے وہ کچھ دنوں ایک پادری کے یہاں رہا، پھر ایک سنگ تراش کے پاس کام سیکھنے کے لئے رکھا گیا۔ سنگ تراش سخت آدمی تھا، مگر اس کی سختی کا روسو پر الٹا اثر ہوا۔ اس کے مزاج میں تلون پہلے سے تھا، اور کام سے وہ ہمیشہ جی چراتا تھا، سنگ تراش کی شاگردی کے زمانے میں اس کی عادتیں بہت بگڑ گئیں اور وہ چوری تک کرنے لگا۔ استاد کی سزاؤں سے اس کی طبیعت کی خلقی وحشت اور بڑھ گئی اور ایک مرتبہ جب وہ شہر کے باہر گیا اور واپسی میں اتنی دیر کر دی کہ شہر کے دروازے بند ہو گئے اس نے وطن کو خیرباد کہی اور دنیا کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ ان دنوں اس کی عمر قریب سولہ سال تھی۔ اس وقت سے آخر دم تک وہ آوارہ گردی کرتا رہا۔ اگر کہیں زیادہ عرصے تک قیام بھی رہا تو وحشت نے اسے بےچین رکھا۔ گھریلو، کام کاجی زندگی اسے کبھی میسر نہ ہوئی اور ہوتی بھی تو وہ اسے برداشت نہ کر سکتا۔ آوارہ گردی کے سلسلے میں اس نے بہت کچھ برائی بھلائی دیکھی، ہر قسم کے لوگوں کی صحبت میں رہا، بہت سی کمینہ پن کی حرکتیں کیں، شرمندگی اور بےعزتی کے دکھ سہے۔ ادبی شہرت اسے پہلے پہل ۱۷۵۰ء میں حاصل ہوئی، جب وہ ۳۸ سال کا تھا۔ اس سے قبل وہ لوگوں کی سرپرستی کا

محتاج رہا' اور سوا ان چند سالوں کے جو اس نے انسی[۱] کے قصبے میں ایک خاتون مدام وارن[۲] کے ساتھ گزارے'
اس کی ساری زندگی بڑی مصیبت اور تکلیف میں بسر ہوئی اور اس کی مزاجی کیفیت بگڑتی گئی۔ علم حاصل کرنے
کا اسے کبھی شوق نہیں تھا' اس کا مطالعہ آخر تک بہت محدود رہا' لیکن جب اس نے لکھنے کو قلم اٹھایا
تو وہ حوصلے اور آرزوئیں جو اب تک صرف وحشیانہ انداز اور ناشائستہ حرکتوں میں ظاہر ہو سکی تھیں اس
طرح پھوٹ نکلیں جیسے ایک چشمہ پہاڑ کے سینے سے ابلتا ہے' اور جس طرح وادیاں چشمے کے شور سے گونجتی
ہیں' اور وہ سیلاب بن کر میدان میں پہنچتا ہے تو بہت سے خطوں کو ویران کر دیتا ہے مگر ہر جگہ زندگی کے
بیج بھی بوتا جاتا ہے' روسو کی صریر قلم نے سارے فرانس کو ہلا دیا، اس کے خیالات کے تموج نے بہت سی
بستیاں اجاڑ دیں، مگر ہر جگہ نئی بستیوں کے بسنے کا سامان بھی کرتا گیا۔

روسو کے فلسفے کو جو گہرا تعلق اس کی طبیعت سے اور اس کی زندگی سے ہے وہ اس کی پہلی تصنیف
سے ظاہر ہو جاتا ہے' جس کا موضوع یہ ہے کہ "آیا علوم و فنون کے احیا سے اخلاق کو ترقی ہوئی ہے یا
نہیں"۔ روسو علوم و فنون میں بہت کم استعداد رکھتا تھا' اس کی اخلاقی زندگی سے دوسرے عبرت کے
سوا کچھ حاصل نہ کر سکتے تھے' لیکن اس نے علمی اور فنی ترقی کے مقابلے میں ایسے اخلاقی معیار پیش کئے ہیں جن
سے اسے دلی محبت تھی اور ایک ایسی معاشرت کا خاکہ کھینچا ہے جس کے وہ بچپن سے خواب دیکھ رہا
تھا۔ اس نے اپنی بحث میں اپنے دل کے سارے درد اور حسرت اور آرزو کو اپنا دلیل بنایا ہے اور مضمون کیا
لکھا ہے' ایک دکھ اور شوق بھری کہانی سنادی ہے۔ یہی مضمون ایک لحاظ سے اس کی پہلی سیاسی
تصنیف بھی ہے' کیونکہ وہ عقیدے جن پر اس کی سیاسی تعلیم کا انحصار تھا سب سے پہلے اسی میں بیان
ہوتے ہیں' اور وہ رنگ جس میں اس کا تصور ڈوبا رہتا تھا سب سے پہلے اسی میں نظر آتا ہے۔

علوم و فنون کی اخلاقی قدر پر بحث کرتے ہوئے روسو کا انداز زیادہ تر شکایت کا ہے۔ وہ اس سے

Annecy. (۱)
Mme. Warens. (۲)

انکار نہیں کرتا کہ انسان کی ترقی کا خیال یعنی انسان کا فطرت زیر کرکے اس سے کام لینا، عقل کی روشنی سے اس تاریکی کو دور کرنا جس نے دنیا کو گھیر رکھا ہے، زمین اور آسمان کو اپنے عمل کا میدان بنانا، اور اس کے ساتھ ہی اپنے نفس کا مشاہدہ کرکے اپنی سیرت اور سرشت، اپنے فرائض اور اپنے انجام کے راز معلوم کرنا، ایک نہایت دل کش خیال ہے۔ لیکن اس کے نزدیک اس میں بھی شبہہ نہیں کہ "جس قدر ہمارے علوم اور فنون درجہ کمال کی طرف بڑھے اسی قدر ہمارے اخلاق بگڑتے گئے"۔ حقیقت کی تلاش میں انسان ہزاروں غلط باتیں مان لیتا ہے، اور ان غلطیوں سے جو نقصان ہوتا ہے وہ اس فائدے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو حقیقت کے علم سے ہوتا۔ اس لئے کہ حقیقت تو محض نظری اور ذہنی ہوتی ہے، مگر اس کی راہ میں انسان جو ٹھوکریں کھاتا ہے ان کا سیرت اور اخلاق پر برا اثر ہوتا ہے۔ علمی جد و جہد سے بھی زیادہ مضر روسو کے نزدیک فنون اور صنعت و حرفت کی ترقی یعنی متمدن زندگی ثابت ہوتی ہے۔ دولت سرفرازی کی ہوس، شہرت کا چسکا، دکھاوے کی خواہش، اور سب سے زیادہ آرام طلبی انسان کے اخلاقی معیار کو پست کر دیتی ہے۔ "لوگ ہمیشہ رسم و رواج کی پابندی کرتے ہیں، اپنے ذاتی مذاق کا کبھی لحاظ نہیں کرتے، ان میں اتنی ہمت نہیں رہتی کہ اپنی اصل صورت میں نظر آئیں"۔ مصر، یونان، روما، سب اپنی ابتدائی حالت میں قابل رشک ملک تھے، لیکن جب سے انھوں نے علوم و فنون کی طرف توجہ کی ان کی ساری خوبیاں رخصت ہوگئیں، عیش پرستی اور آرام طلبی نے ان کی عظمت کو خاک میں ملا دیا اور انھیں کسی کام کا نہیں رکھا۔

ہم کو یہ نہ فرض کر لینا چاہئے کہ روسو یہاں اس فطری زندگی کی مدح سرائی کر رہا ہے جس کو اس سے قبل کے سیاسی فلسفے میں اس قدر نمایاں حیثیت حاصل ہے اور جس کی ہر فلسفی نے اپنی مصلحت کے مطابق دلکش یا وحشت انگیز تصویر کھینچی ہے۔ وہ اس قوم جس نے اپنی انسانیت ظاہری نفاست اور شائستگی پر نثار کر دی تھی ایک زمانہ یاد دلا رہا ہے جب اس کا اخلاقی معیار سادہ مگر بہت اعلیٰ تھا، جب آسائش اور آرام کا سامان بہت کم تھا، مگر دلی مسرت میسر تھی، جب اس نے اپنے ذہن کو علم سے روشن نہیں کیا تھا مگر علم کی دھندلی روشنی میں چلنے کی کوشش کرکے ٹھوکریں بھی نہیں کھائی تھیں۔

روسو کی اس پہلی تصنیف سے اس کی ساری ذہنی خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔ ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا معیار علمی نہیں اخلاقی ہے، اس کا فلسفہ آرزوں اور حسرتوں کا فلسفہ ہے، وہ مصلح نہیں ہے، "فن زندگی" پر طبع آزمائی کر رہا ہے۔ اس کی طبیعت ایسی تھی کہ ایک گذشتہ زمانے کی یاد ہی اس کی مسرت کا سامان ہو سکتی تھی (۱)، جو خوبیاں اسے اپنے زمانے میں نظر نہ آئیں، جس طرح کے انسان، جس طرز کی معاشرت اور اخلاق دنیا میں دیکھنا اسے نصیب نہ ہوا، ان سب کو اس نے ایک گذشتہ زمانے میں موجود فرض کر لیا۔ یہ اس کے تخیل کا اعجاز ہے کہ ایک افسانہ جس سے انسان زیادہ سے زیادہ اپنا جی بہلا سکتا تھا ایک دلفروز اور ہمت افزا حقیقت بن گیا۔ لیکن یہ خواب کی باتیں، خواہ وہ علم کے بدتر مرتبہ رکھتی ہوں، علم کی تعریف میں نہیں آسکتیں اور علمی اخلاق پر ایسی خیال آرائیوں کا چاہے جتنا اچھا اثر پڑے، ہم انہیں اخلاقیات میں شامل نہیں کر سکتے، اس لئے کہ ان میں عقل اور منطق کو ذرا بھی دخل نہیں۔

روسو کی تعلیم کا کسی علم سے تعلق نہیں، عالم کے لئے جو ذہنی خصوصیات لازمی ہیں ان میں سے ایک بھی اس میں موجود نہ تھی، اور اس نے مطالعے کے ذریعے سے جو تھوڑی بہت معلومات حاصل کی تھیں انہیں ہم مروت میں بھی علم نہیں قرار دے سکتے۔ لیکن خود روسو اور اس کے تمام حامی اور مخالف اس غلطی میں مبتلا رہے کہ وہ عالم ہے اور اس کا فلسفہ علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ روسو نے جو بات کہی وہ زیادہ تر لوگوں کو سچی معلوم ہوئی، اس کی طرح ہزاروں لاکھوں ایسے تھے جنھیں اپنے ماحول سے وہی شکایتیں تھیں جو اس کو تھیں، جن کے دلوں میں وہی آرزوئیں تڑپ رہی تھیں جنھوں نے اس کو دیوانہ کر دیا تھا۔ روسو نے علم اور نظریۂ اخلاق کے بھیس میں جو تعلیم پیش کی وہ فن زندگی کا ایک نیا اصول تھی، جس میں اتنی قوت تھی کہ وہ نظام معاشرت کا نقشہ بدل دے اور ایک نئے دور تمدن کی بنیاد ڈالے۔ علوم و فنون اور تہذیب کی ہمت شکن اور دل کو بجھا دینے والی فضا سے اکتا کر اس نے "رجوع بہ فطرت" کی صدا بلند کی۔

---

(۱) Spranger: Kultur u. Erziehung. روسو کی سیرت اور فلسفے پر میری نظر میں اس سے بہتر اور کوئی مضمون نہیں۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ انسان کو جانوروں کی سی زندگی بسر کرنا چاہیے ۔ روسو کی آرزو تھی کہ تہذیب ان امراض سے پاک کر دی جائے جو اس میں پیدا ہو گئے ہیں ، وہ زنجیریں توڑ دی جائیں جنھوں نے انسان کو اور اس کی طبیعت کو بالکل جکڑ دیا ہے ۔ اسی نیت سے اس نے پہلے تہذیب پر حملہ کیا اور پھر نئے سرچشموں سے اسے تازگی اور قوت پہنچائی (۱) اس کے فرانسیسی مداحوں اور پیروؤں کے نزدیک فطری حالت کی طرف واپس جانے کے معنی یہ تھے کہ زندگی کے نئے اور بہتر اصول اختیار کئے جائیں ، انسانوں کی تقسیم خواص اور عوام میں نہ کی جائے ، شہریوں کی حیثیت سے سب کا مرتبہ برابر ہو ، اور سیاسی زندگی کے معنی شرفا اور درباریوں کی خوشامد اور حاکموں کی زیادتیوں کو برداشت کرنا نہ ہو بلکہ ایک اجتماعی جد و جہد میں شریک ہونا اور فرائض عامہ کو انجام دینا ۔ جس آزادی اور مساوات کے روسو نے گن گائے اسی کی ہر روشن خیال فرانسیسی کو تمنا تھی ، جس معاشرت اور سیاسی زندگی کو روسو نے انسانیت کا تقاضا سمجھا اس کا اپنے اپنے رنگ میں سب کو حوصلہ تھا ۔ روسو سے ہر بات میں اتفاق کرنے والے بہت کم تھے ، لیکن اس کی تصانیف میں ہر شخص کو کہیں نہ کہیں اپنے دل کی بات اس طرح کہی ہوئی مل گئی کہ وہ روسو کا معتقد اور گرویدہ ہو گیا اور اسے اپنی تمام خواہشوں کا ترجمان سمجھنے لگا ۔

روسو کی دوسری تصنیف ، " انسانوں میں عدم مساوات کا آغاز " (۱۷۵۴) موضوع کے لحاظ سے سیاسیات سے زیادہ تعلق رکھتی ہے اور اس میں سیاسیات کے چند اہم مسائل ، جیسے قانون فطرت ، سیاسی زندگی کی ابتدا اور سیاسی مظاہرہ کی پہلی شکلوں پر بحث بھی کی گئی ہے لیکن یہاں بھی اس کے خیالات میں منطق اور تاریخ اور شاعرانہ تخیلات کی وہی عجیب و غریب آمیزش ہے جو اس کی پہلی تصنیف میں ملتی ہے ۔ اپنے مقالے کا مقصد اس نے یہ بتایا ہے کہ انسانی زندگی کی نشو و نما میں " وہ وقت معین کیا جائے جب حق کے بجائے طاقت کا دور دورہ ہو گیا اور

---

(۱) Spranger تصنیف مذکورہ ۔

خود فطرت انسانی قانون کے ماتحت کردی گئی اور یہ بتایا جائے کہ کیا کیا سبز باغ دکھا کر زور آور کمزوروں کی
فرماں برداری پر آمادہ کرلئے گئے، اور لوگوں نے سچی مسرت کے بدلے ایک فرضی سلامتی خریدلی۔" عدم
مساوات کے آغاز کے متعلق اپنا نظریہ بیان کرنے کے لئے روسو نے ضروری سمجھا کہ خالص حیوان سے
مہذب انسان ہونے تک انسانی نشو و نما کے تمام مدارج، فطری معاشرت اور اس معاشرت کے سیاسی
اور تمدنی زندگی میں تبدیل ہونے کا طریقہ دکھایا جائے۔ ~~وہ فطری زندگی کو ہوبز، سپی نوزا اور لوک کی~~
طرح ایک تاریخی مظہر نہیں قرار دیتا۔" انسان کی فطرت میں اصلی اور مصنوعی کا فرق کرنا آسان کام نہیں
ہے، یا ایسی حالت کے متعلق کما حقہ علم رکھنا جو اب موجود نہیں، بلکہ شاید کبھی موجود نہ تھی اور نہ کبھی وجود
میں آئے گی، لیکن جس کے متعلق صحیح خیالات رکھنا ضروری ہے، تاکہ ہم اپنی موجودہ حالت کی قدر و
قیمت کا صحیح اندازہ کرسکیں۔" یعنی روسو کے نزدیک فطری زندگی کو ایک تاریخی حالت سمجھنا غلط ہے،
فطری زندگی محض ایک معیار کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ بھی ایک شاعرانہ معیار ہے۔ لیکن روسو خود اس
بات کو بھول جاتا ہے اور شروع کے اس ایک جملے کے سوا اور کہیں نہ یہ محسوس ہوتا ہے اور نہ روسو خود
ظاہر کرتا ہے کہ اس کی نیت عدم مساوات کے مسئلے پر خالص علمی اور تاریخی بحث کرنا نہیں ہے۔

پہلے تو وہ ان مصنفوں پر اعتراض کرتا ہے جنھوں نے انسانی سیرت کو صحیح طور پر سمجھے بغیر
قانون فطرت پر رائے زنی کی ہے۔ ہر ایک اس کی تعریف اپنے فلسفے کے مطابق کرتا آیا ہے" اور اس
کی بنیاد ایسے مافوق الطبیعی اصولوں پر منحصر کی گئی ہے کہ جنھیں دریافت کرنا درکنار ہم لوگوں میں بہت کم
ایسے ہیں جو انھیں سمجھ بھی سکیں۔" یہ خیال کرنا کہ انسان اپنی فطری حالت میں ان دقیق قاعدوں اور اصولوں
کو دریافت کرسکتا تھا گویا یہ فرض کرنا ہے کہ آدمی انسان بننے سے پہلے ہی فلسفی ہوگیا تھا۔ فطری زندگی
کے بارے میں بھی ان لوگوں کی رائے غلط ہے، "سب نے، فکر، لالچ، ظلم، ہوس اور غرور کا ہر وقت
ذکر کرتے کرتے فطری زندگی میں ان تصورات کا وجود فرض کرلیا ہے جو ابھی انھوں نے معاشرتی زندگی
پر قیاس کرکے قائم کئے ہیں۔" وہ ذکر کرتے ہیں وحشی کا اور تصویر بناتے ہیں مہذب آدمی کی۔" خود روسو
کے خیال میں عقل سے بہت پہلے انسان کی رہبر دو جبلتیں ہوتی ہیں، ایک تو اپنی سلامتی اور بہبودی کی خواہش،

اور دوسری اپنے ہم جنس کو تکلیف میں دیکھنے سے نفرت ۔ انسان جب وحشی جانوروں کی طرح رہتا تھا تو اس میں
اپنی جان محفوظ رکھنے کی پوری صلاحیت تھی ۔ وہ مضبوط، پھرتیلا اور چالاک ہوتا تھا ۔ مگر ہم کو یہ نہ سمجھ لینا چاہئے
کہ اسے اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت برسرِ پیکار رہنا پڑتا تھا ۔ چونکہ انسان کے اس حالت میں نہ اخلاقی
تعلقات ہوتے ہیں نہ معینہ فرائض، اس لئے وہ نہ اچھا ہو سکتا ہے نہ برا ۔ اس میں نہ خرابیاں ہو سکتی
ہیں نہ خوبیاں ۔ "ہمیں ہوبز کی طرح یہ نہ طے کر لینا چاہئے کہ نیکی کا کوئی تصور نہ ہونے کی وجہ سے انسان
لازمی طور پر برا ہوتا ہوگا ۔" انسان آزاد تھا، بے پروا تھا، نہ دکھ سہتا نہ دکھ پہنچاتا تھا ۔ وہ درخت کے
نیچے بیٹھ کر خوب پیٹ بھر کھاتا، قریب کے چشمے میں اپنی پیاس بجھاتا، پھر اسی درخت کے تلے پڑ کر
سو جاتا اور اس طرح اس کی کل ضروریات پوری ہو جاتیں ۔ لیکن وہ اس حالت پر قائم نہیں رہ سکتا تھا ۔
انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان صاحبِ اختیار ہوتا ہے ۔ جبلی خواہشوں کے علاوہ
اس میں اپنا ارادہ ہوتا ہے اور انفرادی اور مجموعی حیثیت سے ترقی کرنے اور درجہ کمال تک پہنچنے کی استعداد
آب و ہوا اور دوسرے فطری محرک انسانوں کو اپنی قوتِ ایجاد کام میں لانے اور اپنی زندگی کے طریقے کو
بہتر بنانے پر مجبور کرتے ہیں ، رفتہ رفتہ وہ باہمی امداد کی قدر پہچاننے لگتے ہیں ، خاندانی زندگی شروع
ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ مردوں اور عورتوں میں فرائض اور ذمہ داریوں کی تقسیم ۔ انسان میں اب
آزادی اور تنہائی کی خواہش کے بجائے محبت اور ایثار کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، اور ملکیت کا دستور بھی
عام ہو جاتا ہے ۔ "معاشرے کا اصل بانی وہ پہلا شخص تھا جس نے زمین کے ایک ٹکڑے کے چاروں طرف
باڑھ لگا کر یہ کہنے کی ہمت کی کہ یہ میرا ہے، اور جسے ایسے سادہ لوح لوگ مل گئے کہ انھوں نے اس کی
بات مان لی ۔" لیکن شروع شروع میں اپنے اور پرائے کا احساس بہت قوی نہیں تھا، فرائض کی تقسیم
سے فرصت کا وقت بڑھ گیا تھا، لوگوں کو آسائش اور آرام کی فکر ہو گئی تھی ، مگر اس کے لئے سامان
کافی نہ تھا ، اور گو اس زمانے میں ان خرابیوں کے آثار موجود تھے جو بعد کو نمودار ہوئیں ، پھر بھی ہم کہہ سکتے
ہیں کہ یہ " دنیا کے شباب کا زمانہ " تھا ۔

ہوبز، سپی نوزا اور لوک پر اعتراض کرنے کے باوجود روسو نے فطری زندگی کا نقشہ بنانے میں

وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو ان فلسفیوں نے کیا تھا۔ اس نے اس حد تک تو مبالغے سے پرہیز کیا ہے کہ انسان کو اس حالت میں کسی دقیق فلسفۂ قانون کا موجد نہیں قرار دیا۔ لیکن اس کا فطری انسان بھی محض تصور کی ایجاد ہے خواہ اس ایجاد سے روسو کا مقصد کچھ بھی ہو۔ انسان جب جانوروں کی سی زندگی بسر کرتا تھا تو وہ بالکل جانور رہا ہوگا، اور اس کی حالت قابل رشک نہیں قابل رحم ہوگی۔ اس مسئلے پر عملی بحث کرنا فضول ہے کیونکہ اس کے متعلق ہمیں کوئی معلومات نہیں ہیں۔

انسانی زندگی کا حال عالم شباب تک بیان کرکے روسو نے عدم مساوات کے آغاز پر بحث شروع کی ہے۔ جب سے انسان دوسرے کی مدد کا محتاج ہو جاتا ہے اور وہ ذخیرہ اور سرمایہ جمع کرنے کے فوائد محسوس کرتا ہے، مساوات غائب ہو جاتی ہے، ملکیت اور اس کے ساتھ محنت کا رواج ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے تمدن کے مداح اس نئے رواج کو بہت مبارک سمجھیں، کیونکہ تمدن کا انحصار انھیں پر ہے، "فلسفی کے لئے لوہا اور اناج وہ چیزیں ہیں جنھوں نے انسان کو متمدن کردیا اور نوع انسانی کو تباہ کردیا۔" یہ وہ چیزیں ہیں جو دولت کو بڑھاتی ہیں، دولت بڑھنے سے فساد پیدا ہوتا ہے، اور دولتمند لوگ اس فساد سے فائدہ اٹھا کر غریبوں کو بہکاتے ہیں، اور انھیں معاشرے کی بنا ڈالنے اور ملکیت کے حق کو محفوظ رکھنے کے لئے قانون وضع کرنے پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ اس معاشرے اور اس حکومت کی نہ کوئی معین شکل ہوتی ہے اور نہ اس کی بنیاد قوی ہوتی ہے، لیکن وہ حاکموں کی مطلق العنانی اور رعایا کی غلامی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ "جن عیوب کی وجہ سے معاشرتی ادارے ناگزیر ہو جاتے ہیں انھیں کے وجہ سے ان اداروں کا صحیح استعمال ناممکن ہو جاتا ہے" دولت پیدا ہونے کے بعد فضائل کی کچھ قدر نہیں رہتی اور جیسے جیسے آرام طلبی اور عیش پرستی لوگوں کی سیرت کو بگاڑتی ہے، ان کے حاکموں کا تسلط بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک طرف قوم میں خودداری کا احساس اور آزادی کا مبارک شوق نہیں رہتا اور دوسری طرف حاکم اپنے فرائض کو بالائے طاق رکھ کر اپنے حقوق کو تسلیم کرانا اور قوم کو غلامی میں مبتلا رکھنا اپنا اصل مقصد سمجھنے لگتے ہیں۔ روسو کا اصل موضوع عدم مساوات کے آغاز کو سمجھانا تھا، اور جیسا کہ وہ ایک جگہ پر کہتا ہے سیاسی مظاہر کا ذکر اس نے محض ضمناً کیا ہے۔ لیکن اس ضمنی بحث میں اس نے بہت سے نظریے پیش کئے ہیں

جن کا وہ کوئی معقول ثبوت نہیں دیتا ۔ وہ یہ صاف صاف نہیں بیان کرتا کہ اس کے نزدیک سیاسی زندگی کیونکر شروع ہوئی اور ریاست اور سیاسی معاشرے کی بنا کیا سمجھی جانا چاہئے ۔ کہیں کہیں پر تو وہ معاہدۂ اجتماعی کی طرف اشارہ کرتا ہے، مگر اس کا مستقل خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست اور سیاسی اداروں کو امیروں کے فریب کا نتیجہ سمجھنا چاہئے ۔ ہم کو قطعی طور پر صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگ آزادی کی حالت سے یکبارگی مطلق العنان حاکموں کے ماتحت نہیں ہوگئے ۔ انھیں اپنی آزادی عزیز تھی اور یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ انھوں نے اپنی مرضی سے مطلق العنان حکومت قایم کی ہوگی ۔ لیکن روسو نے ان مسائل پر محض ایک سطحی نظر ڈالی ہے، اور اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لئے دلیلوں کے بجائے خطابت سے کام لیا ہے ۔ فلسفی " انسانوں کی طرف غلامی سے ایک طرح کی رغبت منسوب کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ جو ان کی نظروں کے سامنے ہوتے ہیں اپنی غلامی کو صبر سے برداشت کرتے ہوتے ہیں ۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ آزادی کا وہی حال ہے جو معصومیت اور نیکی کا ۔ جب تک یہ چیزیں ہم میں موجود ہوں ہم ان کی قدر پہچانتے ہیں، لیکن جب وہ جاتی رہیں تو ان کا شوق بھی غائب ہو جاتا ہے ۔" جو خود غلام ہو، جیسے کہ روسو کے خیال میں سیاسی فلسفی عام طور سے تھے، اس کے تو ذہن میں آزادی کا تصور قایم ہونا دشوار ہے ۔ " جب میں ننگے وحشیوں کے گروہوں کو یورپ کے سامان آسائش پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے اور اپنی آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے بھوک، آگ، قید کی زنجیریں اور موت کی مصیبتیں دلیرانہ برداشت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ آزادی پر بحث کرنا غلاموں کا کام نہیں ۔"

روسو کی سب سے مکمل تصنیف " معاہدۂ اجتماعی " ہے، جو ۱۷۶۲ء میں شائع ہوئی ۔ اس تصنیف میں وہ اپنی بحث نہایت ٹھنڈے دل سے شروع کرتا ہے، مگر پھر اس کا جوش یکایک ابل پڑتا ہے ۔ " انسان آزاد پیدا ہوا ہے، مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے ۔ بہتیرے اپنے آپ کو دوسروں کے آقا سمجھتے ہیں، حالانکہ دراصل ان سے بھی بڑھ کر غلام ہوتے ہیں ۔ یہ تبدیلی کیسے ہوئی ؟ مجھے نہیں معلوم ۔ یہ حق بجانب کیونکر ثابت کی جا سکتی ہے ؟ میرا خیال ہے کہ میں اس مسئلہ کو حل کر سکتا ہوں ۔"
روسو کا یہ کہنا کہ اسے نہیں معلوم کہ آزاد انسان غلام کیسے ہوگئے ایک عجیب بات ہے، اس لئے کہ اس نے

" عدم مساوات کے آغاز " میں اسی پر بحث کی تھی اور اسی کے متعلق ایک نظریہ پیش کیا تھا۔ لیکن یہاں پر اس کا مقصد شکایت نہیں ہے، یہاں وہ سیاسی نظام کو حق بجانب دکھانا چاہتا ہے۔ " عدم مساوات کے آغاز " میں اس نے لوگوں کی جس ابتدائی غلطی کا دکھڑا رویا تھا اس کی وہ یہاں پر تلافی کرنا اور ایک ایسے نظام کا خاکہ کھینچنا چاہتا ہے جو شہریوں کی آزادی اور عزت کو محفوظ رکھے۔ روسو کا ارادہ سیاسی یا متمدن زندگی کی مخالفت کرنا نہیں تھا، " معاہدۂ اجتماعی " میں سیاسی زندگی کو جو مرتبہ دیا گیا ہے وہ یونانیوں کے سوا اور کسی نے اسے نہیں عطا کیا۔ لیکن یہ پڑھ کر کہ " انسان آزاد پیدا ہوتا ہے مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے " خواہ مخواہ اندیشہ ہوتا ہے کہ روسو نے ساری دنیا کو تہ و بالا کر دینے کی ٹھان لی ہے۔ ایسے ہی جملوں کی بدولت آزادی کو ترسی ہوئی فرانسیسی قوم میں روسو کے فلسفے کا بہت بڑا چرچا ہو گیا اور ایک اُمنگ نے جو سب کے دل میں اُٹھ رہی تھی الفاظ کا جامہ پہن لیا۔ مگر روسو کا مطلب وہ نہیں تھا جو بظاہر اس کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ انسان آزاد ہرگز نہیں پیدا ہوتا، اسے آزادی صرف صحیح قسم کی سیاسی زندگی میں اور سچے سیاسی اصولوں پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے، ورنہ وہ ہوس اور غرض کا بندہ رہتا ہے۔ انسان زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اس سے تو انکار کرنا مشکل ہے، لیکن یہ زنجیریں اس کی تنگ نظری، خود غرضی اور نفس پرستی نے ڈھالی ہیں، ان سے وہ رہا اس صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اپنے دل کو پاک کرے، راست بازی کو اپنا مسلک بنائے، اور اس حقیقت کو جو اس کی نظروں سے کبھی چھپی نہیں رہتی اپنا رہبر بنائے۔ یہ سب روسو نے بعد کو بیان کیا ہے، اور اس میں گو شاعری بہت ہے، مگر وہ سچی شاعری ہے، اس کا مقصد تعمیر ہے، اس طرح کی وحشت ناک تخریب نہیں جس نے فرانسیسی انقلاب میں خون کے دریا بہائے۔

یہ بتا کر کہ وہ سیاسی نظام کو برحق ثابت کرنے کی تدبیر نکالنا چاہتا ہے، روسو ان نظریوں پر غور کرتا ہے جو ریاست کے آغاز کی نسبت پیش کئے گئے ہیں۔ ریاست کو محض زور آوروں کے زور پر منحصر کرنا غلط ہے، کیونکہ زبردستی سے کوئی حق نہیں پیدا ہوتا اور ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ محکوموں کو اس کا حق ہے کہ جب ممکن ہو وہ حاکموں کے پنجے سے نجات حاصل کر لیں۔ یہ بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ سیاسی اقتدار

خدا کی دین ہے، اور اس وجہ سے فرماں برداری ہمارا فرض ہے۔ جیسا کہ بوسوئے اور فلمر کا خیال تھا، کیونکہ اگر اقتدار خدا کی دین ہے تو سب بیماریاں بھی اسی کی دین ہیں، اور اگر ہم بیماری کا علاج کراتے ہیں تو ہمیں سیاسی نظام کی اصلاح کرنے کا بھی حق ہے۔ چونکہ سیاسی نظام نہ خود بخود وجود میں آیا نہ خدا کے حکم سے، اس لئے بس یہی صورت رہ جاتی ہے کہ ہم انسان کو اس کا موجد اور بانی سمجھیں۔ گروٹی اس نے فرماں روائی کی بنیاد ایک معاہدے کو قرار دیا تھا جس کے رو سے محکوم تمام حقوق بادشاہ کی طرف منتقل کر دیتے ہیں، جیسے غلام اپنے آقا کو اپنی ذات اور ملکیت پر پورا اختیار دے دیتا ہے۔ لیکن روسو کو ایسا معاہدہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے جس میں ایک فریق کا سراسر نقصان ہو اور دوسرے کا ہر طرح سے فائدہ۔ "اپنی آزادی سے دست بردار ہونا اپنی انسانیت اور تمام انسانی فرائض سے دست بردار ہونا ہے۔ ایسے شخص کے لئے جو ہر چیز سے دست بردار ہو جائے کوئی معاوضہ ممکن نہیں۔ ایسی دست برداری انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے، کیونکہ انسان سے ارادے کی تمام آزادی لے لینا اس کے افعال و اعمال کو اخلاقی معنی سے خالی کر دینا ہے۔ مختصر یہ کہ ایسا معاہدہ جس میں ایک طرف مطلق اقتدار کا مطالبہ اور دوسری طرف کامل فرماں برداری کا وعدہ ہو مہمل اور متناقض ہے کوئی قوم جنگ میں مغلوب ہونے پر بھی معاہدے کے ذریعے سے غلام نہیں بنائی جا سکتی۔ فاتح جان بخشی کے بدلے میں غلامی پر مجبور نہیں کر سکتا ہے، اس لئے کہ فاتح کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ جن لوگوں پر وہ غالب آئے ان سب کو مار ڈالے اور اگر وہ جبراً حکومت کرے تو بھی محکوم قانون اور اخلاق کے رو سے اس کی اطاعت پر مجبور نہیں۔ اس طرح روسو یہ ثابت کر دیتا ہے کہ سیاسی اقتدار صرف محکوموں کی رضامندی سے قائم ہو سکتا ہے اور اس کا انحصار ہمیشہ انھیں کی رضامندی پر رہتا ہے اس کے بعد وہ اپنے نظریے پیش کرتا ہے۔

"عدم مساوات کے آغاز" میں روسو نے اس آزاد فطری زندگی کو جب کہ انسان نے پہلے پہل اجتماعی طرز معاشرت اختیار کیا دنیا کا عالم شباب قرار دیا تھا۔ لیکن "معاہدۂ اجتماعی" کی تصنیف تک اس کے خیالات بہت کچھ بدل گئے تھے۔ یہاں "عالم شباب" کا دور بالکل بے ثبات قرار دیا

جاتا ہے، اور معاشرے کا قائم ہونا صرف ایک ترقی کی صورت ہی نہیں بلکہ حفاظت کا واحد طریقہ مانا
جاتا ہے۔ "معاہدہ اجتماعی" میں روسو فطری زندگی کو تاریخی واقعے کی نوعیت نہیں دیتا، اس طرح
وہ اس اعتراض سے بچا رہتا ہے جو لوک پر کیا جا سکتا ہے، کہ اس نے ایک واقعہ کو تاریخی قرار دیا ہے
جس کا پتہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتا۔ ہوبز کی طرح اس نے فطری زندگی اور معاہدہ اجتماعی کی ڈوریوں
سے منطق کا جال بھی نہیں بُنا ہے۔ معاہدے کا ذکر کرنے سے پہلے وہ یہ ثابت کر چکا ہے کہ ریاست
زبردستی قائم کی جائے تو چاہے وہ صدیوں قائم رہے اسے ریاست کہنا اور اس کے ماتحتوں کو شہری
اور آزاد سمجھنا غلط ہے۔ لوگ غلام بنتے ہیں اور بنائے جاتے ہیں، تلوار کی دلیل کو رد کرنے کی اکثر لوگوں
میں ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن روسو جس ادارے کو ریاست اور جس معاشرے کو سیاسی معاشرہ سمجھتا
ہے وہ اس طرح قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے رضامندی کی شرط ہے اور یہ شرط اسی حالت میں
پوری ہو سکتی ہے جب لوگ اپنے ادارے سے مناسب معاہدہ کریں۔ اس معاہدے کے مختلف فقرے
"گو وہ شاید کبھی باقاعدہ بیان نہیں کئے گئے ہیں، ہر جگہ ایک سے ہیں، ہر جگہ تسلیم کئے جاتے ہیں"
"ہم میں سے ہر ایک سب کے ساتھ مل کر اپنی ذات اور اپنی تمام قوت کو ارادۂ عامہ کے بالکل تحت
کر دیتا ہے، اور اس کے بدلے میں ہم ہر ایک کو اجتماعی ہستی کا ایک جزو تسلیم کرتے ہیں" یہ معاہدہ افراد کو
ایک مربوط جماعت بنا دیتا ہے، "اس سے ایک اخلاقی اور اجتماعی ہستی پیدا ہوتی ہے جس کے
اتنے ہی اجزا ہوتے ہیں جتنے کہ افراد جماعت میں شریک ہیں، اور جسے اسی معاہدے کے ذریعے سے
ربط و اتحاد، مجموعی شخصیت، جان اور ارادہ حاصل ہوتا ہے" افراد کے لئے معاہدے میں شریک
ہونا گویا اپنے آپ کو جان اور مال سمیت معاشرے اور ریاست کے حوالے کر دینا ہے۔ اس کے بعد وہ
کسی حق کی نسبت یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ معاشرے یا ریاست کے اختیار سے باہر ہے۔ لیکن
روسو یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ اس سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا۔ چونکہ ہر ایک یکساں اپنے حقوق سے
دست بردار ہو کر ریاست کو ان کا محافظ بنا دیتا ہے، اور شرائط سب کے لئے ایک سے ہوتے ہیں،
اس لئے کسی زیادتی کا اندیشہ نہیں رہتا اور اتحاد اور ربط میں بھی کوئی کمی نہیں رہتی۔" مختصر یہ کہ ہر شخص

چونکہ اپنے آپ کو اور سب کے حوالے کر دیتا ہے، اس لئے وہ (در اصل) اپنے آپ کو کسی کے بھی حوالے نہیں کرتا، اور چونکہ معاہدہ کرنے والوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہوتا جس پر ہم کو وہ حقوق نہ حاصل ہو جائیں جو ہم خود اسے دیتے ہیں، اس لئے ہم جتنا کھوتے ہیں اتنا ہی ہمیں واپس بھی مل جاتا ہے اور جو کچھ ہمارے پاس ہوتا ہے سے محفوظ رکھنے کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔" انفرادی حقوق کے طرفداروں کو یوں اطمینان دلا کر روسو ان فائدوں کو بیان کرتا ہے جو انسان کو معاشرے اور ریاست کے قائم ہونے سے میسر ہوتے ہیں۔ یہاں یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ سچی سیاسی زندگی کا کس درجہ قائل تھا، اور وہی فطری معاشرت جس کی اس نے پہلے اتنی تعریف کی تھی، اگرچہ محض بگڑے ہوئے تمدن اور تہذیب کی ضد میں، "معاہدہ اجتماعی" کی تصنیف کے وقت، یعنی جب وہ سچی سیاسی زندگی کا نقشہ کھینچ رہا ہے، اسے کتنی حقیر معلوم ہونے لگی تھی۔ سیاسی معاشرے اور ریاست میں داخل ہو کر انسان اپنی فطری آزادی سے اور اس حق سے ہاتھ دھوتا ہے جو اسے ہر چیز پر جو اسے بھلی لگتی حاصل تھا۔ لیکن اس کے بدلے میں اسے ملکیت اور ملکیت کا حق ملتا ہے، اور معاشرے کے ارادۂ عامہ کے سوا اس کے حقوق میں دست اندازی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ فائدہ خود روسو کے نزدیک اور فوائد کے مقابلے میں بہت ادنیٰ ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس نے سیاسی معاشرے کا وجود میں آنا نوعِ انسان کی سلامتی کے لئے ناگزیر فرض کیا تھا۔ اب وہ کہتا ہے کہ "فطری حالت سے گزر کر سیاسی نظام میں داخل ہونے سے انسان میں ایک حیرت انگیز تبدیلی ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے عمل میں جبلت کی جگہ انصاف کا معیار کارفرما ہو جاتا ہے اور اس کے افعال میں وہ اخلاقی صفت پیدا ہو جاتی ہے جو پہلے موجود نہ تھی۔ اس وقت جسمانی خواہش کے بجائے فرض کا احساس، ہوس کی جگہ حق کا احساس، انسان کے عمل کا محرک بن جاتا ہے، اور انسان، جو اب تک اپنے سوا کسی کا خیال نہیں کرتا تھا، خود کو دوسرے اصولوں کے مطابق چلنے پر مجبور پاتا ہے، اور اسے نفس کا کہنا ماننے سے پہلے عقل کے مشورے پر چلنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اس حالت میں وہ بہت سے اختیارات کھو بیٹھتا ہے جو اسے فطرت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں، لیکن ان کے بدلے میں اسے اتنے ہی بڑے فوائد بھی پہنچتے ہیں۔ اس کے قویٰ استعمال میں آتے ہیں، اس کے خیالات وسیع، اس کے احساسات لطیف

اور اعلیٰ ہو جاتے ہیں، اس کی ساری شخصیت بلندی کے اس درجے پر پہنچ جاتی ہے کہ اگر اس نئی حالت میں خود اس کی زیادتیاں اور ستم کی برائیاں اسے اس کی قدیم حالت سے بھی زیادہ نیچے نہ کر دیتیں، تو اس کا فرض ہو جاتا کہ ہمیشہ اس مبارک لمحے کو دعا دیتا رہے جب وہ فطری زندگی کی قید سے رہا ہوا اور ایک بیوقوف اور جاہل جانور سے ایک ذی عقل ہستی، ایک انسان بن گیا۔"

اس میں شک نہیں کہ روسو کا معاہدہ اجتماعی ایک عینی تصور ہے، اور اس طرح ایک آن میں انسان کی کایا پلٹ جانا شاعرانہ مبالغہ ہے، تاریخ بھی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سیاسی حقوق اور فرائض کا احساس رفتہ رفتہ پیدا ہوا۔ لیکن تاریخ کی رو سے بھی ہم روسو پر صرف یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اس نے انداز بیان کسی قدر غلط اختیار کیا، اس کا دعویٰ دراصل صحیح ہے۔ انسان کا حیوانی عنصر اسے فطرت کی طرف سے ملا ہے، اس عنصر میں خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی، لیکن اسی وجہ سے کہ آدمی میں انسانی عنصر بھی شامل ہے، اس کے لئے حیوانی زندگی خطرناک ہو جاتی ہے، اور خطروں سے نجات پانے کی صورت یہی ہے کہ وہ اپنے فطری عنصر کو انسانی عنصر کے ماتحت کر دے، یعنی سیاسی معاشرہ قائم کرے، کیونکہ انسانی عنصر کو نشو و نما کے لئے جو ماحول درکار ہے وہ صرف سیاسی معاشرے میں میسر آ سکتا ہے۔ سیاسی معاشرہ اگر ویسا نہ ہو جیسا کہ اسے ہونا چاہئے تو انسان کا حیوانی یا فطری عنصر غالب رہتا ہے، جسے روسو اپنی اصطلاح میں "فطری حالت کی طرف واپس جانا" کہتا ہے، اور اصطلاح تاریخ میں یہی کیفیت حالت تنزل یا بگڑی ہوئی نشو و نما کہلائے گی۔ فطری عنصر کا غالب رہنا انسان کی شان کے خلاف ہے کیونکہ عقل اور اخلاقی احساس، جو انسانی سیرت اور سرشت کے زیور ہیں، ناموزوں فضا میں کبھی فروغ نہیں پا سکتے، اور انسان کو نشو و نما کی وہ آزادی نہیں مل سکتی، اس کے حوصلوں میں بلند پروازی کا وہ شوق پیدا نہیں ہو سکتا جو روسو اور نوع انسانی کے دوستوں اور قدردانوں کی نظر میں انسان کا خداداد حق ہے۔ سیاسی آزادی کے متعلق خیالات میں اختلاف ہو سکتا ہے اور انفرادیت کے حامی روسو پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے ریاست کو اس قدر وسیع اور ہمہ گیر اختیارات دیئے کہ اس کی ریاست اور ہوبز کے حاکم مطلق بادشاہ میں صرف نام کا فرق رہ جاتا ہے۔ روسو نے واقعی ریاست کو مختار کل بنا دیا ہے، اور ارادۂ عامہ کی فرماں روائی پر

جو معاہدۂ اجتماعی کے بعد خود بخود قائم ہو جاتی ہے، کسی طرح کی پابندی عاید نہیں کی گئی ہے۔ روسو کا دعویٰ یہ ہے کہ ارادۂ عامہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس لئے کہ ہر شخص اپنی بھلائی چاہتا ہے اور ارادۂ عامہ صرف اس عام خواہش کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس کی ریاست میں حاکم اور محکوم کا وہ فرق جو محکوموں کے حقوق کو جوکھم میں ڈال دیتا ہے، پیدا نہیں ہو سکتا۔ ریاست کے تمام شہری خود ہی فرماں روا بھی ہیں اور فرماں بردار بھی، حاکم بھی، محکوم بھی۔ ریاست کا ربط جبراً قائم کیا ہوا نہیں، شہریوں کے اپنے معاہدے کا نتیجہ ہے، شہریوں کے امن اور اطمینان کی ذمہ دار کوئی غیر قوت نہیں، بلکہ ان اغراض اور مقاصد کی وہ ہم آہنگی جو سیاسی معاشرے کے وجود میں آتے ہی لوگوں کے دلوں میں جلوہ افروز ہو جاتی ہے۔ روسو کی ریاست محض ظاہری اتحاد نہیں، وہ ایک جسم نامی ہے جس کے اجزا کل میں محو ہو جاتے ہیں۔ اس کے ہاں نظریہ نہیں ہے کہ فرد اور معاشرے یا ریاست کے درمیان حقوق اور اختیارات کی تقسیم کر کے کوئی نازک توازن قائم کرے، بلکہ وہ ریاست میں کامل جسم نامی کے اوصاف پیدا کرنا چاہتا ہے۔ "جس طرح فطرت ہر انسان کو اپنے اعضا پر پورا اختیار دیتی ہے، اسی طرح معاہدۂ اجتماعی سیاسی معاشرے کو اپنے تمام اراکین پر کامل اختیار دیتا ہے، اور اسی اختیار کو ہم فرماں روائی کہتے ہیں، جب ارادۂ عامہ اس کا رہبر ہو۔" ارادۂ عامہ کے عامل اور ریاست کے فرماں روا خود شہری ہوتے ہیں، اس لئے روسو انھیں کسی طرح سے پابند کرنا مہمل سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ اندیشہ بھی بے جا ہے کہ شہری ایسا طرز عمل اختیار کریں گے جس سے خود انھیں نقصان پہنچے۔ دراصل اس کا منشا یہ ہے کہ چونکہ ریاست ایک نامی جسم ہے، اس لئے شہریوں کے کوئی ایسے حقوق نہ ہونا چاہئیں، فرماں روائی پر کوئی ایسی قید نہ ہونا چاہئے، جس سے ریاست کی نشوونما میں خلل پڑ سکے اور اس کے وجود میں آنے کا مقصد فوت ہو جائے۔

اور مسائل کی طرح اس میں بھی روسو نے واقفیت اور ہنیت کی ایسی آمیزش کر دی ہے جس نے خود اسے اور اس کے اکثر پیرووں کو غلط فہمی میں ڈال دیا۔ اس کا یہ نظریہ کہ ریاست ایک جسم نامی ہے بالکل صحیح ثابت کیا جا سکتا ہے، اور فرد اور جماعت میں جو ربط وہ پیدا کرنا چاہتا تھا اس کی اہمیت اور ضرورت ظاہر ہے۔ لیکن اغراض کی وہ ہم آہنگی، مقاصد کی وہ یکجہتی جو روسو نے فرض کی ہے سیاسی

زندگی کا پہلا قدم نہیں ہے بلکہ ترقی اور نشوونما کی آخری منزل، کمال کا انتہائی درجہ۔ روسو نے ہر اس حالت کو جو اس کے سیاسی فلسفے کے مطابق نہ ہو، معاشرے اور ریاست کی بگڑی ہوئی شکل قرار دے کر بحث سے خارج کر دیا ہے، اگرچہ وہ خود بھی محسوس کرتا ہے کہ سیاسی اخلاق کا اس بلندی پر قائم رہنا جس پر وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا بہت دشوار ہے۔ اس کا سیاسی فلسفہ ایک بہت اعلیٰ معیار ہے، جس پر ہر قوم کو اپنا سیاسی نظام جانچتے رہنا چاہئے، لیکن اس معیار کے حصول کو قبل از وقت ممکن سمجھ لینا بڑی خرابی کا باعث ہو سکتا ہے۔ روسو پر اس کا الزام نہ لگانا چاہئے کہ اس نے اپنے تخیل کو دنیا کے جزوی "واقعات" کا پابند نہیں کیا۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ اس نے واقعیت اور عینیت کی درمیانی کڑیاں توڑ دیں۔

روسو سے پہلے بھی سیاسی فلسفیوں نے قوم کی فرماں روائی کا دعویٰ کیا تھا۔ ریاست کو ایک جسم نامی قرار دینے میں بھی اس نے کوئی جدت نہیں کی۔ لیکن اس سے پہلے کوئی بھی جمہوریت کا سچا معتقد نہیں تھا، کسی کو اس کا یقین نہیں تھا کہ عوام، یعنی سیدھے سادے غیر مہذب لوگ، ریاست کا بیڑا پار لگا سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ روسو کے دل میں سوئٹزرلینڈ کی سیاسی زندگی نے پیدا کیا اور روم اور یونان کی تاریخ کے مطالعے نے اسے اور پختہ اور گہرا کر دیا۔ لیکن اس عقیدے کا انحصار ایک اور نظریے پر ہے جسے روسو کے ذہن کی خاص ایجاد اور اس کے فلسفے کا جوہر سمجھنا چاہئے، اور وہ اس کا "ارادۂ عامہ" کا نظریہ ہے۔ روسو نے کہیں ارادۂ عامہ کی تعریف وضاحت سے نہیں کی ہے، مگر ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ان جبلی خواہشوں اور حوصلوں کی طرح جو فطرت نے ہر نامی جسم کو دئے ہیں، ریاست بھی بحیثیت ایک جسم نامی کے ایک ارادہ رکھتی ہے، جو ایک غیر محسوس طریقے سے اس کو خطروں سے بچاتا اور منزل مقصود کی طرف مائل کرتا ہے۔ شہری اس سیاسی جسم نامی کے اجزا ہیں، اس لئے وہ ارادۂ عامہ کے حامل ہوتے ہیں۔ "جب تک کہ انسانوں کی ایک متحد جماعت اپنے آپ کو ایک جسم سمجھتی رہے، اس کا عام حفاظت اور بہبودی کے متعلق ایک ارادہ رہتا ہے۔ اس وقت ریاست کے تمام قویٰ چست اور سادہ ہوتے ہیں اور اس کے سیاسی اصول صاف اور روشن۔ اس میں اغراض کی پیچیدگیاں اور تضاد

نہیں پایا جاتا۔ عام مفاد حاصل کرنے کی صورت ہر جگہ بالکل واضح ہوتی ہے اور اسے دریافت کرنے کے لئے صرف تھوڑی سی عقل سلیم درکار ہوتی ہے۔ لیکن اگر سیاسی زندگی کا معیار پست ہو جائے اور انفرادی اغراض کے سوا ریاست کا اور کوئی رہبر نہ ہو، تو ارادۂ عامہ بگڑتا نہیں یا معدوم نہیں ہوجاتا۔ وہ ہمیشہ ایک سا رہتا ہے اور ہمیشہ خالص، ہمیشہ شہریوں کو صحیح رستے پر چلاتا ہے اور عام مفاد کی طرف مائل کرتا ہے۔ اگر وہ ظاہر نہ کیا جائے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ شہریوں کے دل میں موجود نہیں۔ وہ صرف معطل ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا سننے اور ماننے والا کوئی نہیں ہوتا روسو نے خود یہ بات صاف طور پر کہی نہیں ہے، لیکن اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ریاست اور ارادۂ عامہ ایک ساتھ وجود میں آتے ہیں، اور جب تک ریاست نیست و نابود نہ ہو جائے، اس میں ارادۂ عامہ موجود رہتا ہے۔ گویا دونوں کا تعلق جسم اور جان کا سا ہے۔

ارادۂ عامہ کا نظریہ پیش کر کے روسو نے قوموں اور ریاستوں کی تاریخ کو زندہ کر دیا اور ان کی جد و جہد کی ایسی روشن اور ہمت افزا تعبیر کر دی جو محض تاریخی مطالعے یا وطن پرستی کے برتے پر نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس نے اپنے نصب العین کو عملی صورت دینے کی کوشش بھی کی اور اس میں اسے سخت ناکامی ہوئی۔ اس کا یہ فرض کرنا کہ ہر مسئلے کے متعلق ارادۂ عامہ معلوم کیا جا سکتا ہے خود ایک غلطی تھی، اسے معلوم کرنے کی تدبیریں بتا کر اس نے اپنے فلسفے کو مضحک بنا دیا۔ ارادۂ عامہ ہر شہری کے دل میں ایک پاک جذبے کی شکل میں ہر وقت موجود ہوتا ہے، لیکن شہری خواہ کتنے ہی نیک نیت اور نیک سیرت، جوش حمیت اور جوش ایثار سے معمور ہوں، وہ ہر معاملے میں محض اپنی ذاتی رائے دے سکتے ہیں، اور اس کا ہمیشہ امکان رہتا ہے کہ ان کی رائے غلط ہو۔ رائے شماری کے ذریعے سے ارادۂ عامہ کسی صورت سے دریافت کیا ہی نہیں جا سکتا، اس کا اقلیت اور اکثریت کی رائے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اس کا کسی ایک مسئلے پر اظہار ہو سکتا ہے۔ وہ تاریخ کے خزانے میں ایک بیش بہا جوہر کی طرح محفوظ رہتا ہے اور اسی کو مل سکتا ہے جو صدق دل اور خلوص سے اس کو تلاش کرے۔ روسو کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اگر شہریوں کی نیت بری ہو، ریاست میں فرقے

پیدا ہو جائیں اور ذاتی اغراض ریاست کی ضروریات سے زیادہ اہم سمجھی جانے لگیں تو ریاست کا ترقی کرنا اور اپنے مقاصد حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ "اگر شہری کافی معلومات حاصل کرنے کے بعد، مگر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کئے بغیر کوئی فیصلہ کریں تو چھوٹے چھوٹے اختلافات کی کثیر تعداد کا فرق نکال کر ارادۂ عامہ ہمیشہ معلوم ہو سکتا ہے" یا یہ کہ "مجلسوں میں جتنی ہم آہنگی ہو، یعنی رائے شماری کے جس قدر اتفاق رائے ظاہر ہو، اسی قدر ارادۂ عامہ غالب رہتا ہے"۔ ارادۂ عامہ ریاست اور سیاسی معاشرے کا رہبر ہوتا ہے، مگر یہ کہنا محض ابلہ فریبی ہے کہ "جو شخص ارادہ عامہ کی فرماں برداری سے انکار کرے اسے باقی سب فرماں برداری پر مجبور کریں گے، جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ آزاد ہونے پر مجبور کیا جائے گا"۔ اسی طرح روسو نے ایک جگہ اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص عام رائے کو اپنے خلاف پائے تو اسے سمجھنا چاہیئے کہ اس نے ارادۂ عامہ کی نسبت غلط اندازہ لگایا ہے، اور اس کی رائے مان لی جاتی تو وہ خود اس کے حقیقی ارادے کے خلاف ہوتی، (۱) اور اس لحاظ سے وہ آزاد نہ ہوتا، کیونکہ آزادی صرف ارادۂ عامہ کی فرماں برداری سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسی منطقی بازیگری روسو کے فلسفے کی شان کے بہت خلاف ہے اور اگر اس کے ذہن میں واقعیت اور عینیت میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہوتی تو اسے ایسی دلیلوں سے کام لینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اختلاف رائے خلوص کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے، اس میں کوئی اندیشے کی بات نہیں۔ غلطیاں کرنا اور بھٹکنا آزادی کی شرط ہے، کیونکہ اس کے بغیر تجربے کا وہ ذخیرہ فراہم نہیں کیا جا سکتا جو آزادی کو ایک حقیقت بنانے کے لئے ناگزیر ہے لیکن روسو کی عینیت پرستی اور رومانیت نے اسے گوارا نہ کیا کہ انسان کسی اعلیٰ مصلحت کی بنا پر بھی اپنی اصل سے دور ہو۔

---

(۱)۔ ہر شہری روسو کے نزدیک حقیقت میں وہی چاہتا ہے جو ارادۂ عامہ چاہتا ہو، اور ارادۂ عامہ سے بے جانے یا جان بوجھ کر اختلاف کرنا گویا اپنے اصلی مقصد سے دور ہو جانا ہے۔

عینی زندگی کی کسی نعمت سے محروم رکھا جائے۔

جہاں تک سیاسی نظام کا تعلق ہے' روسو کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ریاست چھوٹی ہونا چاہیئے۔ جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے اس کی اور تجویزیں سب بیکار ہو جاتی ہیں۔ رسم پوری کرنے کے لئے اس نے حکومت کے مختلف طریقوں پر بحث کی ہے' اور جا بجا مونٹس کیو کی نقل کر کے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ سیاسی مسائل کے اس پہلو سے غافل نہیں جس کی طرف مونٹس کیو نے توجہ دلائی تھی۔ مگر یہ سب محض دکھانے کے لئے ہے۔ روسو کا دل اس نظام اور انھیں سیاسی اصولوں میں اٹکا ہے جو یونان اور روما میں رائج تھے۔ اس کے نزدیک فرماں روائی کا حق نہ کسی کو دیا جا سکتا ہے نہ کوئی اس میں حصہ لگا سکتا ہے' شہری اگر اس مقدس حق کو اپنے ارادے سے محدود کر دیں تو وہ بنیادی معاہدہ جس نے ان سب کو ایک ریاست اور سیاسی معاشرے کی شکل دی تھی خود بخود ٹوٹ جاتا ہے اور وہ پھر منتشر افراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ غرض فرماں روائی کی تمام شرائط پوری کرنا شہریوں کا فرض ہے اور اس فرض سے وہ کسی حالت میں سبکدوش نہیں ہو سکتے' خواہ وہ حکومت کا کوئی طریقہ بھی اختیار کریں۔ فرماں روائی کا سب سے اہم فرض قانون وضع کرنا ہے' اور قانون روسو کے نزدیک احکام نہیں بلکہ "اتحاد کے ضابطے" ہیں جنھیں وہی لوگ وضع کر سکتے ہیں جو اس اتحاد میں ارکین کی حیثیت سے شریک ہوں۔ قانون کا تعلق صرف کُلی اصولوں سے ہوتا ہے' جزوی معاملات سے فرماں روا کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر حکومت اس قسم کی جمہوریت ہو جیسے کہ ایتھنز میں تھی' یعنی اگر شہری حاکم بھی ہوں' تو وہ جزوی امور میں بھی حاکموں کی حیثیت سے احکامات جاری کر سکتے ہیں۔ قانون وضع کرنے کے علاوہ فرماں روا کا ایک اور فرض یہ ہے کہ حکومت کا طریقہ معین کرے۔ روسو نے لوک کی طرح حاکم شخص یا جماعت اور فرماں روا' حکومت اور ریاست میں فرق کیا ہے' مگر وہ لوک کے اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتا کہ حاکموں اور محکوموں میں معاہدہ ہوتا ہے اور حکومت ایک قسم کی امانت ہے جو قوم کی طرف سے کسی خاص شخص یا جماعت کے سپرد کی جاتی ہے۔ روسو ایسے نظام کو معاہدۂ اجتماعی کی خلاف ورزی سمجھتا ہے جس میں قوم کی فرماں روائی بلا واسطہ نہ ہو' اور حکومت کا حق' جس میں لوک نے قانون سازی کو بھی شامل کیا ہے' قوم کی رضامندی یا خواہش سے بھی کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔

روسو کے اصول کے مطابق قوم حاکم مقرر کرتی ہے، اور تمام وہ اصول اور قاعدے تجویز کرتی ہے جن پر حاکموں کو عمل کرنا چاہیئے۔ جس طرح فرماں روا جزوی مسائل پر رائے نہیں دے سکتا، اسی طرح حاکم کی قانون نہیں بنا سکتے ان کا کام صرف قانون پر عمل کرنا اور مخصوص مسائل میں ان کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ روسو اس تقسیم عمل کو بھی رد کر دیتا ہے جس کے لحاظ سے حکومت کے تین وظائف ہوتے ہیں، مقننہ، عدالت اور عاملہ مون تس کیو نے قومی آزادی کو اس پر منحصر کیا تھا کہ مقننہ، عدالت اور عاملہ کے اقتدار میں توازن قائم رہے لیکن روسو اس سے بھی مطمئن نہیں۔ وہ حاکموں کی طرف سے بہت بدظن ہے اور اس کے نزدیک قوم کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ ان سے باز پرس کرتی رہے اور ان کے دل میں ذاتی اغراض کو فرائض کے احساس پر غالب نہ آنے دے۔ اس سلسلے میں وہ رومی دستور کے چند اداروں پر بحث کرتا ہے جن کا مقصد حاکموں کو قابو میں رکھنا تھا، اور اس کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کو ایسے ہی ادارے قائم کرنا چاہئیں۔ نمائندوں کے ذریعے سے آزادی کی حفاظت کرنے کا بھی روسو قائل نہیں۔ اسے یقین ہے کہ اگر طریقہ بہت ناقص نہ ہوتا تو یونان اور روما کے مدبر اسے ضرور کام میں لاتے۔ نمائندگی کے رواج کو وہ نظام جاگیری کا ایک ترکہ سمجھتا ہے، اور اس وجہ سے اس کی نظروں میں اس رواج کی وقعت اور بھی گھٹ جاتی ہے، یہاں تک کہ انگلستان کا دستور اور نظام نمائندگی بھی اسے پسند نہیں۔ اس کی رائے میں انگریز صرف اس تھوڑی سی مدت کے لئے صحیح معنوں میں آزاد ہوتے ہیں جب وہ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں،" اور اپنی آزادی کے لمحوں کو وہ جس طرح استعمال کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسی قابل ہیں کہ ان کی آزادی چھین لی جائے۔ لیکن روسو دراصل اس غلط فہمی میں تھا کہ نمائندے محض جمہور کی کاہلی اور آرام طلبی کی وجہ سے منتخب کئے جاتے ہیں، اور اسی بنا پر اس کی یہ رائے قائم ہوئی کہ "جس وقت کوئی قوم نمائندے مقرر کرتی ہے وہ آزاد نہیں رہتی، بلکہ یہ کہنا چاہیئے فنا ہو جاتی ہے۔" واقعات کی شہادت اس کے بالکل خلاف ہے۔ دنیا میں شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ نمائندے منتخب کرنے کی رسم کاہلی یا آرام طلبی کے سبب سے اختیار کی گئی ہو۔ ہر قانون کے متعلق پوری قوم کی رائے لینا عملاً ناممکن ہے، اور پھر ہر شخص ہر معاملے میں رائے دینے کا اہل بھی نہیں ہوتا اس لئے قوم میں سے ایسے لوگ جو معتبر، ہوشیار اور سمجھدار ہوں اور جن کے خیالات سے قوم کی اکثریت کو اتفاق ہو

نمائندگی کے لئے منتخب کرلئے جاتے ہیں۔ خواہ نمائندے جزوی امور میں کوئی خاص رائے دینے کے پابند کئے جائیں یا نہ کئے جائیں، جمہور کی کثرت تعداد ایک ایسی دشواری ہے جو ان کی بلا واسطہ فرماں روائی کو ناممکن کردیتی ہے، اور نمائندوں کے ذریعہ سے رائے ظاہر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اور اگر قوم میں ذرا بھی سیاسی حس اور امور عامہ سے دلچسپی ہے تو نمائندوں کا توسط اختیار کرنے سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہو سکتا روسو نے یہ فرض کرکے کہ جس طرح قوم فرماں روائی سے دست بردار نہیں ہو سکتی ویسے ہی وہ اسے نمائندوں کے ذریعے سے عمل میں نہیں لا سکتی' نمائندگی کے رواج کو اپنے نزدیک اصولاً غلط ثابت کردیا ہے، لیکن اگر قوم اپنے معاملات کی طرف سے بے پروا نہ ہو تو نمائندوں کے دغا دینے کا کوئی اندیشہ نہیں، اور وہ اس پر مجبور ہوں گے کہ رائے عامہ اور ارادۂ عامہ کا اظہار کریں۔ زیادہ خطرہ ان ریاستوں میں ہوتا ہے جہاں ایتھنز کی جمہوریت کی طرح عوام خود حکومت کرتے ہیں، اور وہ لوگ جن کے حوصلے قومی نمائندے بننے سے پورے ہو جاتے عوام کو بےجا اور بےجا طریقوں پر اپنے اثر میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ روسو نے اگر ذرا غور کیا ہوتا تو نمائندگی کے رواج کی مصلحت اس کی سمجھ میں آجاتی، کیونکہ انگلستان میں بھی قوم کے بہت سے ایسے نمائندے تھے جو اسے فائدہ پہنچا رہے تھے اور جن کی جدوجہد کا محرک وہی ارادۂ عامہ تھا جس کی حکمرانی روسو کا نصب العین تھی۔ لیکن روسو صرف اپنے زمانے کی تہذیب سے بیزار نہیں تھا بلکہ تمام سیاسی نظام سے بھی، اور قدیم رومی اور یونانی مثالیں ایسی دل فریب تھیں کہ اپنے زمانے کی دشواریوں کو حل کرنے کے لئے روسو نے ان کی نقل کرنے کے سوا اور کوئی تجویز پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ایک اعلیٰ سیاسی معیار، سادی زندگی، اخلاقی فضائل کی سچی قدر، اس کے ساتھ چھوٹی ریاستیں جن میں شہری خود فرماں روائی کے فرائض انجام دے سکیں اور حاکموں پر نگرانی کرسکیں، یہ اس کے نزدیک سیاسی فلاح کی صحیح تدبیریں تھیں۔

فرد اور معاشرے کا ربط قائم رکھنے کے لئے مذہب بھی بہت ضروری ہوتا ہے، اور روسو نے اسے نظر انداز نہیں کیا۔ وہ رومی کلیسا کے نظام اور مذہب کی اس شکل سے جو عیسائیت نے یورپ میں اختیار کی تھی بہت نفرت کرتا تھا، اور اس وجہ سے اس نے مذہب کے مسئلے پر بالکل نئے نقطہ نظر سے غور کیا اور اس کے متعلق ایک بالکل نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ قدیم زمانے کے مذہب معاشرے میں ربط تو پیدا کرتے تھے،

مگر ان میں تنگ نظری بہت تھی، غیروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ان کی تعلیم میں شامل نہیں تھا اور وہ خدا کی سچی پرستش کو مہمل رسموں کے پردے میں چھپا کر لوگوں کو اوہام پرست بنا دیتے تھے۔ قدیم مذہبوں کی جگہ دین عیسوی نے لی تو پرانی خرابیاں سب باقی رہیں اور بہت سی نئی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ عیسائیت نے ایک طرف تو اس کی تعلیم دی کہ دین اور دنیا، سیاسی اصول اور مذہبی عقیدے جداگانہ چیزیں ہیں، جس سے لوگوں کے دلوں میں سیاسی فرائض کی اہمیت بہت گھٹ گئی، اور دوسری طرف ریاست کے مقابل ایک کلیسائی نظام قائم کیا جو قوت اور اقتدار میں یورپ کی تمام ریاستوں سے بڑھ کر تھا۔ روسو فطرتاً کسی خاص مذہب کی پیروی سے معذور تھا، اس نے خود بجبر اپنے اصلی عقیدے کو بدلے ہوئے دو بار تبدیل مذہب کیا، اور جس روحانی تسلی کی اسے تلاش تھی وہ کسی مذہب میں نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنی تسکین قلب کے لئے ایک نیا فلسفہ حیات بنایا تھا، جسے اس کے جوش عقیدت نے ایک مذہب کی شکل دیدی تھی، اور اسی کی اس نے اپنے سیاسی فلسفے میں ترجمانی کی ہے۔ مذہب کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک ذاتی دوسرا معاشرتی۔ ذاتی مذہب کے عقائد بشرطیکہ وہ انسان کو ایک ناقص شہری نہ بنا دیں، فرماں روا کے دائرہ اثر سے باہر ہیں، اور ریاست ان میں دخل دینے کی مجاز نہیں، کیونکہ معاہدہ اجتماعی فرماں روا کو جو اختیارات دیتا ہے وہ مفاد عامہ کے معاملات تک محدود ہیں۔ لیکن اسی ذاتی مذہب کے ساتھ ایک سیاسی یا معاشرتی مذہب بھی ضروری ہے، جس کے عقائد طے کرنا فرماں روا کا فرض ہے۔ یہ عقائد دراصل بالکل مذہبی عقیدوں کی طرح نہ ہونے چاہئیں، بلکہ "نیک چال چلن کے عقائد"، جن کے بغیر اچھا یا فرماں بردار شہری ہونا ناممکن ہے۔ ریاست کو اس کا اختیار نہ ہونا چاہئے کہ ہر شخص کو اس سیاسی مذہب کے تسلیم کرنے پر مجبور کرے لیکن وہ انکار کرنے والوں کو ملک بدر کر سکتی ہے، اس بنا پر نہیں کہ وہ مشرک یا منافق ہیں، بلکہ اس بنا پر کہ وہ خلوص کے ساتھ قانون اور انصاف کے قائل نہیں ہو سکتے اور ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ ضرورت کے وقت ریاست پر جان و مال نثار کر سکیں گے۔ سیاسی مذہب کے عقیدے بہت سادے اور سلجھے ہوئے ہونا چاہئیں، اور تعداد میں بہت کم۔ خدا کی ذات، اس کی قدرت، انصاف اور علم غیب پر ایمان لانا، موت کے بعد زندگی، نیکی اور بدی کا اجر، اور معاہدۂ اجتماعی کے تقدس کا معتقد ہونا

کافی ہے۔ نوابی میں صرف نا رواداری ہونا چاہیئے کیونکہ یہ بڑی فتنہ انگیز چیز ہے۔

روسو نے اپنے نزدیک مذہب کا مسئلہ اس طرح کر دیا ہے کہ دین اور دنیا دونوں کے تقاضے پورے ہوجائیں۔ لیکن سیاسی مذہب، خواہ وہ کتنا ہی سادہ اور سلجھا ہوا ہو، یقیناً ذہنی تشدد کا ایک بہانہ ہوجائے گا، اور اس لئے روسو کے سیاسی مذہب اور کلیسا کے اس نظام میں جس سے وہ نالاں تھا صرف نام کا فرق رہ جاتا ہے۔ پھر بھی روسو کا کلیسا کو نظام معاشرت سے خارج کر دینا مصلحت وقت کے لحاظ سے بہت مناسب تھا۔ مذہبی رہنماؤں اور اداروں سے لوگ عام طور پر شاکی تھے، یورپ کی اکثر ریاستوں میں کلیسا کی بیجا طرفداری کی جاتی تھی اور اس کے علاوہ کلیسا ذہنی آزادی اور ترقی میں حائل ہو۔ لہٰذا سیاسی مذہب کی تجویز تو کہیں پسند نہیں کی گئی اور اسے عمل میں لانے کی صرف ایک مرتبہ فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں کوشش ہوئی، لیکن روسو کے اس عقیدے کا بہت چرچا ہوا کہ مذہب ایک ذاتی چیز ہے اور اس کا انحصار ایسے جذبات پر ہے جو اداروں اور رسموں سے بے نیاز ہیں۔ "معاہدۂ اجتماعی" میں روسو نے اس عقیدے کو تفصیل سے نہیں بیان کیا ہے اور اس کا اثر بھی سیاسیات سے زیادہ یورپ کے عام فلسفۂ حیات اور ادب پر ہوا۔ پھر بھی ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ سیاسی ذہنیت میں ہیجان اور تعمیری حوصلے پیدا کرنے کے علاوہ روسو نے مذہب کو لوگوں کے تصور میں ایک نیا رنگ دیدیا، کیونکہ رومانیت کی تحریک اسی کی تصانیف کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔

روسو کے سیاسی فلسفے پر نکتہ چینی کرنے کی بہت گنجائش ہے، اور اگر کوئی چاہے تو اسے بالکل مہمل اور اس کے نظریوں کو ایک دوسرے کی ضد ثابت کر سکتا ہے۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روسو کا اتنا گہرا اثر کیوں پڑا۔ گر ہم فرانسیسی انقلاب کو محض مجنونانہ فعل قرار دیں تب بھی یہ ایک معما رہ جاتا ہے کہ کانٹ (۱) جیسا فلسفی، گوئٹے (۲) جیسا شاعر، فشٹے (۳) جیسا قوم پرست، روسو کا معتقد کیونکر ہوا۔

---

(۱) Kant-

(۲) Goethe-

(۳) Fichte-

روسو، اصل فطرت کا ایک مجوبہ تھا۔ ہمیں اس کے سیاسی فلسفے پر تنقید کرتے وقت یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ اس نے سیاسی مسائل پر بحث ایک عالم کی حیثیت سے نہیں کی بلکہ اس شخص کے نقطۂ نظر سے جو آوارہ گردی کرتا رہا تھا، دن رات خیالی باتوں میں محو رہا تھا، جو ہم جنسوں کی قدردانی سے مایوس ہو گیا تھا اور مناظر فطرت سے محبت کر کے دل کا شوق پورا کرتا رہا تھا۔ غریبوں کی مصیبتیں دیکھ کر اسے غربت سے لگاؤ پیدا ہو گیا، مبلغوں کے ساتھ رہ کر اسے ولطادے کے مذہب اور مذہبی اختلافات کی حقیقت معلوم ہو گئی اور اپنا بچپن اور تعلیمی زمانہ یاد کر کے اس نے تعلیم کا نیا اصول ایجاد کیا، جس میں بچوں کا زیادہ احترام مدنظر ہے اور ان کی طبیعت کی افتاد کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ سیاسیات کی علمی اور فلسفیانہ باریکیوں کی طرف سے اس نے بہت بے توجہی برتی، تاریخ کو اس نے نظرانداز کیا، اور اپنے عہد کی زندگی کا مطالعہ بالکل فضول سمجھا، اس لئے کہ یہ سب باتیں اس کے اصل مقصد سے دور تھیں۔ وہ اصلاح نہیں چاہتا تھا، اس کی آرزو تھی ایک ایسا شدید انقلاب پیدا کرنا جو لوگوں کی طبیعتوں کو بدل دے، اور انھیں ان مصیبتوں سے نجات دلائے جن میں انھوں نے اپنے آپ کو مبتلا کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں روسو کے متعلق صرف ایک سیاسی فلسفی کی حیثیت سے بحث کرنا، جیسا اس کے انگریزی نقادوں نے کیا ہے، صحیح نہیں۔ سیاسی حوصلے اور نصب العین بحض علم کی بنیاد پر نہیں قائم کئے جا سکتے۔ اگر روسو کی علمی غلطیوں نے یورپ کی سیاسی زندگی میں نئی امنگیں پیدا کر دیں، اور سیاسی جدوجہد میں نئی جان ڈال دی تو وہ نہایت مفید غلطیاں تھیں۔

روسو کا اثر لوگوں کے جذبات پر سب سے زیادہ فرانس میں ہوا، اس کے سب سے قابل قدر علمی پیرو اور اس کے نظریوں کے مفسر جرمنی میں کانٹ، فشٹے اور ہیگل (۱) تھے، اور انگلستان میں بہت دن بعد گرین (۲) بریڈلے (۳) اور بوزین کوئٹ (۴) ہوئے۔ فرانس میں جس طرح سے

---

(۱) Kant, Fichte, Hegel (۲) Green (۳) Bradley (۴) Bosanquent

روسو کی تعلیم کا چرچا ہوا اور اس کا جو غلط استعمال کیا گیا وہ اس کے حق میں بہت مضر تھا' اور اس نے متین اور محتاط لوگوں کو روسو کی طرف سے بہت بدظن کر دیا۔ روسو کی تعلیم گلی کوچوں کے فتنہ انگیز مقرروں اور مدبروں کی خاص چیز سمجھی جانے لگی' اور اس پر ان خوں ریزیوں کا بھی الزام لگایا جانے لگا جن کی بدولت فرانسیسی انقلاب کو' جو بڑی امیدوں کے ساتھ شروع ہوا تھا اور جس سے یورپ کے تمام روشن خیال لوگوں کو بہت ہمدردی تھی' بے لگام اور بے باک قومی فرماں روائی کی ایک عبرت ناک مثال بن گیا۔ انقلاب کے بعد نپولین کی جنگوں نے یورپ کی اکثر قوموں میں فرانس کی طرف سے ایک دلی نفرت پیدا کر دی' جس طرح پہلے انقلابیوں کی زیادتیوں اور خصوصاً لوئی سیزدہم کے قتل نے بادشاہوں اور شرفا کو اس کا دشمن بنا دیا تھا۔ روسو کی اصلی تعلیم سے نہ انقلاب کی خوں ریزیاں جائز ثابت کی جا سکتی تھیں نہ نپولین کی وہ لڑائیاں جنھوں نے بہت سی قوموں کی آزادی چھین لی اور سب کو مصیبت میں ڈال دیا۔ روسو خود قتل خون' بلکہ ہر قسم کے تشدد کے خلاف تھا' اور آزادی کو سب سے بڑی نعمت سمجھتا تھا۔ اس وجہ سے عین انقلاب کے زمانے میں بھی اسے فرانس کے باہر کانٹ اور فشتے جیسے قدردان ملے' اور پھر جب انقلاب کا دور ختم ہو گیا اور قدامت پسند مدبروں نے صرف فرانس میں بادشاہی نہیں قائم کر دی بلکہ ان کے خیالات کی جگہ جو انقلاب نے رائج کر دئے تھے پرانا شاہ پرستی اور حکومت پرستی کا فلسفہ جبراً تسلیم کرانا چاہا تو آزادی اور قومی فرماں روائی کے بہت سے حامی پیدا ہو گئے اور سیاسی اصلاح کی ایک عام تحریک شروع ہو گئی جو زیادہ سنجیدہ اور محتاط لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔

رفتارِ عالم

برطانیہ کیساتھ مسولینی کا سمجھوتہ | شروع جنوری میں برطانیہ اور اٹلی کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا اُس کی بنا پر دونوں قوموں نے طے کیا کہ بحرِ روم کے علاقہ میں معاملات سیاسی کو جوں کا توں رکھا جائے۔ اس کا مطلب بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسولینی اسپین کے باغیوں کی امداد بند کردے گا۔ لیکن اٹلی نے اس سمجھوتے کی تاویل اس سے بالکل مختلف کی ہے۔ اطالیہ کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت برطانیہ اسپین میں ردی اثر نہ بڑھنے دیگی۔ معلوم نہیں حقیقت کیا ہے۔ لیکن قرائن سے، اطالیہ کی تاویل صحیح ثابت ہورہی ہے اس لئے کہ برطانوی تاویل اگر صحیح سمجھ لیجائے تو اطالیہ پر لازم ہے کہ اسپین کے وہ علاقے جو اسی وقت اس کی فوج کے قبضے میں ہیں خالی کردئے جائیں۔ لیکن اب تک ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ جزائر بیارک میں اطالوی فوج بدستور موجود ہے۔ غریب ہسپانیہ کو تو اس سمجھوتے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ اگر کچھ حاصل ہوا ہے تو انگریزوں کو جنھیں حبش اور اطالیہ کی جنگ کے زمانہ میں اپنا تمام بحری بیڑہ مجبوراً بحرِ روم میں اکٹھا کرنا پڑا تھا اور اب اس سمجھوتے کے بعد وہ پھر مسولینی کی طرف سے مطمئن ہوکر اپنے بیڑے کی از سرِ نو تقسیم کررہے ہیں۔

اسپین میں جرمنی اثر | موجودہ صورت حال کا دوسرا پہلو بھی نظر انداز کرنے کے لایق نہیں باغیوں کی امداد کے لئے جرمنی سے سامانِ جنگ اور رضاکاروں کی آمد برابر جاری ہے کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ برطانیہ کے ساتھ اٹلی کا یہ معاہدہ جرمنی کے لئے مفید ثابت ہوگا ——— اٹلی کو حبش کے مفتوح علاقے میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے اُسے پوری توجہ اور ایک بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے اسی لئے خیال ہے کہ اٹلی کوئی عملی امداد باغیوں کو نہ دے گا بلکہ جرمنی کا وہ خواب پورا ہوگا جو فرانس کے لئے خطرناک ہے۔ جرمن اسپین کو فتح کرنا تو نہیں چاہتا البتہ یہ خواہش ضرور ہے کہ اسپین میں ایسی حکومت کا قیام

ہے جو ضرورت کے وقت جرمنی کے کام آسکے۔ جرمنی کی خواہش ہے کہ فرانس سے جنگ کی صورت میں اسپین کی افواج فرانس کے جنوب و مغرب (پیرے نیز) سے دھاوا کریں اور شمال و مشرق میں جرمنی کے خلاف فرانس کی مدافعت کو کمزور کر دیں اس کے علاوہ اسپین کے بندرگاہ۔ اسپینی مراکش اور جزائر بلیارک سے بھی پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اسپین کے بندرگاہوں پر اس وقت بھی جرمنی کا اثر موجود ہے۔ بغاوت سے پہلے تجارت کا مال اسپین کے جہاز ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے اب اس بہانے کی آڑ میں اسپین کے جہازوں کو دشمن کا خطرہ ہے یہ کام جرمن جہازوں کو مل گیا ہے اور نہ صرف رسل و رسائل کا کام جرمن کمپنیوں کو مل رہا ہے بلکہ درآمد و برآمد کا کام بھی وہی انجام دے رہی ہیں۔ ہیسا ایک جرمن کمپنی ہے جو اسپین میں بغاوت سے پہلے Valencia اور Sevilla کے درمیان حرف کے فرائض انجام دیتی تھی اب اس کا کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ یورپ کے کسی دوسرے ملک کی جہاز راں کمپنیوں کو دخل نہیں رہا۔ خریدار کو بس یہ کہہ دینے کی ضرورت کہ فلاں چیز درکار ہے۔ ہیسا جرمن بندرگاہوں سے بلا توقف مال لاکر حاضر کر دیگی۔ فوجی قوت اس کی پشت پر ہے۔ اُسے یہ بھی دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ دام نقد ملیں گے یا مال کے عوض مال دیا جائے گا۔
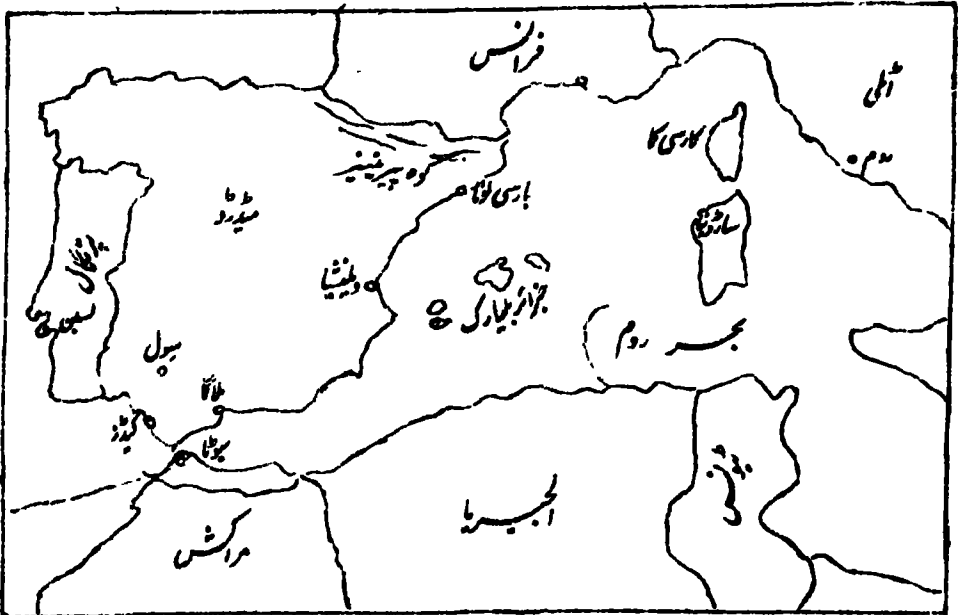
جرمنی کا معاشی اثر اسپین میں جس تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے اس کی ایک اور مثال سنئے۔ گذشتہ ایام میں کوئی سوا لاکھ لوہے کے پیپے زیتون کے تیل کے لئے جرمن کارخانوں کو مہیا کرنے کا آرڈر ملا تھا جس میں نصف کے قریب وہاں پہنچائے بھی جاچکے ہیں۔ پہلے یہ پیپے ہالینڈ یا فرانس سے آتے تھے اور نسبتاً کم قیمت میں مل جاتے تھے اب جرمنی سے لئے گئے اور زیادہ دام دے کر لئے گئے۔ اسی طرح کاغذ کے کاروبار کا حال ہے۔ یہ بھی اسپین کو سویڈن یا فن لینڈ سے براہ راست نہیں پہنچتا بلکہ ہمبا کے ذریعہ ملتا ہے اور ظاہر ہے کہ قیمت میں کسی قدر اضافے کے ساتھ ہی ملتا ہوگا۔

دوسری جانب وہ چیزیں جن کی جرمنی کو ضرورت ہے اور اسپین سے مل سکتی ہیں آسانی سے جرمنی کو مہیا ہو رہی ہیں۔ اون اور کارک بہت بڑی مقدار میں جرمن ایجنٹ خرید رہے ہیں اور مراکش میں اسپین کی کانوں سے لوہا اس سے بہت زیادہ مقدار میں نکالا جارہا ہے جو پہلے نکالا جاتا تھا۔ کوئی تیس ہزار ٹن زیتون کا تیل بھی اسپین سے خریدا گیا ہے جس میں جرمنی کو بہت نفع کی توقع ہے۔ یہ سب کاروبار اسپین کو جرمنی کا پابند کر رہا ہے اور ہٹلر بھی مجلس اقوام کو مجہول محض سمجھ کر کھلم کھلا باغیوں کی امداد کر رہا ہے تاکہ فتح کی صورت میں وہ اپنی اس رفاقت کی پوری قیمت وصول کر سکے۔

۳۷ء کا بین الاقوامی زاویہ نگاہ | ۳۶ء کے بارہ میں نجومیوں نے طرح طرح کی تباہیوں اور ہولناکیوں کی پیشین گوئیاں کی تھیں لیکن غنیمت ہے کہ وہ سال ختم ہو گیا اب سوال یہ ہے کہ آیا ۳۷ء میں امن و امان کا دور دورہ ہوگا یا بے چینی اضطراب اور بد امنی پھیلے گی۔ اس میں شک نہیں کہ بین الاقوامی سیاست کی متعدد گتھیاں ایسی ہیں جن کا سلجھنا باقی ہے۔ مثلاً ہسپانیہ کا مسئلہ۔ چین و جاپان کی کشمکش۔ معاہدہ لوکارنو پر دستخط کرنے والی حکومتوں کا سوال۔ تجارتی توازن کا برقرار رکھنا۔ عام اقتصادی حالت کی درستگی وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو بڑے خطرناک ہیں۔ تاہم جہاں تک عسکری تیاریوں کا تعلق ہے مختلف حکومتیں اپنے اپنے تناسب کے اعتبار سے رفتہ رفتہ باہم توازن قائم رکھنے کی فکر میں ہیں اور معاشی حالت کی اصلاح میں کوشاں ہیں۔ لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سال نو امن و امان کا پیام لایا ہے؟ ممکن تو یہ بھی تھا لیکن

جبتک زیادہ اہم حکومتیں باہم دگر رعایات دینے کے لئے تیار نہ ہوں کامل امن وسکون کی فضا پیدا نہیں ہوسکتی ——— اور ان بڑی سلطنتوں میں سے امن کا انحصار بالخصوص جرمن پر ہے۔

کسی سلطنت کی بیرونی سرگرمیوں کی حد کلی یا جزوی طور پر مندرجہ ذیل تین امور پر مبنی ہے:۔

(۱) اس کی فوجی تیاریاں مکمل ہیں ؟

(۲) آیا اندرونی خلفشار اسے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کے علاج کے لئے بیرونی ممالک کی طرف رُخ کرے۔

(۳) آیا اہم بین الاقوامی مسائل اسی طور پر سامنے آتے ہیں کہ اُن کا فوری فیصلہ ضروری ہو ؟

اگر حق بات پوچھیئے تو بڑی سلطنتوں میں صرف جرمنی ہی ایک ایسی طاقت ہے جہاں ان تینوں صورتوں کو بڑے غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جرمنی کے بحری بیڑے کو اگر مستثنےٰ کر دیا جائے ——— کیونکہ وہ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ معاہدہ کے مطابق معین حد سے آگے نہیں بڑھا ہے ——— تو اس کی فوجی تیاریاں اس حد تک پہنچ چکی ہیں جو کسی دوسرے ملک کو میسر نہیں۔ اس کی برّی فوج۔ فضائی بیڑہ۔ کیمیاوی ساز وسامان آلات جنگ ذرائع نقل وحمل غرض کہ جملہ تیاریاں زمانہ جنگ کی ضروریات کے عین مطابق ہیں۔ ان جنگی تیاریوں میں جرمن قوم کو بہت زیادہ اخراجات برداشت کرنا پڑے یہاں تک کہ باشندوں کے لئے ضروریات معیشت خریدنا مشکل ہوگیا۔ جرمنی کی ان آئے دن کی مشکلات نے اُسے دوسرے ممالک کی طرف حریصانہ نگاہ ڈالنے پر مجبور کیا۔ ہسپانیہ میں عدم مداخلت کا مسئلہ۔ چین اور جاپان کی چپقلش۔ معاہدہ وکارنو۔ عالمگیر معاشی استحکام۔ یہ چاروں اہم مسائل بیک وقت جرمنی کے سامنے آگئے ہیں جس سے وہ شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہا ہے کہ ان کو حل کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی فاعلی اقدام لازم ہے۔ اس وقت کسی دوسری سلطنت کو اس ضرورت کا سامنا نہیں۔

ترازو جرمنی کے ہاتھ میں ہے اور ہٹلر جس جانب چاہے اُسے جھکا سکتا ہے۔

چین کی بغاوت | چانگ ہو لیانگ اور اس کے ہمراہیوں نے چین کی مرکزی حکومت کے خلاف

علم بغاوت بلند کر کے نہ صرف چینیوں کے اتحاد کو تباہ کر دیا بلکہ قومی طاقت کو بھی کمزور کیا اور ہر قسم کی ترقی کو رک دیا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ بعض نوجوان اس باغی جنرل کی تائید و حمایت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز ان نوجوانوں کی نادانی اور بے خبری کی دلیل ہے۔ بہر کیف ہمیں اس طبقے سے سروست کوئی سروکار نہیں جو اپنے ذاتی اغراض کی خاطر بدامنی کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ افسوس ان نوجوانوں کی حالت پر ہوتا ہے جو یہ خیال رکھتے ہیں کہ مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہے کہ دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس لئے اس کی جگہ کوئی مضبوط اور طاقت ور حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے نوجوانوں کے ارادے نیک ہیں اور ان کے دلوں میں حُبّ وطن کے جذبات بھی موجزن ہیں لیکن وہ اپنے جوش و خروش اور ناپختگی کی بنا پر حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کیا انھیں معلوم نہیں کہ مرکزی حکومت گذشتہ چار پانچ برس سے جنگ سے پہلو تہی کر رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اندرونی ملکی اتحاد کے لئے کوشاں ہے۔ اُس کی یہ آرزو ہے کہ آیندہ اگر ہم کو دشمن کے مقابلہ کے لئے میدان جنگ میں جانا پڑے تو ہم سب متحدہ طاقت اور مکمل نظام کے ماتحت اقدام کریں۔ ممکن ہے جلد باز اور جوشیلے نوجوان اس کا احساس نہ رکھتے ہوں۔ لیکن جاپان نے اسے خوب سمجھ لیا ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے تاناڈا میمورنڈم ملاحظہ ہو جس میں صاف صاف اعلان ہے کہ " چانگ کیشک اور اس کی جماعت ایک طرف اور جاپان کی شہنشاہیت دوسری طرف۔ تو کیا جاپان کی شہنشاہیت فریق ثانی کے سامنے جھک جائے گی یا اُسے پورے طور پر کچل کر رکھ دے گی؟"

نوجوانوں کو ان الفاظ پر غور کرنا چاہیئے۔ جاپان نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا ہے کہ چانگ کیشک اور اس کی جماعت ایک زبردست اور طاقت ور حکومت ہے اور اس لئے جاپان نے اپنی توجہات اُس کی تباہی پر مرکوز کر رکھی ہیں۔ کوئی ایسی حرکت جو چانگ کیشک کی حکومت کے لئے ضرر رساں ثابت ہو چین کی متحدہ طاقت کے لئے تباہ کن اور جاپان کے جارحانہ اقدام میں مدد معاون ہوگی۔

چانگ کیشک کی فوجیں جنگ کے لئے سویان کی طرف بڑھ چکی تھیں اور متحدہ مرکزی حکومت کی طرف سے دشمن کے مقابلہ میں یہ سب سے پہلا اقدام تھا جس کے تین مقاصد تھے۔ اول یہ کہ دشمن کو شمالی اور
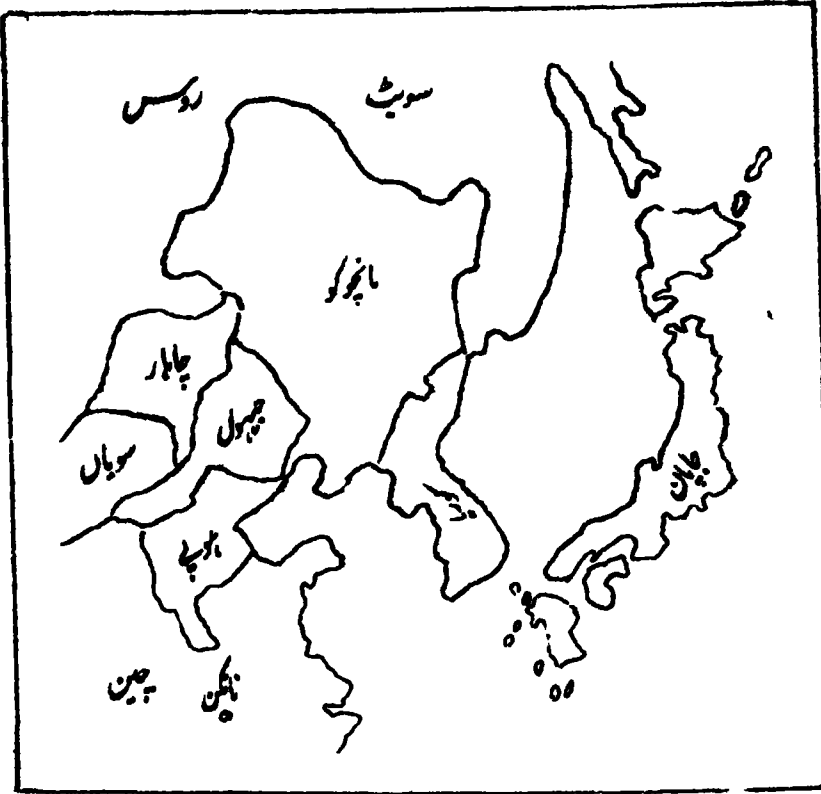
مشرقی سویان سے نکال باہر کیا جائے ۔ دوم یہ کہ شمالی اور مشرقی چاہار کا علاقہ واپس لیا جائے ۔ سوم مشرقی ہوپیائی پر قبضہ جمایا جائے ۔ لیکن عین اس دن جبکہ نائب وزیر جنگ چنگ کو فوجوں کی کمان کا حکم مل چکا تھا اور ابھی پہلا مقصد بھی حاصل نہ ہونے پایا تھا کہ یکایک چانگ ہولیانگ اور اس کی جماعت نے غداری کی اور چانگ کیشک کو گرفتار کر لیا —— وہ چانگ کیشک جس کی ذات حکومت لو تمام اہل چین کی حفاظت کی ضامن ہے ۔ اس بغاوت کے متعلق یہ کہنا کہ یہ دشمن کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی غرض سے کی گئی تھی عقل و خرد کی توہین ہے ۔

(اقتباسات)

تفہیمات الالٰہیہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب جو عربی و فارسی میں ملی جلی ہے۔ مجلس علمی ڈابھیل ضلع سورت نے دو جلدوں میں مع فہرست کے شائع کی ہے اور میرے پاس اس غرض سے بھیجی ہے کہ اس پر تبصرہ لکھوں اس لئے مجھے اس حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

یہ کتاب آج سے ۲۵، ۲۶ سال پہلے میں نے مطالعہ کی تھی۔ اس وقت اس کی طرف سے میری روح میں سخت بغاوت پیدا ہوئی تھی اور جس طرح شیخ اکبر علامہ محی الدین ابن عربیؒ کی فتوحات اور فصوص کے مطالعہ کے بعد ان کو بند کرکے میں نے قطعاً اُن سے صرف نظر کرلیا تھا۔ وہی معاملہ اس کے ساتھ بھی کیا، مگر باوجود اس کے ان دونوں بزرگوں کی عقیدت میرے دل میں قائم رہی اور میں اُن کی علمیت اور ولایت سے منحرف نہیں ہوا۔ تاآنکہ ایک مدت کے بعد مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ یہ حضرات اہل حال ہیں۔ اس کے بعد میری اجنبیت جاتی رہی اور میں نے دوبارہ اُن کی تصانیف کو جس قدر پڑھا اسی قدر محظوظ ہوا۔

لیکن تاہم میری یہ رائے حتمی تھی اور اب بھی ہے کہ یہ کتابیں عوام کے لئے جن میں وہ علماء فقہا بھی شامل ہیں جو اہل ظاہر ہیں اور لفظوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہرگز مفید نہیں بلکہ تشویش خاطر کا باعث ہیں۔ اس لئے ان کی اشاعت اسی حلقے میں محدود رہنی چاہئے جو ان کو سمجھتے اور ان سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

---

[1] اس کتاب میں جا بجا شیخ اکبر کو ابن العربی الف لام کے ساتھ لکھا گیا ہے اور تصحیح نہیں کی گئی۔ حالانکہ اہل علم میں یہ متعین ہے کہ ابن العربی شیخ ابوبکر ہیں جو فقہاء شافعیہ میں سے ہیں اور جن کی کتاب احکام القرآن علماء میں بہت مقبول ہے اور ابن عربی بلا الف لام کے شیخ اکبر علامہ محی الدین ہیں۔

شاہ صاحب پر جو فیوض اور عطیات الٰہی ہوئے منجملہ اُن کے وہ شرح صدر بھی ہے
جس کی بدولت اسرار و رموز کے بیان پر اُن کو ایسی قدرت بخشی گئی جو آج تک کسی ولی کو
نصیب نہیں ہوئی ، اس کتاب میں انھوں نے سینکڑوں حقائق شرعیہ صوفیانہ ، متکلمانہ ، اور فلسفیانہ
زبان میں بیان کئے ہیں جن کو سمجھنے کے لئے ان علوم کے ساتھ قرآنی بصیرت کی بھی ضرورت ہے
جو لوگ صرف تفسیروں کی عینک سے قرآن کو دیکھنے کے عادی ہیں وہ ان حقائق تک نہیں پہنچیں
گے ، اور یا تو ان سے بیزاری کا اظہار کردیں گے ، یا اضطراب کے گرداب میں پھنس کر حیرت میں
پڑ جائیں گے ۔ کیونکہ شاہ صاحب کے بیانات معنوی مشاہدات پر مبنی ہیں اور دلائل و براہین سے
جن سے کہ اہل ظاہر قانع ہوتے ہیں بیشتر عاری ۔ دو ایک باتیں مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں ،

فنا انسانی معاد کے متعلق اہل ظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ ہر فرد مرنے کے بعد قیامت کے دن اٹھایا
جائے گا ۔ اور اپنے نامہ اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے گا اور ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا یا
دوزخ میں ، اس مدت کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا ۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "رحمٰن" کا اسم رحموت کی جہت سے جملہ فعلیات پر حائز ہے
اور ازل خالص سے اس کی امتیازی خصوصیت صرف اسی فعلیت سے قائم ہے ۔ ورنہ حقیقت ایک
ہی ہے جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے ۔

فادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن ایاماً تدعوا فلہ الاسماء الحسنیٰ

اسی " الرحمن " کی تجلیات کے فیضان سے " انسان اکبر " کا ظہور رہا ، یہ انسان اکبر
انسان اصغر کے ساتھ حقیقتاً متحد ہے ۔ ان میں باہم کلی اور جزئی کی تفریق کرنا منطقی عقل کا فساد
نظر ہے ۔ کیوں کہ ان دونوں کی ساخت ایک ہی ہے اور ایک ہی کلمہ سے ہے ۔ اسی انسان
اکبر پر جس میں اس کے اجزا (افراد) مضمحل اور محو ہوتے رہتے ہیں فساد طاری ہوگا[1] اور بالآخر

---

[1] غالباً آیت کریمہ وما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ سے اس فکر کا سراغ لگایا ہے

نہ صرف وہ بلکہ جملہ حیوانات و نباتات بھی فنا ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ نہ کوئی عنصر باقی رہے گا نہ کوئی فلک، اور عدم کی آندھیوں کے جھکڑ، عرش اور پانی پر چلنے لگیں گے۔ جس سے وجود کی دنیا سر تا سر ویران ہو جائے گی۔ اس کے بعد پھر الرحمٰن کی تجلیات کا آغاز ہوگا جن کی وجہ سے عالم ہستی کا نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اس قسم کے کتنے دور گذر چکے ہیں؟ ان کا کوئی حساب انسان کے تو کیا خود آسمانوں کے بھی حاشیہ خیال میں نہیں ہے بلکہ گذشتہ دور کی یاد بھی نئے دور میں باقی نہیں رکھی جاتی۔

عرش اہل ظاہر عرش کو اس طرح سمجھتے ہیں کہ اس کی نوعیت ایک تخت کی ہے جس پر اللہ مستوی ہے اور وہ وہاں سے عالم پر اپنے احکام جاری کرتا ہے۔ قرآن میں یہ بھی ہے کہ "کان عرشہ علی الماء" جس کی تشریح حدیث میں اس طرح کی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا فاصلہ ۷۱، ۷۲، یا ۷۳، سال کی راہ ہے اور آسمان سات ہیں، جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے، ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک کے فاصلے بھی اسی قدر ہیں، ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔ (ترمذی کتاب تفسیر باب سورۃ الحاقہ)

یعنی سات آسمان ہیں جن کے اوپر فلک محدود ہے جو پانی ہے۔ اس کے اوپر سات حاملین عرش جو پہاڑی بکروں سے تعبیر کئے گئے ہیں عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔

اور شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ وحدت کبریٰ اور وجود اقصیٰ کی پیہم تجلیات کا مآل کار ایک ایسی تجلی پر ہوا جو زبان شرع میں "الرحمٰن" کے نام سے موسوم ہوئی اس تجلی کے فیضان سے ایک ناسوتی موجود کا ظہور ہوا جو دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک عرش جس پر الرحمٰن مستوی ہے اور دوسرا پانی[1]

---

[1] غالباً مراد ہے آیۃ کریمہ "وجعلنا من الماء کل شیء حی" میں نے اپنی کتاب تعلیمات قرآن میں وہ آیتیں بھی نقل کی ہیں جنمیں عرش کے پانی پر اور پانی کے مبداء حیات ہونے پر غایت تخلیق کا انحصار ظاہر کیا گیا ہے۔

جو عالم امکان کا مبدأ ہے۔ جملہ کائنات کی صورتیں عرش میں ہیں اور جو اس سے خارج ہو وہ عدم محض ہے۔ اس طرح پر عرش مع اپنے مشمولات کے بمنزلۂ شخص واحد کے ہے، جس کے آنکھ بھی ہے اور وہ الرحمٰن ہے۔ اسی کو اصطلاح فلسفہ میں عقل فعّال کہتے ہیں۔ اور جس کے نفس ناطقہ بھی ہے جو عین اس کی ذات ہے اور جس کی جان بھی ہو جو اس کے تمام اعضاء یعنی افلاک و عناصر میں ساری ہے اور جس میں قلبی قوی بھی ہیں جن سے امور جزئیہ کا صدور ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے بیان کے مطابق عرش و ماء دونوں میں چار چیزیں مختلف ہیں، یہاں وہاں، آج اور کل، کون و فساد اور بالفعل و بالقوہ، ناسوتی عقل نے ان کے لئے مکان و زمان وصیوسنے و صورت کے نام تراشے ہیں[۱]۔ ان مثالوں سے میرا مدعا یہ ہے کہ شاہ صاحب کا بیان بلند اور لطیف سہی لیکن جمہور مسلمانوں کے لئے کس قدر بعید الفہم ہے۔

ظہور خودی راہ عرفان میں جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ عارف کے اوپر خود اس کے نفس کے مراتب کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں اپنے ان مراتب کو جابجا بیان فرمایا ہے میں ان کو نہایت اختصار کے ساتھ اپنے الفاظ میں لکھتا ہوں۔

(۱) اللہ نے مقام کریم اور مرتبہ عظیم سے مجھ کو سرفراز فرمایا جس پر بزرگوں کو بھی رشک ہوگا۔ لوگو میں تم میں اجنبی ہوں تم مجھ کو نہیں جانتے۔ میرے سر پر تاج ہو اور ہاتھ میں قلم۔ میرا قلب حلیم ہے اور زبان شیریں (صفحہ ۷۵، ج ۲)

(۲) دو گوہر گراں بہا بمن دادہ اند، یکے اتمام دورۂ کمال، دیگر وصایۂ آنکہ مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ ہمہ جوشش او میزد،

نفخۂ از ریاض قدسیہ مراسخت در بر گرفت ــــــ ہمہ روئے من می بینند وشیوہ من نمی نگرند

جہانیاں بمن آیند دستہ طلبند   انال سبب کہ منم این زمان مطاع جہاں

---

[۱] نہ صرف یہی بلکہ فلسفیوں کے مقولات عشرہ بھی اہل حقیقت کے نزدیک سراسر موہومات ہیں۔

کنوں وہی رسولم خسزانہ دار علوم بدست ماست کنون خیرو انتفاع جہان[۱]

(ص ۱۱۵ ج ۲)

(۳) مجھ سے کہا گیا کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو جنت میں بلا حساب داخل کر دئے جائیں گے[۲]

(ص ۱۱۹ ج ۲)

(۴) اللہ سبحانہ نے مجھے مجددیت کا خلعت پہنایا۔ کیوں کہ میرے اوپر حکمت کا دور ختم ہو گیا

(ص ۱۳۱، ج ۲

(۵) میں اللہ کی کس زبان سے حمد کروں اور کن لفظوں میں اس کی صفت بیان کروں جس نے مجھ کو سارے کمالات عطا کر دئے۔ (ص ۱۴۳، ج ۲)

(۶) مجھے صحابۂ کرام، اولیاء عظام اور علماء اعلام کے مقامات ملے، پھر وصایت، ارشاد اور مجددیت کے مناصب عطا ہوئے۔ (ص ۱۴۴، ج ۲)

(۷) چہ گوئی ودحق کسیکہ منسلخ است بسوئے وحدت کبریٰ ہر چہ ہست ولیست، و ہر چہ ہست تفصیل ولیست (ص ۱۹۳، ج ۲)

(۸) مجھے معلوم ہے کہ قبر میں کون سی تجلی ہو گی اور کون سی حساب کے دن، اور کون سی جنت میں یہ جملہ تجلیات میرے سامنے حاضر بلکہ میرے قلب میں موجود ہیں۔ میں افلاک، معادن، اشجار، بہائم، ملائکہ، جن، لوح، قلم، اسرافیل بلکہ ہر اس شئی کے کمال کا کامل احاطہ کئے ہوں جو وجود کے تحت میں ہے۔ (ص ۲۰۰، ج ۲)

(۹) اس نے مجھے اہل طریقت کا امام بنا دیا اور حقیقت قرب تک پہنچنے کے سارے رستے بجز میری پیروی کے بند کر دئے، اب اہل مغرب و مشرق سب میری رعایا ہیں۔ ور میں ان کا امام۔ خواہ جانیں یا نہ جانیں۔ (ص ۱۲۵، ج ۲

---

[۱] غالباً شاعری کا کمال شاہ صاحب کو نہیں عطا ہوا۔ کیونکہ کمالاتِ بزرگانہ میں اس کا شمار نہیں ہے

[۲] اس کا ماخذ یہ آیت ہو سکتی ہے۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا الآیۃ

(۱۰) امرار اور ملوک میری زیارت کو آئیں گے، علمار صلحار مجھ سے استفادہ کریں گے۔ میرے اوپر ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کردی جائیں گی۔ میرے اصحاب اور ذریت میں برکت ہوگی۔ میں اگر نہ ہوتا تو دنیا بھی نہ ہوتی۔ (ص ۳۰ ج ۱)

(۱۱) امید آنست کہ اگر خدا خواستہ بر دست وے من، زمانہ تازہ شود۔ (ص ۹، ج ۱)

(۱۲) میری پیروی دو جماعتیں کریں گی۔ ایک میں سابقین کی استعداد ہوگی۔ ایک میں اصحاب یمین کی (ص ۱۰، ج ۲)

یہ اور اسی قسم کے بہت سے مراتب تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا کوئی صحیح محمل آیات یا احادیث سے نکل نہ سکے یا اہل ظاہر کو اس سے وحشت ہو۔

شاہ صاحب کے مجددیت کے دعوے پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ان کے ذریعے سے ہندوستان کے مسلمانوں میں قرآن اور بالخصوص حدیث کا علم پھیلا۔ اور جیسا کہ انھوں نے فرمایا ہے دو گروہ خصوصیت کے ساتھ اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہوگئے یعنی اہل حدیث و علمائے دیوبند اہل حدیث غفار کی جماعت ہے جنھوں نے تقلید کا قلادہ توڑ کر پھینک دیا اور کتاب و سنت کی ترویج اور شرک و بدعت کے مٹانے میں بلا خوف لومۃ لائم علماً و عملاً ایسی کوششیں کیں کہ سارے ہندوستان میں اُن کی روشنی پھیلی اور توحید کا منارہ بلند ہوا۔ اگرچہ اب لامرکزیت کی وجہ سے ان میں اضمحلال پیدا ہوگیا ہے اور وہ ولولہ اور جوش جو پہلے تھا باقی نہیں رہا۔ پھر بھی ان کی دینی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دیوبندی جماعت مرتفقین کا گروہ ہے جو عوام کے ساتھ ملا جلا رہا۔ اس نے تقلید کو بھی قائم رکھا اور فروعی امور میں امتیازی خصوصیت اختیار کر کے اپنا فرقہ الگ نہیں بنایا مگر اصولی اصلاح یعنی محو شرک و بدعت اور اشاعت کتاب و سنت میں پوری جد و جہد سے کام لیا۔ یہاں تک کہ اپنی اسلامی خدمات کی بدولت ہندوستان کے جمہور مسلمانوں پر ان کا اثر غالب آگیا۔ اعراب تک

مدرسہ دیوبند کی وجہ سے چونکہ ان میں ایک مرکزیت باقی ہے اس لئے اُن کی کوششوں کا سلسلہ جاری ہے - یہی جماعت اس وقت اسلامی ہند میں مذہب کی علمبردار ہے -

یہ دونوں گروہ شاہ صاحب کو اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کرتے ہیں - کیا یہ بات اُن کی مجددیت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے ؟ - ہاں اپنی ذریت کے متعلق انھوں نے برکت کی جو خبر دی تھی وہ صرف تھوڑے زمانے تک صحیح ثابت ہوئی - پھر ان کی اولاد منقرض ہو گئی - مجھے یاد ہے کہ ۱۹۱۱ء میں مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلوی کے خاندان میں ایک شادی تھی جس کی شرکت کے لئے میں دہلی آیا تھا - اس وقت ایک شخص سید احمد نامی جو اپنے آپ کو ولی اللہی کہتے تھے - مجھ سے ملے تھے، ان کا قد چھوٹا تھا اور داڑھی بڑی وہ اسی کتاب یعنی تفہیمات کو طبع کرانے کی فکر میں تھے - اس کے ۱۲۰ صفحے چھپے ہوئے مجھے دکھلائے بھی تھے، میں نے اس کی بابت ان کو کچھ مشورے بھی دئے مگر اس کے تھوڑے ہی زمانے کے بعد وہ انتقال کر گئے - اب جہاں تک مجھے علم ہے شاہ صاحب کی ذریت میں کوئی باقی نہیں ہے -

لطیفہ | حافظ حمید الدین فراہی مرحوم نے جو قرآن سے اکثر علمی لطائف نکالا کرتے تھے - ایک بار مجھ سے کہا کہ اس آخری دور میں اللہ نے دو شخصوں کو خدمت قرآن کے لئے چنا - جن کی خبر اس آیت میں دی ہے - وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ وھو الولی الحمید یعنی شاہ ولی اللہ اور حمید الدین - ایسا ہی ایک اشارہ اس کتاب میں بھی مجھے ملا - شاہ صاحب لکھتے ہیں

صوفی امروز ہیبت از اسماء حسنیٰ کما قال قولہ الحق " وھو الذی ینزل الغیث الایہ " ہیچ میدانی کہ ایں کجا صورت خواہد بست - جائیکہ کس نگوید کہ پدر ولی فلانست و مادرش فلانہ - (ص ۱۸ ج ۲)

مجددیت | یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں دو منصب، مجددیت اور مہدویت کے احادیث کی رو سے مسلم چلے آتے ہیں - پہلا مجدد جو دوسری صدی ہجری کے سرے پر ہوا لوگوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو قرار دے دیا - لیکن اس کے بعد سے یہ رتبہ علماء و صلحاء کے حصے میں آگیا - ہر ہر صدی

میں مختلف جماعتیں مختلف اسلامی ممالک میں اپنے اپنے معتمد علیہ اکابر کو مجدد گردانتی رہیں۔ جس کا سلسلہ اب تک برابر چلا جاتا ہے۔ چونکہ مجددیت کا مدار عمل سے زیادہ ذاتی وجاہت پر ہے اس لئے اس کے واسطے میدان بہت وسیع ہے۔ مہدی کا منصب اہلِ سیف کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ کیوں کہ اس کے فرائض علماء وصلحا کے حیطۂ قدرت سے باہر تھے، اور روایات کی بنیاد پر چونکہ یہ غیر اہلِ بیت سے نہیں ہو سکتا تھا اس لئے انھیں کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ دوسرے خادمانِ ملت وحامیانِ دین جنھوں نے جہاد و اعلاء کلمۃ الحق میں اپنا خون اور پسینہ ایک کیا جیسے سلطان محمود غزنوی، سلطان نور الدین زنگی شہید، سلطان صلاح الدین اور سلطان محمد فاتح، وغیرہ اُن کے واسطے نہ مجددیت رہی نہ مہدویت۔

اہلِ عرفان | قرآن میں وارثین کتاب کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں "سابق، مقتصد، اور ظالم لنفسہٖ" ان کی تفصیل مختلف سورتوں میں ہے۔ جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں اہلِ عرفان کا مقام معلوم کرنے کے لئے تاریخی ادوار کے لحاظ سے انھیں ناموں کے ساتھ مسلمانوں کے طبقات کو مختصراً بیان کرتا ہوں

(۱) سابق:- یہ وہ طبقہ ہے جس کو ایسا امام متفق علیہ[۵] نصیب ہوا جو خالص اللہ کی مرضی اور اس کے احکام کے مطابق چلنے والا تھا۔ مرکزیت کی بدولت اُن کے اجتماعی مقاصد متعین تھے۔ اور ان کے سامنے سوائے اللہ اور اس کی رضا کے کچھ نہ تھا۔ یہی مقربین بارگاہ ہیں۔ "السابقون السابقون اولئک المقربون"۔ ان کو عرفان کی جستجو کی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ صداقت مجسم ان کے سامنے تھی اور عمل بالقرآن نے خود ان کو سراسر عرفان بنا دیا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کا زمانہ نبوت کے بعد صرف ۳۰ سال تک رہا۔

(۲) مقتصد:- اپنے امراء کے تغلب سے یہ طبقہ امام متفق علیہ سے محروم ہو گیا اور براہِ راست

---

[۵] امام منصوص نہیں۔ کیوں کہ قرآن سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اگر امام منصوص کوئی ہے تو صرف رسول ہے جو امام متفق علیہ میں داخل ہے۔

احکام الٰہی کی ماتحتی سے اُن کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اُن کے مرکزی مقاصد میں استبدادی اغراض شامل ہو گئے تھے۔ اس لئے اُن میں سے بہت سے لوگ جزئی جماعتوں میں یا انفرادی طور پر اپنی اپنی نجات کی راہیں نکالتے تھے انھیں میں سے کچھ لوگوں نے ترک دنیا اور زہد کا طریقہ اختیار کیا یہی لوگ اہل عرفان یا اہل تصوف کہے گئے۔

۳۔ ظالم لنفسہٖ۔ مقتصدین نے جب ایک مدت تک کی مہلت پاکر بھی اپنی حالت کی اصلاح کی کوشش نہیں کی اور اپنے امراء کی غلامی پر قانع رہ کر حکومت الٰہی کو بھلا بیٹھے تو اس کی سزا میں وہ اور اُن کے اُمراء سب کے سب کفر کی محکومیت کے جہنم میں ڈال دیے گئے۔ اُن کے لئے نہ صرف اجتماعی بلکہ بہت سے انفرادی راستے بھی نجات کے بند ہو گئے۔ لیکن پھر بھی مختلف راہیں مقبولیت کی کھلی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بھی کچھ لوگ تصفیہ باطن کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور سلوک کے مقامات طے کرکے نجات کی اُمید رکھتے ہیں۔

اگرچہ اہل نظر میں ابھی یہی مسئلہ زیر بحث ہے کہ یہ نجات اور مقبولیت کا ذریعہ بھی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ باطنی ریاضتوں سے یہی مدارج غیر مسلم کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن اس بحث سے قطع نظر کرکے نفس طریقت یا تصوف کو دیکھا جائے تو تاریخی حیثیت سے اس امر میں بہت کم شبہ کی گنجائش ہے کہ مسلمانوں میں یہ چیز عہدِ غلامی کی پیداوار ہے۔

ان اہل عرفان میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر ان کو متفق علیہ امام مل جائے تو وہ بھی سابقین کے رتبہ تک پہنچ جائیں۔ مگر اجتماعی اعمال نجات کی راہیں بند پاکر ان کا سارا رجحان باطنی اصلاح کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس راہ میں آسانیوں سے زیادہ دشواریاں ہیں اور ایسے مقامات آتے ہیں کہ اگر حبل اللہ یعنی قرآن کا دامن دونوں ہاتھوں سے مضبوط نہ پکڑے ہوئے رہیں تو قدم اپنی جگہ سے اکھڑ جاتا ہے۔ اور پھر حیرت میں سرگرداں ہونے لگتے ہیں، ان حضرات میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن پر حال کا غلبہ ہو جاتا ہے اور ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ مگر بعض کی نسبت علمی حال پر غالب رہتی ہے۔ وہ ان قلبی واردات کو بیان

کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے لئے نہ زبان ہے نہ الفاظ؛ اس وجہ سے بالعموم ان کے کلام میں ابہام پایا جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ کلام بھی خالص صحو میں نہیں ہوتا بلکہ فی الجملہ سکر کی کیفیت اس میں شامل رہتی ہے۔ ان بیانات کو زیادہ سے زیادہ وجدانیات اور ذوقیات کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ بعض اہل علم نے تو ان کو سراسر شطحیات قرار دیا ہے۔

ان بزرگوں میں سے جنھوں نے ان کیفیات کو لکھا ہے۔ شیخ اکبر اور شاہ صاحب ممتاز ہیں شاہ صاحب کا قدم جادۂ شرع سے کہیں ہٹتے نہیں پایا ہے۔ مگر شیخ اکبر نقطۂ اتصال پر پہنچ کر جہاں حظیرۂ قدس کی تجلیات کا ظہور ہوتا ہے اتحاد کی طرف جھک گئے اور اپنی کتاب فتوحاتِ مکیہ کا پہلا فقرہ یہ لکھا کہ

سبحان الذی خلق الاشیاء وھو عینھا۔

اور پھر زندگی بھر اسی کی تشریح کرتے رہے۔

مجھے امام ابن تیمیہ جیسے شخص پر جو اس قابل ہیں کہ امت اُن کے اوپر فخر کرے تعجب آتا ہے کہ انھوں نے حال کا کوئی لحاظ نہیں رکھا، اور شیخ اکبر جیسے شخص کو جو قدوۃ الاولیا ہیں طاغوت اکبر کہہ دیا۔ بجز اس کے کیا کہا جائے کہ یہ وہی اہل باطن و ظاہر کا مقابلہ تھا، جو اس سے پہلے شیخ عبد القادر جیلانی اور امام ابن جوزی میں پیش آچکا تھا۔

باوجود اس کے کہ شاہ صاحب نے غلبہ حال میں بھی ظاہر شرع کا لحاظ رکھا ہے اور اس سے تجاوز نہیں کیا ہے پھر بھی وہ اپنے اس کلام سے خوش نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

یہ بیان میری فطرت کی قوت ممیزہ کے باعث ہے عنقریب اس کو قتل کرکے ایک گہرے کنوئیں میں دفن کردوں گا۔ (ص ۱۵ ج ۲)

آخر میں پھر یہ حقیقت بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے وجدانی بیانات اور صوفیانہ تصانیف سے ممکن ہے کہ اہل نظر کچھ لطف یا فائدہ اٹھا سکیں مگر عوام کے لئے ان میں کوئی نفع نہیں ہے بلکہ الٹا نقصان ہے کیونکہ بعض لوگ انکو دیکھکر اس قسم کے بلکہ اس سے بھی بڑے بڑے دعوے کر بیٹھتے ہیں اور امت میں بدنظمی اور تشتت پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

جلد ۲۸	مئی ۱۹۳۷ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

قیمت سالانہ ۵ روپیہ   فی پرچہ ۸ آنہ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شایع کیا

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شائع کی ہیں جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔ مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) **مطبوعاتِ جامعہ**۔ جامعہ کی شائع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۲) **ناشرینِ اُردو**۔ جامعہ کے علاوہ اردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

(۳) **مصنفینِ اُردو**۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مولفین اردو کی کتابوں کی فہرست

(۴) **بچوں کی کتابیں**۔ بچوں کے لئے اردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۵) **عورتوں کی کتابیں**۔ عورتوں اور بچیوں کے پسندیدہ کتابیں۔

(۶) **مختصر فہرست کتب**۔ کتب اردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست۔

(۷) **ادبی کتابیں**۔ تاریخ و تنقید ادب، مقالات و انشا، ناول، افسانہ، نظم، ڈراما، مکاتیب ظرافت وغیرہ پر اردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۸) **مذہبی کتابیں**۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

(۹) **تاریخی کتابیں**۔ پانچ سو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست

(۱۰) ۔ اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبعیات، کیمیا، طب، حفظانِ صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیر طبع ہے۔ عنقریب شائع ہوگی۔

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ڈاکٹر انصاری مرحوم

سبز خاک شہیدے برگہائے لالہ می پاشم

ڈاکٹر انصاری موجود تھے اور کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تھی تو سوال فوراً زبان پر آتا تھا ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا؟ اب جبکہ ڈاکٹر انصاری کی رحلت کی خبر آئی تو تھوڑی دیر تک عقل و حواس معطل رہے، سوچنے لگا آخر ڈاکٹر انصاری کیوں کر جاں بحق ہوئے اور یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ وہ خود اپنے لئے اس موت کا سد باب نہ کر سکے جس کو ان کی نتھری چھلکیلی، گہری اور مریض اور تندرست دونوں کو تسکین دینے والی آنکھیں ہمیشہ روک دیتی تھیں، ٹال دیتی تھیں اور بھگا دیتی تھیں۔

میں ہمیشہ مریض رہا اور ڈاکٹر انصاری سے اپنی تکلیف رجوع کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میرا مرض معمولی مرض نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جب ذہن کی فضا ایسی مٹیالی، نمناک اور غلیظ ہو جاتی جس کو میں اس طرح چھو سکتا تھا جیسے گلی سڑی پھپھوندی کو اس وقت میں اُن کے مطب کا رخ کرتا۔ انتظار میں اکثر زیادہ وقت صرف ہوتا اور میں اُن کے انتظار کے کمرہ میں بیٹھا، فتحپوری کی دوکانوں، گزرنے والوں کی تگ و دو، گاڑیوں اور پھیری والوں کے شور و شغب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چہل پہل، یہ لہر بہر، یہ مشغولیت، یہ خلفشار زندگی ہے جس سے میں ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا جاؤں گا۔ زندگی ہی وہ کل ہے جو اپنے جزو سے مستغنی ہے تو مجھ پر بڑی مایوسی اور اکثر بغاوت کا جذبہ طاری ہو جاتا۔ اور میں زیادہ بیتابی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا منتظر ہو جاتا۔

اتنے میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر آتی، وہ اپنے مضبوط اور ہموار قدموں سے زینہ پر چڑھتے اور کسی ہمراہی سے گفتگو کرتے ہوئے سنائی دیتے۔ دیکھتے ہی مسکراتے اور اس طور پر کہ گھنی پلکوں کے نیچے سے اُن کی آنکھیں بھی مسکرانے لگتیں، کہتے بھئی تم کہاں، بڑے عرصہ تک غائب رہے

میں کہتا ڈاکٹر صاحب بڑی تکلیف ہے، پریشان ہوں، کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ بولتے گھبراؤ نہیں ابھی دیکھتا ہوں، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ باتیں اس لب و لہجہ سے اور اس طرح ہنس ہنس کر اعتماد اور اعتقاد، دل آسائی اور دلربائی کے ساتھ، دوستی اور بزرگی کی شان سے کہتے کہ مجھے خود محسوس ہونے لگتا کہ میں ناحق پریشان ہوا، اس سے پہلے کیوں نہیں آیا۔ خواہ مخواہ اتنے دنوں مصیبت و مایوسی میں کیوں مبتلا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا اس سے بات کرتے جاتے، اندازِ گفتگو سے محسوس ہوتا کہ وہ دوسرے سے بات اس لئے کر رہے ہیں کہ مجھے تقویت پہونچے اور مجھ سے گفتگو کرتے تو اوروں کو محسوس ہوتا کہ وہ دوسروں میں بھی اعتماد اور امید کی روح بیدار کر رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ صرف مریض یا اُن کے اعزا نہ ہوتے بلکہ مختلف اقسام کے لوگ ہوتے۔ مقاصد کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی، لیکن ڈاکٹر انصاری کی بات میں وہ جادو تھا کہ ہر شخص یہی سمجھتا کہ گو ڈاکٹر انصاری مخاطب دوسروں سے ہیں لیکن کہہ وہی رہے ہیں جو ہماری تقویت یا دلچسپی کا موجب ہو۔

ڈاکٹر انصاری اپنے معائنہ کے کمرہ میں لے جاتے، مجھے اس قسم کے معائنہ خانوں اور اپریشن روم وغیرہ میں جانے کا اکثر اتفاق ہوا ہے لیکن جس امید اور اعتماد کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر بھاٹیا (لکھنؤ) کے حوالہ کیا ہے وہ مجھے کہیں اور نصیب نہ ہوا۔ ڈاکٹر انصاری اس طرح دیکھتے، ٹٹولتے گویا وہ خود اپنے زخم یا درد کو ٹٹول رہے ہیں۔ اُن کی انگلیاں، خوبصورت، سڈول، گداز، پاکیزہ خوش رنگ اور ایسی معتدل حرارت کی ہوتیں اور اُن کو وہ اس نرمی اور نزاکت کے ساتھ کام میں لاتے کہ مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کسی دوسرے کی انگلیاں میرے جسم کو چھو رہی ہیں۔ آہ ان کی گھنی ابروئیں اور لمبی پلکوں والی، گہری، روشن اور ہنستی ہوئی آنکھیں اور شیر و شہد سی نگاہیں جو جسم و جان میں اس طور پر نفوذ کرتیں جیسے کوئی اچھا خیال یا اچھا کام قلب کو بالیدہ، جذبات کو رنگین اور خیالات کو بلند کر دیتا ہے۔ وہ مریض کا معائنہ ایسے کرتے جیسے وہ اُن کا جان چھڑکنے والا بھائی چہیتا بیٹا یا جاں نثار دوست ہے۔ اُن کی پیشانی ایک روشن فضا تھی جس میں مریض کو

امیدوار بڑھانے والی امید کے نقوش نظر آتے تھے۔

معائنہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا گویا ڈاکٹر انصاری کو آج تمام دن کوئی اور کام کرنا نہیں ہے اور اُسی مریض پر تمام وقت اور توجہ صرف کر دیں گے۔ معائنہ ختم کرنے کے بعد میز پر لیٹے ہوئے مریض کو خود سہارا دے کر اُٹھاتے۔ کچھ دیر تک اسے میز پر پاؤں لٹکائے ہوئے بٹھا رہنے دیتے اور خود اُس کے پاس کھڑے ہو کر اس طور پر باتیں کرتے جیسے اپنے کسی گہرے بے تکلف دوست سے خوش گپی کر رہے ہوں۔ اس کے بعد سہارا دے کر میز سے اُتارتے، کپڑے پہنانے میں مدد دیتے، نسخہ لکھتے، استعمال کی ترکیب بتاتے اور رخصت کر دیتے۔

ڈاکٹر انصاری سے رخصت ہو کر میں اپنے آپ کو بالکل تندرست سمجھنے لگتا۔ اگر مرض کی کچھ تکلیف بھی ہوتی تو سمجھتا کہ دوا استعمال کرنے کے بعد ہی جاتی رہے گی۔ چنانچہ میں مطب سے اُترتے ہی فتحپوری اور چاندنی چوک کی چہل پہل اور ہمہمی میں گم ہو جاتا۔ پھل والوں کے ہاں سے پھل خریدتا اور کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتا اور مدتوں پرہیز کرتے کرتے کھانے پینے کا جو لطف کھو چکا ہوتا اس کو بد پرہیزی سے از سر نو حاصل کرتا۔ دل کا اندوہ چھنٹ جاتا اور زندگی خوشگوار اور خوش آئند معلوم ہونے لگتی۔

میں نے ایک بار ڈاکٹر انصاری کو سرجری کرتے بھی دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ماہر مصور کے ہاتھ میں موقلم ہے یا کوئی مرصع ساز کسی نازک زیور یا مشین پر کام کر رہا ہے۔ نشتر اُن کی انگلیوں میں اس طور پر کام کرتا جیسے بہزاد اپنے قلم سے خطوط کھینچ رہا ہے۔ نزاکت اور صلابت دونوں کا امتزاج، ایسا امتزاج جو قوس قزح کے رنگوں میں پایا جاتا ہے، چہرہ پر سنجیدگی، آنکھوں میں گہرائی انگلیوں میں صفائی اور تیزی۔ آپریشن میں آلودگی کا ہونا لازمی ہے لیکن ڈاکٹر انصاری کو آپریشن کرتے دیکھئے تو معلوم ہوتا جیسے مشین کا ماہر مختلف ٹکڑوں کو جو اسکریو سے جڑے ہوں، خوبی پھرتی صفائی اور اعتماد کے ساتھ علیحدہ کر رہا ہے۔

مدتیں گذریں میری طفولیت اور الہلال کے شباب کا زمانہ تھا۔ الہلال کے جتنے پرچے

آتے تھے ہم لوگ اس کو شوق اور عقیدت سے پڑھتے تھے۔ عبارت سمجھتے تو فخر کرتے اور جہاں نہیں سمجھتے تو وہاں یہ خیال کرتے تھے کہ کوئی بڑی بلند یا گہری بات کہی ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے اس لئے اس کا احترام اور زیادہ کرتے تھے۔ پچھلی بار گھر گیا بچپن کی الماری گرد و غبار سے اَٹی پڑی ہوئی تھی۔ ایک پر اتفاقیہ نظر جا پڑی۔ دیکھا تو اس وفد کی تصویر تھی جو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سرکردگی میں یہاں سے جنگ بلقان میں زخموں کی مرہم پٹی کے لئے گیا تھا۔ یہ تصویر اس زمانہ میں الہلال میں شائع ہوئی تھی نیچے لکھا ہوا تھا۔

"اے وہ لوگو کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو جب وہاں پہنچنا تو خدارا
اُن کے زخموں پر سختی نہ کرنا کیوں کہ وہ زخم ان کے نہیں ہیں بلکہ اسلام کے ہیں"

آہ وہ زمانہ یاد آگیا جب اَبوالکلام' محمد علی' ڈاکٹر انصاری کو ہم سب خدا جانے کیا سمجھتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلام پر تیرہ سو برس نہیں گذرے ہیں۔ بڑے ہو کر ہم بھی ہندوستان سے باہر جا کر مسلمان مجاہد کی طرح لڑیں گے زخمی ہوں گے شہادت پائیں گے فاتح کہلائیں گے۔ دنیا دیکھے گی کہ اسلام اور اسلامیوں سے بڑھ کر کوئی نعمت اور منزلت نہیں ہے۔ آج جبکہ یہ سطور لکھ رہا ہوں ماضی کا غبار زندگی کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہے اور تصور کی کرنیں طفولیت کے اس افق پر پڑ رہی ہیں جہاں ہم رہ رہ کر تلملا اُٹھتے تھے کہ کیوں بچپن کا زمانہ نہیں ختم ہوتا اور ہم ترکوں کی مدد کے لئے۔ اسلام کا نام روشن کرنے کے لئے' زخمی ہونے کے لئے سپاہیوں کی صف میں کھڑے ہونے کے لئے کیوں نہیں بلائے جاتے۔ لیکن اب کیا حال ہے' ہم بدل گئے زمانہ بدل گیا' دنیا بدل گئی رنج و راحت' عزت و ذلت کا تصور بدل گیا۔ زندگی کی جد و جہد وہی ہے لیکن جد و جہد کا لطف باقی نہیں رہا تصورات میں نہ رنگینی باقی رہی نہ حرارت' عزائم میں نہ استواری ہے اور نہ برکت! مانا موجودہ عہد کے مسائل اور مطالبات کچھ اور ہی ہیں فرائض اور ذمہ داریاں بھی بدلی ہوئی ہیں لیکن خدارا کوئی یہ بتائے یہ کیسے مسائل ہیں یہ کیسے فرائض ہیں جن سے دماغ میں روشنی نہیں پیدا ہوتی دلوں میں ولولے نہیں پیدا ہوتے ہاتھوں میں قوت نہیں پیدا ہوتی اور زندگی سے حرارت مفقود ہو چکی ہے۔

ظاہر ہے میں پرانے وقتوں کا ہوں راگنی بے وقت کی ہے، زمانہ ترقی کر چکا ہے، زندگی اور زندگی کے تار و پود نئے اسلوب سے مرتب ہو رہے ہیں ہر چیز کی قدر و قیمت گھٹ بڑھ رہی ہے۔ جس چیز کو ہم متاع یوسفی سمجھتے تھے وہ متاع کا سد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور جسے اب دیکھ کر ہم خجل اور سراسیمہ ہوتے ہیں وہی حاصل حیات ہے۔ زمانہ اور زندگی کی رفتار ہی نہیں اس کا رخ بھی بدل گیا ہے لیکن زندگی کی برہنگی کو حقائق کا انکشاف کیوں کہئے۔ سائنس کے کرشموں کو انسانیت کا معجزہ کیوں بتایا جاتا ہے۔ آرٹ اور آزادی کی، قربان گاہ پر کن چیزوں کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ افراد کی شادی و غمی کیا ہوئی، ان کی پروا کیوں نہیں کی جاتی۔ جماعت کے ریگ زار سے افراد کی امید اور امنگ کے نخلستان کیوں فنا کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب بے وقت کی راگنی صحیح رنج و راحت کا تصور اور وہ بھی درست لیکن رنج و راحت کا احساس کیوں کر بدل گیا؟

ڈاکٹر انصاری ہندو مسلمانوں کے نفاق و افتراق کو دور کرنے کی فکر میں تمام عمر کوشاں رہے۔ وہ نفاق و افتراق کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مرض سمجھتے تھے اور ایک سچے طبیب اور ڈاکٹر کی مانند مریض سے ہمدردی کرتے اور مرض کے ازالہ میں پوری توجہ اور دلسوزی اور قابلیت صرف کرتے رہے۔ انھوں نے ہندو مسلم اختلاف کو ہندو یا مسلم کی حیثیت سے نہ کبھی پرکھا اور نہ اس کی چارہ سازی کی انھوں نے اس مرض کے ازالہ کی ایک حقیقی طبیب کی حیثیت سے کوشش کی۔ ڈاکٹر انصاری کے لئے اس کے علاوہ اور چارہ کار ہی نہ تھا۔ وہ جب کرتے جیسا کچھ کرتے اور جتنا کر سکتے سب ڈاکٹر کی حیثیت سے کرتے اور ایسا ہی انھوں نے کیا۔

ڈاکٹر انصاری کی وفات سے کتنے لڑکے لڑکیاں یتیم ہو گئیں۔ بیوائیں لاوارث ہو گئیں۔ نوجوان بے دست و پا ہو گئے۔ رفقا جی چھوڑ بیٹھے۔ وہ معلوم نہیں کن کن مواقع پر کیسے کیسے لوگوں کی مدد کر چکے تھے اس بڑے پہیے کی گردش سے کتنی چھوٹی چھوٹی اور مختلف متفرق مشینیں گردش کر رہی تھیں۔ وہ

محتاجوں ہی کے مددگار نہ تھے بلکہ اُن لوگوں کی آن بان اور وضعداری کے بھی کفیل تھے جن کو "اسیلئے گردشِ ایام" برابر پیستی جاتی تھی۔ ایسوں کی دستگیری معمولی کام نہ تھا۔ دولت، اثر، اقتدار کا کتنا بڑا حصہ اس پر صرف ہوتا ہوگا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے ہر قسم کی مدد، انتہائے کشادہ جبینی اور دریادلی کے ساتھ دوسروں کی کی ہوگی۔ اور شاید کوئی ایسا نہو جس سے اسی نوعیت کی مدد ڈاکٹر انصاری نے حاصل کی ہو۔

انھوں نے خوب کمایا، خوب صرف کیا، ان پر ایسے ایسے مواقع بھی آئے جب اُن کے پاس کھانے اور خرچ کرنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن اُن کی زندگی میں کسی ایسے کو، جس کے کفیل ڈاکٹر انصاری تھے کبھی کسی ایسے موقع سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ جب اس کو کھانے اور خرچ کرنے کی سختی جھیلنی پڑی ہو ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے رفقا میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جس نے ڈاکٹر انصاری کی اتنی مدد کی ہو جتنی ڈاکٹر انصاری نے اس کی کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ لوگ جن پر ڈاکٹر کے احسانات تھے ڈاکٹر کے لئے کیا کرتے ہیں۔ ڈر صرف اسی سے ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان اکثر و بیشتر صرف یہ کرتے ہیں کہ مدد لینے میں تو حق و ناحق کی بھی تمیز اُٹھا دیتے ہیں لیکن مدد دینے کے وقت اور اس حالت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں جب خود ہم کو مدد مانگنے کی ضرورت ہوئی تھی اور ہماری مدد کی گئی تھی۔

ڈاکٹر انصاری جامعہ ملیہ کے قیام و ترقی میں جو کچھ کرتے رہے اور اُن کی جو امیدیں اور ولولے اس سے وابستہ تھے اس کا اندازہ میں کر سکتا ہوں۔ غالباً چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو مجھ سے زیادہ اس کا احساس کر سکتے ہوں۔ ابھی ابھی رمضان کی ایک شام کو ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ جامعہ کی نئی عمارت دیکھنے " اوکھلے " گیا ہوا تھا۔ اوکھلے کے صاف سادے ورق پر ایک نقش اُبھر رہا تھا۔ بدیع اور بلند۔ عمارت کا نقشہ اور اس کا پیکر ابھی ناکمل تھا۔ تصور تصویر میں منتقل ہو رہا تھا۔ مستقبل کا افق دھیرے دھیرے ان تمام گہرائیوں اور پہنائیوں کے ساتھ بے نقاب

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ

ہو رہا تھا جن میں مومن کا عزم پرورش پاتا ہے، بالیدہ ہوتا ہے اور آفاق پر چھا جاتا ہے۔

عمارت کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک طرف ڈاکٹر انصاری آسودۂ خاک تھے اور مدفن کے بہشتی جھروکے سے اپنے حسنات کی فردوس تعمیر ہوتے دیکھ رہے تھے۔

دیر ہو رہی تھی ہم سب واپس آگئے۔

~~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~~

عہدِ رنگیں کی یادگار ہوں میں | یعنی اپنا ہی سوگوار ہوں میں

آ کہ بیتابِ انتظار ہوں میں | دل کی اک آخری پکار ہوں میں

ذرۂ آستانِ یار ہوں میں | صد مہ و مہر در کنار ہوں میں

میری ہستی کا واہ کیا کہنا | تیری ہستی کا پردہ دار ہوں میں

نہ سہی۔ تو ترا خیال تو ہے | یوں بھی فردوس در کنار ہوں میں

اُف جواں مرگیاں، محبت کی | ہائے کس کس کا سوگوار ہوں میں

نکہتِ گل کا بھی دماغ نہیں | کتنا آزردۂ بہار ہوں میں

وہ حقیقت ہے خود مری ہستی | جس حقیقت کا پردہ دار ہوں میں

اللہ اللہ نزاکتیں میری | اپنی خاطر پہ بھی تو بار ہوں میں

تجھ کو تکلیفِ صد نظر ہے، ہے | اپنے ہونے پہ شرمسار ہوں میں

مجھ کو رنگِ خزاں سمجھ کے نہ دیکھ | مژدۂ آمدِ بہار ہوں میں

چینی جمہوریت

چینی اور غیرملکی | شروع میں چین کی طرف سے غیرملکیوں پر کوئی بندشیں نہ تھیں۔ لیکن مغربی قومیں جو سترھویں صدی عیسوی میں یورپ سے ابل ابل کر دنیا پر چھا رہی تھیں ان کا مقصد محض تجارت اور بھائی چارہ نہ تھا۔ بلکہ وہ ملک گیری اور غلبہ چاہتی تھیں۔ مشرقی قوموں کا ستارۂ عروج غروب ہو چکا تھا۔ مصر و چین ہندوستان و ایران کی تہذیبیں خوابیدہ تھیں۔ عربوں اور تاتاریوں کا طبل جنگ خاموش ہو چکا تھا۔ اس وقت یورپ اٹھا اور افریقہ، ایشیا، آسٹریلیا اور امریکہ پر چھا گیا۔ چین میں اولاً پرتگیزی آئے اور امن پسند عرب تاجروں کو ختم کر کے کانٹن پر تسلط کر لیا۔ اور یورپی قومیں بھی جلد ہی آنے لگیں اور اپنی طاقت کے زعم میں چینی حکومت، چینی قانون اور رعایا کو کچھ نہ گردانا۔ آخر ان حرکتوں سے تنگ آکر ۱۷۵۷ء میں حکومت نے اغیار کے لئے "دور باش" کا مسلک اختیار کیا اور سوائے کانٹن اور مکاؤ کے اور ہر جگہ ان کو تجارت کرنے سے ممانعت کر دی۔ اس پر بھی عیسائی پادریوں نے کنفیوشس[۵۱] کی تضحیک نہ چھوڑی اور چینی قانون کی طرف سے بے پروائی برابر جاری رہی[۵۲]۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپی طاقتوں کو اپنی جنگی قوت پر ناز تھا۔ اور ہر ایک طاقت اپنی حکومت اور اپنا اثر بڑھانے پر تلی ہوئی تھی۔ آزادانہ تجارت کی حمایت۔ مظلوم اور بیکس رعایا کی طرفداری۔ تہذیب اور تعلیم کی ترویج۔ امن کا قیام یا ہتک یا کسی جانی[۵۳] یا مالی نقصان کا انتقام ان میں سے کسی کو وجہ بنا کر

---

۵۱ چین کا سب سے بڑا حکیم اور فلسفی

۵۲ ۱۷۸۴ء میں ایک غیرملکی جہاز "Lady Hughes" کے ملازمین نے دو چینیوں کو مار ڈالا۔ چینی حکومت نے انتہائی کوشش کی لیکن غیرملکیوں نے نہ مجرموں کو چینیوں کے حوالے کیا نہ خود سزائیں دیں۔

۵۳ "جانی نقصان" اکثر و بیشتر تو پادریوں کے قتل کی صورت میں ہوتا تھا۔ اور انہی کا "خون بہا"

جنگ چھیڑ دی جاتی تھی اور اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا لیا جاتا تھا۔

۱۸۴۲ء میں اتحادیوں سے جنگ کے بعد جو عہد نامہ نانکن ہوا اس کے ذریعہ چین نے وہ سب کچھ کھو دیا جس کے معنی خودداری اور آزادی کے ہو سکتے ہیں۔ یوں کہنے کو صرف تین چیزیں غیروں کو دی گئیں۔ لیکن اس کے بعد پھر چین کے پاس کچھ نہ بچا۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں:۔

۱۔ غیر ملکیوں کے مخصوص حقوق[۵]۔ اس کے ماتحت غیر ملکی چینی قانون سے بری ہو گئے۔ چینی حکومت غیر ملکیوں پر کسی جرم پر بھی مقدمہ چلا ہی نہیں سکتی۔ غیر ملکیوں کا مقدمہ محض ان کے اپنے ہی ججوں کے سامنے ہو سکتا ہے۔ اور ان کی سزا وغیرہ بھی اپنے ممالک کے قانون کے ماتحت اپنے ججوں کی رائے سے ہو سکتی ہے۔ چین میں خواہ کسی جگہ کوئی غیر ملکی کسی قسم کا جرم کرے اس کا مقدمہ غیر ملکی عدالتوں ہی میں ہو سکے گا۔ خواہ مدعی یا مدعا الیہ چینی ہو' یا چینی حکومت۔ اسی طرح غیر ملکیوں پر چینی ٹیکس یا چنگی کا عمل درآمد نہ ہو گا۔ شانگھائی کا ایک حصہ غیر ملکیوں کے بسنے اور انکی عدالتوں وغیرہ کے لئے دے دیا گیا تھا۔ یہی "بین الاقوامی آبادی" کہلاتی ہے۔ شروع میں یہ ۴۷۰ ایکڑ رقبہ تھا لیکن اب ۵۵۸۴ ایکڑ ہو گیا ہے۔ اس کی کل آبادی نو لاکھ چھپن ہزار ہے۔ جن میں نو لاکھ ۴۰ ہزار چینی ہیں اسی طرح کل بلدہ کے ٹیکس کا ۰ ۰ فی صدی بھی چینی ہی دیتے ہیں۔ لیکن ان کو مجلس بلدہ کی ممبری تو الگ رہی اس کے انتخاب کے لئے رائے تک دینے کا حق نہیں ہے۔

بقیہ فٹ نوٹ کا ۱۔ سب سے زیادہ اہم بھی تھا۔ کوریا میں عیسائیوں کے ایک خاص فرقے کے دو پادری مارے گئے۔ یہ لوگ جرمنی کے باشندے تھے۔ لیکن اس فرقے سے تعلق رکھتے تھے جس کو جرمنی حکومت نے ملک بدر کر دیا تھا۔ لیکن اب بہانا ہاتھ آیا۔ جرمنی نے چین سے ان کے خونبہا کا مطالبہ کر دیا اور ان کے عوض پورٹ آرتھر دبا بیٹھے۔ یورپ کی دیکھا دیکھی جاپان نے بھی اپنے بدھ سادھو بنا بنا کر چین میں بھیجنے شروع کئے تاکہ وہ بھی اپنا قیمتی خون وہاں گنوائیں اور ملک پرستی کا ثبوت دیں۔

۵ے Extraterritoriality.

۴۔ مالیات ملک پر قبضہ ۱۸۴۲ء اور اس کے بعد کے معاہدوں کے ذریعہ چین میں اشیا کی درآمد پر محصول بلا تخصیص جنس ہمیشہ کے لئے قیمت کا ۵ فی صدی مقرر کر دیا گیا[۵۱]۔ اور اس کو بڑھانے کا چین کو کوئی اختیار نہیں رہا۔ اسی کے ساتھ برآمد پر بھی زیادہ سے زیادہ پانچ فی صدی ہی ٹیکس کی اجازت دی گئی۔ درآمد کے محصول کے علاوہ اندرون ملک میں ایک اور ٹیکس ہوتا ہے جسے چین میں لی کن کہتے ہیں[۵۲]۔ یہ چینی یا غیر چینی سب کو دینا پڑتا تھا۔ لیکن محصول درآمد مقرر ہونے کے بعد غیر ملکیوں نے لی کن دینے سے انکار کر دیا۔ اور وہ اس سے بری سمجھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تخصیص کی وجہ سے ملکی تاجر غیر ملکیوں کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ درآمد کے محصول عائد کرنے میں بھی یہ ستم ظریفی کی گئی کہ اشیاء کی قیمت جو ۱۸۵۸ء میں خود غیر ملکیوں ہی نے اصل قیمت کو بہت کم کر کے مقرر کی تھی وہ بغیر تبدیلی نصف صدی سے زیادہ تک قائم رہیں گو اس زمانے میں اشیاء کی قیمتیں بہت چڑھ گئی تھیں۔ حسب بالا عہدناموں کے کچھ ہی عرصے بعد چین کو اور لڑائیاں لڑنی پڑیں اور ان سب کے اخراجات اور ہرجانے کی رقم اس قدر ہو گئی کہ حکومت کو غیر ملکیوں سے قرضہ لینا پڑا جس کی ضمانت میں درآمد کا محصول اور نمک کا محصول غیر ملکیوں کے ہاتھ رہن رکھ دینا پڑا۔ پہلے انگلستان۔ فرانس۔ جرمنی۔ امریکہ نے ایک متحدہ مجلس قائم کی جس نے چین کو قرضہ دینا شروع کیا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں روس اور جاپان بھی اس سمجھوتے میں شریک ہو گئے۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ چین پر غیر ملکیوں کی گرفت اور مضبوط ہو جائے۔ ورنہ اصل بات تو یہ تھی کہ جاپان اور روس جس وقت اس مجلس میں شریک ہوئے اس وقت خود ان کی حکومتیں بے حد مقروض تھیں ۱۹۱۲ء

۵۱۔ دوسرے ممالک میں درآمد پر محصول بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور مختلف قسم کی اشیاء پر مختلف شرح ہوتی ہے اشیاء خوردنی وغیرہ مثلاً اناج وغیرہ پر کم اور سامان عیش و نشاط مثلاً شراب۔ سگرٹ۔ موٹر وغیرہ پر بہت زیادہ ہوتا ہے یہ ملک کی آمد کا بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور اسی سے اپنے ملک کی تجارت کو خاطر خواہ قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ مثلاً جاپان میں چینی تمباکو پر شرح محصول درآمد قیمت کا تین سو پچاس فی صدی ہے۔

۵۲ ہندوستان میں اس کو Municipal Terminal Tax یا چنگی کہتے ہیں۔

کے انقلاب[۵۱] کے بعد سے چین کو بہت قرضے کی ضرورت پڑی - یہ قرضہ یا ہرجانہ ادا کرنے کے لئے لیا جاتا تھا یا صنعتی ترقی کے لئے اور یا حکومت کے انتظامات کے لئے ظاہر ہے کہ تینوں خصوصاً آخری دو صورتوں میں ملکی معاملات میں قرضخواہ کا کس قدر عمل دخل ہو جائے گا[۵۲] - پھر یہ قرضہ بھی ایک طرح سے بالجبر دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ اس بات سے ظاہر ہے کہ واشنگٹن کانفرنس (۱۹۲۱ء) میں جب چین نے جاپان کا ایک قرضہ ادا کرنا چاہا تو جاپان نے واپس لینے سے انکار کر دیا کیونکہ دراں صورت جاپان نے شان ٹنگ میں "حقوق" جار کھے تھے ان سے دست بردار ہونا پڑتا تھا دیگر عہدناموں میں بھی یہ شرط شامل ہے کہ بلا منظوری قرض خواہ قرضے نہیں چکائے جا سکتے - یہ بھی عہدناموں کے ذریعہ طے ہو گیا ہے کہ چین بجز اس مجلس کے کسی اور سے قرضہ نہ لے سکے گا - ۱۹۱۲ء میں انگلستان کی کرسپ اینڈ کمپنی نرم شرائط پر چین کو حسب ضرورت قرضہ دینے پر تیار تھی - لیکن غیر ملکیوں نے اس کی اجازت نہ دی اور بالآخر چین کو اسی متحدہ مجلس سے روپیہ قرض لینا پڑا۔ پھر ایک اور دقت یہ ہے کہ چین میں چاندی کا سکہ رائج ہے۔ اور یہ تمام قرضے سونے کے حساب سے دئے گئے ہیں - اس طرح بھی شرح تبادلہ کا نقصان چینیوں کو اٹھانا پڑتا ہے - جنگ عظیم کے بعد وہ پہلی قرضہ دہندہ مجلس ختم ہو گئی - لیکن ۱۹۲۰ء میں امریکہ کی تجویز پر امریکہ انگلستان فرانس اور جاپان نے پھر ایک نئی مجلس بنائی - شروع شروع میں جاپان راضی نہ ہوتا تھا - لیکن "منچوریا" میں اس کے "خاص حقوق" تسلیم کر لینے کے بعد وہ بھی شریک ہو گیا۔

حسب بالا مختصر سے بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چین کس طرح اغیار کے پنجے میں ہے۔ چینی حکومت کی آمدنی زمین کے لگان، نمک کے محصول - درآمد کے محصول - برآمد کے محصول - افیون کے

---

۵۱ ۱۹۱۲ء تک چین میں شہنشاہیت تھی - اس کے بعد جمہوریت قائم ہو گئی۔

۵۲ مثال کے طور پر کانوں اور ریلوں کو لے لیجئے - بہت سے قرضے ان دو صنعتوں کے ابھارنے کے لئے بھی لئے گئے - چنانچہ لوہے کی بڑی کانیں کل پانچ ہیں اور ان میں سے چار کم و بیش کملاً جاپانیوں کے ہاتھ میں ہیں اور صرف ایک چینیوں کے پاس - اسی طرح ریلوے - دیکھئے ص ۳۵۸

محصول اور لی کن پر منحصر ہے۔ یہاں انکم ٹیکس، اسٹامپ وغیرہ کچھ نہیں۔ آمد کی مدّات میں زمین کا لگان کم و بیش مستقل چیز ہے۔ بلکہ آئے دن کی بے چینیوں اور کسانوں کے احتجاج کی وجہ سے اس میں معتدبہ کمی ہو رہی ہے۔ افیون کے متعلق حکومت کی سخت کوشش ہے کہ یہ تجارت ہی ختم ہو۔ گویا یہ مد بھی کم ہو رہی ہے اور جلد ہی ختم ہو جائے گی برآمد پر ۵ فی صدی سے زیادہ ٹیکس لگا نہیں سکتے۔ اور اس کے علاوہ بھی برآمد پر ٹیکس لگانا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔ نمک اور درآمد کا ٹیکس بھی مقرر ہے اور اغیار کے ہاتھوں میں ہے۔ لی کن کو زیادہ کرنے سے اندرونی تجارت ختم ہو جانے کا ڈر ہے۔ خصوصاً بس لئے کہ غیر ملکیوں پر یہ محصول لگ نہیں سکتا۔ گویا اس کو بڑھانے سے ملکی تاجر ختم ہو جائے گا۔ اور محصول صفر رہ جائے گا۔ اس کے مقابلے میں نئی حکومت کے قیام کے سارے اخراجات۔ ملک کی ترقی کی تدابیر۔ اندرونی اور بیرونی سازشوں اور حملوں سے حفاظت یہ سب روپیہ چاہتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ موجودہ صورت میں تو چین ہمیشہ ہمیشہ محتاج رہے گا۔

۲- غیروں کے مذہب کی آزادی بلکہ اس کی عزت اور اولیت:- ۱۸۶۰ء کے عہد نامے میں فرانسیسیوں کے جعل کی[1] بنا پر پادریوں نے جھوٹے سچے دعوے شروع کر دئے۔ برسوں قرنوں کی بنی بنائی عمارتوں کو یہ کہہ کر تڑوا دیا گیا کہ یہاں پہلے گرجا تھا اور یہ زمین ہمیں واپس ملنی چاہئے۔ اس سے جو کچھ زک حکومت کی خودداری کو پہنچی وہ ظاہر ہے۔ پادریوں کے اس طرح ملک پر چھا جانے سے چینیوں کو اور نقصان بھی پہنچے۔ چینی سوسائٹی میں تفریق ہوگئی۔ نو عیسائیوں کے نزدیک اجداد پرستی گناہ عظیم ٹھیری

---

[1] ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۰ء تک انگلستان، فرانس، امریکہ اور روس نے متحدہ طور پر چین کے خلاف جنگ کی۔ اور جب چین کو بالکل پامال کر لیا تو اپنے من مانے شرائط صلح پیش کئے جس پر چین کو دستخط کرنے پڑے۔ فرانسیسیوں نے اپنے معاہدے میں جعل کر کے دو فقرے بڑھا دئے کہ عیسائی پادریوں کو تمام چین میں تبلیغ کی اجازت ہوگی اور گذشتہ ضبط شدہ جائدادیں اُن کو بلا معاوضہ واپس دی جائیں گی۔

اور پرانے چینی اس کو اہم ترین عبادت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پادریوں نے جو کتابیں چینیوں کی متعلق لکھی ہیں۔ وہ تعصب اور سیاست کی وجہ سے سخت گمراہ کن ہیں۔ اور چینیوں کے متعلق بہت ہی خراب قسم کی معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ اس طرح بین الاقوامی طور پر چینی عزت اور خودداری کو بڑا دھکا لگا ہے۔[۵۱]

چین میں غیر ملکی مسئلہ کے اس مختصر سے بیان کے بعد ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے کہ اب ایک عرصہ سے اور خصوصاً ۱۹۱۲ء کے انقلاب کے بعد سے چین کی تاریخ کے نشیب و فراز کی ذمہ داری ملکیوں کی زیادہ غیر ملکیوں پر ہے۔ مارچ ۱۹۱۲ء میں ایک عارضی نظام بنایا گیا اور یوآن شی کائی صدارت کے فرائض انجام دینے لگا۔ لیکن یوآن صرف صدارت سے مطمئن نہ تھا۔ اس کا مطمح نظر اپنی شاہنشاہیت تھی یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ جمہوریت کا پہلا صدر بھی غدار ہو۔ یوآن نے غیر ملکیوں سے خفیہ معاہدے کرنے شروع کئے۔ سب سے زیادہ ضرورت روپیہ کی تھی۔ اور روپیہ ہونے کی صورت میں پھر اندرونی مخالفتوں کا دبانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس لئے یوآن نے برطانیہ۔ فرانس۔ روس۔ جرمنی اور جاپان کی متحدہ مجلس سے ایک زرِ کثیر قرضہ لے لیا۔ اس کے اس فعل میں مجلس مشاورت شامل نہ تھی۔ یہ قرضہ حکومت کی آمدنی کی ضمانت پر لیا گیا تھا اور اس حساب میں نمک کا محصول غیر ملکیوں کے حوالہ کر دیا گیا تھا ڈاکٹر سن یٹ سین کی "جماعتِ عوام" کومن طانگ جو اصلیت میں انقلاب کا باعث ہوئی تھی اس قرضہ پر بہت بگڑی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر سن یٹ سین نے فوجی مداخلت بھی کرنی چاہی لیکن اس میں یوآن کا نیا لیا ہوا روپیہ اور غیر ملکی رفیق کام آئے اور ملک پرست کومن طانگ کو دبا دیا گیا ۱۹۱۳ء میں یوآن شی کائی نے کومن طانگ کو خلاف قانون قرار دیا۔ اور ۱۹۱۴ء میں صوبجاتی مجالس مشاورۃ

---

[۵۱] جن بعض اشخاص نے چینی تہذیب وغیرہ کی تعریف بھی کی ہے اس کا بھی مقصد سیاسی ہے بلقول آنریبل مسٹر برٹرینڈ رسل "وہ تمام دول جو چین سے مادی طور پر انتفاع چاہتی ہیں وہاں کی پرانی تہذیب اور قدامت پرستی کی بہت تعریف کرتی ہیں اور ترغیب دیتی ہیں کہ چین اسی ماحول میں مگن رہے۔ اور ترقی نہ کرنے پائے"

از مسئلہ چین

توڑ ڈالیں۔ اسی سال اس نے شاہنشاہی مندر میں مخصوص پوجا کی رسم بھی ادا کی جو صرف شاہنشاہ ہی کرسکتا ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اسی سال اپنی شاہنشاہیت کا اعلان کردے لیکن غیروں کے مطالب کے یہ بات موافق نہ تھی کہ خانہ جنگی کا فیصلہ اس آسانی سے ہو جائے اس لئے انھوں نے خصوصاً جاپان نے اس کو نہ مانا۔ بلکہ کومن طانگ کے طرفدار ہوگئے اُدھر یورپ میں جنگ عظیم چھڑ گئی اب اتحادیوں نے یہ کوشش شروع کی کہ کسی طرح چین بھی ان کی طرف ہو جائے اور اس کے بدلے یوآن شی کائی سے شاہنشاہیت کا وعدہ بھی کرلیا۔ لیکن اس وقت چین کا اتحادیوں کے ساتھ ملجانا جاپان کے مفاد کے خلاف تھا اس لئے اس نے حکمت عملی دباؤ اور مخالف جماعت یعنی کومن طانگ کو مدد دے کر چین کو شریک جنگ نہ ہونے دیا۔ اب حالات ایسے سقیم ہوگئے تھے کہ جون ۱۹۱۶ء میں یوآن شی کائی کی موت ملک کے لئے رحمت ثابت ہوئی۔ اس کے بعد لی یوآن ہنگ صدر منتخب ہوا۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء تک کے عرصے میں اس طرف تو ملک میں مسلسل خانہ جنگی رہی اور ادھر منگولیا روس کے زیر اثر آگیا اور تبت برطانیہ کی ہمت پر آزاد ہوگیا ۱۹۱۴ء سے یورپی قومیں خود اپنے ہی جھگڑے میں مشغول ہوگئیں تو چین میں جاپان کی بن آئی۔ ۱۹۱۵ء میں جاپان نے پیکن گورنمنٹ کو اپنے مشہور اکیس مطالبات پیش کئے جو انتہائی ذلیل کن اور سخت تھے اور جن کی رُو سے ہر قسم کے تجارتی سیاسی اور ملکی مفاد اپنے لئے محفوظ کرلئے گئے۔ ۱۹۱۶ء میں منچوریا کی حدود کے جھگڑے پر چین و جاپان میں جھڑپ بھی ہوگئی۔ لیکن ابھی وقت نہیں آیا تھا اس لئے جاپان دانستہ واپس ہٹ گیا۔ جنگ عظیم کے معاملہ میں جس طرح جاپان نے چینی معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا ہے وہ اس کی حکمت عملی کی بہت کامیاب مثال ہے۔ چین کے اتحادیوں کے ساتھ ہوجانے سے جاپان کی مخالفت دو وجہ سے تھی جیسا کہ وائی کاؤنٹ ائی شی جاپانی وزیر کے بیان سے ظاہر ہے۔ اول تو جاپان کو یہ خطرہ تھا کہ اگر چین اتحادیوں کے ساتھ ہوگیا تو لڑائی کے بعد ان کی مدد سے ممکن ہے یہ میرے اثر سے نکل جائے اور دوسرے " جاپان یہ ہرگز گوارا نہیں کرسکتا کہ چین کی فوجیں منظم اور مضبوط ہو جائیں اور آج تو وہ اتحادیوں کے ساتھ جرمنی سے

لڑیں اور کل خواہیں ہی نکال باہر کریں۔" جاپان کی خواہشات حتی المقدور پورا کرنے کی اتحادیوں کے
پاس بہت معقول وجہ تھی ۔ جاپان خود غیر جانب دار تھا ۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ آخری وقت جس کی
فتح ہوتی دیکھے اسی کے ساتھ ہو جائے ۔ تاکہ مالِ غنیمت میں حصہ دار ہوسکے ۔ جاپان کو یقین تھا کہ
جرمنی جیتے گا ۔ اور اسی لئے وہ اتحادیوں سے ملنا نہ چاہتا تھا ۔ ادھر اتحادیوں کو یہ فکر تھا کہ کہیں
جاپان جرمنی سے نہ مل جائے کیونکہ پھر مشرق کو وہ نہ بچا سکتے تھے ۔ اسی لئے وہ جاپان کو محض غیر
جانبداری رکھنے کے لئے اس کی ہر قسم کی خاطرداری کے لئے تیار تھے ۔ چنانچہ اس سے فائدہ اٹھاکر
جاپان نے اتحادیوں سے ۱۹۱۷ء میں خفیہ معاہدوں کے ذریعہ یہ طے کرلیا کہ اتحادیوں کی فتح کی صورت
میں چین میں جرمنی مقبوضات اور حقوق تام و کمال جاپان کو مل جائیں گے ۔ اور اس کے علاوہ بھی شمالی
چین میں جاپان کے مخصوص اور مزید حقوق تسلیم کرلئے جائیں گے ۔ جب تک یہ معاہدہ نہ ہوگیا جاپان
ہرگز اس بات پر رضامند نہ تھا کہ چین اتحادیوں کا ساتھ دے اور ان کو اپنا ہمدرد بنالے ۔ لیکن اس
خفیہ معاہدے کے بعد سے پھر جاپان کو کوئی ڈر نہ رہا ۔ اس موقعہ پر دو اور ایسی باتیں بھی ہوگئیں جن
سے جاپان کا رہا سہا اعتراض بھی جاتا رہا ۔ اول تو امریکہ جو اب تک غیر جانبدار تھا اب جرمنی کے
مخالف ہوگیا اور اس کی کوشش سے ، اس کے ساتھ متعدد اور حکومتیں بھی جرمنی کے خلاف ہوگئیں ۔
اس سے فتح و شکست کا مسئلہ بھی مشتبہ نہ رہا ۔ دوسرے امریکہ ہی کے کہنے پر چین میں بھی شرکتِ
جنگ کا سوال اٹھا ۔ وزیر اعظم طوآن چی جوئی شرکت کے موافق تھا لیکن صدر مخالف ۔ یہ اختلاف
اس قدر بڑھ گیا کہ سارے ملک میں پھیل گیا ۔ اس اختلاف کو بڑھانے میں بھی جاپان کا فائدہ تھا کہ اس
سے چین کی قوت گھٹتی تھی ۔ اس لئے اس نے وزیر اعظم کی طرف ہوکر شرکتِ جنگ کا اعلان کرادیا ۔ صدر
نے وزیر کو علیحدہ کردیا ۔ لیکن بیرونی مدد کے زور پر وزیر طوآن نے بغاوت کی ۔ ادھر صدر نے چانگ سن
کی مدد مانگی جس نے جون ۱۹۱۷ء میں معزول بادشاہ کو پھر سے تخت پر لابٹھایا ۔ لیکن طوآن وزیر اعظم
کی مدد سے فتحیاب ہوا اور پیکن فتح کرلیا ۔ صدر کو روپوش ہونا پڑا ۔ طوآن نے نیا صدر منتخب کرلیا ۔
اب معاملہ صاف تھا ۔ چنانچہ جاپان کی رضامندی سے طوآن نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کردیا

(اگست ۱۹۱۴ء) ۔ ادھر جاپان نے اتحادیوں کا طرفدار بن کر چین میں جرمن مقبوضات پر حملہ کر دیا اور
ان سب کو دبا بیٹھا ۔

طوآن کی بغاوت اور بعدہٗ فتح کا مقامی اثر بھی بہت ہوا ۔ ممنوعہ کومن طانگ کے ممبر پھر
ایکبار جمع ہوئے اور وزیر اعظم کے اس خود مختارانہ رویہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ۔ اور ڈاکٹر
سن یت سین کی صدارت میں ایک عارضی اور متوازی حکومت کانٹن میں قائم کر لی ۔ اس نئی حکومت
نے چاہا کہ غیر ملکی اس کو باقاعدہ اور چین کی اصلی حکومت گردانیں ۔ لیکن ظاہر ہے کہ غیر ملکی بھلا ایسا
کیوں کرتے ۔

۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کے اختتام کے بعد وارسائی امن کانفرنس میں چین بھی شامل
ہوا ۔ اور فاتحین کی صف میں شامل ہوا ۔ یہ صحیح ہے کہ جنگ میں چین نے کوئی خاص مدد اتحادیوں کو
نہیں پہنچائی [۱] لیکن یہی حال جاپان کا تھا ۔ وہ بھی محض انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہوا تھا ۔
امن کانفرنس میں فاتحین دونوں دونوں ہاتھوں سے مال غنیمت لوٹ رہے تھے ۔ چین بے چارے
نے کوئی نئی چیز نہیں مانگی بلکہ صرف یہ خواہش کی کہ چین میں جو جرمنی مقبوضات ہیں وہ واپس چین کو
مل جائیں اغیار کے حلقہ اثر میں نہ رہیں ۔ جو ریلیں ۔ ڈاکخانے وغیرہ ملک میں موجود ہیں ان کا اختیار
چینی حکومت کو ہی مل جائے ۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا ۔ جرمنی مقبوضات جاپان
کو ملے ۔ صرف یہی نہیں بلکہ منچوریا میں اس کے خاص حقوق تسلیم کئے گئے ریل و ڈاکخانے کے مطالبہ
کو یہ کہکر ٹال دیا گیا کہ ان چیزوں کا امن کانفرنس سے کوئی تعلق نہیں ۔ غرضکہ فاتحین میں ایک صرف
چین ہی تھا جو بجائے فائدے کے اور الٹا کھو بیٹھا ۔ اسی زمانے سے چین میں جاپان کے خلاف سخت

---

[۱] چینیوں نے کوئی لڑائی نہیں لڑی ۔ سوائے اس کے کہ بحرہ چین میں جو جرمن جہاز تھے ان کو ضبط
کر کے اتحادیوں کے حوالے کر دیا ۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ پچھتر ہزار چینی مزدور فرانس اور میسوپوٹیمیا میں
کیمپ میں کام کرتے رہے ۔

نفرت پیدا ہوگئی اور اسی وقت سے اسے اپنے مخلص دوست یعنی امریکہ کی ہٹ دھرمی کا بھی پتا چل گیا ۔ سب کے بدلے چین کو یہ حق دیا گیا کہ وہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشن) کا ممبر ہوسکے گا اور بڑے زور شور سے یہ کہا گیا کہ یہ ایسی عزت افزائی ہے کہ جس پر چین جتنا بھی خوش ہو کم ہے[۵۱] ۔

امن کانفرنس میں ناانصافی ۔ جاپانیوں کی بڑھتی ہوئی دست بُرد ۔ ڈاکٹر سن یٹ سین کی تعلیم اور زبان میں انقلابی اصلاحات اور پھر شانگہائی کی ہڑتال[۵۲] یہ ایسی چیزیں تھیں کہ کم از کم کچھ روز کے لئے تو تمام چین کو متحد کر دیا ۔ اور سب نے مل کر قومی فلاح اور بہبودی کی طرف توجہ کرنی شروع کی ۔ چنانچہ واشنگٹن کانفرنس منعقدہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں چینیوں نے متفقہ طور پر وہی مطالبات پیش کئے جو امن کانفرنس میں کئے تھے اور یہ بھی چاہا کہ محاصل میں جو پابندیاں ہیں وہ توڑ دی جائیں اور چین کو اختیار ہو کہ وہ درآمد پر مناسب محصول لگائے ۔ اس دفعہ کچھ یونہی سی اشک شوئی ہوگئی ۔ ڈاکخانہ اور بعض ریلوں کا انتظام چینیوں کو دے دیا گیا ۔ شان تنگ میں جاپانی اثر کم ہوگیا ۔ اور محصول کے بارے میں گو پابندیاں وہی رہیں لیکن یہ طے ہوگیا کہ اب تک تو نامشی ۵ فی صدی دیا جاتا تھا اب واقعی ۵ فی صدی دیا جائے ۔

---

۵۱ گو بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ یہ بھی چین کے لئے کچھ فائدہ مند چیز ثابت نہ ہوئی ۱۹۲۶ء میں (اور اسی سال چین ممبر بھی ہوا تھا) شہر وان سین پر جو مطلق بے اسلحہ اور بے فوج کے تھا گولا باری کی گئی ۔ پھر ۱۹۳۵ء میں جاپان نے مانچکاؤ دبا لیا ۔ لیکن لیگ کوئی مدد نہ دے سکی ۔

۵۲ شانگہائی میں ایک جاپانی کارخانے میں ایک بارہ سالہ بچی عورات کی بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی پر تھی ۔ ذرا سی سستی پر جاپانی مستری نے بری طرح زدوکوب کیا ۔ اس کی حمایت میں چینی مزدوروں نے ہڑتال کر دی اور مظاہرہ کیا ۔ جس پر پولیس نے گولیاں چلائیں اور کئی چینی طلباء مر گئے ۔ اس پر تمام ملک میں اشتعال پھیل گیا ۔

لیکن چین کی یہ متحدہ کیفیت قائم نہ رہ سکی ۔ جاپانی اثر نے جلد ہی خانہ جنگیاں شروع کرادیں۔ منچوریا کا چانگ سولن[۵] اس کے کہنے پر ہر طرح لڑنے پر تیار رہتا۔ جنوب میں ڈاکٹر سن یت سین کی حکومت عارضی زندگی جی رہی تھی۔ لیکن شمال کی حالت زدہ تھی ۔ بالآخر ۱۹۲۱ء میں سوشی چانگ نے استعفٰے دیدیا ۔ اور صدارت کے لئے دوبارہ لی یوآن ہنگ منتخب ہوا ۔ ۱۹۲۴ء میں غیر ملکی اثرات کی وجہ سے پھر شمال میں سخت قسم کی خانہ جنگی شروع ہوگئی ۔ مارچ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر سن یت سین فیصلہ کرانے کی نیت سے پیکن گئے ۔ لیکن بدقسمتی سے اسی مہینے کی بارہ تاریخ کو ان کا انتقال ہوگیا لیکن اس واقعہ نے ان کو مہاتما بنا دیا ۔ اور ملک ان کے پروگرام کو پورا کرنے کے لئے ٹوٹ پڑا۔ یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ڈاکٹر سن یت سین کے پروگرام کا خاکہ ہدیہ ناظرین کریں جس کو چینی الہام سے کم نہیں سمجھتے :-

یہ پروگرام تین اصولوں پر قائم ہے ۔ اور وہ تین اصول یہ ہیں :-

۱۔ وطنیت :- اس کے تحت میں اپنی قوم کو ابھارنا اور زندہ بنانا ہے ۔ تاکہ دیگر اقوام کے ہمسر ہوسکے۔

۲۔ جمہوریت :- اس کے تحت میں دو چیزیں آتی ہیں :-

(الف) انتظام حکومت :- اور اس کے پانچ شعبے ہیں :-

(i) مجلس قانون ساز

(ii) محکمہ عدالت

---

[۵] :- جاپان نے اس جنرل کو لاتعداد قرضہ اسی غرض سے دیا تھا۔ بلکہ اس کو ہر قسم کی مدد دیکر وہ چاہتا تھا کہ چانگ سولن سب پر حاوی آجائے اور دوبارہ بادشاہت قائم کرے ۔ اس صورت میں چین میں جاپان کا عمل دخل مکمل ہوجاتا ۔ لیکن دوسری غیر ملکی طاقتیں اس انتظام سے خوش نہ تھیں ۔ وہ ایک اور گڈے کو تخت پر بٹھانا چاہتی تھیں ۔ چانگ سولن ۱۹۲۸ء میں ریل کے ڈبے میں بم پھٹنے سے ہلاک ہوگیا اور اس کا بیٹا چانگ سوہ لیانگ اس کا جانشین ہوا ۔ لیکن جاپانیوں کی اس سے نہ بنی ۔

(iii) مجلسِ انتظامیہ

(iv) مجلس برائے تقررِ ملازمین حکومت و امتحانات

(v) مجلس برائے قیامِ امن و پولیس

(ب) تحفظِ حقوقِ عوام (جس میں۔ رائے۔ انتخاب۔ آزادیٔ رائے و تقریر و تحریر نمائندگی وغیرہ سب آتے ہیں۔

۳۔ اشتراکیت۔ اس کے تحت میں کسانوں اور مزدوروں کے معاشی حقوق کا قیام ہے۔ تاکہ ان لوگوں کی حالت سدھر سکے اور قوتِ لایموت اور ضروریاتِ زندگی کا ٹھکانہ ہو جائے ڈاکٹر سن یٹ سین کا قول تھا کہ "ہمیں سرمایہ داری سے لڑنا نہیں ہے بلکہ ہماری لڑائی تو فاقہ اور قلت سے ہے۔"

ڈاکٹر سن یٹ سین کے انتقال کے بعد لوگوں میں ان کے پروگرام کو کامیاب بنانے کا غیر معمولی جوش پھیل گیا۔ اسی میں روس کے اشتراکی لیڈر خصوصاً بورو ڈن بھی شامل ہوئے اور اس پروگرام کو حتی الوسع کامیاب بنانے میں مدد دینے لگے۔ گویا اب یہ ایک نئی کومن طانگ پیدا ہو گئی اس وقت اس کے کارپردازان میں مسز سن (اہلیہ صاحبہ ڈاکٹر سن یٹ سین) سن فو (فرزند ڈاکٹر سن یٹ سین) ٹی۔ وی۔ سونگ (مسز سن کے بھائی) اور چانگ کائی شک (جن سے مسز ٹی۔ وی۔ سونگ کی بہن منسوخ ہیں) تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں جنرل چانگ کائی شک[1] نے شمال پر حملہ کر دیا اور سب کو شکست

---

[1] چانگ کائی شک کی فوجی تعلیم ماسکو میں ہوئی تھی۔ یہ شروع میں مسلمان تھے۔ لیکن انکی چوتھی شادی مسٹر ٹی۔ وی۔ سنگ کی بہن سے ہوئی جس کے بعد سے عیسائی ہو گئے ہیں۔ مسٹر ٹی۔ وی۔ سنگ چین میں مالیات کے ماہر اور بے انتہا امیر ہیں۔ ان کی دولت اور صلاح ہی زیادہ تر مارشل چانگ کائی شک کی کامیابی کا راز ہے۔ ڈاکٹر سن یٹ سین کی وفات کے بعد خیال تھا کہ ڈاکٹر موصوف کا سب سے بڑا معتمد لیاؤ چنگ کائی اس کا خلیفہ مقرر ہوگا کیونکہ وہ اشتراکیوں کا بھی نمائندہ تھا۔ لیکن اس کے قتل کے بعد بورو ڈن کی مدد سے چانگ کائی شک کو مین طانگ کا صدر بنا دیا گیا۔

سے کرایکن کو کومن طانگ کا صدر مقام بنایا۔ مارچ ۱۹۲۷ء تک اس قومی سپاہ کو بہت سی کامیابیاں حاصل ہو چکی تھیں اور اغیار کا اثر کم ہو گیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس مہم میں بھی اتحاد قائم نہ رہ سکا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۲۷ء کو نانکن کی فتح پر فوج کی اشتراکی جماعت نے شہر میں اس طرح لوٹ مار مچائی کہ ان کے اتحاد عمل کا نتیجہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور جانگ کائی شک وشترک یا اشتراکی جماعت سے الگ ہو کر اپنی جماعت الگ بنانی پڑی جس کا صدر مقام نانکن میں بنایا گیا۔ یہیں سے چین اور روس کی مخالفت شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۷ء کی شنگھائی کانفرنس میں کومن طانگ نے روسی اشتراکیوں کے خلاف فیصلہ کر کے ان سے مقاطعہ کر لیا۔ اور بوروڈن کو نکال دیا گیا۔

کومن طانگ میں شروع ہی سے دو تاثرات کارفرما تھے۔ بعض تو کملاً اشتراکی رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔ یہ کسانوں اور مزدوروں کے طرفدار اور دولت کی مناسب تقسیم کے قائل تھے اور جمہوریت اور قومیت کے تو اسی قدر قائل تھے جتنا کہ اشتراکی لیکن یہ دراصل تجار۔ اور دیگر متوسط درجے کی مخلوق کے نمائندے تھے۔ کسان اور مزدور سے ان کو کوئی خصوصیت نہ تھی۔ اول الذکر پارٹی گویا روسی تجربہ کی مؤید تھی۔ اسی لئے جب مارشل چانگ کائی شک نے اس کی مخالفت کی اور کومن طانگ یا بالفاظ دیگر سارے چین کو اس اثر سے پاک کرنا چاہا تو ملک کے تمام متوسط الحال اشخاص۔ تاجر۔ ساہوکار اور اہل کارخانہ کے علاوہ ماسوائے روس اور غیر ملکیوں نے بھی مارشل چانگ کائی شک کی حکومت کی ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا۔ درآمد کے محصول کا اجارہ ٹوٹ گیا جو چین کے لئے سب سے زیادہ اہم بات ہے۔ برطانیہ نے ہانکو کی مراعات سے دست برداری دیدی۔ دوسری اقوام نے بھی ہمدردانہ اور مساویانہ سلوک برتنے کی کوشش کی۔ گویا نہ صرف ملکی روپیہ بلکہ غیر ملکی روپیہ اور قوت بھی مارشل چانگ کائی شک کے ساتھ ہو گئی۔

۱۹۲۸ء کے شروع حصے میں چین میں ہر جگہ جنگ تھی۔ لیکن اسی سال بہتر صورت ہوتی گئی جرنیل چانگ کائی شک نے اور جرنیلوں سے اتحاد کر لیا اور چاروں طرف سختی سے بدنظمی کو دبانا شروع کیا۔ جاپان شمال میں تکلیف دئے جاتا تھا۔ ۱۹۱۶ء کے بعد اب پھر اس سے کھٹ پٹ ہو گئی لیکن

یہ شعلہ فوراً ہی دب گیا۔ ۱۹۲۸ء کے آخر میں دارالسلطنت پیکن سے نانکن میں آگیا۔ اور یہیں کومن تانگ نے حکومت کا دستور و نظام بنایا جو یہ ہے:۔

سارا ملک ۲۸ صوبوں میں منقسم ہے۔ جن میں ۱۹۱۵ ضلعے اور ۱۱ بلدیہ ہیں۔ نظام حکومت اسی چربے پر بنایا گیا ہے جو ڈاکٹر سن یت سین نے پیش کیا تھا۔[۵۱] گو ڈاکٹر موصوف کے انتقال کے بعد اس پر دو چیزوں کا اثر پڑا۔ اول تو خود کومن تانگ کے اندرونی اختلاف کا اور دوسرے وہ فوجی سپہ سالار جنھوں نے ۱۹۱۲ء کے انقلاب کو ظہور میں لانے میں مدد دی تھی اپنے اختیارات بہت زیادہ چاہتے تھے۔ ان کے علاوہ طوچن یعنی وہ سپہ سالار جو بدنظمی کے زمانے میں عارضی طور پہ صوبوں کے حاکم بنادئے گئے تھے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ بنا رہے تھے۔ بہر حال ۱۹۲۸ء کے نظام کا خاکہ یہ ہے:۔

۱۔ مجلسِ حکومت: یہ ۱۵ ممبروں کی مجلس ہے۔ اسی کے ہاتھ میں چینی حکومت کے تمام آخری اختیارات ہیں۔ اس کا صدر حکومت چین کا صدر ہوتا ہے۔ اسی کو صلح جنگ معاہدے وغیرہ کے اختیارات ہیں۔ وہی چینی سپاہ کا سپہ سالارِ اعظم ہوتا ہے۔

۲۔ مجالسِ خمسہ۔ جن کو یوآن کہتے ہیں۔ ان کے کام یہ ہیں:۔

ا۔ انتظامیہ

ب۔ قانون سازی

ج۔ عدالت

د۔ تقرر ملازمین حکومت و امتحان و تعلیم

س۔ قیام امن و پولیس

ان مجالس کے صدر مجلسِ حکومت مقرر کرتی ہے۔ اور ان کے آپس کے جھگڑے بھی چکاتی ہے۔

---

۵۱ دیکھئے صفحہ ۱۳۶

امتحان اور تعلیم کے پوآن نے طریقہ تعلیم نئے اصولوں پر قائم کیا ہے۔ پہلے یہ جاپانی طرز پر آزمایا گیا تھا۔
لیکن موجودہ طریقہ تعلیم امریکہ جیسا ہے۔ جس کی تقسیم یہ ہے:۔

۱۔ ابتدائی تعلیم :۔ چھ سال کا نصاب ہے۔ یعنی چھ سال سے بارہ سال تک کی عمر تک۔ یہ دو حصوں میں منقسم ہے یعنی ادنےٰ و اعلےٰ جو ہر ایک تین سال کا ہے۔ قانوناً اتنی تعلیم لازمی ہے۔

۲۔ ثانوی تعلیم :۔ چھ سال کا نصاب عمر بارہ سال سے اٹھارہ سال تک۔ یہ بھی حسب سابق ا۔ نےٰ و اعلےٰ میں منقسم ہے۔ ادنےٰ حصے کے بعد جو طلبا یونیورسٹی میں جانا چاہیں وہ تو معمولی اعلےٰ میں داخل ہو جاتے ہیں اور جو ثانوی تعلیم سے آگے پڑھنا نہیں چاہتے ان کے لئے ثانوی تعلیم کا حصہ اعلےٰ فنی تعلیم کا ہوتا ہے۔

۳۔ اعلےٰ تعلیم :۔ چار سال کا یونیورسٹی کا نصاب

اس کے علاوہ نورمل اور فوجی تعلیم کے لئے بھی مدارس ہیں۔ بعض جگہ ثانوی تعلیم کی جگہ صنعتی تعلیم کا نصاب ہے۔ اور پھر اسی مناسبت سے اعلیٰ تعلیم یونیورسٹی کی ہے۔

انتخاب کے مراحل ابھی طے نہیں ہوئے ہیں اور انہی پر کومن طانگ میں اس قدر اختلاف ہے۔ اغلباً کومن طانگ کے نمایندے صوبوں کی مجالس میں جائیں گے اور وہاں سے پھر مرکزی مجلس میں۔

عدالت کے معاملے میں چین کا انتظام ابھی تک بہت عجیب تھا۔ عدالت محض فوجداری تھی۔ دیوانی اور مالی کا نہ کوئی قانون نہ عدالت۔ اس قسم کے تنازعے اغلباً بہت کم ہوتے ہوں گے۔ اور جو ہوئے بھی تو ان کو سرپنچ یا مختلف تجارتی انجمنیں خود ہی فیصل کر لیتی ہوں گی۔ اسٹامپ وکیل یا استغاثہ کچھ نہیں۔ منصف ہر وقت کا نوکر ہے۔ فریادی کسی وقت بھی عدالت کا گھنٹہ بجادے منصف کو اسی وقت مقدمہ کی سماعت کرنی پڑتی ہے اور کم سے کم وقت میں طے کر کے سزا بھی فوراً ہی دے دی جاتی ہے۔ صرف موت کی سزا کی منظوری حکام بالا (پہلے شاہنشاہ) کی طرف سے آتی ہے عام طور پر یہ سزا بھی

دی جاتی ہیں :-

ہنٹر لگانا ۔ کوڑے لگانا ۔ شہر بدر کرنا ۔ ہمیشہ کے لئے جلا وطن کرنا ۔ سزائے موت جو بذریعہ پھانسی یا گردن زدنی دی جاتی ہے ۔ سزائے موت کے ساتھ کسی عضو کو قبل موت یا بعد از موت کاٹا بھی جا سکتا ہے ۔ گو کہا جاتا ہے کہ عملاً ایسا بہت کم ہوتا ہے[۵۱] سزائے قید تعزیرات چین میں تھی ہی نہیں ۔ لیکن ۱۹۰۶ء سے شامل کر لی گئی ہے ۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان بہت سے دیوانی و دیگر قوانین بھی مرتب کئے گئے ۔

گاؤں کا انتظام وہی پرانی طرز پر ہے کہ گاؤں کا مکھیا یا سرپنچ ہی وہاں کا حاکم اعلیٰ ہوتا ہے ۔ مگر یہ نظام اور دستور ابھی تک تو محض کاغذ ہی پر ہیں ۔ کیونکہ خانہ جنگیوں سے کسی کو فرصت ہی کہاں ملی کہ کوئی تعمیری کام کیا جائے دستور کو عمل میں لانے کی دقتوں کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ کس طرح فوجی سپہ سالار اور طوچن اپنے اپنے مخصوص حقوق پر اڑے ہوئے ہیں ۔ شمالی چین کا سپہ سالار چانگ سوہ لیانگ اسی بات پر ۱۹۳۰ء میں بگڑ بیٹھا اور پیکن پر اپنی حکومت جمالی ۔ لیکن اس وقت یہ چنگاری آسانی سے دب گئی اور صلح ہو گئی ۔

کومن طانگ کی اشتراکی پارٹی بھی بالکل خاموش نہ تھی ۔ مئی ۱۹۳۱ء میں کانٹن میں اس پارٹی نے ایک متوازی حکومت کی بنا ڈالی اور " جنوب مغربی سیاسی مجلس " کے نام سے کارفرما ہوئی ۔ اسی زمانے میں شمال میں جاپانی فتنہ پھر جاگ اٹھا ۔ منچوریا ۱۶۴۴ء سے سلطنت چین کا حصہ تھا ۔ اس کا رقبہ جرمنی اور فرانس دونوں کے رقبوں کے برابر ہے ۔ ۱۹۲۸ء تک اس علاقے کا صوبہ دار چانگ سولین تھا ۔ اس کے ہلاک ہونے کے بعد اس کا بیٹا چانگ سوہ لیانگ صوبہ دار یا با لفاظ دیگر حکمران ہوا ۔ جاپان کا اس حصہ ملک پر بہت عرصے سے دانت تھا چنانچہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو اس نے مکڈن (منچوریا کا پایہ تخت)

---

۵۱ ۔ انگلستان میں ۱۸۳۲ء تک دو سو سے اوپر جرائم کی سزا موت تھی ۔ ۱۸۷۰ء تک کے قانون میں یہ تھا کہ باغی کو سزائے موت دینے کے بعد اس کی لاش کے چار حصے کر دئے جائیں ۔

پر حملہ کر دیا اس حملے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ جاپانی سپاہیوں کے قواعد کرتے وقت ان سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ریل کی پٹری بم سے اڑا دی گئی جس کے متعلق جاپانیوں کا یہ خیال ہے کہ یہ حرکت چینیوں کی تھی اور اس کا مقصد جاپانی سپاہ کو نقصان پہنچانا تھا۔ اس کے علاوہ دو اور وجوہ بھی بیان کی جاتی ہیں۔ ایک جاپانی افسر کپتان ناکامورا کا وسط منچوریا میں قتل اور دوسرے یکم جولائی ۱۹۳۱ء کا فساد جو چینیوں اور کوریا کے باشندوں میں آبپاشی کی نالی نکالنے میں ہوا۔ لیکن اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حملہ کی وجوہات حسب ذیل تھیں:۔

۱۔ جاپان کو اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ملک معدنیات اور پیداوار کی ضرورت تھی۔

۲۔ چین میں بیداری ہونے کے بعد سے چین کی نئی حکومت منچوریا میں اپنی افواج بھیجنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

۳۔ جاپان نے اسی مقصد کی خاطر چانگ سولن کو بہت روپیہ دیا تھا۔ اور اس کے ہلاک ہونے کے بعد سے حالات ایسے ہوتے جا رہے تھے کہ منچوریا کا جاپان کو ملنا التوا میں پڑ گیا تھا۔

۴۔ لیکن سب سے زیادہ اہم وجہ تو یہ تھی کہ چین کی نئی حکومت نے جاپانی ریلوے (ساؤتھ منچورین ریلوے) کے متوازی ایک اور ریل بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا جس کا لازمی نتیجہ جاپانی ریل کا نقصان تھا۔

بہر حال وجہ خواہ کچھ ہو ہوا یہ کہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو جاپانی افواج نے مکدن پر حملہ کر دیا اور تین دن کے اندر تین شہر (مکدن، چنگ اور کیرن) لے لئے۔ اکتوبر کے شروع میں زیادہ حصہ ملک جاپانیوں کا تھا۔ ۳ جنوری ۱۹۳۲ء کو چن چو اور دوسرے دن شان ہیکوان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس سارے علاقہ میں جاپان نے عارضی صوبجاتی حکومتیں مقرر کیں جن کے حاکم گو چینی تھے لیکن جاپانیوں کے مقرر کردہ۔ اس کے علاوہ ایک مجلس شوریٰ بھی تھی جس کے زیادہ ممبر جاپانی تھے۔ اسی مجلس نے مکدن میں ۱۹ فروری ۱۹۳۲ء میں ایک کانفرنس منعقد کی جس نے نئی حکومت مانچکاؤ کا اعلان کیا اور اس کی صدارت کے لئے چین کے معزول شدہ منچو شاہنشاہ ہنری پو۔ یی (جو دس سال سے جاپانی اسیر تھا) کو تجویز کیا۔ یہ نئی حکومت ۹ مارچ ۱۹۳۲ء کو معرض وجود میں آئی۔ اور جاپان نے اسے تسلیم کیا بلکہ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء کو اس سے ایک

معاہدہ بھی کر لیا۔ فروری ۱۹۲۲ء میں یہ جمہوریت بادشاہت میں منتقل ہو گئی۔ اور صدر شاہنشاہ ہو گیا۔ ۱۹۳۳ء میں اس سلطنت میں جی ہول کا صوبہ بھی شامل کر لیا گیا۔ اور جاپانی فوجوں کا قبضہ دیوارِ چین کے اکثر و بیشتر دروں پر ہو گیا۔

جاپانی خود سری کا ایک فوری اثر تو یہ ہوا کہ نانکن اور کانٹن کی چینی حکومتوں نے ستمبر ۱۹۳۱ء ہی میں باہم سمجھوتا کرنے کے لئے ایک کانفرنس کی۔ لیکن آپس کی ضد نے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلنے دیا۔ لیکن نومبر کے ختم تک سارے ملک کے طالب علم موقعہ پر آجمع ہوئے اور ان کے دباؤ سے چانگ کائی شک اور ان کے ساتھیوں کو میدان چھوڑنا پڑا اور دسمبر ۱۹۳۱ء میں کانٹن کی اشتراکی پارٹی برسر اقتدار ہو گئی۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ بھی چانگ کائی شک کی ایک سیاسی چال تھی۔ عہدے سے الگ ہوتے وقت ان کے وزیر مال نے خزانہ خالی کر کے اشتراکیوں کو سونپا تھا چانگ کائی شک کا یہ خیال تھا کہ کانٹن پارٹی اس صورت میں کسی حالت سے حکومت نہ چلا سکے گی۔ چنانچہ یہی ہوا اور بمشکل ایک ماہ بعد یعنی جنوری ۱۹۳۲ء میں چانگ کائی شک دوبارہ صدر جمہوریت بن گئے۔

مارشل چانگ کائی شک نے منچوریا کے قضیہ سے اپنا دامن بالکل بچائے رکھا۔ اور اپنی فوج کو کسی بلاواسطہ یا بالواسطہ طریقہ پر بھی اس جھگڑے میں نہ پڑنے دیا۔ بعض سخت گیر معترضین نے اس کے اس طرز عمل کو غداری سے منسوب کیا ہے لیکن اصلیت یہ ہے کہ چانگ کائی شک خود اپنی جگہ مستحکم نہ تھا۔ برابر کے فوجی طوچن ہر وقت اس انتظار میں تھے کہ نانکن کی فوج کی توجہ ہٹے تو مرکزی حکومت پر ہاتھ ماریں۔ ان کے علاوہ اشتراکیوں کے منصوبے بھی بالکل ہی تھے۔ ان دو خطروں کی وجہ سے چانگ کائی شک نے یہی مناسب خیال کیا کہ منچوریا کو اس کی قسمت پر چھوڑے رہے اور نانکن میں جا بیٹھا رہا۔

۱۹۳۳ء میں سارے سال زیچ شان کے دو طوچن انیم کے محاصل پر قبضہ جانے کے لئے لڑتے رہے جس میں تقریباً تین ہزار جانیں ضائع ہوئیں۔ ۱۹۳۴ء میں مارشل چانگ کائی شک کے زیر اثر چھ صوبوں سے زیادہ نہ تھے۔ اس کے مغرب میں تین چار صوبے کملاً اشتراکی تھے۔ جنوب میں کانٹن کی اشتراکی پارٹی

ایک الگ کومن طانگ بنائے بیٹھی تھی۔ شمال میں سنچوریا۔ جی ہول۔ وسط منگولیا اور ہوپی میں اصل حکومت جاپان کی تھی۔ مرکزی حکومت بھی جمہوریت سے کوسوں دور تھی۔ بلکہ اس کی صورت ایک مجموعی آمریت کی تھی۔ مختلف یوآن کے صدر بھی عوام کے نمایندے نہ تھے بلکہ کومن طانگ کے ممبروں میں سے مقرر کردئے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ سنہ ۱۹۳۲ء میں چین کی حالت بہت زدہ تھی۔ فروری سنہ ۱۹۳۲ء میں شمال میں مکمل طریقہ پر مانچکاؤ کی کم وبیش جاپانی سلطنت قائم ہوگئی۔ تو وہ جھگڑا مٹا۔ اس کے بعد سے نسبتاً امن کی سی کیفیت ہے۔ مارشل چانگ کائی شک موجودہ صدر و سپہ سالار اعظم چین کے سامنے ایک عظیم الشان کام ہے اور وہ چینی قومیت کی تجدید اور اس میں دوبارہ جان ڈالنا ہے۔ ملک میں خودداری اور زندگی کا احساس پیدا کرنا، حکومت کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنا، اصول اور حکومت کی پابندی باقاعدگی نظم اور باضابطگی کی تعلیم دینا، حکومت کو رشوت، نااہلی غداری اور خود غرضی کی خرابیوں سے پاک کرنا، مقصد اور عمل میں اتحاد پیدا کرنا یہ ایسی چیزیں ہیں جو موافق سے موافق حالات میں بھی سخت مشکل سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور چین میں تو بلکہ ایسے اثرات زیادہ ہیں اور حاوی تر ہیں جن کے مقصد کی تکمیل ہی چینیوں کی تباہی اور تذلیل میں ہے یہی دو رجحانات ہیں جو چین میں اس وقت دست وگریباں ہیں۔ ایک طرف مارشل چانگ کائی شک تعمیری پروگرام میں لگے ہوئے ہیں اور حکومت کے استحکام کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کی انفرادی حالت بھی سدھارنا چاہتے ہیں کیونکہ بہرحال حکومت بھی آخر افراد کے مجموعے کا ہی نام ہے۔ اسی لئے انھوں نے "تحریک حیاتِ نو"[15] نکالی ہے۔ جس کا مقصد زیادہ تر اشتراکیوں کی

---

[15] تحریکِ حیاتِ نو۔ یہ تحریک سنہ ۱۹۳۴ء میں مارشل چانگ کائی شک نے نکالی۔ منچو خاندان کے زمانے کی بداخلاقیاں، سپہ سالاروں کی خودغرضیاں اور اشتراکی ایجنٹوں کی ریشہ دوانیاں ملک میں اس قدر سرایت کرگئی تھیں کہ ان کی اصلاح ضروری تھی۔ سنہ ۱۹۲۷ء کے بعد سے مارشل چانگ کائی شک اشتراکیوں سے لڑائیاں لڑتے رہے۔ اور ملک کو ان کے اثر سے پاک کیا۔ اسی اثنا میں انھوں نے یہ سوچا کہ سرخ پروپگنڈے کے خلاف کوئی ایسی تحریک جاری کرنی چاہیئے جو ملک کے دماغ کو مسموم ہونے سے بچائے چنانچہ انھوں نے یہ

ریشہ دوانیوں کی کاٹ ہے۔ دوسری طرف غیر ملکی ہر ممکن طریقہ سے چین کو کمزور اور پامال رکھنے کی کوشش میں ہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غیر ملکیوں کے تعلقات پر ایک اور نظر ڈال لی جائے کیونکہ چین میں چینیوں سے زیادہ اہم غیر چینیوں کی نقل و حرکت ہے۔

جنگ عظیم کے بعد چین میں غیر ملکیوں کا توازن اور ان کے مقاصد بالکل بدل گئے۔ فوراً ہی تو جرمنی اور روس اس اکھاڑے سے غائب ہو گئے۔ لیکن روس جلد ہی پھر آن دھمکا۔ امریکہ، انگلستان اور دوسری یورپی طاقتوں کا مفاد اور مقصد اب صرف یہی ہے کہ چین میں تجارت کی کھلا آزادی رہے اور ساری قومیں مساویانہ حقوق کے ماتحت تجارت کر سکیں۔ ان طاقتوں میں ایک بھی ملک گیری یا سیاسی اقتدار کا خواہاں نہیں ہے[۵۱]۔

---

[۵۱] ملکی نقطہ نظر سے انگریزوں سے اس وقت صرف ایک معاملہ میں رہا ہے یعنی برما اور چین کی سرحد کا معاملہ۔ سو وہ بھی تقریباً طے ہو گیا ہے۔ اس کا تصفیہ کرنے کے لئے مجلس اقوام نے ایک کمیشن مقرر کر دیا ہے جس کا صدر جانبین کے علاوہ ایک تیسرے ملک کا ہے۔ اس کمیشن نے زیادہ تر کام ختم کر لیا۔ اب صرف مغربی شان سٹیٹ میں دو سو میل کا معاملہ رہ گیا ہے۔ کمیشن اس سال بھی کام کر رہا ہے۔ اور خیال ہے کہ دو ایک مہینہ میں یہ قصہ طے ہو جائے گا۔

بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ:۔ تحریک حیات نو نکالی۔ اشتراکیوں کی مخالفت میں مارشل چانگ کائی شک کے خیالات فاشسٹی ہو گئے اور وہ اٹلی اور جرمنی کی تقلید میں ترقی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے کم و بیش اپنی آمریت کا اعلان کر دیا۔ یہ تحریک حیات نو بھی ایسے ہی خیالات کا نتیجہ ہے۔ گو چین کی مناسبت سے اس تحریک کی بنیاد چین کی چار اخلاقی نیکیوں کو بتایا گیا ہے جو یہ ہیں:۔

۱۔ لی ۔ یعنی آداب و تمیز ۲۔ آئی ۔ یعنی اپنی اور دوسروں کی خدمت

۳۔ لین ۔ یعنی صداقت اور دوسروں کے حقوق کا تحفظ ۴۔ چیہہ ۔ یعنی بلند خیالی اور عزت

ان کے ماتحت مارشل چانگ نے چینی قوم کو بے عیب زندگی گذارنے کی دعوت دی ہے۔ اس تحریک کے بعض اوامر و نواہی یہ ہیں:۔

۱۔ بازاروں، دفتروں، مدرسوں اور ریل، ٹریم میں ادب قاعدے کا لحاظ رکھا جائے۔ (باقی)

لیکن جاپان اور روس کا معاملہ بالکل مختلف ہے اور اصلیت یہ ہے کہ اب چین میں غیر ملکی مسئلہ کی اہمیت ہے تو صرف ان دو طاقتوں کی وجہ سے ہے ۔ جاپان اور روس کی دشمنی کوئی نئی نہیں ۔ روس کے اشتراکی ہو جانے کے بعد سے یہ اختلاف اور بھی زیادہ ہو گیا ہے ۔ اس اپنی دشمنی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی اغراض چین سے بھی بہت زیادہ وابستہ ہیں اور دونوں ہی بھی اس کے قریب ترین ہمسائے ۔

اس سوال کا جواب کہ چین میں جاپان کے کیا ارادے ہیں خود جاپان نے کبھی صاف صاف نہیں دیا ہے لیکن یہ چیز کوئی ایسی نہیں جو چھپی رہ سکے ۔ جاپان میں بہت سی ایسی اشیا نہیں ہوتیں جن کے بغیر اس کی صنعت و حرفت ایک دن بھی نہیں چل سکتی ۔ لوہا ۔ روئی ۔ ریشم اور دیگر اجناس ات باہر سے

نوٹ بقیہ صفحۂ گزشتہ :-

۲ ۔ دھوکا ، جعل اور رشوت سے بالکل الگ رہا جائے ۔

۳ ۔ بازاروں اور دیگر عام مقامات پر تمباکو نوشی نہ کی جائے ۔

۴ ۔ جوا اور افیون کی قطعاً ممانعت ہے ۔

۵ ۔ عورت اور مرد کے مشترک حمام ناجائز ہیں ۔ مخرب اخلاق کتابوں اور تصویروں کا دیکھنا اور رکھنا ناجائز ۔

۶ ۔ کوڑھ اور جذام کی بیماری والے سر بازار آزادانہ پھریں نہ بھیک مانگیں ۔

۷ ۔ تھیٹر یا کسی عام جلسے میں ہر شخص کو ٹوپی اتارنی چاہیے ۔

۸ ۔ "علم برداری" کے جلسے میں سب کی حاضری لازمی ہے ۔

۹ ۔ کوئی شخص ایک وقت کے کھانے پر دس ڈالر سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتا نہ چند ڈالر سے زیادہ قیمتی تحفہ کسی کو دے سکتا ہے ۔

۱۰ ۔ نمائش اور نزاکت کی مخالفت کی گئی ہے ۔ حجاموں کو ہدایت ہے کہ وہ کسی کے بال گھونگھر والے نہ بنائیں اس کے علاوہ حفظان صحت ، مناسب غذا اور نجی زندگی کے متعلق بھی ہدایتیں دی گئی ہیں ۔ ہر خاندان کو حکم ہے کہ تین ماہ تک روز اپنے نوکروں کو ایک ایک گھنٹہ کی چھٹی دیں تاکہ وہ اصلاحی درس میں شریک ہو سکیں ۔ اس تحریک کا ایک یہ بھی اثر ہوا کہ اس کے ممبروں میں غول کے غول بیک وقت شادیاں کر رہے ہیں ۔

خریدنی پڑتی ہیں۔ یہ ساری چیزیں چین میں با افراط دستیاب ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔ جاپان کی خواہش ہے کہ چین کی منڈی ہمیشہ اس کے ہاتھ میں رہے تاکہ وہ اجناس ضروری ہمیشہ وہاں سے لیتا رہے اور اپنی مصنوعات وہاں بھیجتا رہے۔

دوسرے جاپان کے سرمایہ دار یہ چاہتے ہیں کہ چین میں نفع بخش کاموں میں روپیہ لگا کر وہاں سے منافع حاصل کریں۔ چین کی حالت برسوں سے اس قدر ابتر رہی ہے کہ وہاں نفع بخش اصلاحات بھی ابھی مطلق نہیں کی گئی ہیں۔ چینیوں کے پاس اس کام کے لئے نہ روپیہ نہ علم۔ جاپانی سرمایہ دار اس حالت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور ریل، نہر، کارخانے، بجلی اور سائنٹیفک زراعت کو کام میں لانا چاہتے ہیں۔

تیسرے جاپان کی سول حکومت کے سامنے وہاں کی آبادی کا سوال درپیش ہے۔ خود جاپان کی وسعت محدود اور تنگ ہے۔ اور آبادی اس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ کچھ ہی عرصے میں سارے جاپانیوں کا جاپان میں رہ سکنا ناممکن ہو جائے گا۔ فی الحال ہی آبادی کا دباؤ بہت زیادہ ہے۔ اس لئے جاپانی حکومت شمالی چین کے کم آباد حصوں کو نوآبادیات کی طرح کام میں لانا چاہتی ہے۔

چوتھے جاپانی فوجی طبقہ (جو اور دوسری ہر قسم کی پارٹیوں سے زیادہ با اثر ہے) یہ چاہتا ہے کہ چین اور اشتراکی روس کے درمیان ایک ایسی آزاد ریاست قائم ہو جائے جو جاپان کے زیر اثر ہو۔ اس کے دو مقصد ہوں گے۔ اول تو روسی اشتراکیت کے مقابلے کے لئے جاپان کے واسطے یہ ایک نہایت عمدہ محاذ ہوگا اور یہاں جاپان اپنی فوجی قوت مستحکم کر کے اشتراکی خدشے کا سد باب کر سکے گا اور دوسرے چین بھی روس کی ہمسائگی سے بچ جائے گا اور اشتراکی اثر سے آیندہ کے لئے محفوظ رہے گا۔ اسی خاطر اب بھی جاپان کے زیر اثر مانچکاؤ، جی ہول، چاہار اور ہوپی ہیں۔ لیکن یہ ویران اور صحرائی علاقے ہیں اور ایسے نہیں جہاں معقول خرچ کرنے کے بعد بھی اتنی آمد ہو سکے جو ایک کثیر جاپانی فوج کے اخراجات کی کفیل ہو جائے۔ اس لئے جاپان کی اصلی خواہش یہ ہے کہ دریائے ہوانگ ہو کے شمال کا تمام علاقہ (پانچ صوبے جن کی آبادی ساڑھے سات کروڑ ہے

یعنی جاپان کی کل آبادی سے بھی زیادہ) اس مقصد کے لئے اسے مل جائے۔[۵۱]

اسی طرح روس کے منصوبے بھی کچھ ایسے ہی سے ہیں۔ تجارت کے علاوہ زیادہ تر اس کا مقصد چین کو اشتراکی بنانا ہے تاکہ اپنے حریف جاپان کی کمل کاٹ کر سکے۔ چنانچہ ان دو ملاؤں کے بیچ میں چین کی مرغی "حلال" ہو رہی ہے۔ چین ان دونوں حکومتوں سے سخت عاجز ہے ۱۹۱۸ء کی امن کانفرنس کے موقعہ پر تو جاپان کی طرف سے اس کا دل بالکل پھٹ گیا اور پھر ۱۹۲۷ء میں نانکن کی فتح کے وقت اشتراکیوں کا وہ سخت مخالف ہو گیا۔ مارشل چانگ کائی شک نے اس وقت سے اشتراکی پروپیگنڈا دبانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن اب بھی ملک کسی ایک بات پر پوری طرح متفق نہیں ہے۔ شمالی چین کے طوطے جاپانیوں کے زیر اثر ہیں۔ شمال مغربی صوبوں میں اشتراکی اثر زیادہ ہے۔ نانکن کی حکومت ابھی کسی لڑائی میں پڑنا نہیں چاہتی خصوصاً جاپان سے اُلجھنے میں اسے خطرہ ہی نظر آتا ہے۔ اس لئے وہ ہر ممکن طریقے پر جنگ کو ٹال رہی ہے۔ شمال مغربی صوبوں کے لوگ اس طرزِ عمل سے خوش نہیں۔ وہ جاپان کے مقاطعے پر مصر ہیں اور حکومت کی خاموشی کو اس کی نااہلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ دسمبر ۱۹۳۶ء میں کن سو اور شن سی کی فوجیں اشتراکی اثر کے ماتحت نانکن حکومت سے بگڑ بیٹھیں۔ اور مارشل چانگ کائی شک کو مخالف فوجوں کے جنرل چانگ سولیانگ نے سیان فوہ میں ۱۵ روز تک قید رکھا۔ یہ فتنہ ابھی تک پوری طرح دبا نہیں ہے۔[۵۲]

---

۵۱ ان میں سے بعض نکات کو ایک مضمون میں اور زیادہ وضاحت سے بتایا گیا ہے جو حال میں اخبار اسٹیٹسمین میں شائع ہوا۔ (دیکھو "جاپان کے منصوبے" اسٹیٹسمین ۱۶ اور ۱۸ جنوری ۱۹۳۷ء)۔

۵۲ اس قضیہ کی مختصر سی تاریخ یہ ہے :-
صوبہ شن سی میں اشتراکی اثر زائل کرنے جنرل چانگ سولیانگ کی فوجیں بھیجی گئیں۔ لیکن وہ خود ہی اس رنگ میں رنگی گئیں۔ اور نانکن حکومت سے جاپان کے خلاف جنگ کا مطالبہ کیا۔ اس بے چینی کو دبانے خود مارشل چانگ کائی شک وہاں گئے لیکن مخالف فوج نے ان کو سیان فوہ میں گرفتار کر لیا بہت خطرہ کے بعد بالآخر مارشل

ملکی بدامنیوں، جاپانی دھمکیوں اور اشتراکی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہنے کی صرف یہی صورت ہے کہ حکومت کے پاس سرگرم ہوئی۔ وفادار معقول فوج اور دیگر سامانِ مدافعت ہوں۔ دو چار برس پہلے تک محکمہ مدافعت حسبِ ذیل پر مشتمل تھا۔

بری طاقت:۔ چین کی کل فوج اغلباً ۲۰ لاکھ ہوگی۔ لیکن اس کے یا اس کے سپہ سالاروں اور ان کے نظام کے متعلق بہت نامکمل واقفیت ہے۔

بحری طاقت:۔ ۱۸۸۱ء میں پہلی بار بحری بیڑا بنایا گیا تھا۔ لیکن نسبتاً زیادہ مضبوط ہونے کے باوجود بدانتظامی کی وجہ سے ۱۸۹۴ء میں جاپانی بیڑے سے ہار گیا۔ ۱۹۱۰ء سے نظام قائم ہوا ہے۔ لیکن اب موجودہ بحری طاقتوں کے مقابلے میں چین کا بیڑا نہایت حقیر سا ہے۔ ہر قسم کے کل ملا کر بارہ پندرہ جنگی جہاز ہیں۔

ہوائی طاقت:۔ اس کی حالت بحری طاقت سے بہتر ہے۔ تقریباً پندرہ سو ہوائی جہاز اس

نوٹ:۔ بقیہ صفحہ گذشتہ۔ چانگ کائی شک مع اپنے گرفتار کرنے والے جنرل چانگ سُو لیانگ بخیریت نانکن پہنچ گئے۔ جنرل چانگ سُو لیانگ پر دکھاوے کا ایک مقدمہ چلایا گیا اور ۲ جنوری ۱۹۳۷ء کو ان کو دس سال قید کا حکم سنا دیا گیا۔ دوسرے دن یہ سزا معاف کر دی گئی۔ مارشل چانگ کائی شک کی گرفتاری کے ایام میں نانکن کی فوج نے نہایت تحمل اور بُردباری سے کام لیا۔ لیکن ان کی رہائی کے بعد مرکزی فوج نے اس بغاوت کو کما حقہ دبانا چاہا۔ اس پر ۹، ۱۰ جنوری کو آپس میں کچھ جھڑپ بھی ہوئی جس کی وجہ سے سیان فو کے انگریز و امریکن باشندوں کو نکالنے کی تجویز بھی کی گئی۔ ۱۱ جنوری سے ۱۴ جنوری تک سیان فو پر کملا سرخ فوجوں کا قبضہ رہا۔ مرکزی حکومت کی کوشش اب اس فتنہ کو بغیر لڑائی کے دبانے کی ہوئی اور اسی لئے یہ صلاح ہوئی کہ جنرل چانگ سُو لیانگ کو پھر شمال مغربی افواج کا سپہ سالار بنا دیا جائے۔ ۱۸ جنوری تک عارضی صلح رہی لیکن ۱۹ کو یہ امید ٹوٹ گئی اور پھر ہوتین کے مقام پر حکومت اور جنرل یانگ ہو چین کی فوجیں ٹکرائیں۔ حکومت کو کامیابی ہوئی لیکن ۲ فروری کو پھر سیان فو اشتراکیوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ اور انھوں نے مطالبہ کیا کہ ان کے سردار چانگ سولیانگ کو واپس کیا جائے۔ لیکن یہ خودسری زیادہ عرصہ قائم نہ رہی۔ ۹ فروری ۱۹۳۷ء کو سیان فو حکومت نے فتح کر لیا۔

محلے میں ہیں۔ لیکن اب کچھ عرصے سے لازمی فوجی ملازمت کے اصول پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس لئے فوج کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے جنرل فان سیکٹ اور ۰۰ دیگر جرمن فوجی افسروں کے زیر تعلیم ۱۲ ڈویژن بالکل نئے اصولوں کے ماتحت تیار کئے گئے ہیں جن کے آگے اب کسی صوبجاتی فوج کی کچھ پیش نہیں جاتی۔

فوج اور جنگ کے سامان بڑھانے اور معقول بنانے سے بہت سی مشکلات کا حل تو بے شک ہو گیا اور ہو جائے گا لیکن اس میں دو قباحتیں ایسی ہیں جن کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔ اول تو یہ کہ اندرونی بغاوتوں کو زور کرنے کے لئے تو بے شک مناسب اور کافی فوج مہیا ہو سکتی ہے۔ لیکن غیر ملکی دشمن کے مقابلے کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چین کا معاملہ اب زیادہ تر جاپان اور روس سے ہے اور ان دونوں کے پاس اس قدر سامان جنگ ہے کہ چین خواہ کچھ بھی کرتے اس کا عشر عشیر بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ دوسری چیز اس سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے اور وہ ایسی ہے کہ اندرونی ملکی بغاوتوں کو دبانے کے لئے جس قدر سامان جنگ کی ضرورت ہے اس کے پورا کرنے میں بھی حارج ہو رہی ہے۔ اور وہ روپیہ کا سوال ہے۔ یکم فروری سنہ ۱۹۳۷ء کے پانیر میں مسٹر جارج ٹیلر نے اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ مرکزی حکومت کی آمد کا بہت زیادہ حصہ مرکزی فوج پر خرچ ہو رہا ہے۔ اور صوبجاتی حکومتوں کی فوجیں زمین کے لگان کا بیشتر حصہ ختم کر دیتی ہیں ملک کی آمد کے مدات محدود ہیں اس لئے مزید آمدنی حاصل کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ کسانوں پہ ٹیکس بڑھایا جائے۔ بعض بعض جگہ تو اب کسانوں کو شروع کے مقابے میں تین سو فی صدی زیادہ ٹیکس دینا پڑ رہا ہے۔ اس چیز کا جو کچھ بھی نتیجہ نہ نکلے وہ کم ہے۔ اور ماہرین کا خیال ہے کہ اگر جلد ہی کچھ نہ کیا گیا تو چین میں سیاسی بے چینی سے کہیں زیادہ یہ معاشی مسئلہ اٹھنے والا ہے۔

سوویٹ روس
شمالی منگولیا
چینی ترکستان
وسط منگولیا
تبت
چین
بحیرہ زرد
مانچوکو
چہار
ہانکو
جاپان کے زیر اثر
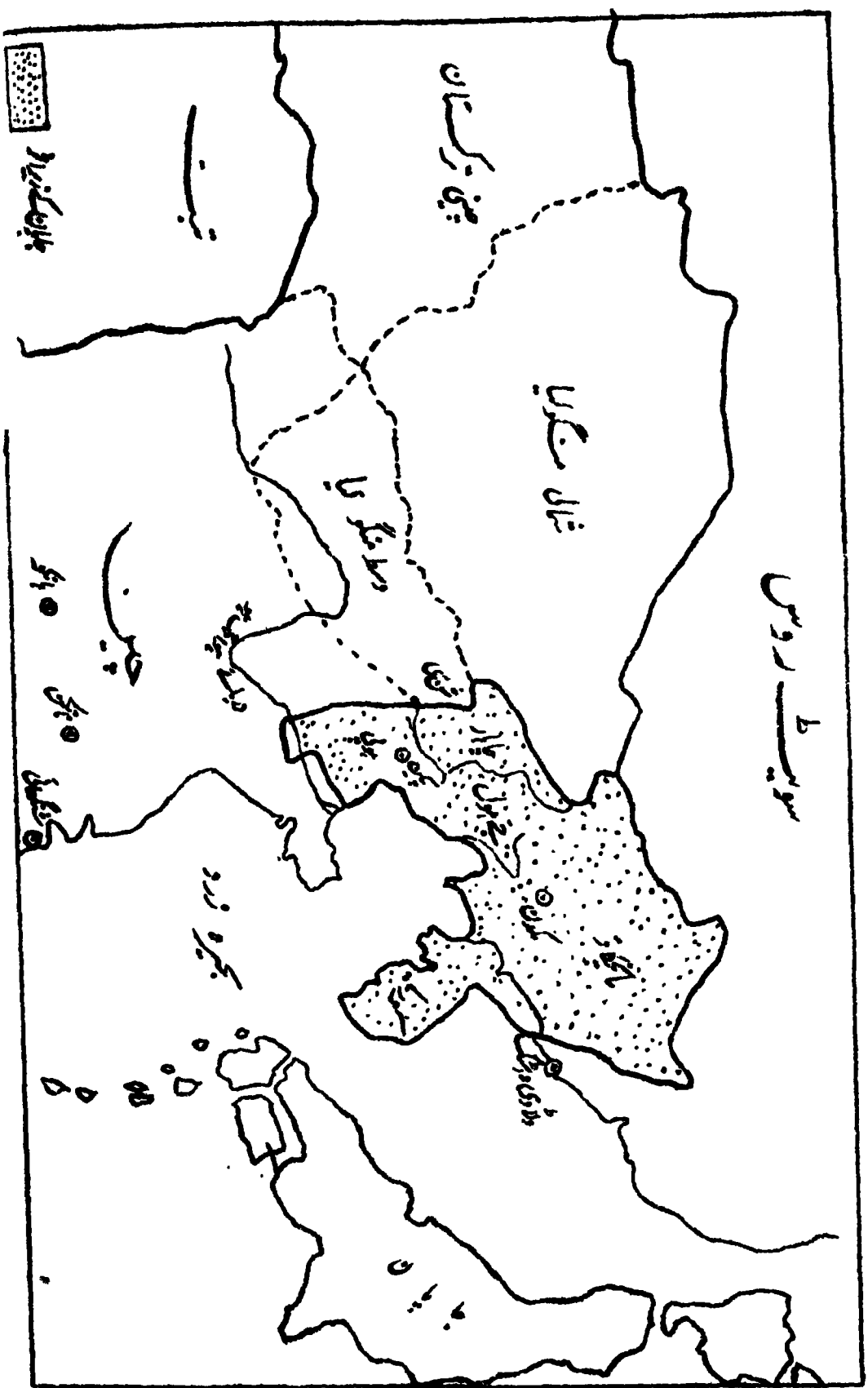
ہندوستانی زراعت کے بعض معاشی مسائل

کھاد کا استعمال

جس طرح انسانوں اور حیوانوں کی پرورش کے لئے مختلف قسم کی غذائیں درکار ہیں۔ اسی طرح پودوں کی نشوونما کے لئے بھی خوراک ضروری ہے۔ اور یہ خوراک مختلف چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ سالہا سال کے تجربوں اور تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ پودے کے پھلنے پھولنے کے لئے جو چیزیں مطلوب ہیں، ان کے منجملہ دس ایسی ہیں کہ جن کے بغیر پودا سرسبز نہیں ہو سکتا، اور وہ یہ ہیں: آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، کاربن، گندھک، فاسفورس، مگنیشیہ، کالسیم، پوٹاس، لوہا، ان میں سے سات چیزیں تو ایسی ہیں جو کافی مقدار میں زمین کے اندر موجود ہوتی ہیں، اور انھیں حاصل کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے باقی تین چیزیں۔ نٹروجن، پوٹاس، فاسفورک ایسڈ، زمین کے اندر کم مقدار میں ہوتی ہیں اور چونکہ وہ فصل کی تیاری کے لئے لازمی ہیں اس لئے انھیں کافی مقدار میں فراہم کرنا ضروری ہے اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے کھاد استعمال کی جاتی ہے اور یہی زراعت میں اس کی اہمیت کا خاص سبب ہے۔ جس طرح موزوں خوراک کی کمی انسان اور حیوان دونوں کو کمزور کر دیتی ہے، اسی طرح کھاد نہ استعمال کرنے سے پیداوار حاصل تو ہو جاتی ہے لیکن خراب قسم کی اور ناکافی مقدار میں۔ جب تک کاشتکار خود اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے خوراک حاصل کرنے کی غرض سے کاشت کرتے تھے، کھاد استعمال نہ کرنے کا نقصان زیادہ نمایاں نہیں تھا لیکن آج کل جب کہ ہر چیز بازار میں فروخت کرنے کے لئے پیدا کی جاتی ہے اور فروشندے ایک دوسرے کے مقابلے پر مال فروخت کرتے ہیں۔ کمترین مصارف سے بیشتر پیداوار حاصل کرنے کا مسئلہ بہت اہم ہو جاتا ہے اور مسئلے کو حل کرنے میں کھاد کا استعمال جس قدر اہم ہے وہ چنداں تشریح کا محتاج نہیں ہے

لیکن باوجود اس اہمیت کے ہندوستانی کاشتکار بالعموم کھاد استعمال کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ملک کے اکثر و بیشتر حصوں میں آبپاشی کی سہولتیں مفقود ہیں۔ اور جہاں پانی ناکافی ہو وہاں کھیتوں میں کھاد ڈالنا بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتا ہے۔ یا کم از کم بے سود ضرور ہے دوسرے کاشتکار کی بے مائیگی، اس کی عام ناواقفیت، اور کھاد مہیا کرنے کی دقتیں اور مصارف۔ یہ بھی بڑی حد تک اس کے استعمال میں مزاحم ہیں۔ تیسری بڑی دقت یہ ہے کہ قدرتی کھاد کا ایک بہت بڑا ذریعہ یعنی مویشیوں کا گوبر، بجائے کھاد کے ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس کی بدولت یہاں کی زرعی زمین اپنے قدرتی حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ جانوروں کے پیشاب اور انسان کے فضلے سے کھاد کا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں اس کے استعمال سے لوگ بہت نفرت کرتے ہیں ان تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی زراعت میں کھاد کا استعمال بہت کم ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں فی ایکڑ پیداوار دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے اور جو پیداوار حاصل ہوتی ہے، وہ بھی خوبی کے لحاظ سے دوسرے ملکوں کی پیداوار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی زمینوں میں پودے کی خوراک کا کام دینے والی خاص خاص اشیاء میں سے جن چیزوں کی کمی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم نٹروجن ہے۔ لہٰذا یہاں کھاد کے متعلق سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ کیونکر نٹروجن کی اس کمی کو پورا کیا جائے۔ فصلوں کی شکل میں نٹروجن کی کثیر مقدار سال بہ سال زمین سے خارج ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کا کوئی جز کسی شکل میں زمین کو واپس نہیں ملتا، گوبر، بھیڑ کی مینگنی، میلا اور نیم اور ارنڈی وغیرہ کی کھلی سے نٹروجن کی کمی پوری کی جا سکتی ہے، لیکن ہمارے ملک میں مویشیوں کا گوبر تو ایندھن کے کام آتا ہے اور قسم قسم کے روغن دار تخم، اناج، چمڑے اور ہڈیاں برآمد کر دی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ثابت نٹروجن کی ایک کثیر مقدار ہر سال ملک سے باہر چلی جاتی ہے۔ غنیمت یہ ہے کہ گرم اور نیم گرم خطوں میں کچھ قدرتی عوامل کا اثر ہی ایسا ہوتا ہے کہ زمین کی کھوئی ہوئی قوتیں اس میں بہ نسبت معتدل خطوں کے جلد عود کر آتی ہیں ورنہ کھاد کے عدم استعمال کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ہماری زراعت کا اور تباہ ہو جانا یقینی تھا۔ تاہم یہ ایک بدیہی بات ہے

کہ جب تک ہمارے کاشتکار اچھی طرح کھاد استعمال نہیں کریں گے، انھیں عمدہ قسم کی فصلیں میسر نہ آسکیں گی اور نہ وہ فی ایکڑ پیداوار کی مقدار ہی خاطر خواہ بڑھا سکیں گے۔

سوال یہ ہے کہ ہندوستانی زراعت میں کھاد کے استعمال کو ترقی دینے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ یہاں کھاد کے متعلق سب سے بڑا مسئلہ نٹروجن کی کمی کا ہے۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ ملک کو اپنے ہی حدود کے اندر نٹروجن حاصل کرنے کے کون کون سے ذرائع میسر ہیں۔ اور ان ذرائع کو ترقی دینے کی کیا صورتیں ہیں اب میں ایسے چند اہم ذرائع اور اُن کے متعلق موجودہ صورت حال اور ضروری اصلاح کی تجویزوں کا ذکر کروں گا۔

(۱) مویشیوں کا گوبر: نٹروجن حاصل کرنے کا یہ ایک اہم ارزاں اور سہل ترین قدرتی ذریعہ ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہندوستان کی زراعت اس کے فوائد سے محروم ہے۔ اول تو ملک کے اکثر علاقوں میں ایندھن کا کوئی اور ذریعہ موجود نہیں ہے، دوسرے یہاں کے دیہات کی عورتیں اُپلوں کو لکڑی اور کوئلہ دونوں پر ترجیح دیتی ہیں۔ جہاں تک اس ترجیح کا باعث محض لاپروائی اور توہمات ہیں۔ اس کا تنہا علاج تعلیم اور پروپگنڈا ہے۔ لیکن جہاں اس کی وجہ لکڑی اور کوئلے کی گرانی ہو وہاں ایک ممکنہ تدبیر یہ ہے کہ دیہات کے قرب وجوار میں جو افتادہ زمینیں مل سکیں ان پر ایسے درخت لگائے جائیں جن کی لکڑی آئندہ مقامی باشندوں کے لئے ایندھن کا کام دے سکے موجودہ جنگلوں کی نگرانی اور مناسب دیکھ بھال سے بھی جلانے کی لکڑی کا ذخیرہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ بعض مقامات میں روئی کے ڈنٹھل، ترلا کی خشک، ٹھونٹھیاں اور ڈنٹھل، جوٹ اور پٹ سن کا گودا اور گنے کا (MEGASS) (جو رس نکالنے کے بعد بچ رہتا ہے) یہ چیزیں ایندھن کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ زرعی کمیشن کا خیال ہے، ان تدبیروں سے استفادے کی گنجائش بہت محدود ہے اور بحیثیت مجموعی مویشیوں کے گوبر کو بجائے ایندھن کے کھاد کے کام میں لگانا۔ یہ حالات موجودہ ایک بہت دشوار امر ہے۔

(۲) مرکب کھاد۔ باوجود اس کے کہ مویشیوں کا گوبر اکثر و بیشتر جلا دیا جاتا ہے اور اس سے کھاد کا کام لینے میں سردست بہت سی دشواریاں موجود ہیں۔ ایک اور آسان اور ارزاں ذریعہ نٹروجن حاصل

کرنے کا ایسا موجود ہے جو تھوڑی سی کوشش اور توجہ سے بہت کچھ ترقی کر سکتا اور ہماری زراعت کو بہت فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دیہات میں گھروں اور راستوں سے جس قدر کوڑا کرکٹ نکلے اور کھیتوں میں فصل کٹنے کے بعد جس قدر گھاس پات، خشک پتے اور ڈنٹھل وغیرہ بچ رہیں ان کو یوں ہی کھلے میدان میں پڑا نہ رہنے دیا جائے، جیسا کہ آج کل بالعموم کیا جاتا ہے اس سے ایک تو گاؤں والوں کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے، اور دوسرے نشروجن حاصل کرنے کا ایک قدرتی اور آسان ذریعہ بے کار ضائع جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر دیہات میں حسب ضرورت گڑھے کھود کر ان میں اس قسم کی تمام چیزیں بہ احتیاط ڈال دی جائیں۔ چند روز بعد عمدہ کھاد دستیاب ہونے کے علاوہ دیہات کی صفائی کا بھی خود بخود انتظام ہو جائے گا اس قسم کی کھاد تیار کرنے میں چین اور جاپان کے کاشتکار بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح چین میں بھی کاشتکار یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ اپنی فصلوں کے لئے گراں قیمت مصنوعی کھادیں استعمال کریں۔ لیکن دوسرے طریقے سے وہ اس کی پوری طور پر تلافی کر لیتے ہیں۔ اور وہ یوں کہ ان کے ملک میں کسی قسم کا کوئی بے کار مادہ نہیں ہے جو کھاد بن کر دوبارہ کھیتوں میں نہ پہنچ لیتا ہو نہ صرف یہ کہ تمام انسانی فضلہ احتیاط کے ساتھ جمع کیا اور کام میں لایا جاتا ہے۔ بلکہ مویشیوں، گھوڑوں، سوروں اور مرغیوں کے فضلات ہر قسم کی گھاس پات، جڑی بوٹی اور اسی طرح کے تمام نباتات کو ملا کر مرکب کھاد کی کثیر مقدار تیار کی جاتی ہے زرعی کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ہندوستانی کاشتکاروں کو اپنے چینی اور جاپانی بھائیوں سے اس بارے میں سبق لینا چاہئے اور کھاد بنانے اور اسے محفوظ رکھنے اور استعمال کرنے کے طریقے سیکھنے چاہئیں۔ زراعت کے محکمہ کے سامنے اس بارے میں جد و جہد کا ایک وسیع میدان کھلا ہوا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان میں کم از کم ایک مثال ایسی موجود ہے جہاں اس طریقے پر عمل کر کے مفید نتائج حاصل کئے گئے ہیں، پنجاب میں ضلع گڑگاواں کے اکثر دیہاتوں میں پروپیگنڈا کر کے گاؤں والوں کو آمادہ کیا گیا کہ وہ گڑھے کھود کر گاؤں کا تمام کوڑا کرکٹ ان میں اکٹھا کریں اور اس میں تھوڑا سا گوبر بھی ملا دیں۔ اس تحریک کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ چند ہی سال کی مدت میں چھ چھ فٹ گہرے اور دس، دس یا بارہ

بارہ فٹ چوڑے کوئی چالیس ہزار سے زاید گڑھے اس غرض کے لئے کھودے گئے۔ یہی نہیں بلکہ گاؤں والوں کو آمادہ کیا گیا کہ وہ انھیں گڑھوں سے بیت الخلا کا کام لیں۔ چنانچہ اس غرض سے ان پر تختے ڈال دیئے گئے اور پوشیدگی کا مناسب انتظام کیا گیا۔ زرعی کمیشن کا بیان ہے کہ جن فصلوں میں یہ کھاد ڈالی گئی ان پر نیز دیہات کی صفائی اور عام حالت پر، اس جد وجہد کا بہت ہی نمایاں اثر ہوا ہے اور اس نے سفارش کی ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی انھیں اصولوں پر کام کیا جائے گڑگاؤں کے اس تجربے کی کامیابی کا سہرا ایک سرکاری عہدہ دار مسٹر برین کے سر ہے جو تجربہ اور پر دیگنڈا گڑگاؤں میں کامیاب ثابت ہوا۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ ضروری، رد و بدل کے بعد ہندوستان کے دوسرے حصوں میں کامیاب نہ ہو

(۳) انسانی فضلہ:۔ ثابت نشر وجن کا تیسرا اہم ذریعہ انسانی فضلہ ہے۔ لیکن ہندوستانی کاشتکار کو اس کے استعمال سے نفرت ہونے کے باعث کھاد حاصل کرنے کا ایک قابل قدر ذریعہ یوں ہی بے کار ضائع ہو رہا ہے لیکن زرعی کمیشن کا بیان ہے کہ اب اس نفرت میں کمی ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ جہاں کہیں انسانی فضلہ پوڈر کی شکل میں دستیاب ہوتا ہے۔ وہاں سے یہ نفرت بالکل غائب ہوتی جا رہی ہے۔ صحت عامہ کے نقطہ نظر سے بھی یہی بہتر ہے کہ فضلہ اپنی اصلی شکل میں نہیں بلکہ پوڈر کی شکل میں استعمال کیا جائے، اور اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ فضلہ کو پوڈر کی شکل میں تبدیل کرنے کی کوئی ایسی ترکیب اختیار کی جائے جو بہت زیادہ گراں ثابت نہ ہو تاکہ اس کی قیمت کاشتکار کی حیثیت سے زیادہ نہ ہو نا سکے اور صوبہ بمبی کے بعض اور حصوں میں اس کے جو اور طریقے اختیار کئے گئے ہیں، وہ بہت کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ اور اس قابل ہیں کہ دوسرے مقامات میں بھی ان کا تجربہ کیا جائے۔ محکمہ زراعت اور بلدیات کے اشتراک عمل سے اس بارے میں بہت کچھ ترقی کی جا سکتی ہے

انسانی فضلے کے استعمال کے خلاف عام تنفر پر غالب آنے کی ایک اور صورت یہ ہے کہ ACTIVATED SLUDGE کا طریقہ اختیار کیا جائے لیکن یہ طریقہ صرف ان شہروں اور قصبوں کے لئے موزوں ہی جہاں

بدرو کا انتظام موجود ہے۔ مزید برآں پوڈر کی شکل میں تبدیل کرنے کی بہ نسبت اس کے مصارف بہت زیادہ ہوتے ہیں گو ساتھ ہی اس میں یہ فائدہ بھی ہے کہ اس کے مطابق تیار کی ہوئی کھاد میں نٹروجن کا زیادہ جز محفوظ رہتا ہے۔ مقامی حالات کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کونسا طریقہ کسی خاص مقام کے لئے زیادہ موزوں ہے

(۴) سبز کھاد :۔ ہری فصل کو جوت کر کھیت میں ملا دینے کو سبز کھاد کہتے ہیں۔" ہمارے ملک کے لئے کھاد کا یہ ذریعہ بہت قابل قدر ہے کیوں کہ اول تو وہ کم خرچ ہے۔ دوسرے جس چیز کی ہماری زمینوں میں خاص کمی ہے یعنی نٹروجن، وہ اس میں بہت کافی مقدار میں موجود رہتا ہے لیکن ابھی عام طور پر یہاں اس سے بہت کم کام لیا جارہا ہے۔ البتہ مختلف صوبوں میں زراعت کے محکموں نے بہت کچھ وقت اور روپیہ صرف کرکے یہ پتہ لگایا ہے کہ کون سی فصلیں سبز کھاد کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ نیز یہ کہ وہ کب بوئی جائیں۔ اور انھیں کس طور پر استعمال کیا جائے چنانچہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس غرض کے لئے پھلی دار پودے، جیسے ارہر، نیل اور مونگ وغیرہ سب سے اچھے ہیں۔ کیونکہ اول تو وہ زمین سے خوراک ہی کم لیتے ہیں دوسرے ہوا کی بہت سی نٹروجن چھوٹے چھوٹے کیڑوں کے ذریعے سے زمین میں جمع کرتے ہیں" زرعی کمیشن کا بیان ہے کہ ہندوستانی کاشتکار اپنے دور فصل میں پھلی دار پودوں کی قدر پہلے ہی سے جانتا ہے لہذا اس بارے میں زراعت کے محکموں کا صرف یہ کام ہے کہ وہ ایسے پھلی دار پودوں کی تحقیق کریں جو زمین کی زرخیزی بڑھانے کے لئے موزوں ترین ہوں اور اپنا اطمینان کرنے کے بعد کاشتکاروں کو ان سے واقف کرائیں۔

(۵) کھلی :۔ لیکن ہندوستان سے ہر سال ان روغن دار تخموں کی ایک کثیر مقدار دوسرے ملکوں کو برآمد کی جاتی ہے سرسوں، السی، نیم، مہوہ، تل، ارنڈی، بنولہ، مونگ پھلی اور اسی قسم کے دوسرے تخموں سے تیل نکالنے کے بعد جو کھلی بچ رہتی ہے۔ وہ بہت فائدے کے ساتھ کھاد کے کام میں لائی جاسکتی ہے۔ اور اس طور پر نہایت مفید نٹروجن حاصل کرنے کا ایک اور عمدہ ذریعہ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ خود ملک میں تیل نکالنے کے بعد جو کھلی بچ رہتی ہے وہ بھی کھاد کے کام

نہیں آتی، کیوں کہ وہ مویشیوں کو کھلا دی جاتی ہے اور مویشیوں کا گوبر بطور ایندھن کے جلادیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس بارے میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ روغن دار تخموں کی برآمد ہی یک لخت موقوف کردی جائے۔ یا کم از کم ان کی برآمد پر بھاری محصول لگائے جائیں۔ لیکن اس سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں آگے چل کر روغن دار تخموں کی کاشت کا رقبہ ہی گھٹ نہ جائے زرعی کمیشن نے اس بات میں اصلاح کی جو تجویزیں پیش کی ہیں وہ یہ ہیں کہ ایک طرف تو ملک میں جدید پیمانے پر تیل نکالنے کی صنعت کو ترقی دی جائے دوسری طرف مویشیوں کے گوبر کو ایندھن کے طور استعمال ہونے سے حتی الوسع بچایا جائے۔ تیل نکالنے کا کاروبار ترقی پانے سے ملک کے اندر کھلی زیادہ مقدار میں دستیاب ہونے لگے گی اور ایندھن کا مناسب انتظام ہونے سے جو کھلی جانوروں کو کھلائی جائے گی، وہ بھی کھاد کے کام آسکے گی۔

(۶) امونیم سلفیٹ :۔ معدنی کوئلہ چونکہ بہت دھواں دیتا ہے اس لئے اس کو صاف کرتے ہیں کہ جلنے میں کم دھواں دے۔ صاف کیا ہوا کوئلہ کوک کہلاتا ہے۔ اور جو میل کوک بنانے میں نکلتا ہے اس میں امونیم سلفیٹ ہوتا ہے جس کو خاص کیمیاوی ترکیب سے تیار کرتے ہیں۔ امونیم سلفیٹ میں قریب ۲۰ فیصدی کے نائٹروجن ہوتی ہے (ص ۵۱) جب سے جمشید پور میں ٹاٹا کا لوہے اور فولاد کا کارخانہ قائم ہوا ہے ہندوستان میں امونیم سلفیٹ کی روز افزوں مقدار پیدا ہو رہی ہے اور یہاں بطور کھاد کے استعمال بھی کی جارہی ہے ہندوستان میں امونیم سلفیٹ بنانے والے اکثر کارخانے برٹش سلفیٹ آف امونیا فڈریشن کے رکن بن گئے ہیں۔ اور اسی وجہ سے یہ ادارہ اپنے کارندوں کے توسط سے یہاں کے کاشتکاروں میں بڑی جدوجہد کے ساتھ پروپگنڈا کر رہا ہے کہ وہ مصنوعی کھادیں استعمال کریں۔ نتیجہ یہ کہ ملک میں امونیم سلفیٹ کی پیدائش کو خوب ترقی ہو رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ملک ہی میں اس کی روز افزوں مقداروں کی کھپت بھی ہو رہی ہے۔ زرعی کمیشن نے اس صورت حال پر بہت اطمینان کا اظہار کیا ہے۔

(۷) ہڈی کا چورا اور پسی ہوئی ہڈی :۔ نائٹروجن کی کمی کو پورا کرنے کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے

مگر اس کی قدر اس وجہ سے زیادہ ہے کہ اس میں نہ صرف نٹروجن کی کافی مقدار ہوتی ہے بلکہ فاسفورک
ایسڈ کا بھی بہت بڑا حصہ پایا جاتا ہے۔ جنوبی ہند میں فاسفیٹ کی کمی بمقابل نٹروجن کے زیادہ
نمایاں ہے اور اسی وجہ سے ان علاقوں میں یہ کھاد زیادہ قابل قدر ہے۔ لیکن ملک میں نٹروجن
حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع کا جو حال ہم اوپر دیکھ آئے وہی حال اس ذریعے کا بھی ہے۔ کیوں کہ ہڈیوں
کی ایک بڑی مقدار چورے کی شکل میں یا پسی ہوئی ہڈی کی شکل میں ملک سے باہر چلی جاتی ہے اور جو
مقدار ملک میں بچ رہتی ہے اس کا بھی بہت تھوڑا حصہ کھاد کے کام آتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں
نقل و حمل کی دقتوں کی وجہ سے باہر سے ہڈی کی کھاد کی مانگ بہت گھٹ گئی تھی اور اس وجہ سے
ملک میں اس کی قیمت بہت گر گئی تھی، لیکن باوجود اس کے مجموعی پیداوار کا دس فی صدی سے زیادہ
حصہ ملک میں صرف نہ ہو سکا حالانکہ اس زمانے میں کاشتکاروں کو اپنی زرعی پیداواروں کی قیمتیں
غیر معمولی طور پر زیادہ مل رہی تھیں۔ ایسی حالت میں یہ تجویز کہ ہڈیوں کی برآمد ہی سرے سے بند کر دی
جائے، کسی طرح مناسب نہیں سمجھی جا سکتی، کیونکہ جو کھاد باہر نہ جا سکنے کی وجہ سے ملک ہی میں پڑی رہ
گی، وہ یہاں کی زراعت میں تو استعمال نہ ہو گی۔ البتہ دوسری طرف ہڈیوں کو پیسنے اور چورا کرنے کی جو
گرنیاں ساحلی شہروں میں آج کل قائم ہیں، وہ تباہ ہو جائیں گی اور مزید براں ملک کا ایک مفلس ترین
طبقہ اپنے ایک ذریعہ معاش سے محروم ہو جائے گا۔ انھیں امور کو پیش نظر رکھ کر زرعی کمیشن نے اس
بارے میں جو سفارش کی ہے، وہ یہ ہے کہ محکمۂ زراعت اول یہ تحقیق کرے کہ کن کن فصلوں میں اور کن
قیمتوں پر ہڈی کی کھاد کا استعمال کاشتکار کے لئے نفع بخش ہو گا۔ پھر یہ دریافت کیا جائے کہ اگر ایسے
زرعی علاقوں میں جہاں کافی مقدار میں ہڈیاں مل سکتی ہوں۔ ان کو پیسنے اور چورا کرنے کی گرنیاں قائم کی جائیں
تو ان کے مصارف کیا ہوں گے اور وہ کن قیمتوں پر ہڈی کی کھاد فروخت کر سکیں گے۔ جب تک ان امور
کی تحقیق ہو کر یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہاں ایسی قیمت پر کھاد فروخت کی جا سکتی ہے جو کاشتکار کی
استطاعت سے باہر نہ ہو اس وقت تک زرعی علاقوں میں ان گرنیوں کے قیام کی سفارش کرنا حکومت
کے لئے مناسب نہیں ہے۔ لیکن ہڈیوں کی کھاد تیار کرنے کے بعض اور طریقے بھی ہیں جن کے لئے

اس قدر اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ کاشتکار چاہیں تو خود اپنے کھیتوں پر بہت تھوڑے خرچ اور معمولی توجہ سے یہ کھاد تیار کرسکتے ہیں۔ اس کے لئے تھوڑا سا گندھک کا تیزاب یا جن دیہاتوں میں یہ دستیاب نہ ہو۔ وہاں مویشیوں کا پیشاب کافی ہو جاتا ہے۔ مگر ہندوستانی کاشتکار نہ مویشیوں کے پیشاب کی قدر جانتا ہے اور نہ اسے جمع کرنے کے طریقوں سے واقف ہے۔ لہذا محکمہ زراعت کے کارکنوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ان امور کے متعلق کاشتکار کو واقفیت بہم پہنچائیں۔ خاص کر ان فصلوں کے لئے جن کے حق میں ہڈیوں کی کھاد بہت زیادہ ضروری اور مفید ہیں۔

(۸) مچھلیوں کی کھاد:۔ مچھلیوں کی کھاد سے بھی، فاسفیٹ اور نٹروجن دونوں چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ مدراس کے مغربی ساحل اور برما کے بعض حصوں سے اور بہت تھوڑی مقدار میں بمبئی اور سندھ سے مچھلیوں کی کھاد برآمد کی جاتی ہے۔ اس برآمد پر محصول لگانا یا اسے بالکل منع کردینا کسی طرح قرین مصلحت نہیں ہے۔ کیوں کہ جو غریب لوگ مچھلیاں پکڑ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں، وہ بلا وجہ اپنے ذریعہ معاش سے محروم ہو جائیں گے اور ساتھ ہی اس کا کوئی یقین نہ ہوگا۔ کہ زراعت میں مچھلیوں کی کھاد کا استعمال ترقی کرے گا۔ زرعی کمیشن کی اس بارے میں یہ سفارش ہے کہ موجودہ قیمتوں پر ہی اس کھاد کے استعمال کو ہندوستانی زراعت میں نفع بخش بنایا جائے تاکہ مچھلیوں کی جو مقدار اب پکڑی جاتی ہے اس میں کمی نہ واقع ہو۔ اور ساتھ ہی وہ باہر جانے کے بجائے ملک کی زراعت میں کام آنے لگے۔

کھاد کے مسئلے کے متعلق زرعی کمیشن نے دو عام سفارشیں بھی کی ہیں۔ ایک یہ کہ بازار میں جو کھادیں عام طور پر فروخت ہوتی ہیں انھیں آمیزش سے محفوظ رکھنے کے لئے زراعت کے محکموں کو چاہئے کہ اُن پر کافی نگرانی رکھیں اور وقتاً فوقتاً ان کے نمونے لے کر سرکاری ماہرین سے اُن کا امتحان کرائیں برطانیہ میں تو اس غرض کے لئے ایک خاص قانون موجود ہے۔ لیکن ہندوستان میں سردست علیحدہ قانون کی ضرورت نہیں ہے البتہ جب کھادوں کی خرید وفروخت کافی ترقی کر جائے اور اُسے نفع بخش پاکر درمیانی اشخاص کثرت سے اس میں حصہ لینے لگیں، یا امتحان کرنے سے یہ معلوم ہو کہ آمیزش

کی خرابی بہت پھیل رہی ہی، تب اس غرض کے لئے ایک علیحدہ قانون نافذ کرنے کی ضرورت پر غور کیا جائے دوسری سفارش یہ ہی کہ کھادوں کے نقل وحمل کے جو کرائے ریلیں وصول کرتی ہیں ان میں تخفیف کی جائے، سرکاری ریلیں تو کھتیوں اور دوسری باربرداری کا کرایہ بہت کچھ گھٹا چکی ہیں۔ ریلوے کمپنیاں بھی اگر اس کی تقلید کریں تو مناسب ہی۔ کھادوں کے استعمال کی بدولت جس قدر پیداوار زیادہ ہوگی اسی قدر ریلوں کو کاروبار زیادہ ملے گا اور انھیں اپنے اس ایثار کا بالآخر کافی معاوضہ مل جائے گا۔

قومی زندگی کی شہ رگیں

قومی زندگی میں بحری، بری اور ہوائی راستوں کو وہی اہمیت حاصل ہے جو جسم انسانی میں شہ رگوں کو ہے۔ ان ہی کے ذریعہ مختلف سلطنتیں محکوم قوموں پر اپنا سیاسی و معاشی اثر اور فوجی اقتدار قایم رکھ سکتی ہیں۔ اگر یہ گرفت ڈھیلی پڑ جائے تو کوئی سلطنت ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے برقرار نہیں رہ سکتی۔

جنگ عظیم کے بعد سے مطمئن حکومتوں بالخصوص برطانیہ اور فرانس اور بین الاقوامی، غیر مطمئن، طاقتوں یعنی جرمنی، اطالیہ اور جاپان کے درمیان مسلسل بحثا بحثی اور جھگڑا ہو رہا ہے۔ قومی زندگی کی یہ شہ رگیں دنیا کے مختلف حصوں میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی یا ٹکراتی ہیں۔ لیکن ابتک ایک نے دوسرے کے مفاد سے مزاحمت نہیں کی ہے کیونکہ کچھ تو بڑی بڑی سلطنتوں نے بعض ایسی رعائتیں کر دی تھیں جن سے کام چلتا رہا اور کچھ غیر مطمئن قوموں نے غیر نزاعی علاقوں پر قبضہ کر کے وقت گذاری کر لی لیکن یہ ترکیبیں ہمیشہ تو چل نہیں سکتیں۔ اگر یہ جھگڑا ذرا بھی بڑھا تو سب تصفیہ یا تو از سر نو کرنا پڑے گا یا لازماً جنگ ہوگی

برطانیہ عظمیٰ ذرا برطانیہ عظمیٰ کے محل وقوع پر نظر ڈالئے اس سارے کے سارے جزیرے کو امریکہ کی کسی ایک بڑی جھیل میں رکھدیا جائے تو پھر بھی جھیل کے اندر کافی خلا رہ جائے۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں ۴½ کروڑ کی ٹھوس اور گنجان آبادی ہے لیکن کوئلہ کے سوائے معدنی پیداوار قریباً ناپید ہے۔ تاہم مقبوضات اور نوآبادیوں کے صدقے یہ چھوٹا سا جزیرہ بہت بڑی قومی سلطنت بن گیا ہے۔ بحر اوقیانوس کے ساحل پر برطانوی مقبوضات پھیلے ہوئے ہیں۔ بحری جنگی اغراض کے لئے بحر ہند پر برطانیہ عملاً قابض ہے۔ بحر روم کے مختصر راستے میں جو ان دونوں سمندروں کے درمیان واقع ہے جگہ جگہ ایسے مقامات ہیں جن پر قلعہ بندیاں

الاسکا
یورپ
ایشیا
ہانگ کانگ
جزائر کناری
کیسابلانکا
سینیگال
افریقہ
بمبئی
فلپائن
جزائر ہوائی
بحر الکاہل
زنجبار
بحر اوقیانوس
بحر ہند
آسٹریلیا
راس اُمید
نیوزی لینڈ
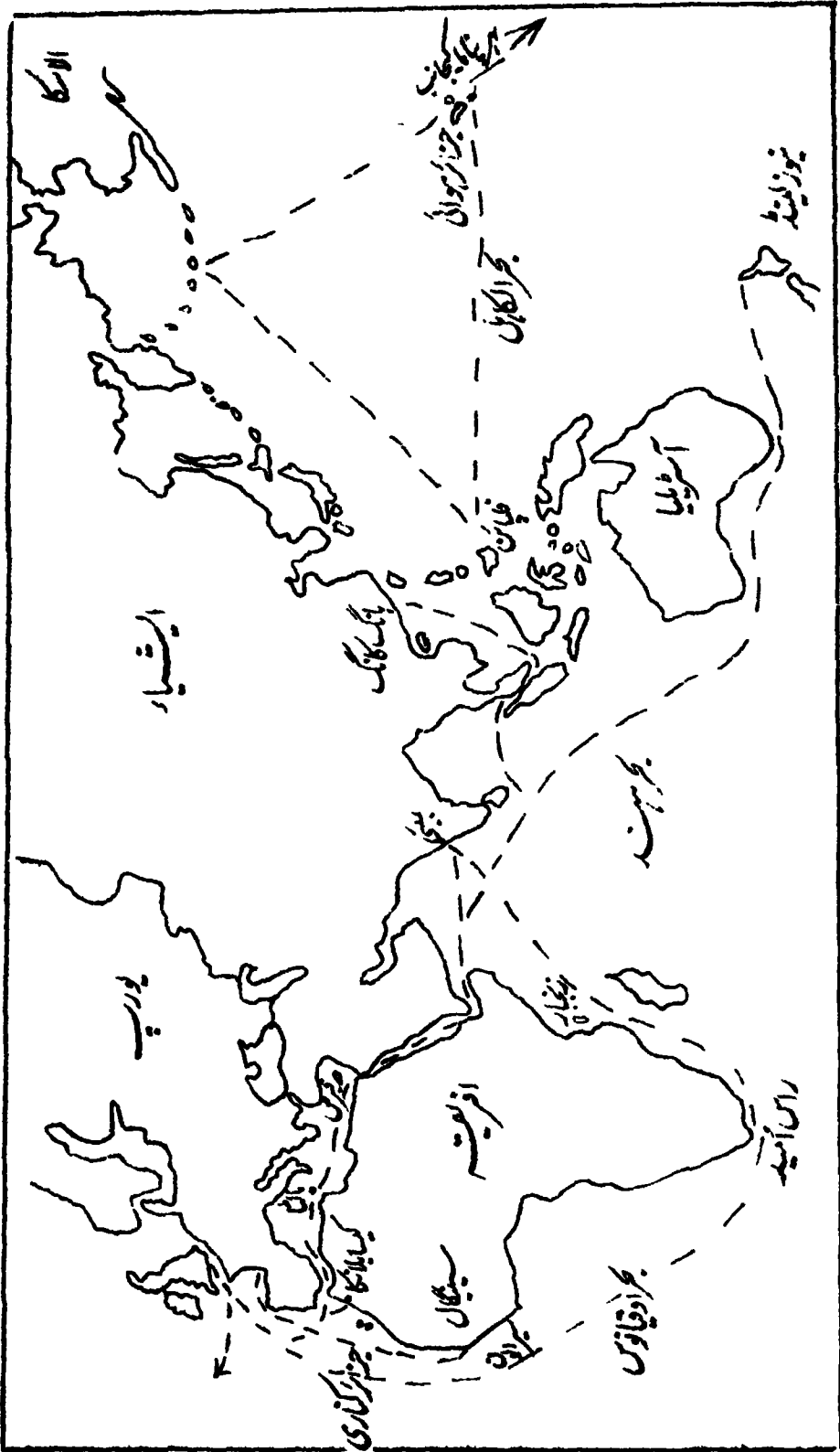
گی گئی ہیں اور اس کے دونوں دروازے برطانوی قلعوں کے ماتحت ہیں۔ مشرق میں سنگاپور بحرالکاہل کے دروازے پر حکمرانی کر رہا ہے چونکہ بحرہ منجمد شمالی روس کے قبضہ میں ہے اسلئے وہ برطانیہ کے اقتدار سے باہر ہے اور سمندر کا یہ ٹکڑا کوئی زیادہ اہم بھی نہیں کیونکہ سرما میں اس کا پانی جم جاتا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ مطمئن ہے کہ جو چیزیں اس کے ہاں نہیں پائی جاتیں وہ باقی دنیا اسے مہیا کر دے گی۔ مثلاً گیہوں کناڈا اور آسٹریلیا سے۔ پیٹرول عراق سے لوہا امریکہ سے روئی مصر سے اور ربڑ ملایا سے فراہم ہوتا رہے گا۔

اب انگلستان کے مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ اول جملہ بیرونی مقبوضات اور سامان رسد کی دور دراز منڈیوں کے ساتھ مناسب سیاسی تعلقات قائم رکھنا۔ دوم ان کے بحری راستوں پر قبضہ و اختیار رکھنا۔ کیونکہ یہ راستے اس کے لئے اصطلاحاً اور واقعتہً زندگی کی شہ رگوں کا حکم رکھتے ہیں۔

پہلی اور نازک ترین برطانوی شہ رگ وہ ہے جو انگلستان سے افریقہ کے انتہائی مغربی سرے یعنی گیمبیا تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ بحری شاہراہوں کے نظام کی بنیاد ہے۔ اس سے بحر اوقیانوس کے راستے، بحرہ روم کا راستہ، اور راس امید سے گذر کر مشرق کو راستے نکلتے ہیں اس کو بحر شمالی کی سمت سے جرمنی سے خطرہ ہو سکتا ہے اگرچہ ہنوز جرمنی کا بحری بیڑہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں۔ انگریزی فرانسیسی اتحاد کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔ برطانیہ اور پرتگال کے گہرے تعلقات کا راز بھی اسی میں چھپا ہوا ہے۔ انگلستان بحر روم کی کسی طاقت کو مشرق کی طرف اپنی راہ میں حائل نہیں دیکھ سکتا نہ اپنے مقدور بھر جزائر ازور اور کناری میں کسی ایسی حکومت کے قیام کی تاب لا سکتا ہے جو اس کی حلیف نہ ہو بحر روم کا مختصر راستہ :- ابتک اس شاہراہ کی اہم ترین شاخ بحر روم کا راستہ چلا آیا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ اس اندرونی سمندری دروازے پر جبل الطارق کے ذریعہ حکمرانی کر رہا ہے جو تنگنائے کے شمال میں ایک بڑا زبردست محفوظ بحری مقام ہے۔ ساتھ ہی برطانیہ نے اس کا خیال رکھا ہے کہ تنجیر جو اس کے جنوب میں واقع

ہے (بین الاقوامی قبضہ کی وجہ سے) غیر جانبدار رہے - جبل الطارق کے مشرق میں بحیرہ روم کا سب سے زیادہ کھلا راستہ واقع ہے جو مالٹا تک بارہ سو میل لمبا ہے۔ مالٹا جزیرہ اسسلی اور ٹیونس کے شمال مشرقی ساحل کی درمیانی آبناؤں سے کچھ دور ایک فوجی اور بحری مرکز ہے چونکہ یہ مقام اطالیہ کے بالکل قریب ہے اس لئے گذشتہ سال برطانیہ اس چوکی کے متعلق مناسب انتظامات کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ گذشتہ ستمبر میں اس جزیرہ کو شاہی نوآبادی میں تبدیل کر دیا گیا جس پر گورنر حکومت کرتا ہے اس کا پہلا کام اطالیہ کا اثر زائل کرنے کی جدوجہد تھی۔ دوم اگرچہ برطانوی بحری بیڑے کا اعتماد مصر کے بحری جنگی مراکز کے محفوظ ہونے پر ہے تاہم مالٹا کی قلعہ بندیاں جزیرے کے نمایاں محل وقوع کے پیش نظر زیادہ مضبوط کر دی گئی ہیں۔

بحیرہ روم کے شمال مشرقی گوشے میں قبرص کا بحری مرکز واقع ہے۔ گذشتہ اکتوبر میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اس جزیرہ میں ہوائی جہازوں اور بحری جنگی جہازوں کے قیام کا بندوبست کیا جائے گا۔ حکومت برطانیہ کے اس اقدام کی وجہ یہ ہے کہ یہ جزیرہ طرابلس اور حیفہ کی حفاظت کرتا ہے اور یہ دونوں بندرگاہیں فرانسیسی اور برطانوی بیڑوں کے لئے تیل مہیا کرتی ہیں پائپ لائن کے ذریعہ یہ دونوں بندرگاہیں اندرون ملک کے تیل کے چشموں سے ملی ہوئی ہیں۔ پہلے تیل کے چشمہ پر کرکوپ کا قبضہ ہے جو عراق پیٹرولیم کمپنی کی ملکیت ہے اور یہ برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کے قریب ایک بین الاقوامی تجارتی ادارہ ہے۔ موصل کا چشمہ جو ٹھیک شمال میں ہے برطانوی آئل ڈیولپمنٹ کمپنی کے ماتحت ہے اور یہ ایک دوسری بین الاقوامی کمپنی ہے۔ اس مقام پر ستمبر ۳۵ء میں جبکہ اطالیہ اور حبشہ کی جنگ زوروں پر تھی خلاف توقع ایک ڈرامہ پیش آیا۔ دو انگریز ڈائرکٹروں نے اس بنا پر استعفے داخل کر دئے کہ تیل کے چشموں پر ایک ایسی کمپنی قابض ہے جسکی باگ ڈور حکومت اطالیہ کے ہاتھ میں ہے۔ جون ۳۶ء میں پابندیاں اٹھا لینے کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا گیا کہ تیل کا چشمہ عراق پیٹرولیم کمپنی نے حکومت اطالیہ سے خرید لیا ہے۔ اٹلی کا حبش پر تسلط برطانیہ کے مفاد کے لئے اتنا خطرناک نہیں جتنا

کہ موصل کے چشموں پر قبضہ و اقتدار تھا۔ برٹش آئل پیٹرولیم کمپنی کی فروخت نے برطانیہ کو پابندیوں کے بارہ میں ایثار دیہ تبدیل کرنے پر آمادہ کر دیا۔

اب آپ جنوب کی طرف اس رستے پر آئیے جو نہر سویز اور بحیرہ احمر سے گذر کر بحر ہند تک پہنچتا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ برطانیہ عظمیٰ مصر میں اپنی فوجی قوت مضبوط کر رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مصری قوم پرستوں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ ۲۶ اگست ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کی اہم دفعات کی رو سے مصر کو آزادی دیدی گئی اس شرط پر کہ وہ برطانیہ کا حلیف رہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر اسکندریہ اور قاہرہ سے برطانوی فوجیں ہٹا کر نہری علاقے میں منتقل کر دی جائیں گی جہاں اُن سے اہم ترین مقصد یعنی نہر سویز کی شاہراہ کی حفاظت کا کام لیا جائے گا۔ ساتھ ہی اسکندریہ اور پورٹ سعید میں محفوظ بحری جنگی مراکز بنائے جا رہے ہیں۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر اندرون مصر میں اسمٰعیلیہ اور ہیلی پولیس میں ہوائی مستقر تعمیر ہوں گے۔

اس سلسلہ کی اگلی کڑی عقبہ ہے جو بحیرہ احمر کے شمال مشرقی گوشہ میں بحری اور ہوائی جہازوں کا ایک مستقر ہے اور مصر۔ فلسطین۔ شرق اردن اور حجاز کی سرحدوں کے قریب واقع ہے۔ بحیرہ احمر کے شمالی دروازہ پر قبضہ مکمل کرنے کے لئے برطانیہ نے جنوبی دروازے کے مشرق میں عدن پر قبضہ کر رکھا ہے اور جزیرہ پیرم پر بھی جو آبنائے باب المندب کے باہر ہے یہ آبنائے خلیج عدن سے ہوتی ہوئی بحر ہند میں جا گرتی ہے۔

راس امید کے راستے مشرق کو:۔ بحیرہ روم کے بارے میں انگلستان کی بے چینی کی شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم اور سر سموئیل ہور کے سفر سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ مانا کہ امن کے زمانہ میں یہ راستہ آسان اور مختصر ہے۔ لیکن برطانیہ۔ فرانس۔ اٹلی۔ جرمنی اور روس کے اہم اغراض کا تصادم جنگ کے زمانہ میں اسے دام موت بنا دے سکتا ہے۔ متعدد حکومتیں اس راستے کو صرف اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ نے اس راستے کے استحکام کی طرف توجہ کی ہے جو راس امید سے مشرق کو جاتا ہے۔

لندن اور کیپ ٹاؤن کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ بحیرہ روم کے راستے بمبئی تک لیکن اس کا محفوظ ہونا وقت کی تلافی کر دیتا ہے۔

اگر ایک لمحے کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ جزائر کناری کسی غیر جانبدار یا حلیف حکومت کے ہاتھوں میں ہیں تو کیپ ٹاؤن تک راستہ صاف ہے۔ جہاں گذشتہ موسم سرما میں انگریزوں نے جنوبی افریقہ کی حکومت کے ساتھ اس بات کا معاہدہ کر لیا کہ وہ اپنے خرچ پر ایک زبردست بحری جنگی مرکز تعمیر کرے گی۔

اس سے آگے بڑھئے تو مدغاسکر اور سی چلس کے مغرب میں زنجبار اور مشرق میں مارشس بحر ہند کے راستے پر سپاہیوں کی طرح پہرہ دے رہے ہیں۔ اس جگہ سے برطانوی جہاز بمبئی یا سنگاپور کو اس قدر بے کھٹکے چلے جاتے ہیں کہ جہاز کا کپتان اطمینان سے سو سکتا ہے۔ چونکہ دونوں سروں پر عدن اور سنگاپور نیز لنکا اور ہندوستان

کے جنوب میں) مجمع الجزائر اس کے وسط میں واقع ہیں لہذا بحر ہند پر عملاً برطانیہ قابض ہے
انگلستان اور گمبیا کی درمیانی مسافت کو چھوڑ کر سنگاپور مشرقی راستے کی آخری اور
اہم ترین کڑی ہے۔ یہ نہ صرف بحر ہند کا مشرقی دروازہ ہے بلکہ بحر الکاہل کا مغربی دروازہ
بھی ہے۔ جزیرہ ملایا اور سماٹرا کے درمیان آبنائے ملاکا کے دہانے پر واقع ہونے کی
وجہ سے یہاں سے جہاز مغرب کی طرف کلکتہ۔ کولمبو اور کیپ ٹاؤن کو جاتے ہیں اور مشرق
کی طرف ہانگ کانگ۔ شنگھائی اور جاپان کو جانے والے جہازوں کی نگرانی کرتا ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ سر اسٹامفر ڈ ریفلز نے ۱۸۱۹ء میں اس جزیرہ کو برطانوی مقبوضات میں شامل
کرتے وقت کہا تھا کہ یہ جزیرہ چین جاپان۔ سیام اور کمبوڈیا پر ہمارا اقتدار قائم رکھا ہے
نیز اسی لئے انگلستان وہاں بحری جنگی جہازوں کا ایک بہت بڑا مستقر بنا رہا ہے جو ۴½
کروڑ ڈالر کے خرچ سے ۱۹۳۹ء میں مکمل ہوگا۔ چونکہ سنگاپور جاپان کی توسیع میں حایل ہے
موجودہ حالات میں جاپانی سیامیوں کے ساتھ خاکنائے کرا میں نہر کھودنے کے بارے
میں گفت شنید کرتے رہے ہیں۔ اس سے سنگاپور کی مسافت کا چکر چین سے کلکتہ تک
بقدر ۶۰۰ میل کم ہو جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ جب برطانیہ کی سنگاپور کی ہفت سالہ اسکیم مکمل
ہوگئی تو نہر کرا برطانوی توپوں کی زد میں آجائے گی اور ہوائی حملوں کے امکان کا تو ذکر ہی نہیں
ہوائی راستے یہ تو برطانیہ کے بحری راستوں کی کیفیت ہے اور باوجودیکہ یہ آئین
جنگ کے مطابق ہر طرح سے کیل کانٹے سے لیس ہیں انگریز سیاست دانوں نے اپنی
توجہ ان کی طرف مبذول کر رکھی ہے ان مقامات کی مزید اعانت کے لئے ہوائی راستوں
کی اہمیت بہت بڑھ رہی ہے۔

اگرچہ تجارتی ہوائی راستے غیر ملکی مقبوضات سے ہو کر گذرتے ہیں تاہم سیاسی
حیثیت سے زیادہ محفوظ ہوائی راستے کی گنجائش ہے۔ جبل الطارق اور مالٹا پہلے دو
مستقر ہیں اس کے بعد مصر۔ فلسطین اور شرق اردن میں ہوائی مستقر ہیں۔ اُن کے بعد

بغداد اور بصرہ اور پھر خلیج فارس میں بحرین۔ وہاں سے کراچی۔ دہلی اور کلکتہ ہوتے ہوئے سنگاپور کو راستہ جاتا ہے جہاں سے ہوائی جہاز آسٹریلیا یا ہانگ کانگ کا رخ کرتے ہیں جس کو مشرقی اور مغربی ہوائی راستوں کے مقام اتصال کی حیثیت سے ترقی دی جا رہی ہے دو مزید راستے ہیں جو اس شہنشاہی سلسلہ کی تکمیل کر دیتے ہیں۔ افریقی راستے کو مصر سے لے کر جنوبی افریقہ تک کے مسلسل برطانوی مقبوضات سے مدد ملتی ہے۔ بحر الکاہل کے پار دو راستے ہیں۔ شمالی جو آئرلینڈ اور نیوفونڈلینڈ سے ہو کر جاتا ہے اور صرف گرما کے لئے قابل استعمال ہے۔ جنوب کی طرف ایک دوسرا راستہ ہے جو آزور اور برموڈا سے گذرتا ہے اور یہ دھند اور کہر کے دنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

فرانس فرانس کا پہلا اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی شمالی افریقہ کی نوآبادیوں کے ساتھ سلسلہ رسل و رسائل قائم رکھے کیونکہ زمانہ جنگ میں بیس فیصدی سپاہیانہ قوت کے لئے انہی نوآبادیوں پر اس کا انحصار ہے۔ برطانیہ کے برعکس فرانس کے جنگی بحری اور ہوائی مراکز کا کوئی سلسلہ نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ مذکورہ بالا مقصد حاصل کر سکے اس کا دارومدار اُن راستوں پر ہے جو غیر جانبدار یا حلیف حکومتوں کے ماتحت ہیں۔

شمال مغربی افریقہ کو دو راستے ہیں۔ پہلا فرانس کے مغربی ساحلی مقام بورڈو کر شروع ہو کر ہسپانیہ۔ پرتگال اور جبل الطارق کے مغرب سے ہوتا ہوا یا تو مراقش میں کیسابلانکا کی طرف جاتا ہے یا ڈاکر کی طرف جو جزیرہ سینگل کی بندرگاہ ہے اور اس طرح یہ راستہ برطانوی جنگی بحری مرکز سے جا ملتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس راستے کی حفاظت کا دارومدار فرانسیسی برطانوی تعاون اور جزائر کناری کی غیر جانبداری پر ہے۔ دوسرا راستہ۔ یا راستے بحیرہ روم میں ہیں جو جنوبی فرانس کی بندرگاہوں مارسیلز اور طولون سے شروع ہو کر اوروں۔ الجزائر۔ اور الجیریا میں بوموتک اور طونسیہ میں بائی زرطاتک جاتے ہیں۔ ان راستوں میں اٹلی سارڈی نیا یا پینٹے لیریا سے فرانس کا مزاحم ہو سکتا ہے لہذا ان راستوں کو جبل الطارق کے اتحاد عمل کی

ضرورت ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم جزائر بلیارک کی غیر جانبداری ہے جو مارسیلز اور ون اور الجزائر کے ٹھیک درمیان میں واقع ہیں۔

بحیرہ روم کے مشرقی گوشے میں فرانس نے شام سے اپنا انتداب اٹھالیا ہے لیکن اس کے لئے ہنوز وہاں کی پائپ لائن تک رسائی حاصل کرنا ناگزیر ہے جس کے لئے وہ برطانیہ کی امداد کا محتاج ہے۔ فرانسیسی سومالی لینڈ کے راستے میں بھی یہی صورت حال ہے جو بحیرہ احمر کے جنوبی سرے یعنی عدن کے مقابل واقع ہے۔

فرانس کے مشرق بعید کے مقبوضات۔ کوچین چائنا۔ ٹونکن اور کمبوڈیا کی ریاست محفوظہ۔ کوئی ایسے ناگزیر نہیں ہیں۔ لیکن یہاں بھی فرانس اپنے بحری راستے کھلے رکھنے کیلئے برطانیہ پر اعتماد کرتا ہے۔ اور برطانیہ بھی خوشی سے فرانس کی مدد پر آمادہ ہے۔ کیونکہ فرنچ انڈوچائنا کی ساحلی خلیجیں سنگاپور کے حدود میں قدرتی بندرگاہوں کی شکل میں ہیں اور برطانوی مفاد کا یہ تقاضا ہے کہ یہ دشمنوں کے ہاتھوں میں نہ چلی جائیں کیونکہ اس صورت میں آزاد انام جاپانی اثر و نفوذ سے بچ نہیں سکے گا۔

جنگ کے بعد فرانس کی حربی طیاری کی بہترین شکل میگی نائٹ کے مشہور قلعوں کا سلسلہ ہے جو جرمنی کی سرحد کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے اور یہ چین کی دیوار اعظم کے بعد دشمن کے حملے کو روکنے کے لئے شاید اس قسم کی سب سے پہلی کوشش ہے

گذشتہ سال بلجیم اور سوئٹزرلینڈ کی سرحدوں پر چھوٹے چھوٹے قلعوں کا اضافہ کیا گیا ہے اصل سلسلہ کو اور بھی مضبوط کر دیا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جرمنی نے رائن لینڈ پر فوجی قبضہ کر لیا ہے اور اسکی فوجیں فرانس کی سرحد سے قریب تر ہو گئی ہیں۔

اٹلی فرانس اور انگلستان اپنے اپنے مقبوضات کو قائم رکھنے کی فکر میں ہیں اور اٹلی توسیع کے لئے کوشاں ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح انگلستان نے حبشہ کو اٹلی کا شکار ہو جانے دیا۔ قبل اس کے کہ اٹلی برطانیہ کے اہم اغراض کے لئے خطرناک ثابت ہوتا اور بحیرہ روم میں

اٹلی سے صلح نہ ہونے کی صورت میں کس طرح انگلستان نے راس امید کے بحری راستے کو مضبوط بنایا۔

بحیرۂ روم میں اٹلی کی ترقی سب سے زیادہ نمایاں رہی ہے بالخصوص پچھلے سال کے دوران میں۔ البانیا کے ساتھ قریبی تعلقات ہونے کے باعث اٹلی بحیرہ ایڈریاٹک پر اقتدار رکھتا ہے لیکن اس کی بحیرۂ روم کی طاقت کا مرکز جزیرہ نما کے مغرب میں ہے۔ ایلبا سے نیچے مغربی ساحل کے ساتھ سارڈی نیا اور جزیرہ نما کے درمیان اور جنوب میں پنٹے لیریا تک ایسا حلقہ ہے جو بحری اور ہوائی مراکز سے پٹا پڑا ہے اور بحیرہ روم میں جنگی مدافعت کے لئے ہر طرح موزوں ہے۔ کیونکہ بمبار طیاروں کی ایجاد سے حلقہ جات کو مقررہ جنگی مراکز کے اوپر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔

ان متعدد جنگی مراکز میں سے جو اس حلقے میں واقع ہیں پینٹے لیریا اہم ترین ہے۔ یہ ایک ایسا بحری مرکز ہے کہ سسلی اور طیونسہ کی درمیانی تنگنائے میں محفوظ مقام پر واقع ہونے سے مشرقی بحیرہ روم کا جبل الطارق بن گیا ہے اور چونکہ مالٹا اس کی زد میں آتا ہے اس لئے برطانیہ کے لئے یہ چیز کچھ خوشگوار نہیں۔

اس حلقے کا مقصد یہ ہے کہ اٹلی کی نوآبادیوں کے راستوں کی مغربی جانب سے حفاظت کی جائے۔ پہلی نوآبادی لیبیا ہے جسکی بندرگاہ طوبرخ ہے جسکی حال ہی میں قلعہ بندی کی گئی ہو یہی وہ مقام ہے جہاں اٹلی اور برطانیہ کی شہ رگیں براہ راست ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔

مشرق میں اطالوی ڈوڈے کنیز جزائر کے مابین گذشتہ سال سے رہوڈز کو بحری اور ہوائی مستقر بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اسی واقعہ سے برطانیہ خوفزدہ ہو کر قبرص کو بحیرہ روم کا مرکز بنانے پر آمادہ ہوا۔ جنگی حیثیت سے رہوڈز اور آس پاس کے جزیرے اٹلی کے لئے اس قدر موزوں ہیں کہ وہ للکار کر کہتا ہے کہ دیکھیں کون بحیرہ اسود سے دردانیال کے رستے ہمارے مقابلہ پر آتا ہے اس سے اٹلی کا اشارہ روس کی طرف ہے۔

اطالیوں کے سامنے دوسرا اہم مسئلہ اری ٹیریا تک جو بحر احمر کے جنوبی کنارے پر واقع ہے رسائی حاصل کرنا نیز حبشہ کے مفتوح علاقے، اور اطالوی سومالی لینڈ تک پہنچانا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہر سویز اور بحیرہ احمر کا راستہ جو برطانیہ کے تصرف میں ہے استعمال کیا جائے۔ گزشتہ جولائی میں یہ معلوم کر کے کہ جنوری ۱۹۳۵ء میں وزیر اعظم لاول نے جزیرہ ڈومیرہ جو آبنائے باالمندب میں واقع ہے اٹلی کو دیدیا ہے اور اس نے اس کی قلعہ بندی بھی شروع کر دی ہے۔ برطانوی تجاویز خاک میں مل گئیں۔ پیرم سے پندرہ میل کے فاصلہ پر یہ نیا بحری مرکز بحیرہ احمر کے جنوبی دروازہ پر برطانوی اقتدار کی مخالفت کر رہا ہے باوجودیکہ یہ جزیرہ اطالیہ کو کلی اختیار نہیں دلاتا۔

بحیرہ روم کے مغربی جانب بعد میں توجہ کی جاسکتی ہے کیونکہ جنگ ہسپانیہ سے اس کی حالت اضطراب انگیز ہوگئی ہے ہسپانوی نوآبادیاں میجارکا اور مائی نارکا خطرہ میں پڑگئی ہیں۔ اٹلی نے باغیوں کے غلبہ کی امید پر پہلے ہی میجارکا میں پاؤں جمالئے ہیں۔ اسکی اہمیت یہ ہے کہ اٹلی اگر جزائر بلیارک پر قابض ہو جائے تو فرانس کا شمالی افریقہ کا راستہ روک سکتا ہے اور جبل الطارق سے مشرقی برطانوی راستے کے لئے بھی خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر سیوطہ بھی جو جبل الطارق کے اندر واقع ہے اس کے ہاتھ آجائے تو پھر وہ برطانوی بحری راستے سے اپنی راہ نکال سکتا ہے۔ کیونکہ سیوطہ اور جزائر بلیارک کے درمیان نصف دن کے بحری سفر سے زیادہ فاصلہ نہیں ہے لیکن جب تک خانہ جنگی ختم نہیں ہو لیتی صورت حالات کا واضح ہونا مشکل ہے۔

جرمنی اٹلی کی طرح جرمنی بھی اپنی بین الاقوامی سیاسی حیثیت کو تبدیل کرنے کا آرزومند ہے معاہدہ ورسیلز کی رو سے نوآبادیوں سے محروم ہو جانے کے باعث اس کے بحری راستے محض ذہنی وجود رکھتے ہیں۔ بحری حیثیت سے جرمنی کے دو اولین مقصد ہیں ایک یہ کہ وہ شمالی افریقہ میں فرانس کی فوجی قوت کے ذرائع کو منقطع کر کے اسے کمزور کر دے۔

دوسرے یہ کہ جس قسم کی ناکہ بندی گذشتہ جنگ عظیم میں جرمنی کے خلاف کی گئی تھی اس کا اعادہ جہاں تک ممکن ہو ناممکن کر دے۔ جرمنی اس امید میں تھا کہ جو قومیں گذشتہ جون میں مونٹریو کانفرنس میں دردانیال کی قلعہ بندی کے بارے میں غور کرنے کے لئے شریک ہوئی تھیں وہ اس بات میں کامیاب ہو جائیں گی کہ روسی بحری بیڑے کو بحیرہ اسود میں بند کر دیا جائے اُن کا ایسا نہ کرنا ریشتاغ کے حق میں ایک سیاسی روک تھی۔ جرمنی کو فوری خدشہ یہ ہے کہ کہیں روس ہسپانوی باغیوں کی امداد نہ کرے اور مستقبل میں وہ نہیں چاہتا کہ سویٹ کے جنگی جہاز بحیرہ روم میں فرانسیسی جہازوں کی اعانت کریں یا ناکہ بندی میں مدد کرنے کے لئے بحیرہ بالٹک کے گرد منڈلاتے پھریں اس حالت کے برعکس جرمنی کے اس ارادے پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ جنرل فرانکو کو اس خانہ جنگی میں فاتح دیکھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ میڈرڈ میں فسطائی حکومت جو ریشتاغ کی رہین منت ہوگی جزائر بلیارک اور سیوطہ کو اغلباً فسطائی حکومتوں کے حوالے کر دے گی۔ اور جزائر کناری اور ازور پر بھی فسطائی تصرف کو ریشتاغ اچھی نظر سے دیکھے گی کیونکہ موخرالذکر جیسا کہ ظاہر ہو چکا ہے بحراوقیانوس کے جنوبی فضائی راستے کا پہلا پتھر ہیں۔ اول الذکر جزیروں میں پہلے ہی تین ہزار جرمن آباد ہیں۔ لونگ ایج (Living Age) کی اطلاعات کے مطابق نازی ایجنٹ اُن کی بخوبی تنظیم کر چکے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جرمن جہازوں نرن برگ اور کولن کے ذریعہ اپریل میں اسلحہ بھی پہنچائے گئے ہیں اس سے آگے جنوب کی طرف جرمنی نے پرتگال کا ایک جزیرہ مجمع الجزائر بسگوز (Bisagos) میں پٹہ پر لیا ہے اور وہاں روغن نکالنے کا اسٹیشن قائم کرنے کے بہانے ایک بحری اور فضائی مستقر قائم کر دیا ہے۔ ایسا مرکز نہ صرف ڈاکر کے لئے خطرہ کا باعث ہوگا جو فرانسیسی سینگل کی بندرگاہ اور جہاز سے پندرہ گھنٹے اور طیارے سے دو گھنٹہ کا راستہ ہے بلکہ یہ برطانیہ کی راس امید کی شاہراہ کے لئے بھی براہ راست خطرناک ثابت ہوگا جرمن کے شمال میں فنون جنگ کا رُخ محض اس مقصد کے ماتحت کر دیا گیا ہے کہ

ناکہ بندی کو کیونکر روکا جائے فریزیا کے جزیروں میں جو جرمنی کے شمالی مغربی ساحل سے کچھ فاصلے پر واقع ہیں اس غرض سے سامان جمع کیا جارہا ہے کہ وہاں سے طیاروں پر بمباری کی جاسکے ۔ معدنی کانیں جن کا راستہ خلیج ہیلی گولینڈ تک جاتا ہے فضائی مدافعت کا کام دیں گی اور آب دوز کشتیاں اور تیز رفتار تار پیڈو جرمن بیڑے کو بحیرہ شمالی میں آزادانہ نقل وحرکت میں مدد دیں گے ۔ اس کے علاوہ ساحلی مدافعت اور ہیلی گولینڈ کی قلعہ بندی دشمن کے بیڑے کی راہ میں آخری روک ہو گی ۔

بحری مسائل کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں لیکن اس وقت سب سے زیادہ دلچسپی یورپ کی بری توسیع میں لے رہا ہے پان جرمن نصب العین کے ماتحت یورپ کا ہر جرمن باشندہ زندگی کی شہ رگ بنا ہوا ہے ۔ لیکن ہٹلر کی آپ بیتی یا خود نوشت سوانح حیات

(Mein Kampf) میں تین اور نمایاں مقاصد کا اظہار کیا گیا ہے۔

(الف) یورپ کی چھوٹی سلطنتوں کی قربانی سے اپنی توسیع کرنا (ب) سوویٹ روس کے علاقہ میں توسیع کرنا۔ (ج) فرانس کی فوجی قوت کو توڑنا۔

ابھی یہ حکمت عملی اپنی پہلی منزل پر پہنچی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریش نے ابھی کوئی بڑی لڑائی نہیں چھیڑی۔ کیونکہ جمہوری حکومتوں نے کتوں کے آگے ہڈی تو پھینک دی ہے لیکن تر نوالہ نہیں پھینکا۔

روس کی طرف بڑھنے کے لئے تین ممکن راستے ہیں جن پر ہم اب غور کرتے ہیں۔

پہلی راہ شمال کی طرف ہے جو میمل۔ لیتھونیا اور لیٹویا سے ہو کر گذرتی ہے اور یہاں کسی قسم کی فوجی مزاحمت نہ ہوگی اور یہ راہ اوپر کو لینن گراڈ تک چلی جاتی ہے جسے روس کی کنجی کہنا چاہیئے۔ یہاں پر جرمنی کی فوجوں کو بحیرہ بالٹک کے جنگی بیڑے سے کمک ملیگی۔ دوسری ممکن راہ وہ ہے جو پولینڈ کے بیچ میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ یہاں اندیشہ یہ ہے کہ جرمنی کو یہ علم نہیں کہ پولینڈ جو فرانس اور ریش دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ دوستی کرنے میں تامل کر رہا ہے عین موقع پر کدھر کا رُخ کریگا۔ تیسری ممکن صورت جنوبی راستے سے ہے جو جنوبی زیکوسلوویکیا اور رومانیہ سے ہو کر یوکرین تک جاتا ہے۔ جرمنی کے تخمینہ کے مطابق غیر ملکوں میں پروپاگنڈا اور وسطی یورپ میں نازیوں کا گہرا اثر و نفوذ پھل لائے بغیر نہ رہیگا۔ آسٹریا کے نازیوں کو اپنے ساتھ ملایا جاسکتا ہے۔ زیکوسلوویکیا کے جرمن باشندے بھی ساتھ ہو جائیں گے اور ہنگری پر جو اب جرمنی کا دوست ہے مزید اعانت کے لئے بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ رومانیا میں پہنچ جانے پر وہاں کے جرمن آبادکاروں سے مدد لی جاسکتی ہے نیز فسطائی کوساگوگا پارٹی سے بھی۔ جسکی بنیاد بڑی محنت سے رکھی گئی ہے۔ ان اطراف میں قوموں کو ایک دوسرے بم کے پھٹنے کا اندیشہ ہے۔

سوویٹ یونین دوسری حکومتوں کی جغرافیائی حیثیت، فاصلہ۔ مختلف النوع قومیں اور

جارحانہ فوجی مقاصد یہ سب چیزیں مل کر روس کو متحدہ حیثیت سے زندگی کی اندرونی شاہراہیں بنانے پر مجبور کرتی ہیں اور اس طرح سے دنیا میں ایک نرالی حالت پیدا ہو گئی ہے۔ جہاں عام طور پر زندگی کی شاہراہیں سرحدوں سے شروع ہو کر جارحانہ طور پر دوسرے ملکوں سے گذرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ من جملہ دیگر قومی وجوہ کے ایک سب سے اہم وجہ دنیا کی دو زبردست قوموں کی بہ یک وقت یہ خواہش ہے کہ وہ سویٹ کے علاقے کو ہضم کر لیں مغرب کی طرف جرمنی زرخیز یوکرین میں اپنا اقتصادی اور سیاسی دام پھیلائے جاتا ہے مشرق کی جانب حال ہی میں جاپان نے سائبیریا اور بیرونی منگولیا کی سرحدوں پر بارود بچھا دیا ہے جو روس کا دوست اور محافظ ہے۔ ان شہنشاہانہ مقاصد کی کشمکش میں سویٹ روس اندرونی ذرائع آمد و رفت کا ایک جال بچھانے میں منہمک ہے تاکہ جنگی مجبوریوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔

اندرونی شاہراہوں میں سب سے زیادہ اہم راہ ٹرانس سائبیرین ریلوے ہے جو سویٹ حکومت کی شاہ رگ ہے اور لنین گراڈ سے ولیڈی واسٹک تک چار ہزار میل کے فاصلہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن معاشی اور سیاسی حیثیت سے جمہوریہ روس پر مکمل قبضہ رکھنے کی غرض سے اشتراکیوں کے بار بار کے اقدام نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ریلیں ناکافی ہیں اور اس صورت حالات کی سوئٹ فار ایسٹرن آرمی' میں مسلسل اضافے اور ان کے رسد اور ذرائع نقل و حمل کے مطالبے سے تائید ہوتی ہے۔ ابھی تک ٹرانس سائبیرین ریلوے طائشت سے ولیڈی واسٹک تک فوجی حیثیت سے غیر محفوظ تھی اور مشرق میں ایک خاص حربی کمزوری سمجھی جاتی تھی۔ تاہم اس سقم کو بی۔ اے۔ ایم کی برانچ لائن تعمیر کر کے دور کر دیا گیا ہے۔ جو جھیل بیکال کے شمال سے بحری صوبے کی طرف جاتی ہے اور مضبوط قلعہ جات کی اوٹ میں ہے اور مانچوکیو کے جاپانی فوجی مقامات سے کافی فاصلے پر ہے تاکہ ہر حالت میں بلا روک ٹوک آمد و رفت جاری رہ سکے اِلّا یہ کہ فضائی بمباری ہو۔

ٹرانس سائبیرین ریلوے مغربی مقام لینن گراڈ سے شمالی جانب بحیرۂ آرکٹک سے اوپر تک اوپر بحیرۂ بیرنٹ کے ساحل پر مرمانسک تک جاتی ہے ۔ یہ شہر بھی من جملہ اُن شہروں کے ہے جو سوویٹ روس نے سائبیریا کا راستہ صاف کرنے کی اسکیم کے ماتحت بنائے ہیں اور یہ ایک ایسی جگہ واقع ہے جہاں سے شمالی بحری راستہ روکا جاسکتا ہے اور یہ رسل و رسائل کی شاہراہ دنیا کے سرے کے پار ولیڈی واسٹک تک کھولی گئی ہے ۔ تین دریا' اب ینسی' اور لینا جو بحیرۂ منجمد شمالی میں جا گرتے ہیں سال کا بیشتر حصہ جہازرانی کے قابل ہوتے ہیں اور شمالی راستے سے جہازوں کی آمد و رفت کے لئے مفید ہیں ۔

جنوب کی طرف سوویٹ روس کی اندرونی لائن جو کوہ یورال اور یوکرین کے شاداب علاقے سے گذرتی ہے اور بحیرۂ اسود کی بندرگاہوں پر جاکر ختم ہو جاتی ہے زیادہ فراخ اور مضبوط ہے ۔ بحیرۂ اسود سے سیاسی اثر و نفوذ کی بنا پر یہ آبناؤں سے ہو کر گذرتی ہے جن پر ترکی کا قبضہ ہے ۔ مونٹریو کانفرنس میں روس نے بلا روک ٹوک دردانیال سے گذرنے کا حق حاصل کرکے جرمنی کے مقابلہ میں دنیا کی زبردست حکومتوں میں جگہ حاصل کرلی ہے ۔

مغرب کی طرف روسیوں کو ۱۹۱۴ء کی طرح جرمن ہوّے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو یوکرین کے علاقے کا رُخ کئے ہوئے ہے یہاں پر مدافعت کی غرض سے روسیوں نے مضبوط قلعے بنوائے ہیں اور اپنے فوجی حدود کو رومانیا اور زیکوسلوویکیا تک وسیع کردیا ہے کیونکہ جرمنی زیکوسلوویکیا کے علاقے ہی میں اپنی پوری فوجی قوت کا استعمال کرے گا جو شمالی جانب سے کوہ کارپے تھین سے محفوظ ہوگا اور جنوب کی طرف آسٹریا اور ہنگری کی حلیف سلطنتیں ہوں گی ۔ اس حملہ کو روکنے کے لئے روس کے جنرل اسٹاف نے زیکوسلوویکیا کے علاقے میں بڑھ کر جرمنی سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی ہے ۔ سوویٹ یوکرین کی سرحد سے لے کر زیکوسلوویکیا کے اندرونی علاقے تک روسیوں نے ریل کی پٹڑی بچھادی ہے ۔ جہاں تازہ اطلاعات کے مطابق سرخ فوج نے ہوائی مستقر اور چھاونیاں قائم کرلی ہیں ۔

یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ سویٹ روس کی شاہراہیں خالصتہً مدافعانہ ہیں لیکن اس چیز کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اشتراکی نصب العین سرمایہ دار حکومتوں کی حدود میں پھیل کر ان کے لئے مستقل خطرہ کا باعث ہو رہا ہے۔ بین الاقوامی انقلابی مجلس کے ٹھوس عملی کام کی وجہ سے روسی خیالات کا اثر سمندر پار تک جا پہنچا ہے اور ان کی نشر و اشاعت مضبوط فوجی سرحدوں سے تجاوز کر چکی ہے۔

ابتک کسی اسلحہ کے کارخانے سے کوئی ایسا گولہ ایجاد نہیں ہوا جو انسانی بہبودی کے اس نصب العین کو تباہ کر دے جس کی روس شدت کے ساتھ اطراف عالم میں تبلیغ کر رہا ہے۔ تاہم انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کی بے گناہی کا عذر دہرا دیا جائے۔ کہ انقلابی خیالات کسی قوم کے اندر زبردستی ٹھونسے نہیں جا سکتے کیونکہ درخت کی طبعی نشو ونما اُس کے اندر ہی سے ہو سکتی ہے۔

جاپان جاپان کی شہنشاہیت دھمکی نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ مشرق میں منگولیا کے اندرونی میدانوں سے لیکر بحیرہ زرد کے کناروں تک میکاڈو کی فوجی قوت کی نمائش ہو رہی ہے جنوب میں جزیرہ مرکونیشیا کے باشندوں نے جاپان کی بحری توپوں کی چاندماری کی آوازیں سُنی ہیں۔ دنیا کی ہر منڈی میں تاجران زرد رنگ کے بیوپاریوں کو جاپان کی حیرت انگیز طور پر سستی چیزیں بیچتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جاپان کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔ اُس کا تیار شدہ مال باوجود بڑی بڑی معاشی دیواریں حائل ہونے کے دنیا کی منڈیوں میں پھیل گیا ہے اور فوجی قوت کے بل پر اُس نے چین جیسی بڑی حکومت کو اپنے سامنے جھکا دیا ہے اور اطمینان سے مانچوکیو میں ایک تئے دور کی ابتدا کر رہا ہے۔ اب تو وہ روسیونکو بھی اپنا کس بل دکھا رہا ہے۔ جاپان کے شباب نے دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اور انھوں نے بادل ناخواستہ اس سانولے رنگ کے بھائی کو اپنی صف میں جگہ دی ہے۔
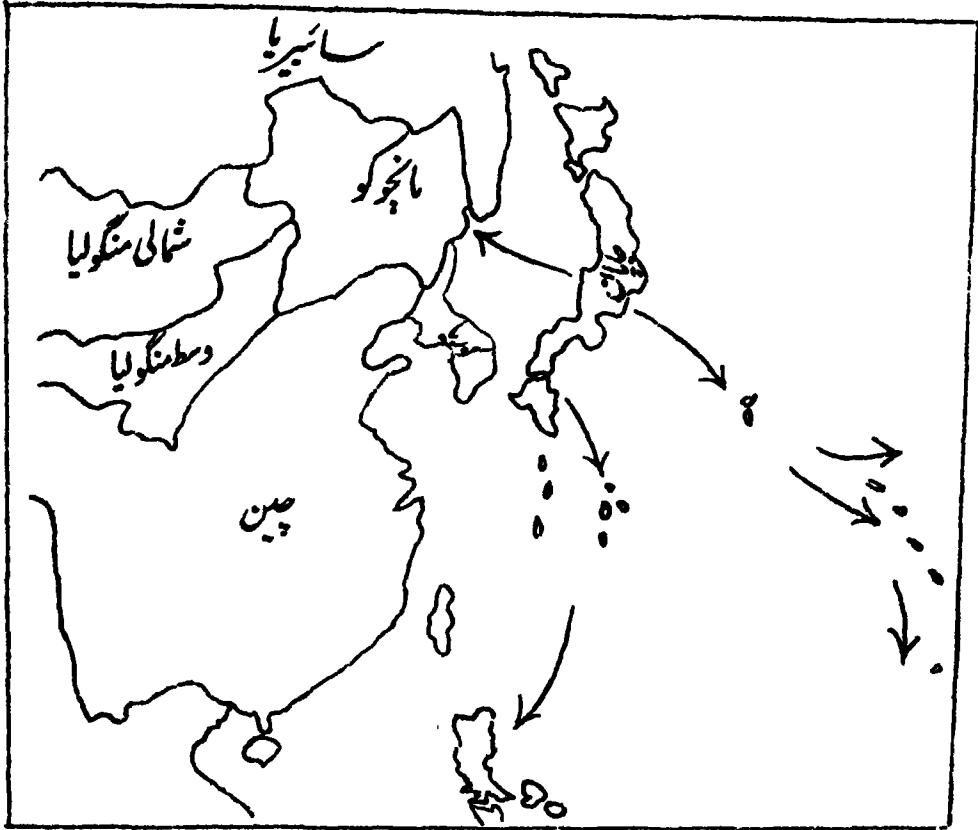
جاپانیوں کی قومی زندگی کی راہ شمالی جانب سنگینوں کی نوک سے نکالی گئی ہے اور جنوب کی طرف جنگی جہازوں کی مدد سے - اور یہ رفتار اس قدر تیز رہی ہے کہ بعض اوقات جاپان کی سول حکومت کو اظہار معذرت کرنا پڑا ہے - ایسے واقعات سُنے گئے ہیں کہ کوانگ ٹنگ (Kwangtang) کی فوج مانچوکو اور چین میں زبردستی گھُس کر علاقے پر علاقے فتح کرتی چلی گئی اور بحری فوج برّی فوج کی ہردلعزیزی پر رشک کرتی ہوئی جنوبی سمندروں میں اپنے کارنامے دکھانے لگی اور اس پر جاپانی حکومت نے اپنا اضطراب بھی ظاہر کیا لیکن ان احتجاجات کو کوئی خاص وقعت نہیں دی گئی - جاپانی برطانوی تاریخ کے بہترین ماہر ہیں اور اُن کی یہ ظاہری کامیابی اُن کے لئے وہی اہمیت رکھتی ہے جو برطانیہ کی تاریخ موجودہ صدی کی ابتدا میں رکھتی تھی - ان کا یہ نعرہ کہ مشرق مشرقیوں کے لئے ہے بہت حد تک انصاف پر مبنی ہے - لیکن جاپانی منطق کی یہ خصوصیت ہے کہ اُس نے

قوت کو فیاضانہ تحقیقات کے پہلو بہ پہلو رکھا ہے۔ ایک طرف تو نہایت خلوص کے ساتھ جاپانی چین کے لئے اپنا اضطراب ظاہر کرتا ہے دوسری جانب چینی قلی کے پیٹ میں اپنی سنگین گھونپ دیتا ہے اور جب جینیوا کے سیاست داں میکاڈو کی چین میں فوج کشی کرنے پر اپنا خوف و ہراس ظاہر کرتے ہیں تو جاپانی اُن پر حقارت سے مسکراتے ہیں اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مغربی تہذیب اپنی تاریخ کی روشنی میں صرف اپنے ہی کو کیوں حق بجانب قرار دیتی ہے۔

جزیرہ نما کوریا سے جاپانی تاجر فوجوں کے عقب میں شمال کی جانب بڑھتے گئے مانچوکیو کے باشندوں کو لوٹا۔ مقامی مصنوعات کو ارزاں مال اور رشوت کے ذریعہ سے تباہ کیا اور جب کبھی ان چیزوں کی مخالفت میں آواز اٹھی تو ارزاں قسم کی نشہ آور اشیا تقسیم کر کے اسے دبا دیا گیا۔ مانچوکیو سے جاپان کی مسلح فوجیں مغرب کی جانب بیرونی منگولیا کی سرحد کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں اور اُن کے پیچھے پیچھے بیوپاری اپنے بکس لئے ہوئے آپہونچے۔ اب تو ان تجارتی کیڑوں نے شہنشاہیت کو اور بھی حیران کر دیا ہے۔ چین کی صوبجاتی حکومتوں کی مالی حالت کو گرانے کے لئے جاپانی بہت سا مال بغیر محصول کے چین میں لا رہے ہیں۔ یہ معاشی حملہ کی ایک نہایت دلیرانہ مثال ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چین کا تعلق بیرونی منگولیا اور سوویٹ روس سے منقطع ہو جائے گا اور اُس کے صوبوں میں جاپان کا اثر اسی طرح پھیل جائے گا جس طرح جنوب میں چینی سمندروں میں پھیلا ہوا ہے

جنوب میں جاپانی زندگی کی شہ رگیں بحر الکاہل کے جزائر کے باعث بہت مضبوط ہیں۔ کیوشیو سے نارموسا تک جو چینی ساحل کے متوازی اور برطانوی بحری جنگی مرکز ہانگ کانگ کے مقابل ہے جاپان کی اندرونی بحری شہ رگ جزائر فلپائن کا رُخ کرتی ہے جہاں جاپانی نوآباد کار فلپائن کی حکومت کے اضطراب کے باوجود پہلے سے موجود ہیں بحر الکاہل کی مسابقت میں جنگی نقطۂ نظر سے بیرونی شہ رگ زیادہ بہتر ہے جو ٹوکیو

سے شروع ہو کر جنوبی سمت میں جزائر او گوسوارہ اور مریانا ہوتی ہوئی مشرق کو جزائر مارشل تک چلی جاتی ہے اور مغربی جانب ییپ Yap سے گذر کر پیلوز تک پہنچتی ہے۔ اب پیلوز سے یہ شہ رگ کہاں جا کر ختم ہو گی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس نے ڈچ اور آسٹریلیا دونوں حکومتوں کو مضطرب کر رکھا ہے۔

فی الحال یہ مقام ایک تیز خنجر کی طرح نیدرلینڈ انڈیا۔ آسٹریلیا۔ برطانوی بورنیو اور نیوگنی کا رُخ کئے ہوئے ہے۔ بحری جنگ کے ماہرین نے لڑائی کے اندیشہ سے اس شہ رگ کا معائنہ کیا ہے جو جاپان نے ڈھائی ہزار جزائر میں پھیلا دی ہے اور جسکا پھیلاؤ خط استوا کے ساتھ ساتھ ۲۷۰۰ میل اور اس کے شمال میں ۱۳۰۰ میل ہے۔ ان ماہرین کا یہ خیال ہے کہ یہ شہ رگ دشمنوں کے جنگی بیڑے کے لئے جو بحرالکاہل کی راہ سے چین کے ساحل پر پہنچنا چاہیں ایک ناقابل تسخیر دیوار ہے۔ ماہرین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اِن ہزاروں جزائر کی بھول بھلیوں میں اگر جہاز آب دوز کشتیاں اور طیارے پھیلا دیئے جائیں تو ایک پرندے کے لئے بھی اُن میں سے اپنی راہ نکالنا دشوار ہو جائے۔

جو ممالک براہ راست جاپان کی زد میں آگئے ہیں اُن پر خوف و ہراس طاری ہے جاپانی شہنشاہیت نے ان ممالک کے اندر اپنا اقتصادی اثر ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ جاپانی اسلحہ اُن کو خوف زدہ کرتے ہیں اور جاپانی روئی کے کپڑوں نے اپنی ارزانی کے باعث خود اُن ملکوں کی منڈیوں میں انھیں مات دیدی ہے۔ یہ پستہ قد زرد رنگ کے بیوپاری ان کے مال کی ہُنڈیاں اور رقم کی ادائے گی ایک مستقل مرض ہے جس کا علاج ابھی تک نہیں سوچا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ مرعوب ملکوں میں سے بعض پرانے علاج کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ مثلاً نیدرلینڈ فضائی سامان جنگ خرید رہا ہے اور ہوائی مستقر تعمیر کر رہا ہے اور آسٹریلیا کی حکومت ایک وسیع اسلحہ بندی کے پروگرام پر غور کر رہی ہے

اور اسے جاپانی اخبارات کے اس صاف وصریح اعلان سے شہ ملی ہے کہ آسٹریلیا کی آب وہوا ٹوکیو کے مقابلہ میں نوآبادیات کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ خود جاپان کے اندر سول حکومت اور فوجی طبقے میں شہنشاہانہ اغراض کے حاصل کرنے کے طریق کار میں اختلاف ہوگیا ہے۔ دونوں جماعتیں اپنی فوقیت کے لئے جھگڑ رہی ہیں۔ فوجیوں کا یہ خیال ہے کہ جنگی فتوحات کے ذریعہ شہنشاہیت کے مقاصد پورے کئے جائیں اور سول کے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ رفتہ رفتہ تجارتی اثر ونفوذ کے ذریعہ جس میں خطرہ کم ہے اپنے عزائم کو عمل میں لایا جائے۔ جاپانی شہنشاہیت کا مستقبل اس تنازع کے نتیجہ پر موقوف ہے۔ اگر فوجیوں کو اس جھگڑے میں فتح حاصل ہوئی تو یقیناً جنگ ہوگی جس میں جاپانی ہر امکانی حربہ استعمال کریگا اور اگر انھوں نے معقولیت سے کام لیا تو جاپان کے ارباب حکومت وصنعت دنیا کی منڈیوں میں سستا مال پھیلا دیں گے اور اپنے ہم وطن کسانوں کی ناراضی کے باوجود ان مواقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل میں حفاظت کی خاطر اور جنوبی امریکہ میں اقتصادی مفاد کے خیال سے امریکہ کی قومی شہ رگیں اگرچہ کم خطرناک حالت میں ہیں برطانوی شہ رگوں کے مقابلہ میں کئی ہزار میل زیادہ وسیع ہیں لیکن یہ اُس درجہ اور اُن معنوں میں اہم نہیں ہیں جن معنوں میں برطانوی شہ رگیں اپنی معاشی اور قومی ہستی کے اعتبار سے اہم ہیں۔ مدافعت کے ماسوا یہ شہ رگیں جن طبقوں کے حدود معین کرتی ہیں اُن کی ذمہ داری بظاہر انہی قوموں پر ڈالدی گئی ہے جسکی وجہ یا تو امریکی شہنشاہیت ہے یا اخلاقی پہلو۔ پہلی صورت کی مثال جنوبی امریکہ کی ہمسایہ قوم کے متعلق امریکہ کا اضطراب اور دوسری صورت کی مثال جزائر فلپائن میں امریکہ کا فیاضانہ نظام حکومت ہے۔

نظری حیثیت سے بحر اوقیانوس کی شہ رگ شمالی اور جنوبی ہر دو امریکہ کے طول میں پھیلی ہوئی ہے یعنی گرین لینڈ کے سرے راس فیر ویل سے لے کر جنوبی امریکہ کے

انتہائی جنوبی نقطے کیپ ہارن تک۔ اگر اس شہ رگ کو کسی ایک مقام سے مسلح ہو کر کاٹنے کی کوشش کی گئی خواہ اس کا مقصد کناڈا پر حملہ کرنا ہو یا جنوبی امریکہ میں سیاسی اثر پیدا کرنا تو اس کا جواب مسلح ہو کر دیا جائے گا۔

بحرالکاہل میں جہاں جاپانی بحری قوت سے سابقہ پڑتا ہے امریکی شہ رگوں کو اُن کی معاشی حیثیت سے بحری اور فوجی حیثیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ان سب میں پُرخطر وہ شہ رگ ہے جو جاپانی حلقہائے اثر میں سے ہو کر گذرتی ہے اور اس کے متعلق سول اور فوجی طبقوں میں مباحثہ بھی ہوتا رہا ہے۔ جنگی مصالح کے پیش نظر جزائر الیوشن سے جزائر فلپائن تک ایک فرضی راہ بنائی گئی ہے جو حفاظت کی پہلی راہ ہوگی۔ جزائر فلپائن سے جزائر ہوائی اُن تک ایک دوسری راہ تجویز کی گئی ہے جو نئی پات امریکن شاہراہ کے متوازی ہوگی اور اس فرضی تکون کو مکمل کرنے کے لئے جزائر ہوائی ان سے جزائر الیوشن تک ایک اور راہ بنائی گئی ہے جو امریکی مدافعت کی دوسری اور اہم ترین راہ ہوگی امریکہ کے بحری حکام صاف طور پر اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ مدافعت کی پہلی راہ دیر تک قائم رہنے والی نہیں کیونکہ جزائر مرکونیشیا میں سے گذر کر جزائر فلپائن سے اتحاد عمل پیدا کرنا منظم جاپانی جنگی بیڑے کی موجودگی میں ناممکن ہو جائے گا۔ اس خیال کے پیش نظر سول حکومت کا اس بات پر اصرار کہ فلپائن کے خلاف جاپان کی پیش قدمی کا مقابلہ قوت سے کیا جائے گا حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ بہرکیف یہ ممکن نہیں کہ بحری حکام اخلاقی وجوہ کی بنا پر بھی اس کی مدافعت کی اجازت دیں۔ جبکہ وہ خود تسلیم کر چکے ہیں کہ فلپائن کی موجودہ حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اُسے جاپان کو یرغمال کے طور پر پیش کر دیا جائے۔

جاپان کی بڑھتی ہوئی اُمنگوں کے باعث بحرالکاہل میں امریکہ کی شہ رگیں محض مدافعانہ ہو گئی ہیں جو بحر اوقیانوس کی راہ کے عین مطابق ہیں۔ یہ شاہ رگیں جزائر الیوشن سے شروع ہو کر جنوب میں کیپ ہارن تک پھیلی ہوئی ہیں اور جزائر ہوائی ان کے

درمیان سے گذرتی ہیں جن میں نہایت مستحکم قلعہ جات ہیں۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ بحرالکاہل کے شمالی ساحل۔ نہر پاناما اور جنوبی امریکہ کے آگے ایک زبردست روک بنادی جائے۔ کیونکہ ان ملکوں نے حملہ کی صورت میں امریکہ کی زیر حفاظت آنا منظور کرلیا ہے۔

پرانے جھگڑے دفن کئے جارہے ہیں

جہانِ فراق

ترا جمال بھی ہے آج اک جہانِ فراق
نگاہِ لطف و کرم خود ہے ترجمانِ فراق

فضا جہانِ محبت کی جن سے تھی رنگیں
تجھے بھی یاد کچھ آئے وہ شادمانِ فراق

تری نگاہ نے چھوڑا تھا جن کو وقتِ وداع
ملے نہ زخمِ نہاں میں بھی وہ نشانِ فراق

نگاہِ ناز تری تھی تمام قول و قسم
کسی کو ہو بھی نہ سکتا تھا کچھ گمانِ فراق

رُلا گئی ترے آسودگانِ خاک کی یاد
وہ بے نیازِ محبت وہ رازدانِ فراق

اُٹھے ہیں تیغِ تغافل سے کھول کر جوہر
نہ کیوں ہوں زندۂ جاوید کشتگانِ فراق

بتا دے کیا نگہِ اولیں کے بعد ہوا
مجھے بھی یاد نہیں کچھ یہ داستانِ فراق

اُمید بن کے نہ اُبھرے دلوں کی دنیا میں
اِسے سمجھ نہیں سکتے یہ بدگمانِ فراق

وہ بے قراریِ دل وہ فضائے تنہائی
وہ سرزمینِ محبت وہ آسمانِ فراق

گدازِ دل سے حقیقت سرشکِ غم کی نہ پوچھ
ہر ایک قطرہ تھا اک بحرِ بیکرانِ فراق

جسے مٹا نہ سکی برقِ کم نگاہیِ حسن
وہی امید کی دنیا ہے پاسبانِ فراق

خود آشنا نہیں ان سے حریمِ تنہائی
یہ سوز و ساز ہیں ناخواندہ مہمانِ فراق

سکونِ قُرب دکھے بے قرار تنگ آکر
سنا ہے ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اب امانِ فراق

خبر کچھ ان کو نہیں اب ترے تغافل کی
بس آج چین سے سوئے بلاکشانِ فراق

جو ایک برقِ نگہ سامنے سے کوند گئی
وہی تھی روحِ محبت وہی ہے جانِ فراق

ہندوستان

کانگریس اور حکومت کی موجودہ کشمکش جس نے نصف درجن صوبجاتی حکومتوں میں تعطل پیدا کرکے سارے ہندوستان میں ایک ہیجان برپا کر دیا ہے عام رائے کے مطابق تمام تر حکومت کی غیر دانشمندانہ پالیسی کا نتیجہ ہے لیکن بعض ارباب نظر کا خیال ہے کہ خود کانگریس اس کی مجرم ہے اس سلسلہ میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ چند برطانوی سیاسیین کانگریس کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے وزیر ہند کے بیان پر نکتہ چینی کر رہے ہیں جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود ارباب اختیار میں دو تقسیمیں ہو گئی ہیں لیکن یقین رکھئے کہ اس اختلاف کی حد ظاہری تک محدود ہے اور یہ کوئی جماعتی اختلاف نہیں بلکہ محض ذاتی حیثیت رکھتا ہے ہمارے کرم فرماؤں کی رائے ایوان حکومت میں رائے شماری کے وقت ہمیشہ وہی ہوتی ہے جو برطانیہ کی استبدادی پالیسی کا تقاضا ہوتا ہے۔ سر سیموئل ہور وغیرہ کے وعدے جن کا گاندھی جی نے اپنے بیان میں ذکر کیا ہے اسی لئے شرمندہ وفا نہیں ہو سکتے کہ وہ سب ان کی ذاتی رائے تھی بہر حال یہ گتھی ابھی تک سلجھی نہیں ہے اس لئے کہ اسے سلجھانے کی سچے دل سے کوشش ہی نہیں کی گئی۔ یہاں ہم فریقین کے بیانات درج کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو اندازہ ہو جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلے میں کس حد تک حق بجانب ہیں آپ کو یاد ہوگا کہ کانگریس نے آل انڈیا کنونشن دہلی کے ہنگامہ خیز اجلاس میں زبردست بحث و مباحثہ کے بعد ۱۷ مارچ ۱۹۳۷ء کو کثرت رائے سے یہ فارمولا منظور کیا تھا۔

وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس بات کی ہدایت کرتی ہے کہ جن صوبوں کی مجالس قانون ساز میں کانگریس واضح اکثریت رکھتی ہے وہاں وہ وزارتیں قبول کرے۔ لیکن

یہ وزارتیں اس وقت تک ناقابل قبول ہوں گی جب تک اسمبلیوں میں کانگریس پارٹی کے لیڈروں کو یقین واطمینان نہ ہوجائے اور وہ عوام سے کہہ سکیں کہ گورنر اپنے مخصوص اختیارات کو ان مسائل میں استعمال نہیں کرے گا جن کو وزرا دستوری حدود میں رہ کر پیش کریں گے اور نیز اُن کے مشوروں کو بھی نظرانداز نہیں کریں گے۔

اسوقت یو پی، مدراس، بمبئی، سی پی، اُڑیسہ اور بہار چھ صوبوں میں کانگریس کی اکثریت ہے مارچ کے آخری ہفتہ میں ان صوبوں کے گورنروں نے حسب دستور کانگریس پارٹی کے لیڈروں سے ملاقات کی اور چاہا کہ وہ وزارت کی تشکیل کریں۔ کانگریس پارٹی کے لیڈروں نے دہلی کی تجویز کے مطابق گورنروں سے اختیارات خصوصی کے متعلق اطمینان دلانے کی درخواست کی جس کا تقریباً ہر صوبہ میں ایک ہی جواب ملا۔

کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت گورنروں کے لئے ان اختیارات کے متعلق ایسا یقین دلانا ناممکن ہے جو کہ انھیں اس ایکٹ کی رو سے حاصل ہیں۔ قانون کی رو سے گورنر کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ ایکٹ کی دفعات کے مطابق عمل کریں اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور ہدایت نامہ آئین کی رو سے اس پر مخصوص اختیارات کے استعمال اور اقلیتوں کے مفاد کے تحفظ کے بارے میں جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اگر گورنر خود بھی ان سے دستکش ہونا چاہے تو نہیں ہوسکتا۔

(گورنر بمبئی)

کانگریس پارٹی کے لیڈروں نے ان ملاقاتوں کے جو جوابات دیئے ان میں ہر ایک نے مختلف الفاظ میں یہی کہا۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ گورنر صاحب نے خلوص دل اور تعاون کی عام پیش کش کے سوا عدم مداخلت کے متعلق باضابطہ یا بے ضابطہ طور پر یقین دلانے سے انکار کردیا۔ اس لئے میرے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ

ان حالات کے ماتحت میں وزارت قبول کرنے سے معذرت کا اظہار کرتا اور ادب
کے ساتھ وزارت کی تشکیل سے انکار کر دیتا۔

. . . . میں نے (گورنر صاحب)

کو بتایا کہ ہم
آئین میں اس وقت کسی قسم کی ترمیم نہیں چاہتے۔ نہ صوبائی خود مختاری کے محدود
دائرہ کار میں کسی قسم کی توسیع کے خواہشمند ہیں ہم چاہتے ہیں کہ جہاں وائسرائے اور
وزیر ہند کی طرف سے امکانی مداخلت کے متعلق تحفظات برقرار رہیں۔ گورنر اور میرے
درمیان ان کی ذاتی رائے سے جو خاص اختیارات استعمال کرنے کا ان کو حق حاصل ہے
ان کے متعلق ہمارے درمیان ایسا سمجھوتہ ہو جائے جو دو شریف آدمیوں کے درمیان
کسی بات کے متعلق ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ گورنر صاحب اپنے مافی الضمیر سے خاص اختیارات
کے عدم استعمال کا یقین دلائیں (راجگوپال آچاریا)

اس صورت حال کے متعلق سب سے اہم بیان وہ ہے جو ۳۰ مارچ کو گاندھی جی کی طرف سے
شائع ہوا۔

"اس تجویز کا اصل مصنف میں ہی تھا کہ وزارتوں کی قبولیت کو مشروط کر دیا جائے
لیکن ایک ایسی شرط کے ساتھ جسے گورنر نہایت آسانی سے منظور کر سکتے تھے
اور اس قسم کی پابندی کا کسی کو خیال بھی نہ تھا جسکی منظوری کا مطلب یہ ہوتا کہ آئین
میں کسی قسم کی معمولی بھی ترمیم اور تنسیخ کی جائے۔ ہماری شرط ہرگز ایسی نہ تھی کہ اسے
قبول کر لینے کی صورت میں گورنروں کی آئینی پوزیشن پر کوئی اثر پڑتا کیونکہ کانگرسیوں کو
معلوم ہے کہ انڈیا ایکٹ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے انھوں نے اس نوع کا
کوئی مطالبہ نہیں کیا میں جانتا تھا کہ اگر گورنروں اور ان کے وزیروں کے درمیان
اس بات کا معاہدہ نہ ہو جائے کہ گورنر اپنے وزیروں کی آئینی سرگرمیوں میں

دخل نہ دیں گے۔ عہدے قبول کرنے کے بعد آئینی جنگ شروع ہو جائے گی
ایسی صورت میں ایمانداری کا تقاضا یہی تھا کہ پہلے سے ہی اس معاملہ کو صاف
کر لیا جائے ورنہ یہ کون نہیں جانتا کہ گورنروں کے مخصوص اختیارات استعمال کرنے
ہی کے لئے دیئے گئے ہیں اور اس مصالحت کا مقصد ان تحفظات کو چھونا تک بھی
نہ تھا جن پر گورنروں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے"۔

ایک زبردست پارٹی جسکی پشت پر فیصلہ کن ووٹروں کی امداد ہو اس سے یہ
توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ خود کو ایک نازک پوزیشن میں ڈالے اور گورنر جب بھی
چاہے اس کی جد وجہد کو کالعدم کر دے . . . . . . کیا میں نے سر سیموئل ہور
اور دوسرے وزیروں کو یہ کہتے نہیں سنا کہ عام حالات میں گورنر اپنے اختیارات
کو استعمال نہیں کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ کانگریس کے فارمولے میں اس سے
زیادہ کچھ نہیں مانگا گیا تھا۔ حکومت برطانیہ نے دعویٰ کیا ہے کہ انڈیا ایکٹ صوبوں کو
حکومت خود اختیاری عطا کرتا ہے اب اگر یہ سچ ہے تو صوبوں کے عمدہ نظم ونسق کی ذمہ داری
گورنروں پر نہیں بلکہ وزیروں کے کندھوں پر ہے ذمہ دار وزیر جنکو اپنے گوناگوں فرائض کا
احساس ہے اپنے روزانہ کاموں میں کسی کو دخل نہ دینے دیں گے اس لئے یہ صاف ظاہر ہے کہ جس چیز کا حکومت
برطانیہ نے لفظاً وعدہ کیا تھا اس وعدہ کو عملاً توڑ دیا ہے اس میں بھی شک نہیں
کہ جب تک عوام اپنے اندر کافی قوت پیدا نہ کر لیں گے حکومت من مانی کارروائی
کرنے میں مطلقاً آزاد ہے لیکن ہم اسے صوبجاتی خود مختاری نہیں کہہ سکتے . . .

. . . میں اپنی تمام تر رواداری کے باوجود حکومت کے موجودہ اقدام پر یہ
کہنے کے لئے مجبور ہوں کہ اب حکومت قلم سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے ہوگی،
کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میرے مطالبہ کی بنا سو فیصدی ایمانداری پر تھی اور اس کو
منظور کر لینے سے یہ نازک صورت حال پیدا نہ ہوتی۔

ہندوستان کے حالات کی اس رفتار نے برطانیہ کے ایوان حکومت میں بے چینی پیدا کردی اور چاروں طرف سرگوشیاں شروع ہوگئیں یکم اپریل کو مسٹر لانسبری نے وائسرائے ہند کو تار دیا جس میں یہ استدعا کی کہ وہ کانگریسی رہنماؤں سے گفتگو کرنے میں پیش قدمی کریں اور لارڈ لوتھین نے دارالامرا میں مصالحت پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میرے خیال میں صورت حال اس سے زیادہ خطرناک ہے جتنا برطانیہ میں عام لوگ محسوس کر رہے ہیں۔ اب بھی ایک نازک اور عظیم موقع ہے۔ اگر اسے کھو دیا گیا تو ہندوستان کی موجودہ بے چینی ایک دفعہ پھر انقلابی صورت میں تبدیل ہوجائیگی"

لارڈ زٹلینڈ نے ہندوستان کے موجودہ حالات کے متعلق ۸ اپریل کی شام کو ایک بیان دیا جس میں گاندھی جی کے بیان کو حیرت انگیز بتلاتے ہوئے فرمایا۔

"سر سیموئل ہور نے مجھے یہ کہنے کی اجازت دی ہے کہ انھوں نے اس بات کا تو کئی دفعہ اظہار کیا کہ گورنروں کے مخصوص اختیارات کے استعمال کا کبھی موقع پیش نہیں آئے گا لیکن یہ کبھی نہیں کہا کہ اپنے اختیارات کو استعمال نہ کرنے کے سلسلہ میں گورنر پہلے ہی سے کوئی وعدہ کرلیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گورنروں سے جو وعدہ طلب کیا گیا تھا وہ آئین میں ترمیم کئے بغیر نہیں دیا جاسکتا ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ آئین کی دفعہ ۵۲ کے مطابق گورنر جنرل کو چند خاص ذمہ داریاں دی گئی ہیں جن میں اقلیتوں کے جائز حقوق کا تحفظ بھی شامل ہے اور جب تک اس قسم کی ذمہ داری اُن پر عاید ہے اُن کو مختلف موقعوں پر اپنی ذاتی رائے کا استعمال کرنا ضروری ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اقلیتوں کے جائز مفاد کے تحفظ کے لئے وثیقہ ہدایات کے مطابق گورنروں کو انفرادی رائے کا استعمال کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر گورنر اس قسم کا وعدہ کرے جیسا کہ کانگریس نے طلب کیا تھا تو وہ اپنی انفرادی رائے پر عمل کرنے کا مجاز نہیں رہتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

. . . . بشکست جمود کے لئے حکومت کی طرف سے کوئی دعوت نہیں
دی جائیگی اگر چاہا تا گاندھی کی طرف سے درخواست کی جائے تو وائسرائے اس پر
غور کریں گے . . . . اقلیت کی وزارتیں جائز ہیں مجلس آئین
کا اجلاس شروع ہونے پر اکثریت ان کو معزول کر سکتی ہے"

لارڈ لوتھین اپنی ۸ اپریل والی تقریر میں اخبار ٹریبیون لاہور کے اس خیال کا ذکر کرتے ہوئے کہ کانگریسی لیڈر جو کچھ چاہتے تھے وہ یہ وعدہ نہیں تھا کہ مخصوص اختیارات کسی بھی حالت میں استعمال نہیں کئے جائیں گے بلکہ صرف یہ کہ ان اختیارات سے وزیروں کی آئینی سرگرمیوں کو رد نہیں کیا جائے گا فرمایا۔

یہ امر تصدیق طلب ہے کہ آیا کانگریسی لیڈروں کا مقصد واقعی یہی تھا یا
نہیں، کیونکہ اس نظریہ سے تو مصالحت کا راستہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ
ایکٹ کے ماتحت ان سرگرمیوں میں مداخلت کرنے کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے"

لارڈ سینبل نے وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"گورنروں نے جو کچھ کیا وہ تو درست ہے لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں
کہ باشندگان ہند سے منصفانہ اور مناسب سلوک ہو، اور جن مشکلات کا انھیں
سامنا ہے وہ دور ہوں . . . . . . ان مشکلات پر جو آجکل درپیش
ہیں جلد از جلد قابو پانا ہے مجھے اس سے بہت مایوسی ہوئی کہ لارڈ زٹلینڈ نے
اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کوئی حوصلہ افزا بات نہیں کہی۔"

ہندوستان میں بھی قانون کے نکتہ شناس اہل علم اس موضوع پر داد علمیت دے رہے ہیں چنانچہ کانگریسی لیڈروں کا جواب دیتے ہوئے سر تیج بہادر سپرو نے فرمایا ہے کہ

"گاندھی جی کی پیش کردہ شرط کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس کا
دستور سے مطابقت کرنا قطعاً ناممکن ہے اس لئے گورنر اپنے طرز عمل میں حق بجانب

ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو کانگریس کو اکثریت
کی تائید کا دعویٰ ہے اور دوسری طرف وہ گورنروں سے وعدہ لینے کے لئے
بے چین ہے ظاہر ہے کہ کوئی سمجھدار گورنر اکثریت کو فراموش نہیں کر سکتا اور
اگر وہ ایسا کرے تو اس کا جواب ہر وقت عملاً موجود ہے" ۔ ۔ ۔ ۔ یہ خیال
بالکل غلط ہے کہ اقلیت کی کابینہ کام ہی نہیں کر سکتی انگلستان کی گذشتہ صدی
کی تاریخ میں اس کی کئی مثالیں ہیں"

مسٹر راجگوپال آچاریہ نے اس کے جواب میں طویل بیان اخبارات کے حوالہ کیا جس میں وہ
فرماتے ہیں

"سر تیج بہادر نے اقلیت اور مشترکہ پارٹیوں کی جو مثالیں دی ہیں وہ ان
صوبوں کی قائم شدہ عارضی وزارتوں سے بالکل مختلف نوعیت کی ہیں اس لئے
یہ عارضی وزارتیں برطانیہ کی تاریخ کے پرانے یا جدید دستور کے کسی حوالہ سے
حق بجانب نہیں کہی جا سکتیں۔

سر سید وزیر حسن سابق چیف جسٹس نے ایسی وجوہات اور دلائل پیش کئے
ہیں جن کا جواب نہیں دیا جا سکتا اور آخر میں انھوں نے کہا ہے کہ یہ عارضی وزارتیں
بالکل خلاف قانون اور ناجائز ہیں اگرچہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۵۲
کے ماتحت گورنر کے فعل پر قانونی عدالت میں سوال کرنے کا حق نہیں رہا لیکن
اس سے گورنروں کے فعل کچھ کم خلاف قانون نہیں ہوتے اس دفعہ سے اگرچہ
گورنر کے فعل کی اصلاح نہیں ہوتی لیکن گورنر کا فعل بھی جائز نہیں ہو سکتا جو کہ
سراسر ناجائز ہے۔

دوسرے حصے میں سر تیج بہادر سپرو نے یہ وعدہ طلب کرنے پر کہ گورنر
وزیروں کے کام میں مداخلت نہ کریں قانونی اعتراض دہرایا ہے۔ سر سپرو کہتے

ہیں کہ گورنر اپنے آئینی اختیارات کو ترک نہیں کرسکتا ہمارا جواب یہ ہے کہ کوئی آدمی بھی نہیں چاہتا کہ وہ ایسا کریں ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم عہدے صرف تب منظور کریں گے اگر گورنر ہمیں یہ بتاسکیں کہ وہ اپنے مداخلت کے حقوق استعمال نہیں کریں گے اگر گورنر کسی وقت یہ محسوس کرے کہ کسی معاملہ میں وزارت غلط طرزِ عمل اختیار کررہی ہے اور اس کا رویہ اس قدر غلط ہے کہ اُسے مداخلت ضرور کرنی چاہیئے تو اُسے فوراً ہاؤس کو توڑ دینا چاہیئے یا وزیر کو برطرف کردینا چاہیئے مطلب یہ ہے کہ صوبجاتی نظم و نسق کے دائرہ میں اسے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ مداخلت کا مطلب ووٹروں کی اپیل پر وزیروں کی تبدیلی ہونا ہے۔"

سر سپرو کا دوسرا بیان

"ان میں سے ایک صاحب نے کہا ہے کہ برطانوی سلطنت کی آئینی تاریخ میں کسی ملک میں بھی اس قسم کی مثال نہیں مل سکتی۔ میں ایک فاضل مصنف کا حوالہ دیکر بتلا چکا ہوں کہ انگلستان میں کئی مرتبہ اقلیت کی گورنمنٹ بن چکی ہے ہاں اگر گورنران ۶ صوبوں میں جہاں کانگریس کی اکثریت ہے۔ کانگریس کے لیڈروں کو وزارت مرتب کرنے کی دعوت نہ دیتے تو واقعی وہ موردِ الزام ٹھیرائے جاسکتے تھے۔ دراصل وثیقہ ہدایات کی کلاز عام حالات کے پیش نظر بنائی گئی تھی اور اس کے بناتے وقت یہ تصور میں نہیں آیا تھا کہ جو پارٹی اکثریت میں آئے گی۔ وہ عہدے قبول کرنے سے انکار کردیگی لیکن سیاسی پیچیدگیوں سے پیدا شدہ غیر معمولی حالات میں گورنر کو اپنے وزیروں کے انتخاب میں کافی آزادی ہے ایسا ہی ملک معظم کو برطانیہ میں ہے گورنر کو گورنمنٹ بنانی چاہیئے اگر وہ بنا سکتا ہے اور پھر اس گورنمنٹ کو پارلیمنٹری طرز حکومت کے رحم پر اور اسی سے پیدا شدہ خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ کوئنز لینڈ میں ۱۹۰۸ء میں ایسی صورت پیدا ہوئی تھی جب گورنر کو اقلیت سے

ہاتھ میں گورنمنٹ دینی پڑی اور مہینوں ایسی صورت رہی - یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے آئین میں ایک ایسی دفعہ ہے جسکی رو سے گورنران اختیارات کو استعمال کرسکتا ہے جو معمولی حالات میں کسی اور پراونشل باڈی کے سپرد ہوتے ہیں لیکن کوئی عاقبت اندیش گورنر ایسے مخصوص اختیارات کا سہارا لینے میں حق بجانب نہ ہوگا"

گاندھی جی کا تازہ بیان :-

"میں نے لارڈ لوتھین کی اپیل پڑھی ہے مجھے ان ملاقاتوں کے الفاظ اچھی طرح یاد ہیں جو میں نے ممدوح اور دوسرے احباب سے کی تھیں اسوقت جس صوبجاتی آزادی کی تصویر دکھائی جارہی تھی وہ موجودہ صوبجاتی آزادی سے مختلف تھی - لارڈ زٹلینڈ نے میرے اس نظریہ کی تائید کی کہ برطانیہ کے سیاست دانوں کے آیندہ عزائم مشتبہ ہیں . . . . . . میں نے کانگریس کمیٹی کو وزارتوں کے قبول کرنے کے متعلق شرط کا مشورہ محض اس لئے دیا تھا کہ کانگریس کے قانون داں اصحاب نے قانونی وضاحت سے میری تشفی کردی تھی کہ صوبوں کے گورنر دستور کی دفعات سے تجاوز کئے بغیر مجوزہ اطمینان دلاسکتے ہیں . . . . حکومت کو چاہئے تھا کہ وہ قانون کی اس دفعہ کے مفہوم کی وضاحت کے لئے غیر جانبدار کمیٹی مقرر کرتی لیکن افسوس کہ اس نے ایسا نہیں کیا - میں دعوت دیتا ہوں کہ تین ارکان پر مشتمل ایک غیر جانبدار کمیٹی قائم کریں جن میں سے ایک ممبر کانگریسی ہو دوسرا برطانوی اور تیسرا وہ جن پر یہ دونوں متفق ہوں . . . . . مجھے افسوس ہے کہ لارڈ زٹلینڈ "پھوٹ ڈالو حکومت کرو" کے اصول پر عمل پیرا ہو رہے ہیں - کانگریس اگر اقلیت کے حقوق سے بے پروائی برتے گی تو دو دن بھی زندہ نہیں رہ سکتی کانگریس کی وزارتیں بشرطیکہ وہ قائم ہو جائیں جس دن اقلیتوں کے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کریں گی اسی روز

فنا ہو جائیں گی لہٰذا میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ وزیر ہند نے جو کچھ کہا حقایق کے
زور پر نہیں کہا بلکہ تلوار کے زور پر کہا ہے۔"

یورپین اسٹیج پر نیا کھیل

اسلامی دنیا

اطالوی عنایات

مسولینی اپنی سیاسی اغراض کے حصول کے لئے مسلمانوں پر بڑے مہربان ہیں۔ وہ نہ صرف افریقہ کے مسلمانوں کو اپنے موافق بنا کر اپنا اثر و اقتدار مضبوط کرنا چاہتا ہے بلکہ اس سے زیادہ دوررسی سے کام لے رہا ہے۔ طرابلس میں جو شاہانہ استقبال کیا گیا۔ اس کی حقیقت "مارننگ پوسٹ" کے نامہ نگار نے تو یہی بتائی ہے کہ سوائے ایک مرعوب قبیلے کے کسی شخص کا دل بھی نفرت سے خالی نہیں ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کی توجہ کا اصل مرکز اس وقت اسلامی دنیا ہے شام کے طلباء پر الطاف وکرم کی یہاں تک بارش ہو رہی ہے کہ باری باری جماعتوں کو روم کی سیر کرائی جاتی ہے اور وہاں غیر معمولی شان و آرام کے ساتھ مہمان رکھا جاتا ہے اور یہی نہیں بلکہ دینی فرائض کی ادائیگی میں آپ خلیفہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے آپ کے دو ہزار مسلمانوں کو حج کی شرکت کے لئے بھیجا تھا۔ مسلمان اب تک کیا کم مغرب کے مورد الطاف وکرم رہے ہیں کہ اب یہ نئی طاقت انھیں گراں بار احسان کرنے آئی ہے۔ جو ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔

(پنچ" لنڈن)

مصر افغانستان، مصر اور عراق کے نوعمر تاجداروں کے دور میں ایک نئی زندگی اور شگفتگی کا پتہ چلتا ہے ہم کہہ نہیں سکتے اس کی وجہ کیا ہے۔ ان نئے نوجوانوں کے فہم و فراست کی تیزی ہے یا پختہ کار مشیروں کی اصابت، یا ان دونوں داخلی اسباب کے علاوہ محض زمانہ کی رفتار کا خارجی اثر۔ شاید صحیح یہ ہے کہ یہ تینوں عنصر کام کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ ان تینوں نوخیز ملکوں میں نئے عہد کا آغاز ہے ہر شعبہ میں اصلاح، ہر ادارے میں تجدید۔ قوم کی فلاح اور ملک کی تہذیب میں تیزی سے قدم اٹھ رہے ہیں مصری، برطانوی معاہدے کے بعد مصر کو موقعہ ملا ہے کہ وہ اپنے داخلی اور کسی حد تک خارجی معاملات کو اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کرے۔ ایک زمانہ تھا کہ افغانستان نے تعلقات میں خود ہی پیش قدمی کر کے مصر میں اپنا سفارت خانہ قائم کیا تھا اور نعم البدل کی امید تھی۔ لیکن سالہا سال کی مساعی کے باوجود مصر نے کوئی جواب نہ دیا اور بالآخر افغانستان نے اپنے سفیر کو واپس بلا لیا تھا۔ لیکن اب مصر میں افغانستان اور دوسرے مشرقی ملکوں سے روابط قائم کرنے پر بڑا زور دیا جا رہا ہے اور اس مجلس کی سفارشات پیش ہو چکی ہیں جو خاص اس مسئلہ کے لئے مقرر کی گئی تھی۔

فلسطین ۱۱ر مارچ کے بم کے حادثہ[۵] سے فلسطین کے امن و اطمینان کے متعلق بڑی تشویش پیدا ہو گئی تھی، لیکن دوسرے ہی دن یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں ہے۔ تمام ذمہ دار حضرات نے اس واقعہ سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، مگر فلسطین کے بعض حالات میں ابھی تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ فضا کچھ اور مکدر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ اسکیم کہ فلسطین ساحلی اور داخلی دو حصوں میں تقسیم کر کے ساحلی علاقہ جو مختلف اسباب کی بناء پر زیادہ اہم ہے انگریزوں کے زیر نگیں یہودیوں کے لئے مخصوص رہے اور داخلی حصہ شرق اردن میں ضم کر دیا جائے ارباب اقتدار کی قوت اختراع

---

[۵] ۱۱ مارچ کو رات کے ۹ بجے یروشلم کی سڑک پر ایک بم پھینکا گیا جس سے سولہ آدمی زخمی ہوئے ان میں ایک کانسٹبل تھا اور ۱۵ راہ گیر۔ اسی رات کو ۲ بجے ۲ بم اور پھینکے گئے۔ جس سے ۷ عرب مجروح ہوئے۔

کی امداد ضرور چاہتی ہے لیکن مسئلۂ فلسطین کو حل کرنے کی سب سے بھونڈی شکل ہے۔ اس تجویز سے جس کی حمایت میں مرحوم شریف حسین کے نیک نام فرزند امیر عبداللہ[1] سب سے پیش پیش ہیں، عربوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ وزیر نوآبادیات کی فوری طلبی پر فلسطین کے ہائی کمشنر انگلستان پہنچے ہیں۔ ان کی گفتگو ابھی تک صیغۂ راز میں ہے۔ استاد جمال الحسینی صدر حزب العربی نے ہائی کمشنر کو ایک خط بھیجا ہے۔ جس میں عربوں کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "آپ جب خیر و عافیت کے ساتھ انگلستان پہنچ جائیں تو مجھ پر یہ کہہ دیں کہ میں نے فلسطین میں ایک ایسی قوم چھوڑی ہے جو سکوت کے نام سے آشنا نہیں ہے جو اپنے وطن کے لئے موت سے بغل گیر ہونے کو سب سے بڑا شرف سمجھتی ہے اس کے فرائض کو بجلی بھی بھسم نہیں کر سکتی۔ اس کی ہمتوں کو کوئی تہدید اور تخویف پست نہیں کر سکتی" نوجوانان فلسطین نے جمعیۃ اقوام کو بھی ایک ایسا ہی جوشیلا پیام بھیجا ہے " عربوں نے باعزم آہنی و ثبات قدم یہ ارادہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے وطن ہی میں زندگی بسر کریں گے۔ وہ دشمنوں کے ساتھ مصروف پیکار ہیں اور یقیناً تا دم آخر جنگ کرتے رہیں گے اور تب تک کرتے رہیں گے کہ جب تک سرزمین فلسطین کے تمام عرب نذر اجل ہو جائیں" عربوں کی حریت و آزادی کے جذبات پہلے سے معلوم و مشہور ہیں۔ لیکن محض جذبات تو ایسی مہموں کا اطمینان بخش فیصلہ نہیں کر سکتے حریف مقابل کی صف میں ایسے پیروانا مجبشرت موجود ہیں۔ جو قوموں کو آپس میں لڑا دینا کھیل سمجھتے ہیں۔ زعمائے فلسطین کی اپیلوں کا جواب عالم اسلام نے بے شک دردمندی سے دیا ہے۔ اسلامی تاجداروں نے بھی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن عالم اسلام کی موجودہ سیاسیات ہمیں یہ امید نہیں دلاتی کہ عملاً کوئی موثر صورت اختیار کی جائے گی، ہم تو یہی کہیں گے کہ فلسطین کے پرجوش مجاہدوں کو صرف اپنے پر اعتماد رکھنا چاہیئے۔ اور پورے عزم و ثبات کے ساتھ میدان میں جمع رہنا چاہیئے۔

حجاز دنیا کی عام معاشی حالت کا اثر حج، میں بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ حجاج کی تعداد اس سال گذشتہ سال سے بھی کم تھی، لیکن بعض خصوصیات کی وجہ سے یہ سال ممتاز ضرور ہے۔ زعمار شلم

---

[1] یہ خود شرق اردن کے امیر ہیں۔

فلسطین میں سے بہت سے اکابرین بشمول سید امین الحسینی مفتی فلسطین و رئیس مجلس الاسلامی الاعلیٰ بھی حج میں شریک ہوئے۔ امام یمن کے تین شاہزادے عبداللہ حسین، قاسم بھی حج کو آئے تھے اس کے علاوہ ایران سے ایک غیر معمولی تعداد حجاج کی آئی تھی جس کو لوگوں نے قدرے تعجب کی نظر سے دیکھا اور خوش ہوئے کہ پرانے مناقشات[1] کو نظرانداز کرنے میں مسلمان وسعتِ قلب سے کام لے رہے ہیں۔ اس سلسلہ کی سب سے اہم کڑی یہ ہے کہ حکومت مصر نے امسال حسب دستور قدیم محمل کعبہ بھیج کر[2] پھر سے ربط و تعلق کی بنیاد ڈالی۔ خود صدر اعظم مصر نحاس پاشا نے بھی ہوائی سفر سے حجاز آکر مناسک حج ادا کئے۔ مصر و حجاز کے خوشگوار تعلقات کی تجدید کے مستحسن اثرات کا آغاز بھی ہوگیا ہے۔ حکومت حجاز دولت مصر کے مشورہ سے مدینہ منورہ میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام مکمل کر رہی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے مصر کی معارف پرور حکومت اپنے خرچ پر مصری پروفیسروں کو مدینہ منورہ بھیجے گی۔

یہودی پروپیگنڈا مسلمانوں کے خلاف یہودی اخبارات مختلف قسم کا پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے یہ خبر آئی تھی کہ حکومت حجاز نے اپنی رعایا کو مسئلہ فلسطین

---

[1] اہل سنت اور حضرات شیعہ کی باہمی رنجشوں کا اثر تھا کہ ایران اور ترکی کی خلافت میں کبھی دوستانہ تعلقات قائم نہیں ہوسکے اور چونکہ حجاز مدت مدید تک ترکوں کے زیرنگیں رہا ہے اس لئے ایرانی عموماً حج میں بہت کم تعداد میں شریک ہوئے تھے اپنی غیر معمولی تعداد کے لحاظ سے یہ پہلا سال ہے۔

[2] کوئی پانچ سو سال سے کعبہ کا محمل مصر سے آیا کرتا ہے جس کے ساتھ سپاہیوں کا حفاظتی دستہ اور بینڈ بھی ہوتا ہے۔ [illegible] سعودی حکومت نے یہ اعتراض کیا کہ ہماری حدود میں محمل کی حفاظت بھی ہمارے ذمہ ہونا چاہئے۔ مصری فوج کو محافظ کی حیثیت سے اندر نہیں آنا چاہئے اس سلسلہ میں [illegible] میں عین حج کے موقع پر ایک نہایت ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا تھا کہ سعودی اخوان کی زیادتی پر مصری فوج نے گولی چلا دی تھی۔ اس واقعہ سے ان دونوں حکومتوں کے تعلقات میں بدمزگی پیدا ہوگئی لیکن خدا کا شکر ہے اب از سر نو تعلقات کی ابتدا ہوئی ہے اور محمل کے سلسلہ میں یہ طے پایا ہے کہ مصری فوج جدہ میں محمل کو سعودی حکومت کے سپرد کر دیا کرے گی۔

میں عملی دلچسپی لینے کی قطعاً ممانعت کر دی ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ جو شخص سرحد کو عبور کرنے کی کوشش کرے گا اسے گولی مار دی جائے گی لیکن وزیر خارجہ کے تازہ بیان سے معلوم ہوا کہ یہ افواہ محض بے بنیاد ہے۔ ادھر عراق کے متعلق خبر آئی کہ فلسطین کے مشہور مرد میدان "فوزی" پاشا کو حکومت نے اس الزام میں کرکوک میں قید کر دیا ہے کہ وہ ترکی اور عراق کے تعلقات میں بدمزگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے، حالانکہ ابلاغ کی اطلاع کے مطابق واقعہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔ فوزی پاشا نے خود حکومت سے کرکوک میں قیام کرنے کی اجازت طلب کی تھی جسے حکومت نے منظور کر لیا تھا اور اب موصوف کرکوک میں حکومت کے معزز مہمان کی حیثیت سے مقیم ہیں اور تمام ارکان حکومت اُن کے احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ فوزی اس فوج کے قائد اکبر تھے جس نے پچھلے سال برطانوی مسلح فوجوں کا مقابلہ کیا تھا اور آج کل محض اس لئے فلسطین سے باہر چلے آئے تھے کہ وہاں اُن کی موجودگی سے لوگوں کو مصالحانہ گفت و شنید کی فضا میں تکدر پھیلانے کا موقع ملے گا۔

ممالکِ غیر

روس کا مقدمہ سازش موجودہ روسی حکومت کے خلاف جو سازش کی گئی تھی اس کا مقدمہ ایک عرصہ سے روسی عدالت میں چل رہا تھا۔ اب اس کا فیصلہ سنا دیا گیا ہے تین سازشی جن کے جرائم زیادہ سنگین تھے اس فیصلہ کی رو سے پھانسی پا چکے ہیں بقیہ ملزمین کو تین سال سے آٹھ سال تک قید کی سزائیں دی گئی ہیں۔

اس مقدمہ کا پس منظر اسٹالن اور ٹراٹسکی کے گذشتہ اختلافات ہیں ۱۹۲۶ء میں جب روس کے انقلابی انگلستان کی عام ہڑتال میں ناکام رہے تو اسٹالن نے اپنے اشترا کی نصب العین کو صرف ایک سلطنت یعنی روس تک محدود کر دیا اور ٹراٹسکی اور اس کے ہم خیال جو اشتراکیت کو عالمگیر وسعت دینا چاہتے تھے اسٹالن کے اس اعلان پر بہت برافروختہ ہوئے اور انھوں نے علانیہ اسٹالن کو غدار کہنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روسی حکومت نے ٹراٹسکی کو جلاوطن کر دیا۔

اسٹالن کا یہ خیال تھا کہ صنعت سماجی نظام کے ماتحت اور زراعت انفرادی حیثیت سے ایک ساتھ نہیں چل سکتیں مگر ٹراٹسکی اور اس کے ساتھی جن کی زندگیوں کا بیشتر حصّہ اس قسم کی سازشوں میں گذرا تھا کب ماننے والے تھے۔ اُنھوں نے دوسرے ملکوں میں پناہ لی اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ روس میں ایک خفیہ تحریک شروع کر دی جس کا مقصد محض یہ تھا کہ اسٹالن اور اس کی تجاویز کو تباہ و برباد کیا جائے۔ لیکن اسٹالن کو کامیابی ہوئی اور زراعت بھی سماجی نظام کے ماتحت آگئی۔ اُدھر سازشی اپنی مخالفانہ سرگرمیوں میں برابر لگے رہے اور سب سے زیادہ خطرناک حرکت یہ کی کہ جرمنی اور جاپان سے جو روس کے شدید دشمن ہیں سازباز شروع کر دیا۔

[illegible]ء میں یہ ایجنٹ پکڑے گئے اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اطالوی اخبار نے اس مقدمہ کو جس طرح پیش کیا ہے ناظرین کی دلچسپی کے لئے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

"[illegible]ء کے اشتراکیوں میں اب کوئی باقی تو نہیں رہا؟"

"صرف آپ"

اسپین کی خانہ جنگی اسپین کی خانہ جنگی کا انداز اب بھی وہی ہے جو پچھلے مہینے تھا۔ کہیں باغیوں کو فتح ہوتی ہے، کبھی حکومت کے کامیاب حملوں کی خبریں آتی ہیں۔
عدم مداخلت کی مجلس بھی اپنا کام ختم کر چکی ہے اور عنقریب اسکی سفارشات پر عمل شروع ہو جائگا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ نئے والنٹیروں کی آمد بند بھی ہوگئی تو کیا اسپین کے حالت کچھ بہتر ہو سکتی ہے؟ مجلس اقوام مسولینی کے ہاتھوں ایک بار زک اٹھا چکی ہے۔ اب پھر وہ اپنے کو بے اثر اور بے عمل جماعت ثابت کرنا چاہتی ہے۔ بغاوت کے ابتدائی زمانہ ہی میں جب اطالیہ کے رضاکار ہزاروں کی تعداد میں اسپین آنے لگے تو مسولینی نے سمجھ لیا تھا کہ یہ صورت عرصہ تک جاری نہ رہ سکے گی اور ان کی آمد روکنے کے لئے مجلس اقوام ضرور کچھ نہ کچھ تدابیر تجویز کرے گی۔ اسپین کے ساحلوں کی حفاظت کرنے والے جہازوں اور مجلس اقوام کی آنکھوں میں کس طرح دھول جھونکی جا سکتی ہے، اس پر ابھی تفصیل سے لکھنا شاید قبل از وقت ہو لیکن اتنا تو پورے اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر بحری راستوں کی حفاظت ہو بھی گئی تو باغیوں کو ہوائی جہازوں کے ذریعہ امداد پہنچانے سے اٹلی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ بغاوت کو جلد ختم کرانے کے لئے ایک تجویز یہ بھی کی جا سکتی ہے کہ مختلف ملک اپنے اپنے رضاکار واپس بلالیں۔ مسولینی اس کے جواب میں نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ اطالیہ کا تو ایک شخص بھی اسپین میں نہیں۔ وہ سب اسپین کے باشندے ہیں یا اس لئے کہ رضاکاروں کو اسپین کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ملکی بنالیا جاتا ہے اور انھیں ایک پروانہ مل جاتا ہے جس سے وہ مسولینی کے بجائے فرانکو کی امت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اطالیہ اور یگوسلادیا بحیرۂ روم پر برطانیہ عظمیٰ کا اب اتنا اجارہ نہیں جتنا کہ پہلے تھا انگریز اٹلی سے بگاڑنا نہیں چاہتے لیکن کھٹکتے ضرور ہیں اور اٹلی بھی جنرل گرانڈی کے اعلانات کے باوجود اپنے پڑوسیوں سے صلح نامے کر کرکے اپنے استحکام کے لئے کوشاں ہے کئی مہینے ہوئے کہ سابق ملک معظم ایڈورڈ ہشتم یگوسلادیا تشریف لے گئے تھے

اب یگوسلاویہ اور اٹلی کے درمیان رشتہ یگانگت جوڑ گیا ہے۔ ذرا یورپ کا نقشہ اپنے سامنے رکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اٹلی کی یہ سیاست وسط یورپ اور جنوب و مشرق کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں پر اپنا اثر قایم رکھنے کے لئے اشد ضروری تھی۔ یگوسلاویا اور اٹلی کے درمیان صرف مختصر سا بحیرہ ایڈریاٹک حائل ہے اور اٹلی کسی حال میں محفوظ نہیں اگر یگوسلاویا کا سازباز کسی دوسرے سے ہو۔ چنانچہ مسولینی کی اس حکمت عملی نے یورپ کے ارباب سیاست کو اس جانب متوجہ کر دیا ہے۔

جرمنی ابھی چند ہی مہینے کا ذکر ہے کہ جرمنی نے رائن لینڈ کے علاقے پر فوجی قبضہ کر لیا تھا۔ اب خبر ملی ہے کہ اُنھوں نے وہاں زبردست قلعہ بندی شروع کر دی ہے۔ خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ فرانس کی قلعہ بندی 'میگی ناٹ لائن' کے عین مقابل ہے۔ فرانسیسی اپنی سرحد سے جرمنوں کا یہ اقدام دیکھ رہے ہیں اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہیں کیونکہ جرمنی فرانسیسیوں کی دفاعی قوت کو کمزور کرنے کے لئے اُن کی چھاتی پر مونگ دلتا نظر آتا ہے۔

امریکہ امریکہ میں Wangner Decisiins Act مزدوروں کی حمایت میں سب سے اچھا قانون ہے۔ یہ قانون حکومت کو حق دیتا ہے کہ اگر مزدور اور مالک دونوں راضی ہو جائیں تو وہ اُن کے جھگڑوں میں دخل دے کر اور اپنا فیصلہ دونوں سے لازمی طور سے منوائے اس کے علاوہ اس کی رو سے مزدوروں کو اجازت ہے کہ اپنا ایک مرکزی بورڈ قایم کریں جو اُن کی جانب سے مالکوں سے معاملات کرے اور اس مرکزی بورڈ کی شاخیں ملک کے ہر حصہ میں ہوں تاکہ جب مزدوروں کو اپنا متحدہ دباؤ مالکوں پر ڈالنے کی ضرورت ہو تو یہ شاخیں ان کی امداد کر سکیں۔

یہ قانون پریسیڈنٹ روزویلٹ کی [illegible] دولت کی تقسیم از سر نو) کی ایک اہم کڑی ہے اور چونکہ عدالت عالیہ میں امریکہ کے سابق پریسیڈنٹ ہوور

(REPUBLICANS.) کے نمایندے زیادہ ہیں اس لئے روزولٹ کا خیال تھا کہ کورٹ کی مخالفت کے سبب ملک میں کوئی ایسا اہم قانون جو اس کی پارٹی DEMOCRATS کے نزدیک ضروری ہو نافذ نہ کیا جاسکے گا۔ لیکن حال ہی میں عدالت عالیہ نے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں اپنا فیصلہ Wagners Decisions Act کے مطابق دیا ہے۔ روزولٹ عدالت عالیہ کو اپنے اثر میں رکھنے کے لئے خود کورٹ کی اصلاح وتشکیل جدید کا قانون کانگریس کے سامنے لانے والا تھا۔ اب خیال کیا جاتا ہے کہ کانگریس کے وہ اراکین جو روزولٹ کی اس اصلاحی تجویز کے متعلق ابتک اپنی رائے قائم نہ کرسکے تھے کورٹ کی اصلاح کے موافق نہ رہیں گے اس لئے کہ کورٹ ملک میں "دولت کی تقسیم نو" کی راہ میں خواہ مخواہ حائل نہیں ہورہا ہے۔

جاپان جاپانی Diet میں اس وقت دو سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ایک میں بحری اور بری فوج کے افسر شامل ہیں۔ دوسری رؤسا کارخانوں کے مالکوں اور غیر فوجی عناصر پر مشتمل ہے۔ اس وقت حکومت میں فوجی اثرات زیادہ تھے جو حکومت کو فسطائیت کے اصولوں کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ جب سے اس پارٹی کو اقتدار حاصل ہوا ہے جاپان کی تجارت اور عام معاشی حالت خراب ہوتی جارہی ہے چنانچہ مخالفین کو ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا زیادہ موقع مل رہا ہے۔ موجودہ حکومت کو اندیشہ تھا کہ اس کا فوجی بجٹ Diet میں پاس نہ ہوگا اس لئے Diet کو ختم کرکے نئے انتخابات کا اعلان کیا گیا ہے۔ انتخابات کی تاریخ ۳۰ اپریل ۱۹۳۷ء ہے اور فوجی عناصر متوقع ہیں کہ وہ قوم میں اپنے غیر معمولی اثر کے سبب نئے انتخابات میں زبردست اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوں گے اگر ان کی امیدیں پوری ہوئیں تو روسی جاپانی تعلقات اور چین سے متعلق جاپان کی سیاست خارجہ پر زبردست فوری اثر پڑے گا۔

شذرات

دن گذرتے دیر نہیں لگتی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم، سابق امیر جامعہ کے انتقال کو پورا ایک سال ہو گیا، پارسال اسی مہینے (۱۰ مئی ۱۹۳۶ء) مسوری سے اچانک ان کے انتقال کی خبر آئی تھی اور تمام ملک میں غم والم کی گھٹا چھا گئی تھی۔ یہ غم اتنا تازہ ہے کہ یقین نہیں آتا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی جدائی کو اتنے دن بیت گئے۔

اس پرچے میں پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا مضمون شائع کیا جاتا ہے۔ رشید صاحب نے بہت ہی دکھے ہوئے دل سے ڈاکٹر صاحب کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے جس شخص کا بھی سابقہ پڑا ہوگا ——— مریض کی حیثیت سے، دوست کی حیثیت، ضرورت مند کی حیثیت سے ——— اس کے جذبات کم و بیش یہی ہوں گے۔

رسالہ جامعہ کی اشاعت میں کچھ عرصہ سے بے ترتیبی پیدا ہو گئی تھی۔ اس تاخیر اشاعت سے ہمارے ناظرین کو جو تکلیف و اذیت پہنچتی رہی اس کا ہمیں پوری طرح اندازہ ہے لیکن کچھ ایسی رکاوٹیں اور مجبوریاں حائل تھیں جن کا تدارک بہت دیر میں ہو سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب حالات پر قابو حاصل ہو گیا ہے اور انتظامات میں ایسی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں کہ آئندہ اس اظہار معذرت کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ مارچ اور اپریل کے پرچے جلد جلد ایک ہی ہفتے میں شایع کر دئے گئے مئی کا پرچہ اپنے وقت پر یعنی مئی کے پہلے ہفتے میں شایع ہو رہا ہے۔

رسالے کے عام مضامین کے سلسلے میں بھی کچھ تبدیلیوں کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یعنی اب سیاسی مضامین کے لئے زیادہ گنجائش رکھی جائے گی۔ ان کے بعد عمرانی و معاشی مضامین کیلئے خاص

ادبی مضامین اور عمدہ افسانے بدستور شایع ہوتے رہیں گے۔ مضمون نگار حضرات سے توقع ہے
کہ مضمون بھیجتے وقت ہماری گذارشوں کا لحاظ رکھیں گے۔

جناب حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی صدر یار جنگ بہادر نے عرصہ ہوا اردو اکادمی میں مقالہ پڑھنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ بارے اب اس کے ایفا کا وقت آیا چنانچہ ۔ ۲۱ اپریل کو آپ جامعہ میں تشریف لائے۔ سہ پہر کے وقت آپ نے جامعہ کے مختلف اداروں کا معائنہ فرمایا۔ جامعہ نگر اوکھلا بھی تشریف لے گئے اور وہاں کی ہر چیز کو غور اور توجہ سے دیکھا آپ نے جامعہ کے نئے تعلیمی تجربوں سے دلچسپی ظاہر کی اور جامعہ کے کاموں پر اظہار اطمینان فرمایا شام کو اردو اکادمی کی طرف سے آپ کے اعزاز میں چاء کی دعوت تھی۔ دہلی اور نئی دہلی کے معززین اس دعوت میں شریک تھے۔

رات کو ۹ بجے آپ نے اکادمی کے جلسے میں اپنا مقالہ پڑھا شمس العلما پروفیسر عبدالرحمٰن صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی جلسے کے صدر تھے۔ مقالہ کا عنوان "قدیم علما کا تعلیمی نصب العین" تھا۔ آپ نے قرآن وحدیث کی روشنی میں نہایت وضاحت سے بیان کیا کہ ہمارے قدیم علما و طلبا کس مقصد سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ استاد اور شاگرد میں آپس کا برتاؤ کیسا تھا؟ طالب علم تحصیل علم کے شوق میں کیسی کچھ مشقتیں برداشت کرتے تھے۔ افلاس تنگ دستی ہزاروں میل کے پیدل سفر۔ اسی قسم کی اور بہت سی رکاوٹوں سے اُن کے استقلال میں ذرا بھی فرق نہ آتا تھا۔

جامعہ کے اساتذہ و طلبا نے آپ کی تقریر غور و توجہ سے سنی اور مفید سبق حاصل کئے باہر کے حضرات بھی کافی تعداد میں جلسے میں شریک تھے۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس سنہ ۱۸۸۶ء میں قایم ہوئی تھی۔ اس حساب سے اس کے قیام کو پچاس برس گذر چکے ہیں۔ اسی تقریب میں گذشتہ مارچ میں اس کی طلائی جوبلی منائی گئی۔ اس کی تفصیل اخبارات میں شایع ہو چکی ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زاویۂ نگاہ اور طرزِ عمل سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہے، تاہم یونیورسٹی کے قیام، مسلمانوں میں تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کرنے اور غیر مستطیع طلباء میں وظائف کی تقسیم کے سلسلے میں اس نے جو خدمات انجام دی ہیں لبا غنیمت ہیں۔

شکر ہے کہ کارکنانِ کانفرنس کو اپنے اصول و عمل کی فرسودگی کا احساس ہو رہا ہے۔ جوبلی کے مختلف خطبہائے صدارت اور مقالات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آہستہ آہستہ کانفرنس میں ایسے طبقے کا اثر و نفوذ بڑھ رہا ہے جو تعلیمی امور میں مہارت کے ساتھ زمانے کی ضرورتوں سے واقف ہے۔ یہ امر کانفرنس کے مستقبل کے لئے بہت خوش آئند ہے۔

اس سال مکتبہ جامعہ نے کئی علمی و ادبی تصانیف و تراجم شایع کئے ہیں، اب روسو کی معرکتہ الآرا تصنیف Social Contract کا ترجمہ معاہدۂ عمرانی کے نام سے زیرِ اشاعت ہے۔ ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی نے کیا ہے۔ کتاب آخر مئی تک تیار ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ حضرت جوش ملیح آبادی کے کلام کا تیسرا مجموعہ "فکر و نشاط" بھی اسی مہینے مکتبہ کی طرف سے شایع ہو رہا ہے۔

اپریل کے جامعہ میں کاتب کی غلطی سے صفحات کے نمبر غلط پڑ گئے ہیں اور یہ غلطی شروع سے آخر تک مسلسل ہے یعنی شروع صفحہ پر ۱۵۹ کی جگہ ۲۵۹ ہونے چاہئے تھے۔ براہِ نوازش اپنے اپنے پرچوں میں تصحیح فرما لیجئے۔

فہرست مضامین

قیمت سالانہ عہ　　پرنٹر و پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع برقی پریس۔ دہلی　　فی پرچہ

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شائع کی ہیں۔ جو حضرات جس مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں ازراہِ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں

۱۔ **مطبوعاتِ جامعہ** ۔ جامعہ کی شائع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

۲۔ **ناشرینِ اُردو** ۔ جامعہ کے علاوہ اردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

۳۔ **مصنفینِ اُردو** ۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مولفین اردو کی کتابوں کی فہرست۔

۴۔ **بچوں کی کتابیں** ۔ بچوں کے لئے اردو کی کتابوں کی فہرست۔

۵۔ **عورتوں کی کتابیں** ۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں۔

۶۔ **مختصر فہرست کتب** ۔ اردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست۔

۷۔ **ادبی کتابیں** ۔ تاریخ و تنقیدِ ادب، مقالات و انشاء، ناول، افسانہ، نظم ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

۸۔ **مذہبی کتابیں** ۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

۹۔ **تاریخی کتابیں** ۔ پانچ سو تاریخی کتابوں کی فہرست۔

۱۰۔ اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات اخلاقیات، طبیعیات، کیمیا، طب، حفظانِ صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیرِ طبع ہے۔ عنقریب شائع ہوگی۔

مکتبہ جامعہ دہلی

جدید اردو شاعری کے بعض میلانات

کسی دور کی شاعری کا تجزیہ کرنے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ اس زمانے کے ممتاز شعراء کا حال بیان کر دیا جائے اور ان کے کلام کا مناسب انتخاب مع ضروری حواشی کے دے دیا جائے الگ الگ تصویریں پیش کرنے سے بھی اکثر ایک مکمل خاکہ سامنے آ جاتا ہے۔ مگر ایک اور صورت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ عام تاریخی اور بیانیہ شاہراہ سے ہٹ کر اُن میلانات کو ٹٹولا جائے جو کسی ایک دور کو دوسرے دور سے علٰحدہ کرتے ہیں۔ اور ان میلانات میں سے خاص خاص کا ذکر اس طرح کیا جائے کہ ایک مسلسل اور مربوط رشتہ قایم ہو سکے۔ پہلی صورت کو (Inductive) اور دوسری کو (Deductive) کہہ سکتے ہیں۔ میں نے دوسرا طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔

ادب میں دوروں کی تقسیم | یہ بھی ایک بحث طلب امر ہے۔ آخر ہمارے پاس وہ کون سا معیار ہے جس کی بنا پر ہم داغ کی شاعری کو جدید نہیں کہہ سکتے لیکن آزاد اور حالی کو جدید شاعری کا پیغمبر قرار دیتے ہیں یہ تقسیم تاریخی نقطۂ نظر سے تو نہیں ہوتی مگر قدرتی طور پر اس کی ایک تاریخی حیثیت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمیں بعض ایسی تاریخیں مل جاتی ہیں جن کی سرحد پر آنے اور جانے والے دور کا اتصال ہوتا ہے اور جہاں زمانہ ایک منزل کو ختم کر کے دوسری میں قدم رکھتا ہے۔

ایسی ہی ایک تاریخ ۱۸۵۷ء کی تھی۔ اور اس وقت جو کچھ ہوا اُسے چاہے آپ مظلوموں کی حرکت مذبوحی کہیں، یا ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی یا انگریز مورخوں کے الفاظ میں غدر۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخ سے اردو ادب عموماً اور شاعری خصوصاً ایک نئے روپ میں سامنے آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس تاریخ اور اس کے واقعات کو پیش نظر رکھنے سے نئی شاعری کا رنگ سمجھ میں آسکتا ہے۔

غدر سے پہلے کی شاعری پر تبصرہ آزاد کے الفاظ میں سنئے۔

" زبان اردو کے پاس جو سرمایہ ہے وہ شعراء ہند کی کمائی ہے جنھوں نے فارسی کی بدولت

اپنی دوکان سجائی ہے اس سرزمین کی ہوا بگڑی ہوئی ہے ۔ جو کچھ ہے وہ اتنا ہی ہے کہ فارسی کے پروں سے اُڑی، لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی ۔ وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہوگئی ۔

مگر یہ رائے تصویر کے صرف ایک رخ بلکہ یوں کہیے.... کہ ایک کونے کے متعلق ہے ۔ آزاد اُردو شاعری کی صورت بتا دیتے ہیں تاکہ پہچاننے والے اُسے پہچان لیں ۔ اس کے مادہ سے انھیں بحث نہیں ۔ ہر دَور کی پیداوار اس دور کا آئینہ ہوتی ہے ۔ اس لئے وہ جدید روش جو قدیم شاعری میں (اور قدیم شاعری سے میری یہاں مراد غدر کے پہلے کی شاعری ہے) کوئی مستحسن پہلو نہیں دیکھتی، قابل لحاظ نہیں ہے ۔ قابل لحاظ یہ بات ہے کہ غدر سے پہلے کی شاعری اور اس کی پرواز شخصی اور صنعتی قدروں تک ہے ۔ داخلی شاعری کا دور دورہ اور خیال بندی اور خیال آرائی کے چرچے ہیں اور موضوع سے اتنی بحث نہیں ہوتی جتنی محاورے کی صحت اور غلطی سے ۔ زندگی بدلتی رہی، ماحول کچھ کا کچھ ہوتا گیا مگر یہ خیال کے بندے عالم خیال میں داد عشرت دیتے رہے ۔ زمانہ کا تقاضا کچھ اور تھا اور اُن کے دلوں کا کچھ اور ۔ بزم عیش بکھر چکی تھی مگر چاندنی راتوں میں پھولوں کی سیجیں سجانا اور دست حنابستہ سے افسردہ انگور لینا ہنوز یاد تھا ۔ یہ مصور اپنے مصور تھے کائنات اور فطرت کے مصور نہ تھے ۔ الفاظ کی دنیا بنا لیتے تھے ۔ ماحول کا نقشہ کھینچنا اُن کے بس کی بات نہ تھی ۔ بلکہ یہ تو شاید اپنی دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا سے آگاہ بھی نہ تھے ۔

نظام دہر نے لاکھوں ہی کروٹیں بدلیں
مگر ہم ایک ہی پہلو سے بیقرار رہے

غدر سے پہلے کی شاعری کے تین کارنامے ہیں ۔ ایک طرف قصیدہ دوسری طرف مرثیہ اور بیچ میں غزل ۔ بلکہ مجھے اجازت ہو تو کہوں کہ غدر سے پہلے کی نظم یا قصیدہ ہے یا مرثیہ ۔ مرثیہ اپنا، قصیدہ دوسروں کا ۔ کہیں کہیں غزل کا ایک شعر قصیدہ ہے تو دوسرا مرثیہ ۔ اُردو کے اچھے اچھے شاعروں نے اپنی رفعت تخیل، اپنی نازک خیالی، اور اپنی شعریت ان بے راہ وادیوں میں برباد کی ۔ انھوں نے مجاز کو

حقیقت کا زینہ کیا مگر پہنچے کہیں بھی نہیں ۔ فضا میں نئے نئے میدان تلاش کرنے کی جستجو میں زمین اور زمین والوں سے دور ہوتے گئے ۔ ہمارے قصائد ہماری ذہنی پستی کا نہ مٹنے والا ثبوت ہیں جس کا اندازہ کرنے کے لئے بائرن کے (Vision of Judgement) اور ہمارے شعراء کے اُسی زمانے کے قصائد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔ دوسری طرف مرثیہ ہے ۔ اس سے میری مراد شہدائے کربلا کا ماتم نہیں بلکہ وہ مرثیہ ہے جو عشق کی ناکامیوں اور مایوسیوں، تہی دستی اور تردامنی بربادی اور ویرانی کو شعر و شاعری کے پردے میں پیش کرتا تھا ۔ اور اپنے نالہ و فریاد سے ساری اجتماعی زندگی کو ماتم اور یاس انگیز بنا دیتا تھا ۔ اس طرز بیان کو صوفیانہ خیالات نے اور بھی مقدس بنا رکھا تھا ۔ کیونکہ دنیا سے الگ رہ کر دنیا کو سمجھنے اور سمجھانے کی یہ گمراہ کن کوشش وہیں سے شروع ہوتی تھی ۔

غزل قدیم شاعری میں ایک خاص شان رکھتی ہے ۔ اس کا عروج قدیم شاعری کا عروج اور اس کا زوال قدیم شاعری کا زوال ہے ۔ ہر صنف شعر کی پیدائش سادگی پر ہوئی ۔ بعد میں اس کا ارتقاء مضامین کے اعتبار سے بہت کم ہوا ۔ اسلوب اور زبان کے لحاظ سے ہر ایک میں الجھاؤ اور ظاہری شان و شوکت بڑھتی گئی ۔ سادگی سے پیچیدگی کی طرف ترقی اُردو شاعری کا عام اصول معلوم ہوتا ہے ۔ غزل پہلے سادہ تھی ۔ بعد میں ادبی صناعی اور حسن کاری کا نمونہ بن گئی ۔ پہلے داستانِ حسن و عشق کی ترجمان تھی آگے چل کر دماغی ورزش کے لئے بہترین آلہ ہو گئی ۔ یہ دور لکھنوی شاعری کا دور تھا ۔

غرض ایک طرف قصیدہ، دوسری طرف مرثیہ اور بیچ میں غزل ۔ یہ میراث غدر کے وقت اُردو شاعری کے پاس تھی یہ روایتی رنگ جاری رہتا اور اس کو جاری رکھنے کی کوششیں بھی جاری رہتیں کہ زمانے نے اپنی آواز کے سامنے ان بے حقیقت نغموں کو فراموش کر دیا اور ان ہی میں سے چند صاحب دل ایسے اٹھے جنھوں نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا ۔ خیالی اور فرضی باتوں کا ماتم نہ کیا بلکہ حقیقی پستی اور زبوں حالی پر افسوس کیا ۔ خود روئے اور دوسروں کو رلایا ۔ پھر ان کے آنسو پونچھے اور انھیں ڈھارس دلائی ۔ آزاد ۔ حالی اور اسمٰعیل کی کوششوں سے جدید اُردو شاعری کی بنیاد پڑی ۔ سر سید کی

تحریک نے اُسے مدد پہنچائی اور وقت کے تقاضے نے اس کے لئے سازگار ماحول پیدا کیا اور اس طرح ہماری شاعری انفرادی اور شخصی موریوں سے نکل کر زمانے کے صاف اور تیز دھارے پر چلنے لگی۔

دنیا میں کوئی بھی نظام ہو اس میں دو مخالف قوتیں برابر سرگرم عمل رہتی ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو ان دونوں کی پیکار اور کشمکش پر ہی اس نظام کی ترقی اور بہتری کا انحصار ہے۔ ایک اپنی حالت پر قائم رہنے کی اور جو کچھ ہے اسے سمیٹ کر محفوظ رکھنے کی، اور دوسری بدلتے رہنے کی اور نئی نئی راہوں کو تلاش کرنے کی۔ ایک کو قدامت اور دوسری کو جدیدیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک پرانی روشوں کے قیام کی ضامن ہے اور دوسری ان میں ترمیم، تراش وخراش، بلکہ بسا اوقات پوری عمارت کے ڈھا دینے کی ساعی ہے برسوں تک قدامت اُردو شاعری پر بری طرح مسلط رہی، جدید شاعری اسی قدامت کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش تھی۔ جس کی رنگارنگی سے ہم آج بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ جدید اُردو شاعری میں قدامت کا عنصر موجود ہے اور ناقابلِ اعتنا نہیں۔ مگر ہم اس وقت صرف اُن میلانات سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو جدید اُردو شاعری کو جدید کے لقب کا مستحق قرار دیتے ہیں اور جو اس کا طرۂ امتیاز ہیں۔ جن سے وہ پہچانی جاتی ہے اور جن کی بنا پر دنیا کی دوسری نظمیات میں جگہ لے سکتی ہے۔

یہ شاعری جن اشخاص کے ہاتھوں پروان چڑھی وہ سب بالواسطہ یا بلا واسطہ انگریزی ادب سے متاثر تھے۔ اُردو پر تقلیدی رنگ ہمیشہ غالب رہا ہے۔ ابتدا میں ہندی کا اثر تھا۔ چنانچہ قدیم اُردو مقامی رنگ سے مالا مال ہے۔ بعد میں فارسی آئی اور اس نے صدیوں تک اُردو کو نوازا اور کچھ کا کچھ کر دیا۔ غدر کے بعد سے انگریزی کا اثر شروع ہوا۔ اس اثر نے موضوع اور طرزِ بیان دونوں پر اپنا پرتو ڈالا۔ اس کے علاوہ تراجم کو بھی رواج دیا، جدید اردو شاعری کے بانیوں کے یہاں تینوں قسم کے نمونے ملتے ہیں۔

جدید شاعری نے اصناف میں کم اضافہ کیا۔ خیالات اور اسالیب میں بہت۔ غدر کے فوراً ہی بعد کی شاعری قومی، معاشرتی اور ادبی اصلاح کے احساس سے پُر ہے۔ اس کی خصوصیات تراجم، نظموں کا رواج مناظرِ قدرت کی طرف توجہ، اور ان کا ذکر سادگی، فطری اندازِ بیان اور اخلاقی طرز میں۔ آزاد۔ حالی اور اسمٰعیل سادگی اور صفائی کے قائل تھے۔ ان میں آزاد استعارات اور تشبیہات سے بھی اپنی دوکان سجاتے ہیں

لیکن نہ اتنی جتنی نثر میں۔ انھیں نے جو میدان اپنے لئے انتخاب کیا اُس میں اُن کے تعلیمی ماحول سے بہت مدد ملی۔ انھوں نے ابتدا سے تراجم اور مقامی رنگ پر زور دیا اور اُن کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور معاشرتی مسائل کی طرف بھی توجہ کی۔ رہے حالی تو ان کا مسلک اُن کے ان اشعار سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں	پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام	ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری	قبلہ ہو اس طرف تو نہ کیجو نماز تو

اس زمانے کے بعد مگر موجودہ احساسِ ازادی سے پہلے اُردو شاعری پر ایک نسبتاً پر سکون زمانہ گذرا جس میں اکبر اور شوق کی شاعری کا نشو ونما ہوا۔ اس دور میں عنصرِ اصلاح سے زیادہ ادبیت پائی جاتی ہے۔

مگر یہ اُردو شاعری کی بدقسمتی تھی کہ ابھی اصلاح کا قدم اچھی طرح جما نہ تھا اور اس کے اچھے نتائج ظہور میں نہ آنے پائے تھے کہ اس کا ردعمل شروع ہو گیا۔ حالی اور اکبر کے زمانے میں اتنا فرق نہیں جتنا ان دونوں کے پیغام میں ہے۔ حالی کا پیام ہے سے پھر تم اُدھر کو جدھر کی ہوا ہو۔ اکبر اس کے خلاف زمانے کے ساتھ تبدیلی کو بری نظر سے دیکھتے ہیں اس معنے کو سمجھنے کے لئے ایک اور حقیقت کو پیش نظر رکھئے حالی کی شاعری کا اولین دور سرسید کی تحریک شباب کا دور تھا۔ اور یہ تحریک اگرچہ فوج ظفر موج کی طرح ملک کے ہر طبقے کو اپنے ساتھ بہا لائی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ مغربیت کے مضر اثرات کو جذب کرنے میں بھی پیش پیش تھی۔ انقلاب کے پہلے دور میں اکثر یہی ہوتا ہے۔ ظاہر بیں نگاہیں سطح پر خس وخاشاک ہی دیکھتی ہیں۔ انھیں موجوں کی آغوش میں موتی کیسے نظر آئیں۔ یہی حشر جدید شاعری کا اکبر کے ہاتھوں ہوا۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ اکبر جیسے اشخاص نے جو نیک نیت بھی تھے اور تھوڑے بہت تنگ نظر بھی انقلاب کی اس چڑھتی ہوئی لہر میں اپنا سب کچھ بہتے ہوئے دیکھا۔ ایک صاحب کی رائے ہے کہ "اکبر کا کلام سائنسی تمدن کا شدید احتجاج تھا جو طنز یہ تک بندی میں کفر کے فتوے صادر کر رہا تھا" لیکن گالی جتنا جوش کو ظاہر کرتی ہے اس سے زیادہ غلطی کو نمایاں کرتی ہے۔ اکبر اپنے عہد کی

مکمل پیداوار ہیں۔ اُن کی شاعری اُن تمام تر ادبی، معاشرتی، رجحانات و تحریکات کی حامل ہے جو ہندوستان میں مغرب کے اولین اثرات کے ردعمل کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ عصرِ اصلاح مغربی اثرات کا دور تھا۔ عہد اکبر ان اثرات کے ردعمل کا دور ہے جس کی ابتدا شبلی سے ہو چکی تھی اور جس کی انتہا اقبال کی شاعری میں پر توفگن ہے۔ اس کی وضاحت آگے چل کر کی جائے گی۔

اکبر نے جب ہوش سنبھالا تو جدید تعلیم کے مضر اثرات پیش نظر تھے۔ اچھے پہلو تک اُن کی نظر پہنچی ہی نہیں۔ دو چیزیں اُن کی شاعری میں قابل غور ہیں۔ ایک تو اُن کا نصب العین دوسرے ان کا اسلوب یا طرز ادا۔ اکبر کی شاعری کا نصب العین ہندوستان میں ایک ایسی قومیت کی تعمیر تھی جس میں روشن خیالی کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب اور روایات مذہب کے تحفظ کا خاص طور پر احساس ہے۔ اکبر مشرقیت کے دلدادہ تھے اور مولویت سے بیزار۔ وہ شوہر پرست بیوی کو پبلک پسند بیوی پر ترجیح دیتے تھے۔ اُن کے خلاف صرف ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ اُن کے زمانے اور عصرِ اصلاح میں اور زیادہ فرق ہونا چاہیے تھا۔

حالی، اکبر، اقبال یہ تینوں مل کر اس تدریجی ارتقا کو واضح کرتے ہیں جو جدید اُردو شاعری میں کارفرما ہے۔ حالی کا کلام بھی ایک مرثیہ ہے مگر اس مرثیہ میں ایک تعمیری شان ہے۔ انھوں نے جس چیز کی اُردو شاعری میں بنیاد ڈالی ہے وہ زندگی اور مسائلِ زندگی سے قریب تھی۔ دوسری اہم چیز ان کا اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ یہ اس صوفیانہ اخلاقیات سے بالکل جداگانہ چیز ہے جس میں کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کو اُردو کا بڑے سے بڑا رند بھی راہ نجات کی خاطر داد سخن دیا کرتا تھا۔ اس اخلاقیات کی بنا زندگی سے زیادہ قریب تھی۔ پچھلے اخلاقیات مابعد الطبیعات کی حد میں جا پڑے تھے۔ حالی نے کئی نئے تجربات کئے۔ انھوں نے غزل کو اخلاقی اور فطری خیالات کے اظہار کا آلہ بنایا۔ اپنی نظموں میں واقعات بیان کئے اور اُن سے نتائج اخذ کرنے میں کبھی پس و پیش نہ کیا۔ عبدالماجد دریا بادی انھیں اُردو کا واعظ شاعر کہتے ہیں۔ اُن کا زور غالباً واعظ پر ہے مگر میں لفظ شاعر پر زیادہ زور دینا چاہتا ہوں۔

جدید اُردو شاعری کی پہلی خصوصیت زندگی اور مسائلِ زندگی سے قربت ہے۔ اُنیسویں صدی کا

آخر نصف میں سماجی نظام سرعت سے بدل رہا تھا۔ مسلمانوں کی پستی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور آہستہ آہستہ سرسید اور ان کے رفقائے کار کی کوششوں سے اس پستی سے نکلنے کے اسباب بھی پیدا ہو رہے تھے۔ انگریزی خیالات جدیدیت کا لباس پہن کر اونچے طبقہ کے لوگوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ اور ان خیالات کی وجہ سے قدیم نقطۂ نظر بدل رہا تھا۔ رسم و رواج کو ایک ایک کر کے ناقدانہ نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ اور اگرچہ ابھی صحیح قوت تنقید وجود میں نہیں آئی تھی مگر جو کچھ تھا غنیمت تھا کیونکہ اسی مدھم روشنی نے رفتہ رفتہ روز روشن کی شکل اختیار کر لی۔ حالی کی شاعری کی مصلحانہ شان خصوصاً مسدس کی مصلحانہ شان ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس پہ سرسید کے وقتی خیالات کا ایک بڑی حد تک اثر پڑا ہے اور اس کا نقطۂ نظر مذہبی اصلاح اور تعلیمی ترقی کا وہی ہے جو سرسید کا ہے۔

اُردو شاعری نے جب فضاؤں کی بے معنی پرواز ترک کی اور زمین اور زمین والوں کے مسائل سے قریب ہوئی تو اس میں قدرتی طور پہ ایک پیامی رنگ پیدا ہوگیا اور اُس وقت سے اِس وقت تک یہی رنگ اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ یہ پیغام آزادی کی جدوجہد کی صورت میں نمودار ہوا مگر آزادی سے یہاں میری مراد صرف سیاسی آزادی نہیں ہے۔ بلکہ شاعری میں ایک نئے تصور کی ابتداء ہے جس کا ذکر میں تفصیل سے کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں جدید شاعری کا کوئی ایک میلان اگر کہا جا سکتا ہے تو یہی آزادی ہے۔ جس کا اظہار نظری اور عملی دونوں طرح ہوا ہے۔ اُن میں موضوعات اور اسالیب دونوں کی آزادی ملتی ہے۔ ان موضوعات میں سے صرف چند پر اظہار خیال اس وقت ممکن ہے۔

پہلی چیز جس میں آزادی ہوئی وہ شاعر کا نقطۂ نظر ہے۔ پہلے شاعر جو کچھ کہتا تھا اپنے لئے کہتا تھا اور اس وجہ سے وہ جو کچھ کہتا تھا اس میں اپنے جذبات، اپنے خیالات اور اپنے رجحانات کو بہت کچھ دخل ہوتا تھا۔ ان جذبات میں اگر کوئی خارجی جذبہ شامل ہوتا تھا تو وہ سرپرستوں کا تھا۔ ہر صنف سخن کا قانون ایک بڑی حد تک اس کے سرپرست وضع کیا کرتے ہیں۔ وہ جس قسم کی چیز پسند کرتے ہیں دنیا ویسی ہی مہیا کرتی ہے۔ یہی حال شاعروں کا ہے۔ وہ اپنے جذبات شعر میں بیان کرتے تھے اور ان جذبات کو جو خارجی چیز متاثر کرتی تھی وہ ان کے سرپرستوں کا مذاق تھا۔ اسی پہ انشا قربان ہوئی۔

یہیں مصحفی نے شکست کھائی۔ یہیں سے امانت نے اندر سبھا کے لئے اور شوق نے اپنی مثنویوں کے لئے مواد حاصل کیا۔ یہ ادب یا شاعری کا داخلی یا (Subjective) پہلو تھا۔ جدید شاعری نے خارجی یا (Objective) پہلو پر زور دیا۔ اور نقطۂ نظر میں اس آزادی کی وجہ سے نئے نئے میلانات اور تجربات ظہور پذیر ہوئے۔ اس تبدیلی اور آزادی کی کارفرمائی چند مخصوص میدانوں میں دیکھ کر اچھی طرح سمجھ میں آئے گی۔

اس جذبہ کے ماتحت وطنی اور سیاسی شاعری شروع ہوئی۔ تعجب ہے کہ غدر سے پہلے سوائے نظیر اکبرآبادی کے کلام کے وطنی شاعری کا سرمایہ بہت تھوڑا ملتا ہے۔ لیکن چونکہ اس زمانے کا قبلہ خاکِ وطن نہیں بلکہ سرزمین ایران تھی۔ اسی لئے یہ کمی سمجھ میں آسکتی ہے۔ غدر کے بعد وطن کی زبوں حالی کا احساس پیدا ہوا اور آخر قومی نوحہ کی شکل میں نمودار ہوا۔ حب وطن کا ابتدائی تخیل جغرافیائی ہے جس میں انسان وطن کے آسمان زمین، عنادل، نغمہ سحری کوہسار اور دریا، باغ اور تاروں بھری رات کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد وطن کی تاریخ، تہذیب اور تمدن کی باری آتی ہے۔ اس کے مشاہیر کا ذکر فخریہ الفاظ میں ہوتا ہے۔ اُن کے کارنامے بڑے جوش وخروش سے بیان کئے جاتے ہیں۔ اُن کے ذہنی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کی بار بار تلقین کی جاتی ہے۔ حب وطن کا تیسرا اور بلند ترین تصور وہ ہے جہاں مادی وسائل کے بجائے انسانیت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ جس میں وطن کے مظاہر مادی پر قناعت نہیں کی جاتی بلکہ اہل وطن کی بے غرض خدمت اور بے لاگ سیوا کا درس دیا جاتا ہے۔ جدید شاعری میں حالی۔ چکبست۔ سرور جہاں آبادی اور دَور اول کے اقبال وطنی شاعر کے لحاظ سے ممتاز ہیں حالی وطن کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں مگر ان کی وطنی شاعری ہمارے لئے اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ اس میں حب الوطن کا تیسرا بلند ترین تصور پیش کیا گیا ہے۔ اپنے اس دعویٰ کے بعد کہ ؎

تیری اک مشت خاک کے بدلے ... لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

حالی اپنے ہم وطنوں سے اس طرح خطاب کرتے ہیں ؎

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو ... اٹھو اہل وطن کے دوست بنو

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ ✤ ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ

مقبلوں مدبروں کو یاد کرو ✤ خوش دلو غمزدوں کو شاد کرو

جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ ✤ تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

چکبست کی وطنی شاعری میں ایک طرف ہندوستان کی قدیم عظمت کی نوحہ خوانی کی گئی ہے ؎

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو ✤ سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو

اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو ✤ سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں

ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں یا اُنکی ہڈیاں ہیں

دوسری طرف وطنی آزادی کا راگ لبرل تخیل کے مطابق گایا گیا ہے ؎

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے ✤ نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اس 'ہوم رول' کا نظریہ ملاحظہ ہو ؎

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے ✤ وطن کے باغ میں اپنا بھی انتظام رہے

گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے ✤ نہ کوئی مرغ خوش الحان اسیرِ دام رہے

سرِ پرشاہ کا اقبال ہو بہار چمن

رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

گو وطن کے مناظر اور قدیم تاریخ کے بہترین مرقعے سرور جہان آبادی کے یہاں پیش کئے گئے ہیں جن کی مشہور نظمیں گنگا اور جمنا اپنے تخیل، اپنی نصب العینیت، اپنے طرز بیان اور اپنی غنائیت کے لحاظ سے بہت کامیاب کہی جا سکتی ہیں۔

اقبال کے موجودہ رنگ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وطنیت کا اس قدر زبردست مخالف ایک زمانے میں وطن کو قدر اعلیٰ اور خاک وطن کے ذرہ ذرہ کو دیوتا سمجھتا ہوگا۔ لیکن اُن کے دور اول کی شاعری میں ایک نہیں بلکہ کئی نظمیں ایسی ملتی ہیں جن میں اقبال نے وطن کی محبت کا اظہار بڑے فخر و مسرت

سے کیا ہے ۔ ان میں کوہ ہمالہ ۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت ۔ ترانۂ ہندی اور نیا شوالہ زیادہ مشہور ہیں یہ تخیل آگے چل کر بالکل بدل جاتا ہے ۔ اور اقبال ایک عالمگیر انسانیت کے خواب دیکھنے لگتے ہیں جس کی تعمیر میں اُن کے نزدیک سب سے بڑی رکاوٹ وطنیت کا محدود تخیل ہے ۔ ترانۂ ملی اور وطنیت ان دونوں نظموں میں اقبال اپنا جدید مذہب بیان کرتے ہیں جس میں وطنیت کی جگہ ملیت نے لے لی ہے اقبال اب وطنیت کے محدود تصور کو تراشیدۂ تہذیب نوی کہتے اور صاف صاف الفاظ میں پکارتے ہیں ؎

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے ٭ قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال کا یہ تصور 'بال جبریل' اور 'ضرب کلیم' دونوں میں جھلکتا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اقبال وطن کے بالکل مخالف ہیں ۔ اقبال کی مخالفت درحقیقت وطنیت کے اس محدود تصور سے ہے جس میں اور کسی شے کی گنجائش نہیں ۔ وطن کی محبت اور وطن کو پستی سے نکالنے کی خواہش 'ضرب کلیم' میں بار بار ملتی ہے ۔ شعاع امید میں فرماتے ہیں ؎

ایک شوخ کرن شوخ مثال نگہ حور ٭ آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو ٭ جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو ٭ جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز ٭ اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن ٭ یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی ٭ جن کے لئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں ٭ محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانہ کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن ٭ تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

اور تنگ نظر اور محدود وطنیت کے خلاف آخر میں یوں اعلان کرتا ہے ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر ٭ فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

وطنیت کا تصور اقبال کے یہاں بہت بلند ہے مگر عام طور پر جدید شاعری ابھی وطنیت کے قدیم تصور سے معمور ہے
اور یہ احساس زیادہ تر سیاسی مشکلات کو حل کرنے میں صرف ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ چونکہ اقبال
ایک وسیع تخیل کے ساتھ ایک عمیق نظر بھی رکھتے ہیں اس لئے بہت جلد وہ وطنیت کے اس محدود تصور سے
آگے بڑھ گئے جو چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں عوام مزدوروں کو پھنسا دینے کا آلہ ہے اور جس کی غایت
محض حاکموں کی تبدیلی ہے اور بس۔ ان کا نصب العین انسانیت کی تکمیل و ترقی ہے۔ اور انسان کی تکمیل
کے لئے اُن کے خیال میں ایک ہی شاہراہ ہو سکتی ہے۔ اور وہ اسلام کی ہے دوسرے شعراء ابھی اس
گنگا کو پار نہیں کر سکے ہیں۔ چونکہ اُن کی نظر زمانے کے سیاسی اور اقتصادی مسائل پر اتنی گہری نہیں ہے
اس لئے وہ ابھی تک وطن میں ایک باغ عدن کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ باغ عدن کبھی تو قدیم تہذیب
کے عناصر پر قائم کیا جاتا ہے اور کبھی اس میں سب کو مساوات کا پیام سنایا جاتا ہے اور کبھی اس میں
عصر حاضر کی سراسیمگی و انتشار سے جائے پناہ تلاش کی جاتی ہے۔ سیماب۔ جوش اور ساغر کی شاعری
اسی قسم کی ہے۔

وطنی شاعری میں شروع ہی سے سیاسی نقطۂ نظر کام کر رہا تھا۔ اس کا سلسلہ بھی حالی
سے شروع ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ایک فاضل کی رائے میں "مسلمانوں کی تاریخ سیاسی میں،
تاریخ معاشرت میں، تاریخ ادب میں، جہاں کہیں صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اس کا سلسلہ
پانی پت کے اس ادیب، شاعر، مصلح، محب وطن اور سب سے زیادہ اس صاف دل اور فرشتہ
خصائل انسان کی کاوش ذہنی کے چشمۂ صافی سے جا ملتا ہے جس کا نام الطاف حسین اور جس کا
تخلص حالی تھا۔" حالی پر سرسید کے وقتی خیالات کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ سرسید کی طرح ان کا
بھی خیال تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ میل جول کر کے ترقی کرنی چاہیئے۔ یہ فیصلہ حالی کے
دماغ کا تھا مگر روشن ضمیر حالی کا دل اس میں شریک نہ تھا۔ انھیں اس امن میں تلس اور قزاقی کی جھلک
دکھائی دیتی تھی اور مساوات کے بلند آہنگ دعووں میں حاکم و محکوم اور رنگ و خون کا امتیاز صاف نظر
آتا تھا۔ کالے اور گورے والی نظم سب نے پڑھی ہوگی اب حکومت کی پالیسی پر یہ بے باک طنز

ملاحظہ ہو ؎

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح ٭ واں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اسکے یہ تھی مشورہ دیتی ٭ یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر ٭ مانو اسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن ٭ جو بات سبک ہو اسے منہ سے نہ نکالو

اگرچہ اس قسم کی نظموں کی تعداد زیادہ نہیں تھی پھر بھی جو کچھ تھی قبل از وقت تھی۔ اور چونکہ ملکی سیاسیات عام طور پر اس کے خلاف تھیں اس لئے ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور ہوا بھی تو اتنا خاموش کہ معلوم نہ ہوا۔ لیکن سیاسی آزادی کا تصور جو کانگریس کے ہاتھوں وجود میں آیا سرعت سے جڑ پکڑتا گیا۔ حالات اس کے لئے ساز گار تھے اور جیسے جیسے تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد زیادہ ہوتی گئی یہ اپنے حقوق اور حکومت میں حصہ کے لئے جدوجہد کرتے گئے۔ اس جدوجہد کا عکس شبلی، اکبر اور چکبست تینوں کے یہاں اپنے اپنے فرق سے ملتا ہے۔ شبلی کے متعلق ایک نقاد کی رائے ہے کہ یہ اگر شعر و شاعری کی طرف زیادہ توجہ کرتے تو دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے۔ بہر حال شبلی کے کلام میں سیاسی اور قومی نظموں کی تعداد بہت کافی ہے۔ کیفیت اور کمیت دونوں کے لحاظ سے یہاں بھی آپ کو حقوق کی جنگ اور اس جنگ کے مختلف پہلو ملیں گے۔ جو انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہو گئی تھی۔ شبلی حریت پسند تھے۔ اور اگرچہ سرسید کے ادبی رفقاء میں سے تھے لیکن ان میں اور سرسید میں جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے ہمیشہ اختلاف رہا۔ مولانا حالی نے سرسید کی بعض رجعت پسندانہ حرکتوں کی تاویلیں کی ہیں مگر شبلی ہمیشہ ان پر اعتراض کرتے رہے اور غالباً ان کی علی گڈھ سے علحدگی کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ مولانا جماعت احرار کے حامی اور ان کے پر جوش مبلغ تھے مگر انھیں بھی ڈر لگا رہتا تھا ؎

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید ٭ سوچتا ہوں کہ یہ آئین خرد ہے کہ نہیں
اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر ٭ اس میں کچھ قابل تسلیم و سند ہے کہ نہیں

جس نئی راہ میں ہیں جادہ پیما یہ لوگ ؎ کوئی اُس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں
پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری ؎ اس دوراہے میں کوئی بیچ کی رہ ہے کہ نہیں

مولانا جس چیز سے سب سے زیادہ گھبراتے تھے وہ تخریبی پروگرام تھا۔ اُس کے متعلق پوچھنے میں۔
بلکہ سے آپنے ڈھائے بہت اچھا لیکن ؎ شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھئے بنیاد
خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم ؎ خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد

اُنھوں نے اپنی دوسری نظموں میں حکومت پر زوال آنے کا ماتم کیا ہے اور چراغ کشتۂ محفل کا رونا رویا ہے مگر یہ درس اُن سے پہلے مسدس میں بھی دیا جا چکا تھا۔ اس لئے شبلی و حالی میں فرق رنگینی و سادگی کا ہے اور کچھ نہیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ قومی پستی کا احساس عام ہو چلا تھا مگر ابھی تک شاعری زیادہ سے زیادہ حالی ہے اس میں استقبالی رنگ نہیں آنے پایا۔ اکبر نے اپنے مخصوص انداز میں سیاسیات، معاشرت، تہذیب (تمدن) مذہب و اخلاق سب پر تبصرہ کیا، مذہب میں اکبر قدامت پسند ہوں تو ہوں، سیاسیات کی دنیا میں یقیناً حُر کہے جا سکتے ہیں ؎

بج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل ؎ ہیں نہایت خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں

چکبست نے سیاسی جدوجہد کا ذرا اور آگے تک ساتھ دیا۔ یہ بھی حقوقی نقطۂ نظر سے چلے تھے مگر اُنھوں نے مہاتما گاندھی کی تحریک اور جنگ سے بعد کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔ اس لئے آخر آخر میں پکار اُٹھے تھے ؎

دم سے گاندھی کے رہے شور وفا بستی میں ؎ قیس جنگل میں رہے کوہ پہ فرہاد رہے

حکم حاکم کا ہے فریاد و زبانی رک جائے ؎ دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے ؎ پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشہ نہیں یہ قوم نے کروٹ لی ہے
آج بے شوق وفا کا یہی جوہر ہوگا ☆ فرش کانٹوں کا نہیں پھولوں کا بستر ہوگا
پھول ہو جائیگا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا ☆ قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا
سنتری دیکھ کے اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

یہ وہ زمانہ تھا کہ عدم تشدد اور خلافت کی تحریک نے گھر گھر شاعر پیدا کر دئے تھے۔ اُن میں خیال کی گہرائی اور پختگی تو نہ ہوتی تھی مگر جوش بے حد ہوتا تھا۔ اور کچھ نہیں تو اس کی بدولت دار ورسن، خون شہیداں، قفس، گلستاں، باغباں، صیاد، جیسے رسمی اور روایتی الفاظ میں ایک واقعیت اور صداقت پیدا ہوگئی۔ مولانا محمد علی اور حسرت ان دونوں نے غزلوں میں جذبۂ آزادی کی تڑپ سے ایک خاص سوز و گداز پیدا کیا۔ حسرت کے یہاں دلی بات پھر بھی دل میں رہتی ہے۔ مگر مولانا چوکنے والے نہ تھے صاف صاف پکارتے ہیں ؎

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی ☆ ہوس زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا ☆ اب بھی احساس ہو اسکا تو ابھرنا ہے یہی
نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر ☆ کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا ☆ کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ☆ ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
تیرے مقابلے کی کسے تاب پر دلے ☆ میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

جنگ عظیم سے قبل آزادی کی جد وجہد ایک محدود طبقے کی طرف سے تھی۔ اور دراصل اس جد وجہد کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقے کے لئے بہتر میدان تلاش کئے جائیں۔ حکومت میں حصہ۔ ملازمتوں میں خاص رعایتیں اور شرح کا تعین۔ ہندوستانی مال کی تجارت میں مراعات کا حصول۔ سودیشی کی تحریک یہ سب اس لئے تھیں کہ حکمراں بدلے جائیں اور بجائے غیر قوموں کے اقتدار کے کمزور، بے بس، خاموش عوام پر تعلیم یافتہ طبقہ یا سرمایہ دار طبقہ کا اقتدار قائم کیا جائے۔ جنگ عظیم کے دوران میں ہندوستانیوں سے بڑے بڑے وعدے کئے گئے تھے۔ جنگ کے بعد ان کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ اصلاحات درعایات کی ایک مزید قسط مل گئی۔ سمند ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا۔ اس بے چینی نے اقتصادی مشکلات سے مل کر ایک عام شورش کی شکل اختیار کر لی۔ یہ شورش صرف عدم تشدد کے زمانے میں، یا سول نافرمانی کے زمانے میں موجود نہ تھی۔ بلکہ برابر جاری ہے۔ کبھی دب جاتی ہے کبھی اُبھر آتی ہے۔ زندگی کی ہر رو کی طرح اس میں بھی مد وجزر آتا رہتا ہے۔ مگر اس میں کئی نئی باتیں داخل ہوگئی ہیں۔ ایک تو اب یہ حقوق کی جنگ نہیں رہی بلکہ کھلم کھلا آزادی کی جنگ ہوگئی دوسرے اس کا مقصد اب ایک جماعت یا گروہ کا اقتدار نہیں بلکہ جمہور کا اقتدار قائم کرنا ہے۔

اب تک اس قسم کے میلانات بیدار کرنے میں ہماری شاعری کا حصہ نہیں تھا۔ دوسرے الفاظ میں ہماری شاعری بجائے سیاسیات کے میدان میں اجتہاد و رہنمائی کے سماج کے عام خیالات کی آئینہ داری پر قانع تھی۔ اسے یوں سمجھئے کہ یہ تحریک شاعری کی وجہ سے آگے نہ بڑھی۔ شاعری صرف پیچھے سے اسے مضبوط کرنے اور مدد پہنچانے پر قانع رہی۔ مگر اقبال اور جوش کی شاعری میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اقبال صرف شاعر ہی نہیں مفکر بھی ہیں اور جوش صرف نقیب۔ اقبال جس مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہیں اُس کے خط وخال بھی دکھاتے ہیں۔ جوش آنے والے زمانے کے تصور میں اس قدر مست ہیں کہ اُس کا کوئی خاکہ نہیں بیان کرتے۔ اقبال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ "ماضی" کے شاعر ہیں۔ احمد علی کے الفاظ میں "اُس ماضی کے عشق میں جو اپنے مردے کبھی کا دفن کر چکا ہے۔ اقبال رنج ومحن کے ترانے گاتے ہیں اور چیختے چلاتے، روتے دھمکاتے۔ قدیم گل وبلبل کے گیت گاتے۔ ایک ناممکن اور بے معنی پان اسلامزم کی

دعوت دیتے ہیں۔ آگے چل کر یہی بزرگ خود غلط نقاد فرماتے ہیں کہ " اقبال کی شاعری بیماروں کی طرح زندگی سے گریز کرتی ہے اور حقیقت کو بہلانے کی خواہش سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ ہم کو صرف غیر معمولی اور بے حرکتی کی طرف کھینچتی ہے اور اس سے زیادہ رجعت پسندانہ ہے " اگر تنقید کوئی مذہب ہے اور اس کی کوئی شریعت ہے تو یقیناً اس شریعت میں یہ الفاظ کفر کے مصداق ہیں (اقبال ماضی کے شاعر صرف اسی حد تک ہیں کہ وہ حالی اور اکبر دونوں کے نقش بہتر ہیں۔ حالی کی قنوطیت اور اکبر کا طنز دونوں اُن کے یہاں ملتے ہیں۔ مگر ان سب پر ان کی اپنی رجائیت غالب ہے۔ جو ان کے اپنے فلسفہ زندگی کی پیداوار ہے۔ اقبال کا نصب العین عالم گیر انسانیت کی تکمیل ہے۔ یہ مقصد اُن کے نزدیک اتحاد ملی ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔ اور اس اتحاد ملی کے لئے وہ ماضی کی بنیادیں مستعار لیتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ۔ چاہئے جنوں تیرا نیا، پیدا نیا ویرانہ کر۔ کے بھی قائل ہیں۔ اتحاد ملی کے قیام کے لئے جس قسم کی زندگی کی ضرورت ہے اس کا راز بتاتے ہیں اور پستی و زبوں حالی کے احساس کے ساتھ ان کا مستقبل کی طرف اشارہ وہی کرتا ہے جو تھکی ہوئی روح کے ساتھ ایک نیا منظر کرتا ہوگا۔ مستقبل کی نئی دنیا کے لئے اقبال جن ہتھیاروں کی ضرورت سمجھتے ہیں انھیں دوسروں سے مستعار لینا انھیں گوارا نہیں۔ اس لئے کہ ان کے خیال میں اپنی ہستی کو پہچاننے کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی۔

ہاں ضرورت اس بات کی رہتی ہے کہ ہستی کو پہچاننے کے بعد اس کو ثابت بھی کیا جائے۔ اس ثبوت کے لئے حرکت، پیکار اور عمل کا فلسفہ سکھایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں مغربی تہذیب کی غارت گری کا پردہ فاش کیا جاتا ہے۔ اور اس کی سرمایہ دارانہ ذہنیت کے خلاف " فرمان خدا فرشتوں کے نام " اور " لینن " جیسی نظموں میں صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے۔ فرمان خدا فرشتوں کے نام اُس نئی دنیا کا پتہ دیتا ہے جو اقبال تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اس نظم کی خوبی اس وقت اور زیادہ ظاہر ہوتی ہے جب ہم " ضرب کلیم " کی دوسری نظم " ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام " اور جوش کی نئی نظم " روح استبدادیت کا فرمان " پیش نظر رکھیں۔ اقبال کی شاعری کا امید افزا پہلو ان کی ایک اور نظم۔ شعاع اُمید سے ظاہر ہوتا ہے جس میں مشرق و مغرب کی ہر شب کو سحر کرنے کا عزم کیا گیا ہے۔ اس نظم کا ایک حصہ اوپر دیا جا چکا ہے۔

روس کی موجودہ حالت

انگریزی کے دو رسالوں (The Nineteenth Century اور The Slavonic Review) میں روس کی موجودہ حالت کے بارے میں دو مضمون نکلے ہیں، ایک مسٹر وکٹر کیزلٹ ایم پی کے چشم دید حالات پر مشتمل ہے، اور ایک جو مسٹر برنارڈ پیرز نے لکھا ہے یہ دکھاتا ہے کہ روس کی خارجی پالیسی پر ملک کی زندگی کس طرح اثر ڈال رہی ہے۔ مسٹر کیزلٹ ایک مالدار مگر شائستہ آدمی ہیں، مسٹر پیرز انشا پرداز اور نقاد۔ لیکن دونوں کے بیان میں کوئی اہم اختلاف نہیں۔ سوشلسٹ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں، مگر اس وقت کوئی ایسی نمایاں عداوتیں نہیں ہیں جن کا ان دونوں میں سے کسی کی رائے پر اثر پڑتا، بلکہ جرمنی اور اٹلی کے خوف سے سرمایہ دار اور بورژوا بھی فاشزم کے مقابلے میں کمیونزم سے کسی قدر دوستی برت رہے ہیں۔

مسٹر کیزلٹ لکھتے ہیں:

"میرا مقصد سیاسی رنگ کا مضمون لکھنا نہیں ہے اور نہ میں کسی کو قائل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد تو بس یہ ہے کہ وہ اچھی اور بری باتیں جو میں نے دیکھیں بیان کردوں۔ سوویٹ راج کے انجام کی نسبت ہم چاہے جو رائے رکھتے ہوں، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اس وقت روس میں ایک عظیم الشان معاشرتی اور معاشی نظام کا تجربہ کیا جارہا ہے، اور جسے بھی معاشیات، معاشرتی بہبودی، یا فن حکومت سے دلچسپی ہے اسے روس میں مطالعے اور مشاہدے کے لئے بہت کچھ سامان ملے گا۔

"میرا خیال ہے کہ میں اتنا بے تعصب تھا جتنا کہ ایسے معاملے میں کوئی ہوسکتا ہے، اور میں یہ طے کرکے گیا تھا کہ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکا وہ دیکھوں گا اور اپنی رائے قایم کروں گا۔ واپسی پر مجھ سے کئی لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو کچھ دیکھنے کی اجازت بھی ملی؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہم جو کچھ

روس میں یہ سب دیکھ سکتے ہیں، سڑکوں پر لوگوں کو روز مرہ کے کاروبار میں مصروف دیکھ سکتے ہیں، گھروں کی، کارخانوں کی، دکانوں کی اور آرام گاہوں کی حالت دیکھ سکتے ہیں، یہ دیکھ سکتے ہیں کہ لوگ کیا کھاتے اور پہنتے ہیں، مزدوروں سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ یہ موقعے ایسے ہیں کہ جن سے ہم عام حالت کا خاصا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سوا ان عہدہ داروں کے جو اس کے لئے مقرر ہیں ہم سرکاری ملازموں سے مبادلۂ خیالات نہیں کر سکتے، اور سیاسی مجرموں کے لئے جو قیدی باڑے (Concentration camps) بنے ہیں ان کے اندر نہیں جا سکتے لیکن اس کی اجازت روس ہی میں کیا یورپ کے کئی اور ملکوں میں بھی نہیں دی جاتی۔

"تمہید کے طور پر میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ روس کا مغربی یورپ کے کسی ملک سے مقابلہ کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ روس پہلے بھی ایک نیم مشرقی ملک تھا اور اب بھی ہے، وہاں کی زندگی کے معیار کو انگلستان، فرانس اور امریکہ کی معاشرت سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ اس وقت روس میں کیا ہو رہا ہے ہم کو ترقی یافتہ مغربی ملکوں کی فضا کو ذہن سے بالکل نکال دینا چاہئے۔

"روس میں بوڑھے آدمی نہیں رہ گئے ہیں۔ جب کبھی کوئی سن رسیدہ آدمی نظر آتا ہے تو یہ سوچ کر تعجب ہوتا کہ وہ کیسے گذر کرتا ہوگا۔ روس میں بوڑھے لوگ "خارج" یا "بیباق" کر دئے گئے ہیں، یا تو اپنے خیالات کے سبب سے یا اس لئے کہ وہ پچھلے بیس برس کی مصیبتیں برداشت نہ کر سکے۔

"پھر آپ کو ایسا ملک تصور کرنا چاہئے جس میں اس چیز کا جسے ہم مذہب کہتے ہیں نام و نشان نہیں۔ کسی روسی مزدور سے مسیح یا خدا کے متعلق گفتگو کرنا اتنا ہی فضول ہے جتنا کہ انگریز مزدور سے گوتم بدھ یا کون فوشیس پر بحث کرنا۔ روس سے عیسائی مذہب اور خدا دونوں خارج کر دئے گئے ہیں۔ اب الحاد کی تبلیغ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، اس لئے کہ نئی پود کی تربیت ایسی فضا میں ہوئی ہے جہاں خدا کے تصور کا کوئی ذکر ہی نہیں، اور روس کی موجودہ آبادی میں ستر فی صدی یہی نئی پود ہے،

جس کی پرورش سوویٹ حکومت کے اصولوں پر ہوئی ہے۔ ہاں، مگر یہ بھی کہہ دینا چاہئے کہ ایک نصب العین، یعنی اپنے سے زیادہ بلند یا زیادہ روحانی قوت رکھنے والی ذات کی پرستش کرنے کی خواہش، جسے ہم میں سے بہتیرے آدمی کی سرشت میں شامل سمجھتے ہیں، آج کل روس میں آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ خدا، مسیح اور پرانے اولیاؤں کی جگہ لینن اور ستالن کو دی جا رہی ہے۔ ہر دکان، ہر سڑک، ہر ہوٹل اور اسٹیشن پر لینن اور لینن سے زیادہ ستالن کی قدآدم تصویریں لگی ہوئی ملتی ہیں۔ کچھ دن ہوئے ایک مضمون چھپا تھا جس کا پہلا جملہ یہ تھا: "ہمارا رب ستالن وہ سورج جس سے کہ ہم کو قوت اور جان حاصل ہوتی ہے ..." قدیم وحشی نسلوں میں مذہب کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔

" اسی طرح آپ ایسا ملک تصور کیجئے کہ جہاں ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ لوگوں کے پاس اپنی ملکیت بہت کم ہے، اور اسے بڑھانے پر آمادہ کرنے کے لئے کوئی محرک نہیں۔ اگر آپ اپنی بنیادی ضروریات کے علاوہ کچھ خریدنا چاہیں۔ اور ایسی چیز آپ کو کسی دکان میں نظر بھی آجائے۔ تو جہاں آپ رہتے ہوں گے وہاں اسے رکھنے کی جگہ نہ ہوگی اور آپ کے پڑوسی آپ پر شک کرنے لگیں گے ....

" ظاہر ہے روس میں سیاسی آزادی نہیں، لیکن روس کے علاوہ اور ملک بھی ہیں جہاں آزادی نہیں۔ وہاں طبقے، نسل اور جنس کا امتیاز بھی نہیں ... جب میں ہوائی جہاز سے اترا تو میرے اسباب کی باقاعدہ تلاشی لی گئی، ہر چھوٹی بڑی چیز نکال کر دیکھی گئی، ہر خط کھولا گیا۔ پہلے مجھے اس سے الجھن ہوئی، مگر پھر میں نے دیکھا کہ جو آدمی میری کتابیں اور خط پڑھ رہا ہے وہ انھیں الٹا پکڑے ہے۔ یہ وہاں کی دفتری حکومت کی شدت کارپردازی کا ایک نمونہ ہے۔ آپ کہیں جائیں، ٹیلیفون پر کسی سے بات کریں، آپ سے کوئی ملنے آئے، ہر ایک بات کی اطلاع حکومت کو پہنچائی جاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی اطلاعات کو ترتیب دینا یا ان سے کام لینا کیسے ممکن ہے۔

"غیر ملک والے اچھے ہوٹلوں میں رہنا چاہیں تو انہیں بہت خرچ کرنا پڑتا ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے ہوٹل خاصے آرام دہ اور صاف ہوتے ہیں ... غیر ملکیوں کو کھانا افراط سے ملتا ہے، لیکن وہ ہوتا ہے روز ایک ہی قسم کا۔ سفارتوں کے متعلقین یا نامہ نگار ـــ روس میں یہی غیر ملکی ملتے ہیں ـ سب کھانے کی چیزیں باہر سے منگواتے ہیں۔ سرکاری ہوٹلوں کے منتظم، پارٹی کے کارپرداز ارکین ہیں' اور غیر ملکیوں کی نقل و حرکت پر صحیح اور مفصل رپورٹیں بھیجتے ہوں گے، مگر وہ ہوٹلوں اور کھانے پینے کے انتظام میں مستعد نہیں کہے جا سکتے۔ اس سبب سے کھانا ان کا سب سے غیر دلچسپ مشغلہ بن جاتا ہے۔ اور سیاحوں کی طرح میں بھی سمجھا تھا کہ روس میں 'کاویار'[۵۱] سستے اور افراط سے ملیں گے، مگر تازہ 'کاویار' مجھے صرف ماسکو میں ملے اور اسے بھی ہم لندن یا نیویارک میں گھٹیا ہی کہتے۔ شاید اچھا 'کاویار' باہر بھیجدیا جاتا ہے۔

"ایک اور بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ روس میں کسی قسم کے بھی موٹر نہیں[۵۲]۔ لینن گراد کے نفسکی پروسپکٹ پر، جو دنیا کی سب سے خوبصورت اور کشادہ سڑکوں میں سے ہے، دوپہر کو نکل جائیے' اور اگر آپ موٹر پر سوار ہیں تو غالباً بس آپ ہی کا ایک موٹر سڑک پر جا رہا ہوگا۔ ٹریمیں بہت ہیں' اور ان میں جتنے آدمی اندر ہوتے ہیں اتنے ہی باہر لٹکے اور ٹنگے ہوتے ہیں۔ لینن گراد کی آبادی قریب تیس لاکھ ہے، ماسکو کی آبادی چالیس پچاس لاکھ' لیکن ان دونوں شہروں میں بس گنتی کے موٹر اور لاریاں ہیں۔ اوڈیسا یورپ کے سب سے آراستہ اور خوش نما شہروں میں سے ہے، لیکن وہاں بھی میں شام کو گھومنے نکلا تو صرف پانچ موٹر دکھائی پڑے اور ٹیکسی ایک بھی نہیں تھی۔ گاڑیوں کی کمی شاید اس لئے تعجب کی بات

---

۵۱ ایک قسم کی مچھلی کے انڈے، جو خاص طرح سے تیار کئے جاتے ہیں۔

۵۲ اس کے خلاف یہ روایت ہے کہ فورڈ کمپنی نے روس میں ایک شاخ کھولی ہے جس نے کئی لاکھ موٹر تیار کر دئے ہیں اور موٹروں کی مانگ بہت بڑھ رہی ہے۔

نہیں کہ روس میں بڑے شہروں اور اُن کے اس پاس کے علاوہ کہیں بھی ایسی سڑکیں نہیں ہیں جو واقعی سڑکیں کہلانے کے قابل ہیں۔ اضلاع میں تو ایسی سڑکیں ہیں ہی نہیں جن پر کسی قسم کی گاڑی چلائی جا سکے۔ میرے بعض ملاقاتی جو سرحد سے موٹر پر ماسکو گئے انھیں سفر میں گیارہ دن لگ گئے۔ میں نے لمبے سفر ریل پر کئے، اور یہ بھی بہت سست تھیں اگرچہ اکسپرس کہلاتی ہیں۔ وہ بچر بچر کرتی ہوئی تیس چالیس میل فی گھنٹہ چلتی ہیں، مگر پٹریاں اتنی خراب ہیں کہ ریل میں کتاب پڑھنا تقریباً ناممکن ہے۔

"تعلیم کو دیکھئے تو اس میں شک نہیں کہ بعض اعتبار سے سوویٹ نے بہت کام کیا ہے کہتے ہیں کہ آبادی میں قریب اسی فی صدی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ اوڈیسا میں میں نے نئے طرز کا ایک اسکول دیکھا جو بہت ہی اچھا تھا۔ عمارت خوشنما تھی، کمرے کشادہ اور ضرورت کے مناسب تھے، استاد بہت مہربان اور جوش کے ساتھ کام کرنے والے لوگ تھے، بچوں کی دیکھ بھال اچھی طرح کی جاتی تھی۔ بچوں میں سے بعض کو دن کا کھانا اسکول کی طرف سے ملتا تھا۔ لیکن اس تعلیم کے باوجود یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جن کو خبر ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ غیر ملکوں کے اخبار روس کے اندر لے جانا یا منگوانا منع ہے، اور روس کے اخباروں میں ایسی ہی خبریں نکلتی ہیں جو حکومت چاہتی ہے۔ ایسے انگریز یا امریکن کی ذہنیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے جسے بیس برس تک وہی معلومات حاصل ہوئی ہوں جو حکومت اس کے لئے مناسب سمجھتی ہو۔

"اب کارخانوں اور مزدوروں کے بارے میں کچھ سن لیجئے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ روس میں بے روزگاری نہیں ہے، اور میں نے اس کی ظاہری علامتیں بھی نہیں دیکھیں۔ تمام کارخانے قریب قریب پورے وقت کام کر رہے تھے۔ بے روزگاری نہ ہونے کے علاوہ اور بھی چند خوبیاں قابل ذکر ہیں۔ بیمار مزدوروں کو پوری مزدوری ملتی رہتی ہے، اور ہر ایک کو پوری تنخواہ پر سال میں تین چار ہفتے کی چھٹی دی جاتی ہے۔ آرام کے لئے اچھے "کیمپ" ہیں، ایسے پارک بھی بہت ہیں جہاں آرام اور تہذیبی تفریح کا انتظام ہے، بچوں کی پرورش گاہیں اور کھیل کود کے میدان ہیں، کھلی ہوا میں

سینما اور موسیقی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ میں غلط فہمی پیدا نہیں کرنا چاہتا کہ روس کی بے شمار آبادی کے لئے اس طرح کی چیزوں کا کافی انتظام ہوگیا ہے، لیکن ایسے جو ادارے میں نے دیکھے وہ بہت سلیقے سے چلائے جا رہے تھے، مزدور بڑی تعداد میں ان سے فائدہ اٹھاتے اور ان کی قدر کرتے تھے۔

" روس میں کام کا ' ہفتہ ' پانچ دن کا ہوتا ہے، اور ہر روز سات گھنٹے کام کیا جاتا ہے، پھر ایک دن آرام کا ملتا ہے۔ اس طریقے کا مغربی یورپ کے قاعدے سے مقابلہ کیا جائے تو روسی مزدور سمجھئے دس فی صدی فائدے میں رہتے ہیں۔ روس اور مغربی یورپ میں جو اجرت دی جاتی ہے اس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ لیکن میں نے اس طرح حساب لگایا ہے کہ روس اور انگلستان میں جو اجرت ملتی ہے اس کی قوت خرید کا مقابلہ کیا۔ روس میں اوسطاً مزدور کو چھ روبل روزانہ ملتے ہیں، اور انگلستان میں چھ شلنگ، اس لئے اگر ہم یہ دیکھیں کہ چھ روبل سے کیا کیا خریدا جاسکتا ہے اور چھ شلنگ سے کیا، تو ہمیں اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ کس کو زیادہ ملتا ہے۔ انگلستان میں چار پاؤنڈ کی ڈبل روٹی نو پنس کو ملتی ہے، روس میں اس کی قیمت تین شلنگ ہوگی۔ انگلستان میں ایک گیلن دودھ دو شلنگ کو ملتا ہے، روس میں چھ شلنگ کو۔ مکھن کا نرخ روس میں بیس شلنگ فی سیر ہے، اور اچھے قسم کا گوشت دس شلنگ فی سیر۔

" یہ سن کر آپ فوراً پوچھیں گے کہ گرانی کا یہ حال ہے تو لوگوں کا گذر کیسے ہوتا ہے۔ اس کا اصل جواب یہ ہے کہ جس چیز کا آدمی کو پتہ نہ ہو اس کے نہ ہونے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت روسی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی حالت دوسرے ملکوں کے مزدوروں سے کہیں بہتر ہے۔ اور پھر گرانی کے ساتھ آسانیاں بھی ہیں جو نقصان کو پورا کرتی ہیں۔ مکانوں کا کرایہ کم ہے، کارخانوں میں دن کا کھانا سستے داموں مل جاتا ہے، ایسی عورتیں بہت کم ہیں جو کوئی کام نہیں کرتیں، جو کام کرتی ہیں انھیں مردوں کے برابر اجرت ملتی ہے، اور اس طرح ہر خاندان کی آمدنی دونی ہو جاتی ہے۔ ایک جواب یہ بھی ہے کہ روسی سفید گیہوں کی روٹی جیسی نفیس چیزیں کھاتے بھی نہیں، ان کی پرانی غذا باجرے کی روٹی

اور کم کلے کا سوپ ہے۔ دودھ ایک نعمت ہے جس پر صرف بیماروں اور بچوں کا حق مانا جاتا ہے
کپڑوں کا قصہ یہ ہے کہ ایسے موقعے بہت کم ہوتے ہیں جب نئے کپڑے پہننا ضروری سمجھا جائے یا لوگ
دوسروں سے بہتر کپڑے پہننے کا شوق کریں۔ میں نے روس میں ایک آدمی کو بھی اچھے کپڑے
پہنے نہیں دیکھا اور نہ کسی کے پیر میں کارآمد اور اچھے بنے ہوئے جوتے دیکھے۔ مجھے شاید یہ بتا
دینا چاہئے کہ اب بورژوا معاشرت کی خصوصیات بھی چوری چھپے پھیل رہی ہیں۔ عورتیں معلوم
کرنا چاہتی ہیں کہ بال بنانے کے اور لباس کے کون سے نئے فیشن نکلے ہیں، اور لوگوں کی اس
طرف توجہ اتنی بڑھ گئی ہے کہ حکومت نے بھی صاف ستھری پوشاک، روزمرہ داڑھی بنانا اور اسی
طرح کی اور بورژوا عادتوں کو پھیلانا شروع کر دیا ہے۔

"یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ رہائش کا انتظام کسی زمانے میں آج کل سے بھی بدتر تھا۔
میں نے صرف لینن گراد اور ماسکو دیکھا، جہاں کی آبادی انقلاب کے بعد سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے
ان دونوں شہروں میں کسی خاندان کے قبضے میں ایک سے زیادہ کمرہ ہونا غیر معمولی بات ہے
جو نئے مکان بنے ہیں ان کا مسالا اتنا خراب ہے کہ وہ شاید ہی ایک دو سال سے زیادہ ٹھہر سکیں۔
اضلاع میں لڑائی کے بعد سے رہائش کا کوئی انتظام کیا ہی نہیں گیا ہے، لیکن میں نے سنا ہے
کہ بعض نئے صنعتی مرکزوں میں شہروں کی ترتیب اور تعمیر میں بڑی کوششیں کی گئی ہیں۔

"میں یہ بتا چکا ہوں کہ مرد عورت میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، نہ گھریلو زندگی میں اور
نہ کارخانوں میں۔ مثلاً عورتیں لوہے کے کارخانوں میں بھی بالکل وہی کام کرتی ہیں جو کہ مرد کرتے
ہیں، اور ریل کی پٹریوں پر بھی اکثر کام کرتی نظر آتی ہیں۔ پچھلے سال دو سال میں طلاقیں بہت کم
لی گئی ہیں، زیادہ تر اس سبب سے کہ طلاق کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔ پہلی طلاق بہت سستی
ہوتی ہے، دوسری اور تیسری مرتبہ طلاق لینے میں اتنا خرچ نہیں ہوتا کہ آدمی برداشت ہی
نہ کر سکے۔ اس کے بعد پھر سرکاری ٹیکس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ صرف بڑی تنخواہ پانے والے سرکاری
ملازم اسے ادا کر سکتے ہیں۔ شوہر اور بیوی دونوں میں سے جو چاہے مخصوص دفتر میں کاغذات

سے کر جا سکتا ہے، اور طلاق مانگی جاتی ہے۔ بعض مرتبہ تو دوسرے فریق کو طلاق کی خبر اسی وقت ہوتی ہے جب اس کے پاس باضابطہ سرکاری اطلاع بھی جاتی ہے۔ اب حکومت اور کومیونسٹ پارٹی دونوں کی طرف سے کوشش کی جا رہی ہے کہ مردوں عورتوں میں اندھا دھند تعلق نہ ہو اور ان کا رشتہ خاندانی زندگی کی صورت اختیار کرے، بلکہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ والدین بچوں سے محبت کریں اور بچے والدین کا ادب کریں۔ جیسے کہ انقلاب سے پہلے قاعدہ تھا۔

"خریداری ایک نہایت پیچیدہ مگر دلچسپ کارروائی ہے۔ ہر دکان سرکاری دکان ہے کسی کو کچھ بیچنے سے غرض نہیں۔ میں ماسکو میں ایک کھلونوں کی دکان میں گیا۔ دکان والے تہذیب سے پیش آئے مگر کسی کو مجھ سے مطلب نہیں تھا۔ خریدنے کی کارروائی خاصی لمبی ہوتی ہے۔ پہلے آپ کو چیز پسند کرنا اور اس کی قیمت معلوم کرنا ہوتا ہے، پھر دکان کے ایک اور آدمی کے پاس جا کر دام دینا اور رسید لینا۔ آخر میں رسید کو لیجانا اور مال وصول کرنا ہوتا ہے۔ یہ کارروائی لمبی ہر حال میں ہوتی ہے، لیکن ان دکانوں میں جہاں مجمع زیادہ ہوتا ہے، مثلاً جہاں کھانے کی چیزیں، شراب یا کتابیں بکتی ہیں، وہاں قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنا عام قاعدہ سا ہو گیا ہے۔ پھر خریدی ہوئی چیز کو رکھنے یا لپیٹنے کے لئے آپ کو اپنا بیگ یا کاغذ لے جانا چاہئے، اور دودھ یا کریم لینا ہو تو اپنا برتن ساتھ رکھئے۔ ایک دن ماسکو میں ہم نے ایک بڑی لمبی قطار ایسی دکان کے سامنے دیکھی جہاں وہ گوشت بکتا ہے جو اچھے حصے نکال لینے کے بعد بچ رہتا ہے۔

"روس کی فوجی اور ہوائی قوت کسی ایسے دشمن کے دانت کھٹے کرنے کو کافی ہے جس کی جنگجوئی اسے روس پر حملہ کرنے پر مائل کرے۔ مجھے بہت معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے کہ فوج مستعد اور کارپرداز ہے، اسے پیٹ بھر کھلایا جاتا ہے اور اس کی ہر ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ روس جیسے پرولتاری ملک میں جہاں ہم سمجھتے کہ فوجی افسر بھی عام سپاہیوں میں سے منتخب کئے جاتے ہوں گے وہاں ایسا نہیں ہے، بلکہ افسر فوجی اسکولوں کے چنے ہوئے طلبا ہوتے ہیں جنھیں اسکول سے فارغ ہونے کے بعد خاص ٹریننگ دی جاتی ہے۔ حال ہی میں سوویٹ فوج میں کپتان، کرنل اور جنرل کے

پرانے خطابات دینا جاری ہو گیا ہے۔

" میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث نہ کروں گا کہ روس میں مجرموں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے، لیکن روسی طریقہ دلچسپ ضرور ہے۔ بولشیوو ئی نامی اصلاحی قید خانے میں جو بہت مشہور ہے قریب چار ہزار نوجوان مجرم ہوں گے۔ یہ ادارہ جس کا انتظام نہایت اچھا ہے اور ایسے ہی لوگوں کے سپرد کیا گیا ہے جو اس کے لئے موزوں ہیں، کئی اعتبار سے ایک نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چوری اور قتل روس میں ایسے جرم نہیں ٹھہرائے جاتے کہ جن کا کسی سے سرزد ہونا اس کے لئے شرم اور ندامت کا باعث ہو۔ بلکہ یہ ناقص نظام معاشرت یا خراب تربیت کے نتیجے سمجھے جاتے ہیں۔ ساری برائی سیاسی جرموں میں ہے' اور قیاس کیا جاتا ہے کہ اس وقت دو سے لے کر تین لاکھ سیاسی مجرم مختلف قیدی باڑوں میں بند ہیں۔ تعمیر کے تقریباً تمام بڑے کام — مثلاً بحر سفید کی نہر سیاسی مجرموں کی محنت سے انجام دئے گئے۔ یہ کام کرانے کی سب سے سستی ترکیب ہے، اور چونکہ روس میں پولیس کا محکمہ مزدور فراہم کرتا ہے' انجینیرنگ کے تمام بڑے کام اسی کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں ایک ہولناک قحط پڑا ' جس میں پچاس لاکھ اور ایک کروڑ کے درمیان جانیں ضائع ہوئیں۔ لیکن جو سرکاری خبریں کرملن[ا] سے بھیجی گئیں ان میں کسی ایسے حادثے کا ذکر نہیں تھا۔ سرکاری اطلاعات تو شاید سیاسی مجرموں کے وجود سے بھی انکار کریں۔ لیکن اس کو کوئی کیا کرے۔

" روس کی خارجی پالیسی ایک بہت بڑا موضوع ہے جس پر یہاں صراحت سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ اگر کوئی بات یقینی ہے تو یہ کہ اس وقت روس کسی پر حملہ نہیں کرنا چاہتا' اس کے مدبروں کو صرف اندرونی زندگی کی تعمیر اور اصلاح کی فکر ہے۔ خود کمیونسٹ پارٹی کے اندر اس معاملے میں اختلاف رائے ہے کہ غیر ملکوں میں پروپگنڈا اور مالی امداد کے ذریعے انقلاب برپا کرنا چاہئے کہ نہیں۔ ہسپانیہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے باوجود سٹالن اور اس کے حامی کم از کم فی الحال ایسی ترکیبوں سے دنیا میں

[ا] Kremlin ماسکو کا پرانا شاہی محل جس میں اب حکومت کے دفتر ہیں۔

انقلاب پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہتے، اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب تک ستالن زندہ ہے کوئی اس کی جگہ پر قبضہ نہ کر سکے گا۔

"روس کو دیکھ کر میں نے جو رائے قائم کی وہ مجموعی طور پر یوں بیان کی جا سکتی ہے۔ روس میں اچھی باتیں ہیں، اگر مزدوروں اور کارخانوں کی حالت کو، فراغت کے موقعوں کو، بچوں کی پرورش گاہوں اور عام آرام گاہوں جیسے اداروں کو، عجائب خانوں کی دیکھ بھال اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کو دیکھئے، دوسری طرف معمولی سیاح کو ملک کی حالت دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک بہت بڑا "غریب وارڈ" ہے، بدنما، بے لطف، یکساں، نہ رنگ، نہ باغ، نہ پھول، نہ رنگینی، نہ جگہ جگہ اور آدمی آدمی میں فرق، نہ آسائش۔ روس میں میں نے جو تین ہفتے گذارے وہ دلچسپ تو ضرور تھے مگر دل پر بھاری بھی گذرے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی ملک کو پیسے ڈالتا ہے۔ مگر میں یہ بھی صاف صاف کہدوں گا کہ اگر اس وقت ووٹ لیا جائے تو اسی نوے فی صدی موجودہ حکومت کو قائم رکھنے کی رائے دیں گے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہوگی کہ زندگی کا اور کوئی طریقہ ان کے علم میں نہیں، کچھ یہ کہ حکومت کا پروپگنڈا بہت اچھا اور ہمہ گیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ایک طرح سے خوش بھی رہتے ہیں۔۔۔"

مسٹر پیرز لکھتے ہیں:-

"جرمنی اور جاپان کے درمیان جو اینٹی کومینٹسٹ (کومیونزم کے خلاف) معاہدہ ہوا اور جس کو فاشسٹ اٹلی کی ہمدردی بھی حاصل تھی اس کے شایع ہونے سے روس کی حالت زیادہ نازک ہوگئی ہے، اور اس معاملے میں جو مسائل درپیش ہیں ان پر ایک نظر ڈال لینا بیکار نہ ہوگا۔

"ہم کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ ستالن اور تروتسکی میں جو جھگڑا تھا، اور جس کے سبب سے تروتسکی آہستہ آہستہ کومیونسٹ پارٹی اور پھر روس سے بے دخل کر دیا گیا اس کی بنیاد اس مرکزی مسئلے پر تھی کہ آیا سوشلزم کا ایک ملک میں قائم رہنا ممکن ہے جب باقی دنیا ساری سرمایہ دار رہے، یا نہیں۔ ستالن کا دعوی تھا کہ ایسا ممکن ہے، تروتسکی کو اس سے انکار تھا، اور اس کا عقیدہ تھا کہ سب سے پہلے اور نفع نقصان کا خیال کئے بغیر عالم گیر انقلاب پیدا کرنا ناگزیر ہے۔ ہمیں اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ

سوشلزم کی تبلیغ کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ اس کو کسی ایک ملک میں کامیاب کرکے دکھایا جائے۔

" سٹالن کے دعویٰ کا لازمی نتیجہ پنج سالہ صنعتی، زراعتی اور تعلیمی منصوبے تھے۔ ان کو عمل میں لانے کے لئے انتہائی بیدردی درکار تھی۔ صنعتی منصوبے کی کامیابی کے لئے ضروری تھا کہ روس سے خام مال، اور خصوصاً کھانے پینے کی چیزیں جن کی ملک میں اشد ضرورت تھی باہر بھیج دی جائیں، اور آئندہ مفاد کی امید میں سب کو اپنا پیٹ کاٹنا پڑا۔ "نئی معاشی پالیسی" کے زمانے میں کسانوں نے صاف ظاہر کردیا تھا کہ وہ زراعت کو شخصی کاروبار کی صورت دینا پسند کرتے ہیں، اور ۱۹۲۳ء میں سوویٹ حکومت نے جو نظام عمل شایع کیا اس میں کسانوں کا یہ مطالبہ بڑی حد تک منظور بھی کرلیا گیا تھا۔ اس حالت میں کسانوں کو اجتماعی کاشت پر مجبور کرنا کاروبار کی گھڑی کو روکنا ہی نہیں بلکہ اسے الٹا چلانا تھا۔ اور اس کا نتیجہ ایک طرح کی خانہ جنگی ہوئی جس میں کسی فریق نے دوسرے پر ذرا بھی ترس نہیں کھایا۔ لیکن اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں منصوبے، زراعتی اور صنعتی، زیر عمل ہیں۔ صنعتی منصوبے نے روس کو پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھاری مشینری بنانے کے لایق کردیا ہے، جس کا ایک ضمنی اثر یہ ہوا ہے کہ مدافعت کی ایک قابل اعتبار صورت نکل آئی ہے اور ایک کمی پوری کردی گئی ہے جو پچھلی جنگ میں بہت محسوس کی گئی تھی۔ ۱۹۳۶ء کے شروع میں تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ کارخانے کی بھاری مشینری تیار ہوگئی ہے اور استعمال کی چیزیں بہت تیزی کے ساتھ بنائی جانے لگی ہیں، بلکہ حال کے میزانئے میں ان کی تیاری کے لئے مقابلتاً بہت زیادہ سرمایہ مخصوص کردیا گیا ہے۔ صنعتی منصوبے کے متعلق اسی طرح یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس میں شک نہیں کہ ملک کے بہت بڑے حصے میں اجتماعی کاشت ہو رہی ہے، اور حکومت اور کسانوں کے درمیان جنگ کی حالت نہیں ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ زرعی آلہ جات کو بہتر سے بہتر بنا دینے سے کسانوں کی اور ضروریات پوری کرنے کا پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مستحکم انتظام ہوگیا ہے اور موسم اور فصل کی تلون مزاجی لوگوں کو پہلے کی طرح پریشان نہیں رکھتی ہے۔ زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اجتماعی کاشت کے اصولوں کو نظر ثانی کے بعد جو شکل دی گئی ہے اس میں کسان کی جبلت اور خواہشوں کا بہت زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ بہر صورت، یہ ایک تعمیری پروگرام تھا جس کا مقصد ملک کا اجتماعی مفاد تھا، اس نے نوجوانوں میں وہ شوق

اور ولولہ دوبارہ پیدا کر دیا ہے جس نے شروع میں ان کے حوصلے بڑھائے تھے اور انھیں ذمہ داری محسوس کرنے اور خود سوچ کر آگے قدم بڑھانے کا موقع دیا ہے۔

" یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جب ستالن نے اپنی پوری توجہ ملک کے تعمیری کاموں کے لئے وقف کر دی تو عالم گیر انقلاب کی کمیٹی کے معاملات پس پشت ڈال دیئے گئے، یہاں تک کہ کئی سال تک کمیٹی کا جلسہ نہیں ہوا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ تروتسکی کی شکست کے بعد اس کمیٹی نے یورپ کے مقابلے میں ایشیا کی طرف زیادہ توجہ کی، اور یقیناً اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کی عداوت زیادہ سخت ہو گئی۔ اسی کی بدولت جاپان نے زیادہ اصرار اور زور کے ساتھ ایشیا کی قیادت کا دعوی کیا، اور اس دعویٰ نے سوویٹ پالیسی کو مخمصے میں ڈال دیا۔

پنج سالہ منصوبہ تکمیل کو پہنچا نہیں تھا جب ہٹلر کے جرمنی پر حاوی ہو جانے سے روس کے آسمان پر ایک نئے طوفان کے آثار نظر آنے لگے، اور سوویٹ روس کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ہٹلر نے اپنی کتاب " میری جدوجہد " میں جو دھمکیاں روس کے ایک حصے کو ہڑپ کر جانے کی دی تھیں وہ بعد کو واپس نہیں لی گئی ہیں، بلکہ اس کے برخلاف اب تک پالیسی کے بارے میں جو اعلانات کئے گئے ہیں ان میں برابر دہرائی جا رہی ہیں۔ اس نے ستالن کی حکمت عملی کے مدافعانہ پہلو کو اور واضح کر دیا ہے، اور واقعی روسیوں کے ذہن میں اب ملک کا تصور، اگرچہ اسے " سوویٹ وطن " کا نام دیا گیا ہے، بہت زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ غیر ملکوں میں دوست تلاش کئے جائیں، اور لتوی نوف نے یہ کام بڑی مستعدی سے انجام دیا ہے۔ اس نے بڑی کوشش کے بعد ریاستہائے متحدہ کو اس پر آمادہ کیا کہ سوویٹ نظام کو باضابطہ حکومت تسلیم کر لے، اس نے روس کو بین الاقوامی اتحاد میں شامل کرایا، جہاں اس کی حیثیت بہت ممتاز رہی ہے، اس نے انگلستان اور فرانس سے تعلقات بڑھائے اور فرانس اور چکوسلوواکیا سے اس نے مدافعانہ معاہدے کئے ہیں جن کا مقصد موجودہ صورت حال کو قائم رکھنا ہے، کیونکہ اس میں ذرا سا ردوبدل بھی ستالن کے تعمیری کام کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی درمیان میں ان قوتوں نے جو موجودہ صورت سے

ملحق نہیں تھیں، یعنی جرمنی، اٹلی اور جاپان، انھوں نے اپنے درمیان زیادہ اتحادِ عمل پیدا کر لیا ہے۔

"خارجی پالیسی کے پہلو بہ پہلو روس کے اندر بھی ایک تحریک جاری رہی ہے جس کا اثر ۱۹۴۲ء سے بعد کے قوانین میں صاف نظر آتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ ملک اور حکومت کو مضبوط اور مدافعت کے لئے تیار کرے، اور حکومت نے بہت سی غیر ضروری اور مبالغہ آمیز خصوصیات کو دور کر کے اسی پالیسی کے مناسب حال اختیار کیا ہے۔

"پچھلے تین سال کے عرصے میں جو تبدیلیاں روس میں ہوئی ہیں وہ صحیح معنی میں تبدیلیاں ہیں اور بہت بڑی تبدیلیاں ہیں۔ نظرِ ثانی کے بعد اجتماعی کاشت کے جو قواعد اتحاد بنے ہیں ان میں خاص خیال اس کا رکھا گیا ہے کہ افراد کو زیادہ ڈھیل دی جائے، جیسا کہ مغربی یورپ کے اتحادی زرعی کاروبار میں ہوتا ہے، اور یہ قواعد کسانوں کو اپنے کھیتوں کے انتظام میں بہت زیادہ آزادی دیتے ہیں اور شخصی ملکیت کا حق بھی بہت بڑھا دیا گیا ہے۔ کسان اب اپنا ذاتی گھر، تین ایکڑ کا باغ، ایک یا زیادہ گائیں، اور جتنے سور اور مرغیاں حاصل کر سکے رکھ سکتا ہے۔ ہر شخص کی آمدنی اس کی ملکیت قرار دی گئی ہے، قانوناً محفوظ کر دی گئی ہے، اور موروثی مانی جاتی ہے، اسی وجہ سے سیونگز بنک میں خوب روپیہ جمع رہتا ہے۔ بہت سے کسان جو جلا وطن کر دئے گئے تھے اب وطن واپس بھیج دئے گئے ہیں۔ سوویٹ کے زرعی نظام میں بس تجارت اور اجرت پر کام کرانے کے اصول کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔

"تعلیمی اور معاشرتی پالیسی میں بھی ایسا ہی بین رجحان نظر آتا ہے۔ والدین کے حقوق اور اختیارات اب بحال کر دئے گئے ہیں اور بچوں کی تربیت میں اب ان کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نوجوانوں میں غنڈہ پن ہر طرح سے روکا جاتا ہے۔ طلاق کے معاملہ میں اگر ایک فریق کو اختلاف ہو تو مسئلہ عدالت میں پیش کیا جاتا ہے، حمل گروانا اب بہت برا مانا جاتا ہے اور اس کی سختی سے روک ٹوک کی جاتی ہے۔ یونیورسٹی کے داخلے پر جو پابندیاں طبقوں کی تفریق کی بنا پر لگائی گئی تھیں، یعنی یہ کہ پرانے بورژوا خاندانوں کے لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے، وہ موقوف کر دی

گئی ہیں، اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں تاریخ اور جغرافیہ جیسے مضامین کی تعلیم پہلے کی طرح خالص مسلکی اصولوں پر دی جاتی ہے[1]، اس نقطہ نظر سے نصاب کی تمام کتابوں کی تصحیح کی گئی ہے، اور اس دور کے نئے قواعد میں وہ قانون بہت معنی خیز ہے جس کا مقصد "بچے کے ذہن پر سیاسی اور مدنی تعلیم کے بوجھ کو حد سے زیادہ بھاری ہو جانے کو" روکنا ہے۔ مذہب اور مذہبی تعلیم کے خلاف جو احکامات جاری ہوئے تھے وہ ابھی منسوخ نہیں کئے ہیں، لیکن ان پر عمل کرنے کی نہ تاکید کی جاتی ہے نہ کسی کو اس کی پرواہ ہے۔

"یہ سب باتیں اس نئے دستور کی ایک ضروری تمہید تھیں جو کہ اب باقاعدہ نافذ ہو گیا ہے، ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس معاملے میں پیش قدمی خود حکومت نے کی، بلکہ ابتدا میں خود کمیونسٹ پارٹی نے، جو اب تک ہمیشہ ہر مسئلے پر بحث کرتی رہی ہے قبل اس کے کہ وہ عمل درآمد کے لئے حکومت کے سپرد کیا جائے۔ نئے دستور نے قومی نمائندگی کو جاری کیا ہے جو مردوں عورتوں دونوں کے غیر مشروط حق رائے دہندگی اور خفیہ ووٹ کے اصول پر مبنی ہے یہ اصول کمیونسٹ حکومت نے شروع میں ترک کر دیا تھا۔ ملک کی نمائندہ جماعت ملک کی فرماں روا ہے، اور وہی یا تو براہ راست یا ایک مستقل کاؤنسل کے ذریعے جو چھٹیوں میں اس کی جگہ کام کرتی ہے، وزیر، جج اور مرکزی حکومت کے تمام عہدہ داروں کا تقرر کرتی ہے۔ جج خود مختار ہیں اور ان کے عال قانونی ان کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں اور اس میں مقامی حکومت کی مدد کے محتاج نہیں۔ دستور نے تقریر، اجتماع، پریس کی آزادی کا اعلان کیا ہے، اور کوئی شخص بلا حکم عدالت نہ گرفتار کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی تلاشی لی جا سکتی ہے۔ یہ تو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ حکومت کے بنیادی اصولوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں، اور یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ دستور خاص طور پر "مزدوروں" کے لئے بنا ہے، لیکن روس میں اب مزدوروں کے سوا کوئی ہے بھی نہیں۔ حال ہی میں یہ سبق آموز منظر دیکھا گیا کہ ملحدوں کے سردار مسٹر یاروس لاؤسکی نے علانیہ

---

[1] جس کا مطلب ہے کہ ان میں کمیونزم کا پروپیگنڈا نہیں کیا جاتا۔

سمجھا یا کہ پادریوں کو بھی اسی طرح ووٹ دینے کا حق ہونا چاہئے جیسے کہ دوسروں کو۔ لیکن اس طرف توجہ
دلانا ضروری ہے کہ ریاست کی اجتماعی ملکیت کا تقدس وہی مرتبہ رکھتا ہے جو ملک کو دشمن سے بچانے
کا فرض، دونوں پر کسی طرح کا حملہ کرنا بغاوت کے برابر ہے "

"جب سوویٹ پالیسی کے اس نئے رجحان کی خبر باہر پہنچی تو اس میں شک نہیں کہ سوویٹ حکومت
کی حیثیت بہت بڑھ گئی اور اس نے صرف دوسرے ملکوں کے باشندوں ہی کی نہیں بلکہ ان کی حکومتوں
کی خوشنودی حاصل کرلی ہر جگہ یہ محسوس کیا گیا کہ دنیا کو پہلے جو چیلنج دیا گیا تھا وہ بہر صورت بہت نرم
کر دیا گیا ہے، اور سوشلزم کے تعمیری کام میں چونکہ ایسی کامیابیاں ہوئیں جو ثبوت کی محتاج نہ تھیں اس
نے لوگوں کو ان سے بہت دلچسپی ہوگئی اور ان کی تعریف بھی کی جانے لگی۔ لیکن حال میں یہ عام خوشنودی
کچھ کم ہوگئی ہے۔ لینن گراد اور ماسکو میں جو قتل کے مقدمے قریب قریب ایک ہی سلسلے میں ہوئے ہیں انھوں
نے قدرتی طور پر ان مقدموں کی یاد تازہ کردی ہے جو پنج سالہ منصوبوں کی عمل درآمد کے سب سے نازک
زمانے کی ایک نمایاں خصوصیت تھے، جب ایسے لوگ جن پر منصوبوں کو ناکامیاب کرنے کی سازش کا
الزام لگایا گیا تھا عدالت میں پیش کئے جا رہے تھے۔ اسی کے ساتھ سوویٹ عدالتوں کے غیر منصفانہ برتاؤ
پر جو اعتراض وکرز کے مقدمے میں کئے گئے تھے۔ اور بجا طور پر کئے گئے۔ وہ بھی یاد آگئے۔ مجھے خود تو
اس میں شک نہیں کہ حکومت کی مخالف انتہا پسندوں کی پارٹی میں ایسی سازشیں کی جا رہی تھیں جن
کا مقصد ستالن اور دوسرے ممتاز عہدہ داروں کا قتل تھا۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو سمجھ میں نہ
آسکے۔ ستالن پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ عالم گیر انقلاب کے معاملے میں وہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے، اور
تروتسکی، زنیوویف اور کامینف کی پچھلی کارگزاری سازش کے شبہے کے موافق پڑتی ہے، اس لئے کہ
ستالن کی طرح انھوں نے بھی سازشوں کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ ان کے مقدموں میں ہر طرح سے
اس پر زور دیا گیا کہ سازش کرنے والوں اور جرمنی کی سیاسی پولیس کے درمیان اتحاد عمل تھا، اور
مقدمے کا یہی پہلو ہے جس کے متعلق شہادتیں سب سے ناقص تھیں۔ اس کے علاوہ میں اس خیال
کو بھی کہ تروتسکی فاشزم کے مفاد کے لئے جد وجہد کر رہا تھا اس لائق نہیں سمجھتا کہ اس پر سنجیدگی سے غور

کیا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ خود لینن کو اقتدار کی راہ میں قیصر کی حکومت سے مدد ملی، اور مجھے اس لئے اس جواب میں کوئی تضاد معلوم نہیں ہوتا کہ سرمایہ داروں کی ایک حکومت کو تباہ کرنے کے لئے دوسری حکومت کو استعمال کرنے میں کوئی برائی نہیں۔ لیکن ایک فاشسٹ حکومت سے مدد حاصل کر کے سوویٹ نظام کو تہ و بالا کرنا بالکل اور ہی نوعیت کا مسئلہ ہے، سوشلسٹ سازشی سوویٹ حکومت کے طرز عمل اور رجحان سے چاہے جتنے غیر مطمئن ہوتے۔ مقدموں کے ملزم چار مختلف گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں؛ ایک تروتسکی کے پیرووں کا، ایک زینوولیف کے، ایک منچلے سیاسی فسادیوں کا اور ایک ان پنج قسم کے دغاباز افراد کا جنھوں نے روسی سیاسیات میں ہمیشہ بہت حصہ لیا ہے۔ جہاں تک کہ یہ ملزم اصولوں کی نمائندگی کر رہے تھے، ان کا انتہا پسند مخالفوں میں شامل ہونا صاف ظاہر ہے، اور ہٹلر نے یہودیوں پر جو لعنت بھیجی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ سازشیوں میں آدھے سے زیادہ یہودی تھے۔ ان میں صرف تروتسکی کے پیرو ایسے تھے جن کی شخصیتوں کو دیکھ کر ان کے انجام پر افسوس کیا جا سکتا ہے، اور انھیں کا سردار سمرنوف تھا کہ جس نے الزاموں کو غلط ثابت کرنے کی سب سے زیادہ جوش کے ساتھ کوشش کی۔ لیکن میری رائے میں وہ خود اپنے بیانات کی بنا پر بار بار پچھاڑا گیا اور اس سے جو سوال پوچھے گئے وہ بالکل جائز اور اسی کے بیان پر مبنی تھے۔ میرا خیال ہے کہ روس کے سرکاری وکیل کو اس کا حق تھا کہ وہ اس چار روزہ کارروائی کا جو کھلی عدالت میں ہوئی اس سے کہیں زیادہ تشدد آمیز طریقے سے مقابلہ کرے جو ہٹلر نے ریم اور دوسرے مخالفوں سے نپٹنے کے لئے ۳۰ جون ۱۹۳۴ء کو اور اس کے بعد اختیار کیا۔

"سوویٹ حکومت کی شہرت کو زیادہ صدمہ اس تعلق سے پہنچا جو اس نے ہسپانیہ کے واقعات سے دکھایا ہے۔ وہاں کی نسبت جو مفصل بیانات ملے ہیں ان سب میں اس پر زور دیا جاتا ہے کہ انتہا پسند گروہ کی کارروائیوں میں کمیونسٹوں کے مقابلے میں نراجی زیادہ حصے لے رہے ہیں، اور اگر یہ دونوں اپنے دشمن فاشزم کے خلاف لڑنے کے لئے مل نہ جاتے تو ان کے درمیان اصول اور مقاصد کا جو اختلاف ہے وہ فوراً ظاہر ہو جاتا۔ یہ فرض کرنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ ہسپانیہ کے کمیونسٹ ایجی ٹیشن میں اسی خیال کے لوگ زیادہ پیش پیش رہے جو روس کی موجودہ حالت سے سب سے زیادہ غیر مطمئن تھے، اور خود تروتسکی نے ہسپانیہ کے معاملات میں

خاص دلچسپی لی ہے۔ اس کے باوجود ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہسپانیہ میں روس نے حکومت کی مدد کی ہے جیسے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فاشسٹ اٹلی اور جرمنی نے فرینکو کی مدد کی ہے۔ اس کے علاوہ عالم گیر انقلاب کی کمیٹی اب تک ماسکو میں موجود ہے، اور جب تک وہ موجود ہے سٹالن اس کی کارروائیوں سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سوویٹ حکومت واقعی سخت کشمکش و پیچ میں ہے۔ وہ کومیونزم اور عالم گیر انقلاب کا جھنڈا اتار نہیں سکتی، نہ ہسپانیہ کے واقعات سے بے تعلقی ظاہر کر سکتی ہے، خصوصاً جب سٹالن پر ہر وقت ان لوگوں کی طرف سے جنھیں اس نے حکومت سے بے دخل کر دیا یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اس معاملے میں بے پروائی کر رہا ہے۔

"ایسا ہی موقع تھا جب فاشسٹ ریاستوں نے مناسب سمجھا کہ کومیونزم کے خلاف متحد ہونے کا راگ الاپنا شروع کریں، اور ساری دنیا کو سوویٹ کے خلاف اصلی جنگ میں شریک کرلیں۔ انھیں اپنے یہاں کے کومیونسٹوں سے کوئی خطرہ نہیں، اس لئے کہ انھوں نے اپنے یہاں اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے، اور ان کا محضر دراصل ظاہر کر دیتا ہے کہ غیر ملکوں کی کومیونسٹ تحریک سے انھیں کیوں مطلب ہو گیا ہے۔ مثلاً جرمنی کے اخبارات میں اس افواہ کا بہت چرچا کیا گیا ہے کہ چیکوسلوواکیا کی حکومت سوویٹ روس کے ساتھ سازش میں شریک ہے، اور اس سے زیادہ مضحک کوئی خیال ہو نہیں سکتا۔ کومیونزم کے خلاف جو اتحاد ہوا ہے اس کے مدنظر ایک نہایت ہی قابل عمل ارادہ ہے، اور وہ یہ کہ اپنے فائدے کے لئے روس کو باقی دنیا سے علیحدہ کر دیا جائے۔ یہ اس وقت ظاہر ہو گیا تھا جب محضر شائع ہونے کے بعد ہی اٹلی نے جاپان اور جاپان نے اٹلی کی فتوحات پر اس کا حق تسلیم کر لیا، حبش اٹلی کا مان لیا گیا اور منچوکوؤ جاپان کا۔ روس کے متعلق ہٹلر کے جو اعلانات ہوتے ہیں ان سب سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے، اور جرمن سفیر فون ربن ٹروپ نے انگلستان کو بھی اس کا اعتراف کرنے کی دعوت دی ہے کہ دنیا کے لئے کومیونزم ہی واحد خطرہ ہے۔"

ہندوستان کا مسئلہ آبادی

(ذیل کا مضمون آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جوبلی کے موقع پر شعبہ معاشیات و اصلاح معاشرت کے اجلاس میں ۲۷ مارچ ۱۹۳۷ء کو پڑھا گیا تھا)

ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ بہت وسیع ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر ایک مختصر صحبت میں اظہار ناممکن ہے۔ اس لئے میں شروع ہی میں اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میں آبادی کے مسئلے کے صرف ایک پہلو پر یہاں سرسری تنقید کروں گا اور وہ پہلو یہ ہے کہ آیا ہندوستان میں ہمیں اولاد کی پیدائش کو کم کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں ہے

جو لوگ پیدائش اولاد پر پابندی عائد کرنا چاہتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ ہندوستان میں آبادی کی پرورش کرنے کی جس قدر وسعت و گنجائش ہے یہاں کی آبادی اس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بے روزگاری اور افلاس مصیبت اور پریشانی، بے چینی اور بد امنی، بیماری اور موت نہایت شدت کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے علاج دو ہی ہو سکتے ہیں یا تو وسائل دولت کو بڑھایا جائے یا آبادی کو کم کیا جائے۔ وسائل دولت میں ترقی کی جا سکتی ہے لیکن اتنی تیزی سے نہیں جتنی تیزی سے آبادی بڑھ رہی ہے اس لئے وسائل دولت کی ترقی کے ساتھ آبادی کے اضافہ کو کم کرنا بھی ضروری ہے۔ کم کرنے کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ ملک کی زیادہ آبادی کو دوسرے ملکوں میں منتقل کیا جائے اور اس سلسلے کو آبادی کے ہر اضافے کے ساتھ جاری رکھا جائے دوسرے یہ کہ اولاد کی نئی پیدائش کو کم کیا جائے۔ آبادی کو دوسرے ملکوں میں منتقل کرنے کا امکان چونکہ ہندوستان کے لئے بہت محدود ہے۔ اس لئے آخری علاج آبادی کے اضافہ کو روکنا ہی رہ جاتا ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا ہو کہ اس گروہ کی یہ دلیل کہاں تک صحیح ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو اس مفروضہ کو جانچنا چاہیے کہ ہندوستان کی آبادی اس ملک کے وسائل دولت سے زیادہ ہے۔ اگر تحدید آبادی کے حامیوں کے اس ابتدائی مفروضہ سے ہی انکار کر دیا جائے تو اُن کی بعد کی تمام دلیلوں کی از خود تردید ہو جائے گی اور اولاد کی پیدائش گھٹنے کی کوششیں غیر ضروری ثابت ہو جائیں گی۔

اس مفروضہ سے انکار دو طرح پر کیا جا سکتا ہے ایک تو اس طرح کہ بے روزگاری اور افلاس، پریشان حالی اور مصیبت۔ بیماری اور موت کی غیر معمولی کثرت یا اضافہ سے ہی انکار کیا جائے اور کہا جائے کہ یہیں حالات بہتر ہوتے جا رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کے وجود کو تو تسلیم کیا جائے لیکن اس کا سبب ذرائع اور وسائل معاش کی کمی کو قرار نہ دیا جائے بلکہ اُن کی ذمہ داری کچھ اور دوسرے اسباب پر رکھی جائے۔ مثلاً کہا جائے کہ حکومت غیر ملکی ہے تنظیم معیشت ناقص ہے۔ تقسیم دولت غیر منصفانہ ہے۔ لوگ موجودہ وسائل کا پورا اور صحیح استعمال نہیں جانتے وغیرہ وغیرہ

افلاس اور بیماری کے اضافہ کے منکر تو ممکن ہے کچھ لوگ ہوں لیکن ان کی کثرت سے انکار کرنے والا تو شاید کوئی نہیں ہے اس لئے اسکو تو بحث کو مختصر کرنے کے لئے ہم ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کئے لیتے ہیں لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ ان خرابیوں کا سبب وسائل معاش کی کمی ہے یا انتظام کی خرابی۔ وسائل معاش کی کمی کا مطالعہ بھی دو پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے اس کا ایک پہلو تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ وسائل معاش سے موجودہ حالت میں جتنا اور جس طرح فائدہ حاصل کیا جا رہا ہے خود اس میں اس بات کی گنجائش ہے کہ زیادہ آبادی کی اس سے پرورش کی جا سکے اور دوسرے اس پہلو سے کہ مستقبل کے مختلف حالات کو سامنے رکھ کر ان وسائل کے ذریعہ فائدہ کی جو توقعات کی جا سکتی ہیں ان کا اندازہ کریں اور اپنے اس اندازہ سے آئندہ کے لئے اس بات کا فیصلہ کریں کہ زیادہ آبادی کی ان وسائل سے پرورش کی جا سکے گی یا نہیں

قوم پرستوں اور سوشلسٹوں کا گروہ غیر منصفانہ تقسیم پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ اُن کے

نزدیک موجودہ حالت میں وسائل دولت سے جتنا اور جس طرح نفع حاصل کیا جارہا ہے اگر اسکی تقسیم انصاف کیساتھ ہو تو ملک میں زیادہ آبادی کی پرورش کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ مثلاً قوم پرست کہتے ہیں کہ غیر ملکی حکمرانوں کی تنخواہوں بھتوں، پنشنوں الاؤنسوں وغیرہ کی شکل میں جو ملکی دولت خرچ کی جاتی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ پر جو سود دیا جاتا ہے۔ غیر ملکی مصنوعات کے معاوضے میں ہندوستان کی جو دولت باہر جاتی ہے اگر وہ ملک کے لوگوں پر صرف کی جائے تو اس سے ملک کی خوشحالی بہت بڑھ جائے گی۔ ایسے ہی سوشلسٹ کہتے ہیں کہ امرا اپنے فضول تعیشات پر اس وقت جو روپیہ صرف کرتے ہیں اگر وہ غربا کو مل جائے گا اور صنعت وزراعت کی تنظیم اشتراکی اصولوں پر کی جائے تو غربا کی مرفہ الحالی میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ ایک حد تک اس میں شک نہیں قوم پرست گروہ اور سوشلسٹ جماعت کا کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن جن لوگوں نے ہندوستان کی مجموعی دولت کا تخمینہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ تقسیم دولت میں چاہے کیسی ہی تبدیلیاں کیوں نہ کی جائیں موجودہ حالت میں اُن سے آبادی کی حالت بہت بہتر نہیں بنائی جا سکتی اس کے لئے وسائل دولت کو وسیع کرنا یا آبادی کو محدود کرنا لازمی اور ناگزیر ہے۔

پھر اس سوال پر کہ وسائل معاش میں کس قدر وسعت کی گنجائش ہے۔ اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے اس اختلاف رائے پر محاکمہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ معاشیات ہند کے پورے مباحث کو اس جگہ دہرایا جائے ایک گروہ غیر محدود صنعتی وزراعتی ترقی اور پیشوں کے تنوع کے خوش آئند خواب دیکھتا ہے۔ دوسرا ترقی کے امکانات کو بہت محدود اور اسکی آئندہ رفتار کو بہت سست بتاتا ہے۔ جہاں تک قدرتی وسائل دولت کا تعلق ہے اس پر سب متفق ہیں کہ ہندوستان میں قدرتی دولت بہت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کے نزدیک چند نہایت اہم قدرتی وسائل سے ہندوستان محروم ہے لیکن دولت کے پیدا کرنے میں جیسا کہ معاشیات کا ابتدائی طالبعلم بھی جانتا ہے محض قدرتی وسائل کافی نہیں ہوتے انکی ترقی دینے اور مفید بنانے کے لئے با مہارت مزدوروں، منتظموں اور سرمایہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اختلافِ رائے ان دوسرے عاملین پیدائش کی رسد کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک فریق کہتا ہے کہ ملک کے موجود حالات جلد بدلنے والے نہیں ہیں۔ چند ناقابل تسخیر مشکلات ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ مثلاً لوگوں کی مذہب پرستی جو انھیں دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر میں مبتلا رکھتی ہے۔ معاشرتی رواج ملکیت کے قوانین، وراثت کے قوانین، اور شادی بیاہ

کے طریقے جن سے آبادی میں اضافہ، تندرستی میں کمی اور تنظیم میں دشواری واقع ہوتی ہے لوگوں کے آپس کے اختلافات اور کمزوریاں جن کی وجہ سے جھگڑوں کے چکانے اور امن و امان قائم رکھنے کے لئے ایک غیر ملکی حکومت کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ سرمایہ تنظیم اور باہنر مزدوروں کی کمی جس کی وجہ سے صنعت و زراعت اپنی موجودہ پست سطح پر قائم ہیں۔ یہ حالات محض حکم دینے سے نہیں بدلے جا سکتے بلکہ انہیں رفتہ رفتہ نہایت محنت اور انتظار کے بعد بدلا جا سکے گا۔ اگر ہندوستان باہر کے ملکوں سے مصنوعات منگا رہا ہے اور خود انھیں اشیاء خام بھیجتا ہے تو اس کا فائدہ دراصل اسی پالیسی کو اختیار کرنے میں ہے موجودہ حالات میں ہر چیز کو جیسا ہونا چاہیے ویسی ہے۔ اس سے بہتر محض لوگوں کے شور مچانے سے نہیں ہو سکتی۔

دوسرا فریق کہتا ہے کہ نہیں یہ سب چیزیں بہت جلد بدلی اور بہتر بنائی جا سکتی ہیں اگر حکومت قوم پرستوں کے ہاتھ میں آجائے اُن کے نزدیک برطانوی حکومت خود غرضی کی بنا پر ہندوستان میں صنعتی ترقی نہیں ہونے دیتی۔ قومی حکومت قائم ہوتے ہی۔ ملک میں صنعتیں قائم ہوں گی۔ روزگار ترقی پائے گا اور ملک کی ساری مشکلات رفع ہو جائیں گی۔ تیسرا فریق صرف برطانوی حکومت کو الزام نہیں دیتا۔ بلکہ شہنشاہیت اور سرمایہ داری کے نظام کو تمام مصائب کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اس کا خیال ہے کہ برطانوی سامراجی نظام عذاب و لعنت کی شکل میں ہندوستان پر مسلط ہے اور اس کے ختم ہوتے ہی اسے امید ہے کہ ہندوستان کی ساری مشکلوں کا حل ہو جائے گا۔ غرضکہ یہ لوگ وسائل دولت کی خراب تنظیم اور خراب تقسیم کی شکایت کرتے ہیں۔ اور اپنی تمام امیدیں اصلاح اور انقلاب کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے قصداً انتہا پسندوں کی مثال کو سامنے رکھا ہے۔ ان میں اعتدال پسند لوگ بھی ہیں جو درمیانی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔

میرے پاس وقت نہیں ہے کہ میں تفصیل کے ساتھ اِن گروہوں کے خیالات کی وضاحت اور اُن پر تنقید کروں۔ یہاں میں صرف اپنے ذاتی نتائج کو بیان کر سکتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کی تبدیلی سے ملک میں روزگار کو بہت خاصی وسعت دی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ برطانوی

شہنشاہیت کی طرف سے ہندوستان کی صنعتوں کی ترقی کے لئے اتنی کوشش نہیں کی جا رہی ہے جتنی ایک ملکی حکومت یقیناً کرے گی۔ زراعت کو بھی ملکی حکومت نسبتاً زیادہ ترقی دے سکے گی۔ ملکی حکومت کے قائم ہونے سے ملک والوں کے لئے ہزاروں اور روزگار بھی نکلیں گے۔ اور نئی نئی راہیں پیدا ہوں گی۔ غیر مساوی تقسیم دولت رفع کرنے سے بھی ملک میں آبادی کی پرورش کرنے کا زیادہ موقع مل سکے گا۔ ان تمام امکانات کی وسعت کا مجھے پورا اعتراف ہے۔ لیکن پھر بھی میں اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہوں کہ ملک میں بھوکوں اور ننگوں کی اتنی کثرت ہے کہ اگر آبادی کو کم نہیں کیا گیا تو وسائل دولت کی یہ متوقع فراوانی بھی آبادی کے معیار زندگی کو امریکہ اور یورپ کے مہذب ملکوں کے معیار تک پہنچانے میں ناکامیاب ثابت ہوگی۔

ہندوستان میں ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان یعنی دس سال میں جو آبادی کا اضافہ ہوا ہے محض اس کا مقابلہ اگر دوسرے ملکوں کی آبادیوں سے کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اضافہ فرانس یا اٹلی کی مجموعی آبادی کے برابر ہے اور اسپین یا پولینڈ جیسے بڑے بڑے ملکوں کی آبادیوں سے زیادہ ہے۔ ہندوستان دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ آباد ملک ہے۔ اس کی آبادی اب چین سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ دنیا کی تقریباً ۱/۵ آبادی ہندوستان میں بسی ہوئی ہے۔ ہندوستان کا رقبہ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے نصف ہے لیکن اس کی آبادی امریکہ سے تین گنی ہے۔ یعنی ہندوستان امریکہ سے ۶ گنا زیادہ آباد ہے۔ انگلستان اور ہندوستان کا مقابلہ کیا جائے تو اس میں شک نہیں انگلستان کی آبادی فی مربع میل ہندوستان سے تین گنا زیادہ نظر آئے گی۔ لیکن انگلستان ایک صنعتی ملک ہے اور تمام سلطنت برطانیہ کے وسائل دولت اس کے تصرف میں ہیں۔ بلجیم اور ہالینڈ میں بھی آبادی فی مربع میل ہندوستان سے تین گنا ہے۔ لیکن ان ملکوں میں زراعت اور تجارت انتہائی عروج و کمال کو پہنچی ہوئی ہیں۔ دوسرے ہم نے ان ملکوں کا مقابلہ ہندوستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کے اوسط سے کیا ہے جس میں زرخیز اور غیر زرخیز، آباد اور غیر آباد سب طرح کے علاقے شامل ہیں۔ اگر ان کا مقابلہ ملک کے محض اُن علاقوں سے کیا جائے جن کے

قدرتی حالات بلجیم اور ہالینڈ سے ملتے جلتے ہیں مثلاً بنگال، مشرقی یوپی۔ جنوبی ہندوستان کے شمالی ساحل کا زیریں علاقہ تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے ان علاقوں کی آبادی فی مربع میل بلجیم اور ہالینڈ سے کم نہیں ہے۔ ماہران زراعت نے تخمینہ کیا ہے کہ زراعت کے پیشہ سے، موافق ترین حالات میں، ایک معقول معیار زندگی کے ساتھ صرف ۲۰۰ آدمی فی مربع میل گذر اوقات کر سکتے ہیں، ہندوستان کی تین چوتھائی آبادی کا پیشہ زراعت ہے۔ کسانوں کی جوت میں آج جو رقبے ہیں وہ بہت مختصر ہیں سنہ ۱۹۲۱ء میں بنگال میں کھیتی کے کام کرنے والے لوگوں کی جوت میں اوسطاً ۲.۲ ایکڑ کا رقبہ تھا ہندوستان کے دوسرے بڑے صوبوں میں یہ رقبہ اوسطاً تین ایکڑ ہوتا تھا بمبئی سرحدی صوبہ اور پنجاب میں البتہ یہ رقبہ اوسطاً ۱۰ ۱/۲ ایکڑ تھا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں تمام ہندوستان کے لئے مزروعہ زمین فی کس سوا ایکڑ تخمینہ کی گئی تھی۔ اور اس میں ایسا رقبہ جس پر اجناس خوردنی بوئی جاتی ہیں۔ فی کس پون ایکڑ تخمینہ کیا گیا تھا۔ زمینوں کی کاشت نفع بخش طریقے پر اسوقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک کاشتکاروں کی جوت میں رقبہ نہ بڑھایا جائے۔ اگر ہندوستان میں صنعتیں ترقی پا جائیں تو آبادی کا جو دباؤ زمین پر ہے ضرور کم ہوگا۔ لیکن زراعت کو ہمیشہ ہندوستان کے پیشوں میں ایک امتیازی اہمیت حاصل رہے گی اور اس کی پیداوار کی ترقی کے محدود ہونے کی وجہ سے ملک کی مجموعی پیداوار کی رفتار ترقی بھی سست رہے گی، صنعتوں کی ترقی کے امکانات کے بارے میں جن توقعات کو قائم کیا جاتا ہے اس میں شک نہیں ان میں سے بہت سی ضرور پوری ہوں گی۔ آبادی کے لئے ان سے روزگار میں ضرور اضافہ ہوگا۔ تجارت اور دوسرے روزگاروں کی ترقی سے بھی حالت بہتر ہوگی۔ لیکن اگر آبادی میں فرانس کی مجموعی آبادی کے برابر محض اضافہ ہوتا رہا تو نئے روزگار کہاں تک فراہم کئے جا سکیں گے اور ملک کی فی کس سالانہ آمدنی کو دوسرے ملکوں کی سالانہ فی کس آمدنی کی سطح تک کیسے بلند کیا جا سکے گا۔

ہندوستان کی سالانہ پیداوار فی کس ۷۱ روپے تخمینہ کی گئی ہے اس کے مقابلے میں انگلستان کی سالانہ پیداوار فی کس ۱۳۵ روپے۔ کناڈا کی ۵۰۰ روپے اور امریکہ کی ایک ہزار روپے بیان کی گئی ہے۔ جب تک ہندوستان کی پیداوار فی کس ان ترقی یافتہ ملکوں کے برابر نہیں ہوگی یعنی

یہاں کی مجموعی پیداوار میں آٹھ گنا ، بارہ گنا اور سولہ گنا اضافہ نہیں ہوگا ۔ ہندوستان کبھی بھی انگلستان کناڈا اور امریکہ کے معیار راحت و آسائش تک نہیں پہنچ سکے گا ۔ کیا ہندوستان کی پیداوار کو بارہ گنا اور سولہ گنا بڑھایا جاسکتا ہے ؟

زراعتی پیداوار کے بڑھانے کا جہاں تک تعلق ہے اس سے بہت زیادہ توقعات قائم نہیں کی جاسکتیں ۔ زمین پر آبادی کا بوجھ اس وقت بہت زیادہ ہے ۔ صنعت و تجارت اور دوسرے پیشوں کی ترقی سے ایک عرصے تک تو اس بوجھ کے کم کرنے کا ہی کام لیا جائے گا اور لوگوں کی خوشحالی میں اضافہ آہستہ آہستہ ہی ہوگا ۔ اگر اس دوران میں آبادی میں اضافہ کا سلسلہ جاری رہا تو زمین سے زراعت و صنعت کی ترقی کے ذریعے آبادی کا بوجھ جتنا چاہیئے اتنا کم نہ ہوسکے گا اور پیداوار کے اضافے کا ایک خاصا بڑا حصہ نئی آبادی کے پالنے اور پرورش کرنے میں صرف ہوتا رہے گا اور زندگی کی راحتیں اور آسائشیں نہ بڑھ سکیں گی یا بڑھیں گی تو بہت کم بڑھیں گی ۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ اگر آیندہ دس سال میں ہم اپنی زراعت کی پیداوار کو ڈیڑھ گنا اور صنعت و تجارت وغیرہ کی پیداوار کو چار پانچ گنا ترقی دینے میں کامیاب ہوئے جو میرے خیال میں ترقی کی خاصی اچھی رفتار ہوگی تو ہماری مجموعی پیداوار آج کے مقابلے میں شاید دوگنی ہوجائے گی ۔ یہ ہمارا بڑا زبردست کارنامہ ہوگا ۔ اور اگر غیر معمولی کوششوں سے ہم پیداوار کو کہیں تین گنا یا چار گنا بڑھا سکے تو سمجھیے کہ ہم ایک معجزہ کر دکھائیں گے ۔ لیکن اس تمام ترقی کے باوصف نتیجہ کیا ہوگا ؟ ہم اپنے معیار کو صرف جاپان کے پست معیار کی سطح تک بلند کر پائیں گے لیکن اگر اس اثنا میں آبادی کے سیلاب نے پچھلے دس سالوں کی طرح اٹلی یا فرانس کی مجموعی آبادی کے برابر ہمارے یہاں آبادی کا محض اضافہ جاری رکھا تو ہماری بہت سی اضافہ شدہ پیداوار تو اس نئی آبادی کے ہی نذر ہوجائے گی اور حصہ رسد فی کس اسی نسبت سے کم ہوجائے گا ۔ ان واقعات کی روشنی میں جب ہم آبادی کے مسئلہ کو دیکھتے ہیں تو ہمارے لئے یہ ضروری اور لازمی ہوجاتا ہے کہ ہم آبادی کی تعداد کو محدود کریں اور اسے ایک معقول حد سے زیادہ نہ بڑھنے دیں

آبادی کے محدود رکھنے کی صورت جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا جا چکا ہے ایک تو یہ ہو سکتی ہے کہ دوسرے ملکوں کو ہجرت کی جائے اور دوسری یہ کہ نئی پیدائش کو روکا یا کم کیا جائے۔ ہندوستان کو دوسرے ملکوں میں اپنی آبادی کے منتقل کرنے کی سہولتیں بہت کم حاصل ہیں۔ ایک دو کو چھوڑ کر باقی تقریباً تمام نوآبادیوں نے جہاں آبادی کے پھیلنے کی گنجائش ہے۔ ہندوستان کے مہاجروں کا داخلہ بند کر رکھا ہے۔ ہندوستان کے تقریباً ۲۴ لاکھ آدمی سلطنت برطانیہ کی مختلف نوآبادیوں میں بسے ہوئے ہیں۔ سلطنت برطانیہ سے باہر جو ہندوستانی رہتے ہیں اُن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ نہیں ہے موجودہ حکومت کی کوششوں سے یا ہندوستان کے خود مختار اور آزاد ہونے کے بعد ممکن ہے ہندوستانیوں کو غیر ملکوں میں نسبتاً بہتر سہولتیں مل سکیں، لیکن اس ذریعہ سے ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ کچھ بہت زیادہ کم نہ ہو سکے گا۔

اس لئے آخیر میں آبادی کو محدود کرنے کا ذریعہ صرف پیدائش اولاد کو کم کرنا رہ جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پیدائش اولاد کو کس طرح کم کیا جائے۔ ہندوستان کے لوگوں کے جذبات اور خواہشات کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس قسم کی کوششوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن دو میں سے کسی ایک طریقے کے اختیار کئے بغیر معیار زندگی میں نمایاں ترقی کی توقع نہیں کی جا سکتی یا تو ضبط نفس اور برہم اچاریہ کا طریقہ اختیار کیا جائے یا (Contraceptives) یعنی مانع اولاد طریقوں کو عام رواج دیا جائے۔ پہلا طریقہ بلاشبہ بہت پسندیدہ اور اخلاقی حیثیت سے بلند اور ارفع ہے۔ اور اس کے اختیار کرنے کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ شادی کو ملتوی کیا جائے۔ شادی کے بعد جنسی خواہشات کو حدود اعتدال میں رکھا جائے۔ ورزش اور جسمانی تربیت کا شوق پیدا کیا جائے۔ مطالعہ، علمی تحقیقات اور خدمت خلق سے دلچسپی پیدا کی جائے وغیرہ۔ دوسرا طریقہ یعنی مانع اولاد طریقہ کمزور قوت ارادی اور طاقت ور جنسی خواہشات رکھنے والے لوگوں کے لئے ہے۔ بعض لوگ اس کے حامی ہیں۔ لیکن اس کے خلاف سخت اخلاقی اور مذہبی اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ضبط نفس کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بہر حال طریقہ جو بھی اختیار کیا

جائے آبادی کو ہندوستان کے موجودہ حالات میں محدود رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے موجودہ پست معیار زندگی میں ترقی ہو۔ ہم دنیا میں کیڑوں کی طرح رینگنے کی جگہ سر اٹھاکر انسانوں کی طرح چل پھر سکیں۔ ہمارا وجود ہمارے ملک اور قوم کے لئے موجب افتخار اور وجہ نازش ہو

روسو کا نظریۂ تعلیم

روسو نے نہ صرف سیاسی دنیا میں بلکہ تعلیمی دنیا میں بھی اپنے خیالات سے انقلاب پیدا کر دیا اس کی مشہور عالم کتاب معاہدۂ عمرانی انقلاب فرانس کا باعث ثابت ہوئی۔ آزادی، مساوات اور اخوت کا جو نعرہ اس نے بلند کیا تھا اس کی صدا بالآخر تمام یورپ میں گونج گئی۔ وہ ایک جذباتی انسان تھا نعرے سے زائد تخریبی کام اس نے بخوبی کیا۔ جو حیثیت "معاہدۂ عمرانی" کی سیاسی ادب میں ہے، وہی حیثیت "ایمیل" کی تعلیمی دنیا میں ہے۔

روسو اٹھارھویں صدی کے آخر میں پیدا ہوا۔ یہ زمانہ مغربی زندگی میں عجیب ذہنی کشمکش کا زمانہ تھا خصوصاً فرانس میں اس ذہنی کشمکش کے آثار بہت نمایاں تھے۔ والٹیر اور فرانس کے دیگر مصنفین متشکک تھے۔ مادیت کا بھی دور دورہ عام تھا۔ ان مصنفین نے اعتقاد اور ایمان کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ کلیسا کے عقائد جو توہمات پر مبنی تھے۔ برباد ہو چکے تھے۔

اسی ماحول میں روسو گنیف میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن کا زمانہ مذہبی ماحول میں گذرا، سوئٹزرلینڈ کے حسین و دل کش مناظر کا گہرا نقش اس کی معصوم فطرت پر بہت زیادہ پڑا۔ اس کی صحت بچپن سے اچھی نہ تھی، وہ ہمیشہ نیک اور پاک باز زندگی گذارنا چاہتا تھا۔ مگر اس کو اپنے جذبات پر قابو نہ تھا۔ نصب العین کی بلندی اور اپنی ذاتی کم زوری کے تضاد کا اس کو بہت سخت احساس تھا۔ پھر اس زمانے میں ایک جابر حکومت قائم تھی۔ روسو آزادی مساوات اور اخوت کا قائل تھا۔ لیکن ڈھونڈنے سے بھی اس کو یہ چیز فرانس کی تمدنی زندگی میں نہیں ملتی تھی۔ پیرس کے ایوانوں میں سوائے عیش و عشرت، تصنع، ریاکاری خود غرضی اور ظلم کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ روسو متعدد مرتبہ پیرس آیا لیکن اس کو وہاں کبھی بھی چین میسر نہ آیا۔ وہ بھاگ بھاگ کر اپنی معشوقہ کے پاس گنیف واپس جاتا تھا۔ جہاں اُسے کھانے کو روٹی اور آرام کے لئے جگہ مل جاتی تھی۔ پھر بڑے شہر کی پرشور زندگی کے بعد حسین و دل کش مناظر

کا یہ سکون اس کو جنت سے بھی بڑھ کر دکھائی دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اس کی حساس اور شاعرانہ طبیعت تمدن سے متنفر ہو گئی اور فطری زندگی کو اس نے سراہنا شروع کیا۔

تمدن اس کے لئے ظلم و جور کا مظہر تھا۔ بخلاف اس کے فطرت، انصاف و مساوات، نیکی اور معصومیت کو حامل، فطرت کا یہ تخیل اس کی سیاسی اور تعلیمی تصانیف کی جان ہے، معاہدہ عمرانی کو وہ اس جملے سے شروع کرتا ہے۔ کہ انسان آزاد پیدا کیا گیا ہے لیکن ہر جگہ پا بہ زنجیر ہے"۔ وہ ان زنجیروں کو کاٹ کر انسان کو پھر اپنی فطری حالت پر واپس لانا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ آزاد پرندوں کی طرح دنیا کے مرغزاروں میں اپنی زندگی گذارے۔ روسو کا مندرجہ بالا جملہ حضرت عمرؓ کے اس قول سے کس قدر مشابہ ہے کہ" انسان کو اُن کی ماؤں نے آزاد پیدا کیا ہے۔ تم اس کو کیوں غلام بنانا چاہتے ہو" فطرت سے بلا واسطہ تعلق کا احساس طبیعتوں کے لئے یہ لازمی نتیجہ ہے۔ وہ فطری ماحول چاہے سوئٹسان کے حسین برفانی پہاڑ ہوں یا عرب کے وسیع صحرا۔

جسمانی آرام کے لئے جس طرح روسو ہر وقت گنف کے سبزہ زاروں کو ڈھونڈھتا تھا اسی طرح روحانی تسکین کے لئے وہ اس پر یقین رکھتا تھا کہ انسان کی اصل فطرت نیک ہے اور خدا نے دنیا کو نیکی کی بنیادوں پر قائم کیا ہے۔

فطرت انسانی کی نیکی کا تصور، کلیسائی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے، عیسائی کلیسا انسانی فطرت کو بد تصور کرتا ہے۔ انسان اس کے نزدیک پیدائشی گناہ گار ہے۔ مسیح کی صورت میں خدا نے اپنا ظہور دنیا میں اس لئے کیا کہ وہ پیدائشی گناہ گار انسانیت کے لئے سولی پر چڑھ کر اس کے گناہوں کا کفارہ دے۔

روسو اس تصور کا سخت ترین مخالف ہے۔ وہ اسلام کے اس تصور کو تسلیم کرتا ہے کہ فطرت انسانی نیک ہے۔ ہر بچہ معصوم پیدا ہوا ہے۔

روسو کے نزدیک بدی جب شروع ہوتی ہے جب بچہ یا نوجوان جماعتی زندگی شروع کرتا ہے۔ بدی کا ذمہ دار در اصل انسانی ماحول ہے۔ روسو انسانوں کو ماحول کی ان بندشوں سے

آزاد کرنا چاہتا ہے۔ وہ انسان کی فطرت اصلی کو آسکے، اصلی رنگ میں قائم رکھنا چاہتا ہے۔ روسو کے متصوفانہ رجحانات یہاں جلوہ گر ہیں۔ وہ انسان کی اصل فطرت کو فطرت ایزدی کا پرتو سمجھتا ہے۔ وہ بچوں کے شگفتہ چہروں میں خالق کائنات کی نیرنگی دیکھتا ہے۔ اصل فطرتِ انسانی حقیقتِ اصلی سے زیادہ قریب تر ہے۔ اس لئے وہ اس کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔

روسو اس معنی میں ایک فلسفی نہ تھا کہ اسے صرف منطقی استدلالات سے بحث ہو اس کو خیالات کی نزاکت اور لطافت سے بھی زیادہ تعلق نہ تھا۔ وہ تو انسانیت کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔ عوام کو ظالم حکومتوں کے پنجے سے اور بچوں کو ظالم انسانوں کی دست و برد سے۔ روسو ہر قسم کی قیود کو بُرا سمجھتا ہے۔ وہ انسان کی سب سے بڑی سعادت اسی میں تصور کرتا ہے کہ وہ اپنی فطرت اصلی کی پیروی کرے۔

لیکن باوجود کوشش کے بھی انسان مکمل طور پر آزاد نہیں ہو سکتا۔ وہ کل کا ایک جزو ہے۔ اس بندش سے وہ کسی طرح بھی آزاد نہیں ہو سکتا، پھر انسان کو اجتماعی زندگی کے لئے اور بھی قربانیاں کرنا پڑتی ہیں۔ لیکن یہ تمام قیود اس قدر زائد نہیں ہیں کہ انسان کی انفرادی آزادی بالکل ہی برباد ہو جائے۔ روسو جہاں تک ہو سکے وہاں تک اس آزادی کو قائم رکھنا چاہتا ہے

روسو کہتا ہے کہ "انسان کی آزادی کو قربان کرنے کے معنی ہیں کہ اس کی انسانیت، اس کے انسانی حقوق اور فرائض کو برباد کر ڈالا جائے"۔ (معاہدہ عمرانی ۱۰۰)

فطرت اصلی سے منہ پھیرنا ہر حالت میں برائی ہے" ہر وہ چیز جس کی بنیاد فطرت پر قائم نہیں ہے اس میں نقائص ہیں۔ اور انسانی جماعت تو اس باعث بہت ہی خراب ہو جاتی ہے"

علمی فکر اور تحقیق کی روسو، کوئی آزادانہ حیثیت نہیں تسلیم کرتا۔ اس کے نزدیک ان چیزوں کو زندگی کے تابع ہونا چاہئے۔ بغیر کسی قید کے غور و فکر تنقید صرف تنقید کی خاطر۔ بلا مقصد علمی جدوجہد اس کے لئے ایک غیر فطری چیز ہے۔

تہذیب و تمدن فطرت اصلی کو خراب کر دیتا ہے۔ یہ اصلی خوشی کا قائل ہے۔ یہ تخیل روسو کے

فلسفہ تعلیم میں ہر جگہ ملتا ہے۔ روسو اپنی مشہور تعلیمی کتاب "ایمیل" میں ایمیل کو انسانوں سے علیحدہ رکھ کر تعلیم دینا چاہتا ہے۔ وہ ایک طالب علم کی زندگی پر سے حکومت اور جماعت کی بندشوں کو ہٹا دینا چاہتا ہے۔ وہ طالب علم کو یہ سکھانا چاہتا ہے کہ انسان کی اصل خوشی یہ ہے کہ وہ اپنی علیحدہ زندگی گذارے اور دوسروں کو اُن کی زندگی گذارنے دے۔ وہ دوسروں سے محبت کرے۔ اُن کا بھلا چاہے۔ مگر بہر صورت کسی اجتماعی قیود میں نہ اُن کو اور نہ خود کو جکڑے۔

آزادی کا یہ تصور رواقیت کے فلسفے پر مبنی نہیں ہے۔ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انسان دوسروں کے دکھ درد سے کچھ بھی واسطہ نہ رکھے اور نہ یہ ہے کہ انسان اپنے جذبات اور خواہشات کو بالکل فنا کر دے۔ یہ ہندوؤں کے سنیاسی فلسفے کی طرح انسان کو جوگی بنا کر ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔ روسو یہ نہیں چاہتا کہ ہر قسم کی خوشیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ وہ اس کو جائز رکھتا ہے کہ ہر قسم کی جسمانی اور ذہنی خوشیاں حاصل کرے البتہ وہ اس کا مخالف ہے کہ وہ بہت زیادہ لطیف اور نفیس کر دی جائیں۔ تمام خوشیوں کو فطری ہونا چاہیئے۔ اگر اس قسم کی کوئی مثال مطلوب ہو تو وہ ایک صحت ور بچے کی خوشیوں میں دکھائی دے سکتی ہے۔

ایک مہذب جماعت میں بچے کو یہ خوشیاں میسر نہیں آتیں۔ انسان بچوں کو بچہ رہنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ روسو کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے کہ اس نے فطرت اور تمدن کے اس تضاد کو واضح کر دیا اور بچپن کے دور کی ایک مستقل تعلیمی حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ روسو نے یہ تصور بہت ہی غیر متعین طور پر پیش کیا۔ اس نے اس کے لئے کوئی عملی طریقہ تعلیم بھی ایجاد نہیں کیا۔ در اصل وہ ماہر تعلیم سے زائد ایک مبلغ تھا۔ جس طرح اس نے سیاسی حقوق کے لئے آواز بلند کی اسی طرح معصوم بچوں کے جذبات کا بھی وہ ترجمان بن گیا۔ اس کام کو اس کے جانشین پسٹالوزی اور فردیل نے باقاعدہ انجام دیا۔

مسیح نے کہا تھا کہ "تم بچوں کی طرح ہو جاؤ"۔ قرآن میں درج ہے کہ "بچے نیک پیدا ہوتے ہیں"۔ اس سچی تعلیم پر کسی کو بھی یقین نہیں رہا تھا۔ عیسائی کلیسا تو خاص طور پر اس تصور کا مخالف تھا

ایک مشہور عیسائی مفکر پاسکل کا قول ہے کہ انسان کی زندگی جب شروع ہوتی ہے جب اس میں عقل آتی ہے اور یہ عموماً بیس برس کی عمر میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے قبل بچہ انسان نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں عام طور پر خیال تھا کہ بچہ انسانیت سے کچھ واسطہ ہی نہیں رکھتا۔ جس طرح عموماً آج بھی ہندوستان میں خیال کیا جاتا ہے اور معصوم بچے جاہل ماؤں، ملاؤں، پنڈتوں اور استادوں کے ہاتھوں خوب پیٹے جاتے ہیں۔

روسو کو تمام عمر یہ تمنا رہی کہ وہ ایک بچے کی طرح معصوم زندگی گذارے۔ باوجود اس تعلق کے بھی جو روسو کو تمام عمر بچوں کے ساتھ رہا۔ روسو کا تصور بچے کے متعلق بالکل عینی ہے۔ وہ اس کو اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرقع سمجھتا ہے۔ اس کے بچے کا تصور ان ہی جذبات سے رنگین ہے۔ روسو کا بچے کا تصور کس قدر عینی ہے وہ اس سے ظاہر ہوگا کہ وہ اکثر اوقات جماعت کے مقابلے میں بچے کی زندگی بحیثیت نمونہ پیش کرتا ہے۔ غرضکہ روسو نے بچے کی تعلیم کے تصور کو بالکل ہی بدل دیا۔ اس کے قبل بچے کے جذبات اور احساسات کا کچھ بھی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ جہاں تک ہوسکے بچے کی خواہشات اور جذبات پر قیود عائد کی جائیں۔ اب بخلاف اس کے معلم کا فرض ہوگیا کہ وہ ہر وقت بچے کے جذبات، احساسات اور خواہشات کا لحاظ رکھے، اس کی آزادی میں کم سے کم دخل انداز ہو اور اس کو جنگل میں ایک خودرو پھول کے پودے کی طرح اُگنے دے۔

لیکن سب سے بڑی مشکل اس نظریہ تعلیم میں یہ ہے کہ جب بچے کو اس طرح آزاد تعلیم سماج سے الگ رکھ کر دی جائے گی تو وہ کس طرح اس قابل ہوسکے گا کہ سماجی فرائض میں حصہ لے سکے۔ روسو کا نظریہ تعلیم منفی ہے۔ مگر پھر بھی وہ اس سے انکار تو نہیں کرتا کہ آگے چل کر طالب علم کا مقصد یہی ہے کہ وہ جماعتی فرائض انجام دے۔ ایک ایسا طالب علم جس نے اپنا بچپن اور اپنی جوانی جماعت سے علیحدہ گذاری ہے۔ کس طرح یکایک اس قابل ہوجائے گا کہ جماعت کے فرائض کو بخوبی انجام دے سکے۔

تعلیم کے منفی تصور کے خلاف یہی سب سے بڑا اعتراض ہے۔ <u>جماعت اور حکومت</u>

تار کی پیداوار ہیں۔ ان میں کامیابی سے حصہ لینے کے لئے خاص روایات کے تحت تعلیم پانے کی ضرورت ہے

روسو کو خود بھی اس کی مصیبت کا احساس تھا اور اس نے اس مسئلے کے متعلق اپنے خیالات Nouvelle Heloise میں ظاہر کئے ہیں۔ یہ تصنیف ایمیل کے تصور تعلیم پر تنقید کرنے کے لئے بہت موزوں ہے۔ یہاں ایمیل کی طرح بچے کی تعلیم بالکل علیحدہ صرف ایک استاد کے تحت میں نہیں ہوتی بلکہ خاندان میں ہوتی ہے۔ باپ کے اصول تعلیم کے مطابق ماں بچے کو عملی تعلیم دیتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم کا جو تصور ایمیل میں پیش کیا گیا تھا وہ نصب العین کا کام نہیں دے سکتا در اصل اس زمانے کی رئیسانہ عیش پسند زندگی کے خلاف یہ ایک ردّ عمل تھا۔ اس زمانے کی امیر سماج کی بیویوں کو روسو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ وہ بچوں کی صحیح تربیت کر سکیں۔ اس لئے وہ بچے ان سے چھین کر ایک استاد کے حوالہ کر دینا چاہتا تھا۔ تاکہ جب بچوں کی سیرۃ مستحکم ہو جائے تو پھر وہ سماج کو واپس کر دئے جائیں اور پھر وہ یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ کس طرح تمام خارجی اثرات سے آزاد تعلیم دی جا سکتی ہے۔

لیکن روسو زائد عرصے تک خاندان کے مستحکم اور ہمہ گیر تعلیمی اثر سے انکار نہ کر سکا۔ وہ بہت ہی جلد اس خیال کی طرف واپس آگیا۔ حقیقتاً خاندان ایک فطری تعلیمی ادارہ ہے اور کوئی بھی تعلیم مستحکم اور صحیح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی بنیادیں خاندانی ماحول میں نہ رکھی جائیں۔ اس حقیقت کا اور بھی زائد احساس پستالوزی نے کیا جس نے اپنے تمام نظام تعلیم کی بنیاد ہی گھر کی تعلیم پر رکھی۔

ایمیل میں روسو نے جس طرح چاہا اپنے طالب علم کا انتخاب کیا تھا لیکن پستالوزی میں اب اسکی نظر اس بات پر بھی ہے کہ بچے مختلف خواص سے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ان نفسیاتی اختلافات پر نظر رکھنا اور اس کے مطابق مختلف قسم کی تعلیم دینا اور مختلف طریقۂ تعلیم اختیار کرنا معلم کا فرض ہے

روسو اب اس بات سے بھی انکار کرتا ہے کہ بچے کی اخلاقی نشوونما صرف خارجی خراب اثرات کو دور کرنے سے ہو جاتی ہے۔ وہ اب اس پر یقین رکھتا ہے کہ اندرونی اخلاقی قوت کی نشوونما بھی اسی قدر ضروری ہے۔

روسو کا یہ خیال جرمن جمیت کے بالکل قریب ہے اور یہاں اس کا اور کانٹ کا فلسفہ ایک دوسرے سے مل جاتا ہے۔ کانٹ روسو کے تعلیمی نظریہ کا بہت ہی قائل تھا۔ دونوں کے نزدیک ضمیر کی قوت کے استحکام میں اصل اخلاقی تعلیم مضمر ہے۔

ذہنی تعلیم میں بھی وہ اس کا قائل ہے کہ صرف خارج سے معلومات کا جمع کرنا علم نہیں ہے بلکہ علم، خارجی تاثرات اور ذہن انسانی کے تعامل سے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں روسو اس نظریہ علم کا قائل نظر آتا ہے جس کی ابتدا ڈیکارٹ کے زمانے سے ہوتی تھی۔ وہ انگریز تجربیئن لاک اور ہابس کی طرح علم کو صرف خارجی تاثرات کا نتیجہ نہیں سمجھتا بلکہ اس میں ذہن انسانی کے آزادانہ بدیہی عمل کو بھی جگہ دیتا ہے تعلیم کا مقصد چنانچہ یہ نہیں ہے کہ باہر سے ذہن انسانی میں اشیا کا علم ٹھونسا جائے جس طرح صندوق میں کوئی چیز ٹھونسی جاتی ہے بلکہ ذہن انسانی کی خفیہ قوتوں کو بیدار کرنا مقصد تعلیم ہے تعلیم کا یہ تصور اب واضح ہو گیا جس کا دھندلا سا تصور فلاطون کو بھی تھا جبکہ وہ ایک یونانی لڑکے سے سوالات کے ذریعے ان باتوں کا علم حاصل کرنا چاہتا تھا جس کا علم اس لڑکے کو پہلے نہ تھا۔
تعلیم کا یہ تصور بہت ہی اہم ہے اس تصور کی بنیاد پر ہمارے زمانے تک فلسفہ تعلیم کی نشوونما ہوتی ہے۔

صرف حافظہ کو ترقی دینا تعلیم کا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ مشکل اوقات میں بچوں میں قوت فیصلہ پیدا کرنا تعلیم کی جان ہے۔ رٹنا اور ایسی چیزوں کا یاد کرنا جس کا مفہوم بچے نہ سمجھتے ہوں، سخت مضر ہے۔ استاد کو بچوں کو خود جواب فراہم نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ کوشش کرنی چاہئے کہ بچے خود سوالات کے جوابات دیں۔ کام کے ذریعے تعلیم کا تصور جس کو ہم عملی تعلیم کا تصور کہہ سکتے ہیں روسو ہی کے زمانے سے شروع ہوا۔

روسو اپنے تعلیمی نظریہ کو تعلیم کا منفی نظریہ کہتا ہے اس سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے استاد طالب علم کی تعلیم میں دخل نہ دے۔ استاد کا صرف یہ فرض ہے کہ وہ بچوں کو خراب اثرات سے بچائے

روسو کا خیال ہے کہ کسانوں کو خاص تعلیم کی ضرورت نہیں ہے چونکہ وہ فطرت سے قریب زندگی گذارتے ہیں۔ ان کے بچوں کی تعلیم خود بخود ان کے والدین کے ساتھ کھیتوں میں ہو جاتی ہے

روسو نے فطری سزا کا نظریہ بھی پیش کیا ہے اس سے اس کا یہ مفہوم ہے کہ بچے اپنے خراب اعمال کے فطری نتائج برداشت کریں۔ بچے اس طرح جو تجربے حاصل کریں گے وہ ان کو تمام عمر فائدہ پہنچائے گا۔ اور اس طرح وہ اعمال اور ان کے فطری نتائج کو واضح طور پر سمجھ سکیں گے۔

غرضکہ سماج کا نصب العین روسو کے پیش نظر یہ ہے کہ وہ آزاد انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اور جس میں ان کے حقوق پر صرف اسی قدر قید لگائی جاتی ہے جس قدر جماعت کے تحفظ کے لئے ضروری ہے۔

ایسے ہی سماج کی بقا کے لئے وہ اپنے تعلیمی نظریوں کے ذریعے بچوں کی تعلیم و تربیت کرنا چاہتا ہے۔

جسمانی اور ذہنی تعلیم کی اہمیت روسو کے یہاں کم نہیں ہے لیکن اخلاقی تعلیم کو وہ تمام تعلیمی نظام کی بنیاد سمجھتا ہے۔ اخلاقی احساس اس کے یہاں شدت سے پایا جاتا ہے اور اخلاقی اور مذہبی حس اس کے یہاں ملا جلا ہے اور یہی حس وہ بچوں میں بھی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک یہی انسان کی فطرت اصلی ہے اور اس فطرت اصلی کو ماحول کے خراب اثرات سے محفوظ رکھنا تعلیم کا سب سے اعلیٰ مقصد ہے۔

سیاسیاتِ عالم کا خاکہ

۱۹۱۹ء میں ورسیلز کی صلح کے بعد یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دنیا سے جنگ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا۔ خصوصاً فاتح مند مطمئن تھے کہ انھوں نے جنگ پسند جرمنی کو بالکل ہی کچل ڈالا اور آسٹرو ہنگرین سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اب وہ باطمینان اپنے نو مفتوحہ علاقوں پر قابض رہ کر فارغ البالی سے بسر اوقات کریں گے۔ مگر انھیں بہت جلد محسوس ہو گیا کہ

ما دو چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

جن ملکوں کو پامال کیا گیا تھا انھیں ضرور قیامت بن کر اٹھنا تھا۔ علاوہ اس کے جنگ کے مصائب فاتح و غیر فاتح کم و بیش دونوں ملکوں کے عوام کو برداشت کرنے پڑے۔ پس عوام میں شخصی حکومت اور شاہنشاہیت[۱] اور سرمایہ داری (Capitalism) کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے اُن ہی سرمایہ دارانہ مفاد پر خواہ مخواہ اُن کے رشتہ داروں کی جانیں بھینٹ چڑھیں جنگ کے اثرات مابعد بھی اقتصادی حیثیت سے بہت برے ثابت ہوئے غریبوں کو روٹی کے لالے پڑ گئے پس زمانے نے کروٹ بدلنی چاہی مظلوم عوام موجودہ تہذیب و نظام سے متنفر ہو گئے شخصی حکومت کا قلع قمع ہو گیا۔ کہیں حکومت جمہوری کی بنیاد پڑی کہیں اشتراکیت نے پر پرزے نکالے، روس میں تو حکومت (STATE) کے خلاف اس قدر جذبات برانگیختہ ہوئے کہ عوام نراج (Anarchist society) کے خواب دیکھنے لگے۔ چنانچہ مطلق العنان زار کو قتل اور روسا کو پامال کر کے ایک انقلاب عظیم برپا ہوا اور لوگوں نے اشتمالیت (Communism) کی طرف قدم بڑھایا۔ چونکہ جرمنی اور اٹلی شخصی حکومت کے عادی تھے اس لئے سیاسی نظام نے ایک نیا روپ بدلا جسے ہم (Dictatorship) یا آمریت کہتے ہیں۔

اس وقت سیاسیات یورپ میں تین سیاسی نظریے عمل پیرا ہیں:-

---

[۱] Monarchy and Imperialism

(۱) روس میں عوام کا نظریہ اشتمالیت ہے۔

(۲) جرمنی اور اطالیہ میں نازیت اور فاسشیت رائج ہے۔

(۳) انگلستان، فرانس اور بلجیم میں جمہوریت۔

حامیانِ جمہوریت کو بقیہ دونوں نظریوں کے علمبرداروں سے بے حد خوف پیدا ہو رہا ہے[۱] کیونکہ ہر فریق اپنے استحکام کے لئے یہی چاہتا ہے کہ تمام دنیا میں اس کے سیاسی نظام کی پیروی ہونے لگے اس لئے مناسب ہوگا کہ ہم پہلے اشتمالیت اور اس کے حریف فاسشیت کے فلسفوں کو اجمالاً بیان کر دیں تاکہ ان سیاسی فلسفوں کا فرق بیّن طور پر ناظرین کے ذہن نشین ہو جائے۔

اشتمالیت کا نقطۂ نظر بین الاقوامی اور عالمگیر ہے۔ اس کے حامی سرمایہ داری (Capitalism) کا خاتمہ کر کے دنیا میں ایک عالمگیر نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں سرمایہ دار جماعت اور دوسرے امتیازی طبقوں کا وجود باقی نہ رہے گا۔ حکومت (States) مفقود ہو گی۔ لوگ اپنا انتظام اتفاق باہمی سے مجلس قائم کر کے خود ہی کر لیں گے۔ مذہب کی تفریق اور اس کا اثر معدوم ہو جائے گا۔ ایک سوسائٹی کے تعلقات دوسری سوسائٹی کے ساتھ محض ملکی یا قومی بنا پر نہ ہوں گے بلکہ اخوت انسانی کے رشتہ سے مربوط ہوں گے۔ ایسا عالمگیر نظام قائم ہو جانے پر دنیا میں دولت کی تقسیم بالضرورت و بالحقوق مناسب طور پر ہو سکے گی۔ مزدوروں پر فی زمانہ جیسی جابرانہ طاقت سرمایہ داروں کی قائم ہے باقی نہ رہے گی۔ دنیا سے جنگ و جدل کا نام حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ کیوں کہ شہنشاہیت (Imperialism) اور سرمایہ داری (Cappitalism) ہی گذشتہ جنگ عظیم کا باعث تھے۔ ہر ملک میں کثرت پیداوار کے باعث غیر ملکی بازاروں کے لئے جدوجہد اور تنازعات شروع ہوئے اور بین الاقوامی ٹرسٹ پیدا ہو گئے۔ دنیا کا اقتصادی بٹوارہ ہونے لگا۔ بازار ہوس گرم ہوا اور بالآخر سرمایہ داری پر مبنی سیاسی نظام نے عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کی۔ بظاہر شہزادہ آسٹریا کا قتل جنگ کا بہانہ ٹھہرایا گیا۔ علمبرداران اشتمالیت اپنے نصب العین میں کامیابی حاصل کرنے کا

---

[۱] فرانس میں اشتمالیت نے نرم صورت اختیار کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا ہے۔

ذریعہ یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ کل دنیا میں اپنے نظریے کو مشتہر کریں۔ اور مزدوروں کو متحد کرکے سرمایہ داروں اور دوسرے امتیازی طبقوں کے خلاف جنگ کریں۔ وہ جبر و تشدد اور قتل و خون بھی حصول مدعا کے لئے واجب قرار دیتے ہیں۔ احتیاطاً ہم کو یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ اشتمالیت کا یہ نظریہ بانیان اشتمالیت کا ہے مگر وہ خود بھی اس پر پوری طرح عمل پیرا نہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ گو اصولاً اشتمالیت کا نظریہ بین الاقوامی ہے؛ تاہم روس جدید خود حقیقتاً قومیت کی تنگ نظری سے پاک نہ ہوسکا۔ بلکہ اصول کی آڑ لے کر وہ خود ملک گیری کی ہوس پوری کرنا چاہتا ہے۔

اصولاً اشتمالیت کا نقطۂ نظر بین الاقوامی اور عالمگیر ہے (Cosmopolitan) ہے اس کے برعکس فاسیت اور اس سے مستخرج نازیت کا فلسفہ سخت گیری کے ساتھ قومی ہے فاسیت اور نازیت کا فلسفہ اشتمالیت اور جمہوریت دونوں کا حریف ہے اُن کا سیاسی نظام آمریت (Dictatorship) ہے دونوں نظریے عدم حکومت کے خلاف ہیں اور عنان حکومت سینکڑوں پارلیمنٹری نمایندگان کی بجائے ایک ایسے ذمہ دار شخص کے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں، جس پر قوم کی ہر جماعت کو اعتماد کلی ہو اور جس نے اپنے ایثار، حب الوطنی، دور اندیشی اور تدبر کی بدولت افراد قوم کے دلوں کو مسخر کرلیا ہو۔ اشتمالیت حکومت (State) اور مذہب دونوں کی دشمن ہے مگر فاسیت اور نازیت، گو اُن کا سیاسی فلسفہ مذہب کے قطعی خلاف ہے، مصلحتاً مذہب کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتے بلکہ مذہب کی ناگزیر طاقت اپنے سیاسی مفاد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی انھیں یہ بھی گوارا نہیں کہ مذہب کسی طرح بھی آمریت کے خلاف سیاسی معاملات میں دخل اندازی کرے۔ چنانچہ آسٹریا اور اسپین جیسے ممالک میں جہاں ہمیشہ مذہب کا حکومت پر اثر رہا ہے اشتمالیت اور فاسیت کے خلاف جذبات برانگیختہ ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آسٹریا میں تو حکومت پر کیتھالک پادریوں نے تصرف حاصل کرلیا ہے اور وہی لوگ چانسلر نامزد کرتے ہیں اسپین میں کلیسائی عہدہ داروں کے علاوہ تمام مخالفین اشتمالیت نے مل کر موجودہ حکومت کے خلاف (جو اشتمالیت کی پیرو ہے بغاوت

کررہی ہے۔

بہرحال تمام یورپ بہ لحاظ اصول تین فریقوں میں منقسم ہے (۱) علمبرداران جمہوریت (۲) علمبرداران اشتمالیت، (۳) علمبرداران نازیت و فاسیت یعنی جرمنی و اٹلی مع اُن ملکوں کے جن کے لئے عہد نامہ ورسیلز کا صلح نامہ ناموافق رہا ہے۔ یعنی آسٹریا۔ ہنگری، پرتگال اور بعض بلقانی ریاستیں چنانچہ اسپین کی موجودہ خانہ جنگی دراصل حامیانِ اشتمالیت اور اُن کے مخالفین کے درمیان ہے۔ حامیانِ اشتمالیت یعنی موجودہ حکومت اسپین کو روس اور باغیوں کو جرمنی اور اطالیہ خفیہ طور پر مدد پہنچا رہے ہیں۔ یہ خیال بھی درست نہیں کہ اقوام یورپ کی فرقہ بندی محض اختلاف نظریات پر مبنی ہے، انگلستان جو ہرگز اشتمالیت کو نگاہ التفات سے نہیں دیکھ سکتا، اس اشتمالیت کے علمبردار، روس اور فرانس کی موجودہ اشتمالیت پسند حکومت سے سیاسی مراسم قائم کئے ہوئے ہے۔ بین الاقوامی اخلاقیات کا یورپ میں خاتمہ ہو چکا ہے ہر ملک اور ہر جماعت میں نفسی نفسی پڑی ہے۔ اطالیہ نے حبش کو ہضم کر لیا گذشتہ جنگ کی فاتح اقوام اپنے مال غنیمت پر قابض رہنا چاہتی ہیں اور جو بین الاقوامی صورت حالات صلح نامہ ورسیلز کے ذریعے پیدا کر دی تھی اسے بدستور قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ محروم جرمنی پھر اپنی نو آبادیات واپس لینا چاہتا ہے بلکہ توسیع تجارت اور نو آبادیات کا خیال چھوڑ کر وہ تسخیر ملک کی آرزو میں سرحد جرمنی سے نزدیک ہی توسیع مملکت کے منصوبے باندھ رہا ہے۔ رائن لینڈ (Rhineland) پر اپنا فوجی تسلط جما ہی چکا ہے، علاقہ سار جو جنگ عظیم کے بعد مجلس اقوام (League of Nations) کے ماتحت کر دیا گیا تھا وہ بھی اسے عوام کے استصواب[1] رائے کے ذریعے ۱۹۳۵ء میں واپس مل چکا ہے۔ مگر وہ علاقہ جو مشرقی پروشیا کو مغربی حصے سے علیحدہ کرتا ہے اور جو پولینڈ سے ملحق، قائم کیا گیا تھا تاکہ اسے سمندر کے لئے راستہ مل جائے اس پر اسے (جرمنی کو) از سرِ نو قبضہ حاصل کرنا باقی ہے مگر اب جرمنی پر قانع رہنا نہیں چاہتا اسے اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے توسیع تجارت و مملکت کی ضرورت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فرانس کی مشرقی سرحد میں دخل اندازی بے سود ہوگی۔ کیونکہ فرانس نے (Maginot line) کے ذریعے

---

[1] Plebiscite

سرحد مشرقی کو ناممکن التسخیر بنالیا ہے اس لئے اس کی نگاہیں روس کے زرخیز خطۂ گندم و معدنیات یوکرین (Ukraine) سائبیریا (Siberia) اور یورال (Ural) پر لگی ہوئی ہیں۔ جرمنی اور فرانس کی دیرینہ مخاصمت ہے۔ فرانس جرمنی کی ہر حرکت سے چونکتا ہے۔ کیونکہ پچھلے ستر سال کے اندر جرمنی فرانس پر دو مرتبہ یعنی سنہ ۱۸۷۰ء اور سنہ ۱۹۱۴ء میں حملہ آور ہو چکا ہے۔ رائن لینڈ (Rhineland) سے جرمنی کا فوجی تسلط جو فرانس کو جنگ کے بعد مامون و محفوظ رکھنے کے لئے صلح نامہ ورسیلز کی رو سے اٹھوا دیا گیا تھا۔ اس پر جرمنی نے فوجی تسلط جما ہی لیا ہے۔ فرانس بھی جرمنی سے خوف زدہ ہو کر دوسرے ملکوں سے دوستانہ مراسم پیدا کرنا چاہتا ہے۔ برطانیہ کو جو یورپ کی سب سے زیادہ زبردست قوم ہے فرانس ہر طرح سے اپنا رفیق بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ گو برطانیہ جس کے ہاتھ میں سیاسیات یورپ کی کلید ہے۔ فرقہ بندی سے بالاتر اپنے لئے ثالث کی حیثیت برتنا چاہتا ہے۔ مگر اس نے یہ بھی بخوبی محسوس کر لیا ہے کہ اس کے رعب و دبدبہ کو کافی دھکا پہنچ چکا ہے وہ پنچ کی حیثیت اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جب اپنی جنگی طاقت خوب بڑھا لے چنانچہ اس نے اسلحہ جنگ میں اضافہ کی پالیسی پر عمل شروع کر دیا ہے۔ فرانس کا دوسرا رفیق بروئے معاہدۂ لوکارنو بلجیم ہے مگر اس اندیشے سے کہ فرانس نے روس سے جرمنی کے خلاف معاہدہ کر لیا ہے اور جرمنی اور روس کے مابین جنگ چھڑنے پر، وہ بھی گھسٹ جائے گا۔ بلجیم معاہدۂ لوکارنو کے عہد و پیمان سے۔ کسی قدر آزاد ہونا چاہتا ہے۔ جرمنی کے خلاف سب سے زبردست سیاسی چال روس و فرانس کا معاہدہ ہے، جو حال ہی میں طے ہوا ہے۔ اس سے فرانس بہت کچھ مطمئن ہو گیا ہے کہ اگر جرمنی نے سرحد فرانس پر حملہ کیا تو عقب سے روس جرمنی پر حملہ آور ہو جائے گا۔ اس طرح جرمنی دو شکنجے میں پھنس گیا ہے۔ جرمنی نے اس پیچ کے خلاف پینترہ بدلا تو جاپان سے روس کے خلاف معاہدہ کر لیا جاپان اور روس ویسے ہی ایک دوسرے سے بدظن ہو رہے تھے اس طرف اگر جنگ چھڑ گئی تو روسی طاقت کو دو طرفہ عمل پیرا ہونا پڑے گا۔

جرمنی نے خوب محسوس کر لیا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کو اپنا رفیق و ہمدم بنائے بغیر

توسیع مملکت کے مدعا میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس نے اطالیہ کو اپنایا ہے۔ ملک حبش پر اطالوی سلطنت کا اعتراف اول اول جرمنی ہی نے کیا تھا۔ اطالیہ کی دوستی جرمنی کے لئے ایک زبردست قوم کی دوستی ہے سیاسیات یورپ کی کلید اس وقت اٹلی اور برطانیہ کے ہاتھوں میں ہے۔ فرانس بھی اٹلی کو اپنانا چاہتا ہے اور اسی وجہ سے اس نے اطالیہ اور حبش کی جنگ کے موقع پر مجلس اقوام کو اطالیہ کے خلاف عملی طور پر سخت رویہ اختیار کرنے سے باز رکھا۔ اطالیہ بھی فرانس کے اس سلوک کو مانتا ہے۔ اور یقین ہے کہ وہ جرمنی و فرانس کے معاملے میں فرانس کو دھوکا نہ دے گا۔ گو یہ امر مسلمہ ہے کہ اس خفیہ معاہدہ کے مطابق جو جرمنی اور اطالیہ کے مابین ہو چکا ہے اٹلی جرمنی کو اس کی غارت گری اور چھین جھپٹ میں مدد دے گا۔ چونکہ جرمنی نے ملک حبش پر اطالوی سلطنت کو تسلیم کیا اس لئے اطالیہ بھی جرمنی کے ساتھ "من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو" کے اصول پر برتاؤ کرے گا۔ دونوں سیاسی نقطۂ نظر سے ہم مشرب ہیں دونوں اشتمالیت کے حریف ہیں دشمن کا دشمن بھی ایک لحاظ سے دوست ہوتا ہے۔ اس رشتہ سے بھی جرمنی اور اطالیہ دوست ہیں۔ نیز اطالیہ یہ بھی چاہتا ہے کہ جرمنی کی حرکات کے سامنے اس کی حرکات تھی پس پشت پڑ جائیں اور ممالک یورپ کی توجہ جرمنی ہی کی طرف مبذول رہے اور حبش کے ساتھ اس کے مظالم کا واقعہ فراموش ہو جائے۔

یہ بات بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ جرمنی اور اطالیہ کے کچھ اغراض و مقاصد رقیبانہ ہیں۔ ہٹلر نے جرمنی کو خالص النسل بنانے کے خیال سے یہودیوں کو بے رحمی کے ساتھ نکال باہر کیا اور جرمنوں کو ایک جھنڈے کے نیچے متحد کر دیا۔ وہ جرمن۔ آسٹریا کو بھی اس جھنڈے کے نیچے لانے کا آرزومند ہے۔ مگر اطالیہ باوجود اس کے کہ جرمنی کا ہم مشرب و رفیق ہے۔ یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کا پڑوسی اتنی زیادہ طاقت پکڑ جائے۔ مگر چونکہ جرمنی کو اطالیہ کی رفاقت درکار ہے لہذا اس نے اطالیہ کو خوش رکھنے کے لئے اس کے ساتھ اس معاملے میں اطمینان بخش سمجھوتہ کر لیا ہے۔

جرمنی، بلقان کی مختصر ریاستوں، آسٹریا، ہنگری اور پولینڈ کے ساتھ شفقت دکھا کر یگانگت پیدا کر رہا ہے۔ تاکہ روس کے لئے اس کا راستہ صاف رہے۔ بلقان کی ریاستیں غیر منظم ہیں اور اُن کی اقتصادی حالت بھی بہت خراب ہے۔ اُن پر جرمنی کی شفقت اپنا کام کر جائے گی۔ اطالیہ بھی اس چال میں جرمنی کی تقلید کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ بحر قلزم میں بلا شرکت غیرے تصرف چاہتا ہے۔

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اسپین کی ملکی لڑائی میں روس حکومت اسپین کو جو اشتمالیت کی حامی ہے در پردہ مدد دے رہا ہے۔ جرمنی اور اطالیہ باغیوں کی خفیہ اعانت کر رہے ہیں۔ مگر حقیقتاً یہ فرقہ بندی نظریوں کے اختلاف (Difference of Ideals) کی بنا پر نہیں بلکہ سیاسی حرص و ہوا پر قائم ہے۔ باغیوں کے پیشوا جنرل فرانکو نے اطالیہ سے خفیہ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ اسے سیوٹا (Ceuta) اور (Balearies) دے دے گا۔ اس طرح بحر قلزم کی حیثیت اطالوی بحر کی ہو جائے گی۔ جرمنی کو بھی فرانکو نے جزائر (Morocco) اور کناری (Canary) دینے کا وعدہ کر لیا ہے اور اس طرح جرمنی، افریقہ یا جنوبی امریکہ میں تسخیر نوآبادیات کے لئے (Canaries) کو بحری بنیاد (Naval Base) بنائے گا۔

برطانیہ یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اطالیہ بحر قلزم کا اجارہ دار بن جائے۔ چنانچہ اطالیہ نے برطانیہ کو چیں بہ جبیں دیکھ کر اس سے بحر قلزم میں صورت حال بدستور قائم رکھنے کا معاہدہ کر لیا ہے۔ بہر حال جرمنی، اسپین اور اطالیہ کی دوستی سے بحر قلزم پا اقتدار حاصل کرے گا۔ جرمنی اپنی محبت کی کمند میں ٹرکی کو بھی لانا چاہتا ہے۔ جیسے برطانیہ نے پہلے ہی کثیر رقم بطور قرض دے رکھی ہے۔ مگر کمال پاشا جمعیت الاسلام کو خواہ مخواہ بلا مطلب کیوں پھیلانے لگا۔ یہ بھی درست ہے کہ فلسطین میں عربوں کی بغاوت سے کچھ اسلامی ریاستوں کی ہمدردی انگلستان کے ساتھ باقی نہیں رہی۔ گو انگلستان نے اعلان بالفور پر جو عرب باغیوں کی تندی کم کرنے کے متعلق کیا گیا تھا عمل کرنے سے گریز کیا ہے

ہٹلر آمر جرمنی نے دوسرے ممالک سے رفاقت پیدا کرنے کے علاوہ یہ بھی احتیاط رکھی کہ ملک

میں خانہ جنگی کا احتمال نہ رہے چنانچہ اندرون ملک افراد قوم کو ایک شیرازہ میں باندھ دیا ہے پروپیگنڈا کے ذریعے نوجوانان جرمنی کے دلوں میں اشتمالیت کے خلاف جذبات مشتعل کرتا رہتا ہے اور روس کو جرمنی کا خونخوار دشمن ظاہر کرکے اس بات کا یقین دلاتا رہتا ہے کہ روس کے دانت جرمنی پر ہیں اس نے ہر فرد قوم کے دل میں حب وطن کے ایسے جذبات پیدا کر دئے ہیں کہ ہر شخص اپنے وطن جرمنی پر شہید ہونے کے لئے تیار ہے جنرل گوئرنگ کا بیان ہے کہ جرمنی کی موجودہ طاقت اس طاقت سے زیادہ ہے جو اسے گذشتہ جنگ کے آغاز میں حاصل تھی۔

جرمنی ہر چار طرف سے طاقتور حکومتوں سے گھرا ہوا ہے اس کا حوصلہ سو سال سے اپنے کو ایک طاقت ور ملک بنانے کا رہا ہے اور اس تمام مدت میں اسی مدعا کے حصول کے لئے ہمہ تن مصروف رہا ہے بسمارک کی سعی جمیل نے جرمنی کو قوم بنایا۔ قیصر ولیم دوم کی کوشش بلیغ سے جرمنی کو سمندر پار نوآبادیات حاصل ہوئیں۔ پھر جرمنی کو اپنی سرحد سے قریب ہی یورپ میں توسیع مملکت کی فکر دامن گیر ہوئی۔ جرمنی کے ہر سربرآوردہ اور ممتاز باشندے نے جذبۂ حب الوطنی کے زیر اثر ہر ممکن خدمت سرانجام دی اور اس ملک نے اپنے اندر وہ طاقت پیدا کرلی جو تمام یورپ بلکہ کل دنیا کو ہلا دینے کے لئے کافی تھی اور جس نے فی الواقع ایسا ہی کیا۔ گو بدنصیبی سے جرمنی کو جنگ عظیم میں شکست ہوئی تاہم اسے اپنی طاقت پر پورا بھروسا تھا اسے گمان بھی نہ تھا کہ چاہ کن را چاہ در پیش کی مثل اس پر صادق آئے گی صلح ورسیلز کے بعد فاتحوں نے یہی سمجھ لیا تھا کہ جرمنی کی طاقت ہمیشہ کے لئے ختم کر دی گئی۔ مگر صورت حال اس کے برعکس ہوئی۔ چنانچہ جرمنی کا فتنہ پھر پوری طاقت کے ساتھ اٹھ رہا ہے۔

یورپ کی یہ سازشیں اور بندشیں دیکھ کر امریکہ کی جمہوری ریاستوں نے بھی متحد ہو کر معاہدہ کر لیا ہے کہ اگر بین الاقوامی سیاسیات میں کوئی بے عنوانی عمل میں آئی تو وہ بعد مشورہ متفقہ طور پر عمل پیرا ہوں گی۔ جاپان بھی بے دھڑک جنگ کے لئے مستعد ہے۔ ملک چین کے ساتھ اس کا ظلم تاریخی واقعہ ہو چکا ہے۔ جاپان جنگ سے ایسا خائف نہیں جیسا کہ وہ فاتح و غیر فاتح ممالک جنہیں جنگ عظیم کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔

جنگ عظیم سے پہلے ہر ملک غیر ممالک کے بازاروں پر تصرف پانے کی جدوجہد میں سرگرداں اور کچے مال کے لئے تسخیر نوآبادیات کی فکر میں مبتلا تھا۔ اپنے مفاد اور خود غرضی کے سامنے بُرا بھلا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ جنگی طاقت بڑھانے کے خبط میں کثیر رقم اسلحہ جات کے اضافے میں صرف کی جا رہی تھی۔ سراجاوو (Serajavo) کا سانحہ جنگ کا بہانہ تھا۔ اب سیاسی دنیا میں پھر وہی صورتیں نمودار ہو رہی ہیں۔ پھر ویسی ہی بین الاقوامی فرقہ بندیاں ہو رہی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ نہایت کے علمبردار جماعتی جنگ کا بندوبست کر رہے ہیں۔ بین الاقوامی تنازعات کے ساتھ ساتھ جماعتی تنازعہ کی صورت بھی زور پکڑ رہی ہے ایک طرف اشتمالیت کا طوفان دنیا بھر میں چھا جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسری طرف فاسیت کی آندھی چل رہی ہے۔ مغرب میں نہیں بلکہ کل دنیا میں یہ دونوں ایک دوسرے کی حریف و مقابل ہو کر پھیل رہی ہیں۔ چین میں اشتمالیت کے جھونکے چل رہے ہیں تو جاپان میں فاسیت کی لہر غالب ہو رہی ہے۔ دنیا کی چند امن پسند ہستیاں صلح قائم رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مگر اُن کی صدا اس نقار خانے میں کون سنتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا جنگ ناگزیر ہے؟ سیاسی مطلع ابر آلود ہے۔ جنگ کے بادل گھنے اور سیاہ ہیں۔ گمان غالب ہے کہ خون کی بارش ہوگی اور موسلا دھار۔ سائنس کی پجاری دنیا نے جنگ کے لئے نئی نئی ایجادیں کی ہیں زہریلی گیسیں ایجاد ہوئی ہیں جو اپنی کرامات حبش اور اطالیہ کی جنگ میں دکھا چکی ہیں۔ جنگ میں اب فوجی و شہری آبادی کا امتیاز اور بچے بوڑھے عورت، مرد، تندرست، بیمار کا فرق بھی اُٹھ گیا ہے۔ سیاسی رہنما بین الاقوامی اخلاقیات کا قلع قمع کر کے نیا سبق پڑھا رہے ہیں۔ ہٹلر، مسولینی اور اسٹالین نے صاف صاف الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ حصول مدعا کے لئے ہر ذریعہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ نیک و بد کا سوال بقول اُن کے، مدعا سے وابستہ ہے نہ کہ ذریعے سے۔ پس ان کا طریق عمل یہ ہے کہ سیاسی عروج اگر دوسری معصوم قوم کا گلا گھونٹ کر بھی حاصل ہو تو مضائقہ نہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ یورپ کی سب سے زبردست طاقت برطانیہ مجلس اقوام کے ذریعہ جنگ کو روکنا چاہتی ہے۔ مگر ہٹلر اور مسولینی اس کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجلس اقوام اس وقت بنی تھی

جب برطانیہ معراج پر پہنچ چکا تھا چنانچہ ہم بھی اپنی سیاسی تکمیل کر لیں پھر مجلس اقوام کے ذریعہ کوشش کریں گے کہ دنیا میں جنگ کی راہ مسدود ہو جائے گویا مجلس اقوام کا مدعا یہ قرار پایا کہ دنیا کی طاقت ور قومیں اقتدار حاصل کر کے کمزور مظلوم و محروم ملکوں کو جبراً و قہراً پست حالت میں رکھیں اور وہ طوعاً و کرہاً رہیں۔ اس طرح طاقت ور قوموں کا اقتدار ہمیشہ قائم و باقی رہے مجلس اقوام کا یہی رویہ رہا بھی ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا تھا۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند   بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

یہی وجہ ہے کہ باوجود اس مصمم ارادے کے کہ دنیا میں اب پھر جنگ نہ ہو مجلس اقوام امکانات جنگ کا خاتمہ کرنے سے معذور رہی۔ محروم و غیر آسودہ ملکوں نے بالآخر زور پکڑ کر اپنے ملکوں کو بھی کامیاب طاقتوں کے دوش بدوش لانے کی کوشش عملی طور پر شروع کر دی ہے اور وہ ہر ممکن ذرائع بے دریغ استعمال میں لانا چاہتے ہیں (Concert of Europe) بھی ان ہی وجوہات سے ناکام رہا اور (Holy Alliance) پائدار ثابت نہ ہو سکا۔

یورپ سے قطع نظر مشرق بعید میں بھی جنگ کے امکانات روز بروز قوی تر ہوتے جاتے ہیں مسٹر جی سٹین اپنی تصنیف "مشرق بعید حالت ہنگامہ میں" (Far East in Ferment) کے آخر میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عالم گیر جنگ جس کے مغرب میں چھڑ جانے کے بہت امکانات ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مشرق میں چھڑ سکتی ہے۔ مشرق میں جنگ کے بادل بحر الکاہل کے نیم اجارہ دار اولوالعزم ملک جاپان سے (جس نے اپنے اندر جرمنی اور اطالیہ کی طرح قومی خود غرضی اور ملک گیری کا امتزاج پیدا کر لیا ہے) اٹھ کر امن مشرق کے افق پر منڈلاتے نظر آ رہے ہیں۔ فاسیت اور نازیت کے ظہور نے دنیا کی طاقتوں کی توجہ یورپ کی طرف مبذول کر کے انہیں جاپان کی طرف سے کسی قدر بے توجہ کر دیا ہے۔ یہ حالات جاپان کے حق میں مفید ثابت ہو رہے ہیں اور وہ زور پکڑ رہا ہے۔ جاپان اور روس کے مابین جو بد ظنی تھی جرمنی اور جاپان کی دوستی اور خفیہ معاہدہ کے بعد سخت دشمنی کی صورت میں مبدل ہو گئی انقلاب روس سے قبل حکومتِ زار کا حوصلہ بحر الکاہل میں مکمل اختیارات حاصل کرنے کا تھا۔ ادھر

جاپان کی آرزو ہے کہ مشرق بعید کی سیاسیات کی کلید اس کے ہاتھ میں رہے۔ برطانیہ اور امریکہ کو جو دخل چین کی تجارت میں حاصل ہے اس کی بنا پر وہ جاپان کا یہ حوصلہ گوارا نہیں کرسکتے۔ اور اس لئے اُن کی متفقہ حکمت عملی یہی ہے کہ وہ چین کو اپنی قوت بڑھانے میں پوری مدد دیں اور جاپان کی توسیع کی باڑھ اس ذریعے سے روکیں۔ امریکہ کو تو بنیاما کے حصار میں اور ہوائی اور منیلا کے جہازی بیڑے کے زور پر بحرالکاہل میں آزادی قائم رکھنے کی کسی قدر قدرت حاصل ہے۔ مگر برطانیہ کو مشرق بعید میں اتنا زور حاصل نہیں۔ چنانچہ وہ اس کمی کو اپنی نعم البدل خارجی پالیسی سے پورا کر رہا ہے۔ ادھر امریکہ نے جاپان کی جملہ تجاویز بابت نوآبادیات واقع جزیرہ ہوائی و مغربی ساحل مسترد کر دیں ادھر جاپان مانچوکو اور سوویٹ یونین کے مابین (بروئے صلح نامہ چین و زار روس) قائم شدہ سرحد کے تسلیم کرنے سے منکر ہے۔ روس اور جاپان کے تنازعہ سے قطع نظر چین بھی جاپان کی مزید دست درازی کے مقابلے کے لئے اپنی طاقت کو منظم اور ترقی پذیر بنا رہا ہے۔ مگر جاپان کی آبادی بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے اس کی ضروریات میں اضافہ ہو رہا ہے اور اسے مالی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ مانچوکو بجائے اس کے کہ جاپان کی اہم کمیوں کو پورا کرتا متعدد صیغوں میں اسکا حریف ثابت ہو رہا ہے جاپان بھی مجبور ہے کہ شمالی چین کو اپنے اقتصادی حیطہ میں شامل کرے۔ کیونکہ شمالی چین کا مخالف رہنا ریاست مانچوکو کو بھی فوجی نقطہ نگاہ سے خطرناک بنا دے گا۔ الغرض مشرق بعید میں بھی لوازمات جنگ مہیا ہیں۔ آتش زدگی کا سامان ہو چکا ہے۔ بس ایک چنگاری کی کسر رہ گئی ہے

"زمانہ"

عشق مٹتا اور مرتا ہی رہا
حسن بنتا اور سنورتا ہی رہا

عشق کارِ عشق کرتا ہی رہا
گو بظاہر وہ نہ کرتا ہی رہا

جمع خاطر کوئی کرتا ہی رہا
دل کا شیرازہ بکھرتا ہی رہا

کوئی جیتا، کوئی مرتا ہی رہا
عشق اپنا کام کرتا ہی رہا

غم وہ میخانہ کمی اس میں کہاں
دل وہ پیمانہ کہ بھرتا ہی رہا

حسن تو تھک بھی گیا لیکن یہ عشق
کارِ معشوقانہ کرتا ہی رہا

وہ مٹاتے ہی رہے لیکن یہ دل
نقش بن بن کر ابھرتا ہی رہا

کچھ نہ دیکھا پھر جنونِ عشق نے
سرد سرد آہیں وہ بھرتا ہی رہا

دل کی دھڑکن آہ سب کچھ کہہ گئی
دل کو میں خاموش کرتا ہی رہا

تم نے نظریں پھیر لیں تو کیا ہوا
دل میں اک نشتر اترتا ہی رہا

وہ جلاتے ہی جلاتے رہ گئے
دل کو مرنا تھا سو مرتا ہی رہا

تنقید و تبصرہ

کتب :-

سویٹ روس کا نظام کار | تصنیف مسٹر ایچ ، این ، بریلز فرڈ ، ایم ، پی ۔
مترجمہ مولانا مظہر علی اظہر ، ایڈوکیٹ ، ہائی کورٹ ، لاہور ، ایم ، ایل ، سی ۔

روس میں انقلاب کے بعد جب قدرے سکون ہوا تو غیر ملکوں سے بہت سے لوگ جنھیں سوشلزم سے لگاؤ تھا نئے نظام کا معائنہ کرنے کے لئے روس پہنچے بعض نے انقلاب کو ناکامیاب یا سوشلزم یا انسانی آزادی اور ترقی کے بہترین اصولوں کے خلاف پایا۔ بعض نے انقلابیوں کی ہمت افزائی اور نئی زندگی کی خوبیاں واضح کرنا مناسب سمجھا۔ مسٹر بریلز فرڈ آزاد خیال اور نئی زندگی کی طرح ڈالنے کے حامی تو ہیں مگر کمیونسٹ نہیں ہیں ، اور انھوں نے کتاب میں اعتدال اور انصاف کا بہت خیال رکھا ہے ، اس لئے وہ مطالعہ کی خاص طور پر مستحق ہے ۔

افسوس ہے اردو کا یہ ترجمہ اصل تصنیف کے آٹھ سال بعد شائع ہوا ہے۔ جب روس کی حالت بہت کچھ بدل گئی ہے ۔ اور اس کے بارے میں مسٹر بریلز فرڈ کی رائے معلوم کرنا زیادہ تر تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے ۔ لیکن چونکہ اندیشہ اس کا ہے کہ روس کی موجودہ حالت کا پتہ ہمیں کچھ نہیں تو پانچ چھ برس بعد تک نہ ہوگا اس لئے اس ترجمے کو غنیمت سمجھنا چاہئے ۔ ہندوستان میں جو لوگ زندگی کے آئین کو بدلنا چاہتے ہیں اُن کا خاص طور سے فرض ہو جاتا ہے کہ روس کے تجربے کا غور سے مطالعہ کریں۔

(م ، ج)

Studies in the Quran | مصنفہ پروفیسر اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم اے
چھوٹی تقطیع ، صفحات ۲۰۰ ، صاف اور خوشنما انگریزی ٹائپ ۔ قیمت آٹھ آنے

ناشر:- (The Federation of Internatinel Fellowships, "Maitri" Kilpauk (Madras)

پروفیسر قریشی کی یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامعیت کے ساتھ مذہب اسلام کا ایک صحیح اور مکمل خاکہ پیش کرتی ہے۔ کتاب کی ترتیب میں ایک خاص جدت پائی جاتی ہے۔ کتاب کے مطالب کو اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے چھ ہفتوں پر پھیلایا گیا ہے اور پھر ہر ہفتہ کے ساتوں دنوں کے لئے ایک ایک بحث کو مخصوص کر دیا گیا ہے۔ پہلا ہفتہ وحدت کے لئے، دوسرا رسالت کے لئے، تیسرا ارکان اسلام کے لئے، چوتھا انسان اور اس کی انفرادی ذمہ داریوں کے لئے، پانچواں نظام اجتماعی کے لئے، اور چھٹا ملت اسلامی کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ مثلاً نظام اجتماعی کے ہفتہ کے سلسلے میں عورت شادی، زن و شوہر، اسلامی شادی کے چند پہلو، خاندان، ہمسایہ، معاشرتی تعلقات کی بنیاد .... یہ سات عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور ہر دن کے لئے ایک بحث کو مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ملت اسلامی کے سلسلہ میں سات عنوانات کے ماتحت بحث کی گئی ہے یعنی تنظیم ملت معیاری، اس ملت کا مقصد، اسلام کی تبلیغ، تلوار کا استعمال، جہاد اور امن۔ واعظ اور مبلغ کے لئے یہ ترتیب خاص طور پر مفید ثابت ہوگی۔ عام مسلمانوں کے لئے بھی جو اپنے ایمان کو مستحکم اور صحیح بنیاد پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ کتاب کا اس ترتیب کے ساتھ روزانہ مطالعہ موجب استقامت اور خیر و برکت ہوگا۔ طرز بیان میں مغربی انداز پایا جاتا ہے جس سے جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے کتاب میں دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ کتاب میں ہر جگہ قرآن کریم کی آیتوں سے کثیر تعداد میں شہادتیں فراہم کی گئی ہیں۔ عبارت اور ترجمہ بہت صاف اور سلیس ہے۔ ہر انگریزی داں مسلمان کو اس کتاب کا ایک نسخہ اپنے پاس ضرور رکھنا چاہئے۔ اور تمام ایسے غیر مسلموں کے لئے جو اسلام سے متعلق مختصر مگر جامع معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

(م، ع)

سوزِ ناتمام | مصنفہ جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی، بی اے، ایل ایل بی وکیل، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۲۰۴ صفحے، ملنے کا پتہ: دفتر ادبی دنیا، لاہور۔ قیمت ایک روپیہ عہ

یہ مختصر افسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اندر کے ٹائٹل پر نہ جانے بھولے پن سے یا غلطی سے لکھ دیا گیا ہے کہ یہ مجموعہ دلآویز ہے۔ مصنف کے پیش لفظ میں افسانہ نویسی کی اہمیت اور انشاء پردازی کے نصب العین پر بحث کی گئی ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ اور ان افسانوں میں آدمیوں اور واقعات کی زبانی زندگی کی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن افسانے پڑھ کر بہت مایوسی ہوتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے وہ ان عامیانہ افسانوں سے بہتر نہیں جن سے آج کل کے رسالے بھرے ہوتے ہیں۔ اور طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے باریک نقش کھینچنے کے لیے مصنف کے قلمدان میں قلم نہیں۔ وہ ساری تصویر اپنے ایک ہی موٹے قلم سے بنانا چاہتے ہیں۔ (م ، ج)

راز | مرتبہ جناب علی احمد صاحب (عثمانیہ) ناشر محبوبیہ کارخانہ جلد سازی، حیدرآباد دکن تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۰۹ صفحے۔ قیمت ۵ر

افسانوں کا یہ مجموعہ "سلسلہ داستاں گو" کا ایک نمبر ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ مجموعے کے بعض افسانے ترجمے ہیں، بعض طبع زاد، لیکن سب دلچسپ ہیں اور زبان بھی اچھی ہے۔ عبدالرشید صاحب قریشی، سال اول (عثمانیہ) کا افسانہ "ردِّ عمل" ہمیں خاص طور پر پسند آیا۔ جو افسانے کہ ترجمے ہیں اُن کی اصل کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ یہ بات قابل اعتراض معلوم ہوتی ہے۔ پھر محبوبیہ کارخانے نے کتاب کے اندر صفحہ ۶۹ پر "اظہارِ حقیقت" کے عنوان سے اپنا اشتہار دیا ہے۔ جس سے ہمارے خیال میں کتاب کی توہین ہوتی ہے رسالوں میں اشتہار ہر جگہ دئے جا سکتے ہیں۔ کتاب کا زیادہ ادب کرنا چاہیے اور سوائے ان مقامات کے جہاں رواج اجازت دیتا ہو کسی قسم کا اشتہار نہ ہونا چاہیے۔

ہمیں امید ہے کہ محبوبیہ کارخانہ داستاں گو کے سلسلے کو جاری رکھے گا اور آئندہ بھی افسانوں کا انتخاب اتنا ہی اچھا ہوگا۔

(۱، ۵)

یادگار ماجد | مجلد، چھوٹا سائز، ضخامت ۰۰۱ صفحات بشمول مقدمات وتمہیدات، کاغذ دبیز، سفید، چکنا، کتابت وطباعت عمدہ، قیمت قسم عام وقسم خاص علی الترتیب عہ، عار مطبوعہ انڈین پریس، الہ آباد، مع تصویر مصنف۔

خان صاحب سید ماجد علی صاحب ماجد (المتوفی ۱۹۳۶ء) ۱۸۶۸ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے، اور اسی شہر میں تعلیم وتربیت و ملازمت اور وفات پائی! وکالت پیشہ تھے، جس کا آخری ارتقار گورنمنٹ پلیڈرشپ اور خطاب خانصاحبی تھا! مذہباً شیعہ تھے اور نتیجتاً ہوشمند، حالِ جہاں وقت۔ وسیع المشرب تھے، اگرچہ طویل وبیخ گیر اثرات وراثت کے خمیازے میں بعض فرسودہ مراسم محرم کے عامل بھی تھے۔ عموماً ایک شریف وخلیق ومہذب، شائستہ اور خوش باش ومرنجان ومرنج انسان تھے، جدید تعلیم پائی تھی اور اُن کا زمانۂ حیات کم وبیش دورِ جدید کے اندر داخل تھا۔ تاہم عہدِ نو کی چند غلط اندازکرنیں ہی تھیں جو اُن پر پڑی تھیں! اردو شاعری میں اُن کا مجموعہ غزلیات اک تانگی کا تنفس ضرور رکھتا ہے۔ لیکن بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ادبیات کی "نشاۃ ثانیہ" کا کوئی نجیب الطرفین مولود نہیں۔ وہی غزلیں ہیں، نرم نہیں تو گرم، تاہم غزلیں، اور عموماً غزلیں! نئی زندگی کا ایک خفیف تاثر ان میں ضرور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تاہم وہ کوئی قومی انقلابی جادو نہیں۔ نہ اس کی پیداوار کوئی جدید ونادر تخلیق ادب کہی جا سکتی ہے! پنڈت منوہر لال زتشی کا مقدمہ اک "دوستانہ تقریظ" سے چنداں مختلف نظر نہیں آتا! نیم بارِ دِ تغزل، رسمی اخلاقیات، وہی تفلسف روایاتی تصوف اور مبہم الٰہیات کے عناصر کسی جدید ادبیت وثقافت کے ساز وبرگ نہیں بن سکتے! ہم باادب اس اس معتدل تلخ نوائی پر مجبور ہیں! زیادہ سے زیادہ حضرت ماجد کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ راسخ الاعتقاد اردو غزل سرائی کی لوم نوائی کا آہنگ مرگ ذرا مضمحل پڑ گیا ہے اور بس، ہنوز دلی بسیار دور است!

(ا، س، خ)

باده سخن (الف)، کیف سخن (ب)، متاع سخن (ج) | ہر جلد کی ضخامت کم و بیش سوا سو صفحات
چھوٹا سائز، کاغذ معمولی سفید، کتابت و طباعت بدرجہ اوسط قیمت ہر جلد ۱۲/ مطبوعہ
اسٹیم پریس حیدرآباد۔

یہ حیدرآباد کے تین جدید العہد شاعروں کے مجموعہ کلام ہیں جن کی ترتیب جناب
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے قلم سے عمل میں آئی ہے۔ ہر مجموعہ اک معیاری قامت و ضخامت
پر مبنی ہے اور مندرجہ ذیل عناصر و مراحل پر مشتمل۔

(۱) دکن کی اردو شاعری، (۲) تصویر شاعر متعلقہ، (۳) شاعر اور اس کی شاعری
(۴) انتخاب کلام شاعر۔

پہلی چیز پر از معلومات کاوش کا ثمرہ ہے جو نوجوان، حوصلہ مند ڈاکٹر زور کا حصہ ہے، تیسری
چیز عمیق، آشنایانہ مطالعہ و جائزہ کا نتیجہ ہے، اور چوتھی مد کا حق ادا کرنے میں بھی پوری وسعت نظر
اور ذوقِ اخذ کا ثبوت دیا گیا ہے!

حضرت مائل (صاحب باده سخن) اک قادر الکلام اور پرگو استاد ہیں، مشکل پسند
واقع ہوئے ہیں اور عموماً سنگلاخ اراضی شعر کو توڑا ہے اور بعض قدیم مسلم الثبوت اساتذہ اردو کے
تتبع کی کامیاب و قابل داد کوششیں کی ہیں۔

حضرت کیفی (موضوع کیف سخن) اک بوقلموں طبیعت کے سخن گو ہیں۔ تقریباً چار تخلص اختیار
کر چکے ہیں۔ آزاد منشی و لطیفہ سنجی اُن کے کلام پر بخط جلی لکھی ہوئی ہے اور حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے
جدید دور احیاء العلوم و نشاۃ ادب کے بلند بانگ و قوی آہنگ نقیب ہیں۔ کیفی اک جامع قال و حال
انسان تھے!۔

حضرت عزیز (متاعِ سخن) اک خوش ذوق، مستغنی المزاج، شگفتہ طبع اور مایہ دار شوکت زبان
و بیان شاعر ہیں! وہ داغ کے اک فنافی الشیخ قسم کے شاگرد ہیں! دہلوی لہجہ و محاورہ کا غیر متزلزل
اتباع اُن کا اک اور امتیاز ہے۔ (۱،۳،ن)

بیاضِ سخن | مولفہ جناب عبدالشکور صاحب شیدا (بتقریب سلور جوبلی شہریار دکن) تقطیع عام کتابی ضخامت ۲۰۵ صفحے، کاغذ، کتابت، طباعت اوسط قیمت غیر مجلد ۱۲؍
ملنے کا پتہ: محمد نسیم احمد نائب محاسب عدالت العالیہ حیدرآباد دکن۔

"موجدین اردو سے لے کر دور حاضر تک سلسلہ بسلسلہ اردو گو شعراء کے کلام غزلیات کا انتخاب اور ان کا اجمالی تذکرہ، نیز ہم قافیہ و ہم مضمون اشعار کا ایک ایک مجموعہ اور چند ہندی ابیات" کتاب کی علمی، ادبی، تنقیدی حیثیت محتاج بیان نہیں امید ہے کہ تاریخ ادب نیز تنقید سے ذوق رکھنے والے حضرات میں کافی مقبول ہوگی۔ (ا، س، خ)

قنوطیت یعنی فلسفۂ یاس | مصنفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، ایم اے پی ایچ ڈی، استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ، تقطیع ۲۲×۱۸، حجم ۱۱۰ صفحے، ناشر خود مصنف، قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب اس نظریۂ حیات کے متعلق ہے جو ہماری طبیعت اور ہماری شاعری کو دیکھتے ہوئے ہمارا قومی فلسفہ کہا جاسکتا ہے۔ فاضل مصنف نے ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے کہ فلسفے کے طالب العلم اور شوقیہ پڑھنے والے دونوں کتاب سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ (م، ج)

داستان | پیر لوئی کی کتاب "افروڈائٹ" کا اردو ترجمہ۔ ناشر ہاشمی بک ڈپو، ریلوے روڈ، لاہور، تقطیع ۲۷×۱۷، حجم ۲۵۴ صفحے قیمت دو روپے (۲ؔ)

یہ کتاب نہایت گندی اور بے معنی کتاب ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ کسی خوش مذاق آدمی کو ایسی کتاب اُٹھا کر دیکھنا بھی چاہئے۔ غلاظت کے کیڑے بھی ہوتے ہیں جنھیں شاید یہ غذا موافق آئے گی۔ (م، ج)

رسید کتب :-

محمدیہ پاکٹ بک | مولفہ منشی محمد عبداللہ صاحب معمار فاضل مرزائیات حجم ۰۰، صفحات تقطیع خورد

لکھائی چھپائی عمدہ ، مجلد قیمت فی نسخہ ۱۲؍
ملنے کا پتہ : شعبہ تالیف وطبع انجمن اہل حدیث برانڈرتھ روڈ ، لاہور۔
اس کتاب پر سال گذشتہ رسالہ جامعہ میں ہم تبصرہ کر چکے ہیں۔ اس کا پہلا اڈیشن فروخت ہوچکا اب دوبارہ مع جدید و مفید اضافوں کے انجمن اہل حدیث نے اس کو شائع کیا ہے۔ تقریباً ۱۰۰ صفحات بڑھائے ہیں۔ مگر تبلیغ کی غرض سے قیمت وہی رہنے دی (ا ۔ ج)

علم بدیع | مولفہ رشید احمد صاحب بالقابہ پرنسپل دارالعلوم گوجرانوالہ۔ تقطیع خورد ، حجم ۱۴ صفحے
ملنے کا پتہ : میسرز لطیف الحسن اینڈ برادرز بک سیلرز ، چوک مولوی الہی بخش صاحب گوجرانوالہ
قیمت مرقوم نہیں ہے۔
یہ رسالہ صنائع و بدائع میں نہائت اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ طلبا کے لئے مفید ہوگا۔

(ا ۔ ج)

اسباق العروض | یہ کتاب مولوی رشید احمد صاحب موصوف کی تصنیف ہے۔ اس کے ملنے کا پتہ بھی وہی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے حجم ۱۲۰ صفحوں کا ہے۔ زبان اور بیان صاف ہے۔ طلبا عروض کے فن کو اس سے آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ (ا ۔ ج)

جمع القرآن والحدیث | ازجناب مولوی ابوالقاسم محمد خاں صاحب سیف بنارسی تقطیع بڑی۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ : آل انڈیا دارالاشاعت ، لاہور
اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے قرآن کریم کی جمع و ترتیب آں حضرت صلعم کے زمانے میں ہوگئی تھی۔ نیز احادیث آں حضرت کے آخری زمانے اور عہد صحابہ میں کتابی صورت میں مدون ہوچکی تھیں۔ مولانا کا انداز عالمانہ ، متین اور سنجیدہ ہے۔

الجمعۃ والہند | ریاست پالن پور میں ایک موضع ہے بسو تین ہزار کی آبادی اور آدھے سے زیادہ مسلمان ،
اب علمار کرام میں کش مکش ہے کہ یہاں جمعہ جائز ہے یا نہیں ۔ قاری محمد رفعت اللہ صاحب مولف کتاب جمعہ
کے موید ہیں اور انھوں نے قصبہ ، مصر ، موضع وغیرہ کی تعریف کے بعد بدلائل یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے
کہ بسو میں جمعہ کی نماز ہونا چاہئے ۔ مولانا کا لہجہ سنجیدہ اور متین ہے ۔

اثبات التقلید مع فضائل النعمان | از مولانا برکت علی صاحب ۔ اس میں تقلید کا وجود ثابت کیا گیا ہے
اور امام ابو حنیفہ (رم) کے کچھ حالات ہیں ۔

جدید خطبات جمعہ | یہ سات خطبوں کا مجموعہ سیرت کمیٹی پٹی لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے ۔ ان میں سے ہر
ایک مفید مباحث پر مشتمل ہے ، مثلاً وحدت خطبات ، خدا کی توحید ، فلسطین کی مظلومی ، تعلیم ، تبلیغ دین وغیرہ ،
ملنے کا پتہ : سیرت کمیٹی پٹی لاہور ۔

تحریک اتحاد اسلامی حصہ دوم و چہارم | از جناب کشفی شاہ صاحب ۔ کشفی صاحب نے ان مختصر سالوں
میں مختلف عنوانات کے ماتحت مسلمانوں کو متحد ہو جانے کی ترغیب دی ہے
ملنے کا پتہ : سیرت آفس پوسٹ بکس ۲۶ رنگون ۔

عثمانی قاعدہ | از واحدہ خانم صاحبہ ، بچوں کے لئے قرآن کی تعلیم کو آسان بنانے کے لئے کئی قاعدے مرتب
ہو چکے ہیں ۔ یہ بھی ایک مبارک کوشش ہے اور بڑی حد تک کامیاب ۔ قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں

قاعدہ اسلامیہ | مصنفہ مختار الحسن صاحب ۔ یہ اردو کا قاعدہ ہے ۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا نام
قاعدہ اسلامیہ کیوں رکھا گیا اور حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب کے پاس کرانے کا کیا مقصد ہے ۔ قیمت ۱۲ ؎

ملنے کا پتہ: بانی زنانہ مدرسہ انوار الاسلام کوچہ دکھنی یلے متصل فیض بازار، دریا گنج، دہلی۔

خورشید رسالت حصہ اول و دوم | از جناب تبسم قریشی منشی فاضل۔ بزم سیرت گجرات، آں حضرت کی سیرت منظوم شائع کر رہی ہے۔ ہر مہینے سولہ صفحے شائع ہوں گے۔ ہر حصے کی قیمت صرف ار

ملنے کا پتہ: بزم سیرت مسلم زمیندار ہائی اسکول گجرات (پنجاب)

رہبر | از جناب شیخ حبیب اللہ صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۶۴ صفحے قیمت ۳ر

ملنے کا پتہ: دی نیو بک اسٹورز کٹک (اوڑیسہ)

ایک اصلاحی فسانہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک مذہبی ماحول میں تربیت یافتہ لڑکی نے ایک یورپ زدہ نوجوان کی کس طرح اصلاح کی۔

سرسید و حالی | از جناب تبسم قریشی صاحب۔ ضخامت ۱۶ صفحات، تقطیع چھوٹی۔ قیمت ار

ملنے کا پتہ تبسم قریشی ناظم بزم سیرت مسلم زمیندار ہائی اسکول گجرات، (پنجاب)

یہ مختصر نظم مولانا حالی کے صد سالہ جشن سالگرہ کے موقع پر پڑھی گئی تھی۔

خیابان ترنم | از حضرت شہیر مچھلی شہری۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۱۷۴ صفحات۔ قیمت عا۔ غالباً جامعہ صلاحیہ عثمانیہ الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

حضرت شہیر مرحوم، قادر الکلام شاعر تھے اور پرانی تہذیب کی یادگار۔ اُن کے شاگردوں نے ان کے کلام کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ غزلوں کے علاوہ اس میں قصائد اور قطعاتِ تاریخی وغیرہ بھی ہیں۔

شفق آرا | از جناب نقش عالمی (عثمانیہ) تقطیع چھوٹی، ضخامت ۸۰ صفحے قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ : احمد پریس چار مینار حیدرآباد دکن۔
اس اصلاحی افسانے میں چند طوائفوں کے کردار کامیابی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

عروج زندگی | از جناب ن حسن ایم اے بی ٹی ال ال بی علیگ تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۲ صفحات قیمت ۸ر ملنے کا پتہ منشی قربان علی بسمل۔ ایڈیٹر اردوئے معلیٰ جامعہ مسجد، دہلی۔
یہ دلچسپ قصہ تعلیم نسواں کی حمایت میں لکھا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک معمولی خاندان کی لڑکی محض اچھی تعلیم و تربیت کی بدولت اپنے اور اپنے خاندان والوں کے لئے خیر و برکت اور عروج کا موجب ہوئی۔

برسی | یہ نظم جناب بسمل سعیدی صاحب نے اپنے باپ کی وفات پر لکھی ہے۔ ضخامت ۱۶ صفحے۔
ملنے کا پتہ اور قیمت کتاب پر درج نہیں۔

خسرو ذی شان | از جناب سید احمد صاحب انصاری تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحات قیمت عمر
ملنے کا پتہ: ایس ام نذیر احمد گلی نمبر ۲۳ بیڈن پورہ قرول باغ، دہلی۔
یہ کتاب شہنشاہ جارج پنجم آنجہانی کے حالات میں نہایت عقیدت سے لکھی گئی ہے آخر میں چند خطاب یافتہ معززین کی تقریظیں بھی ہیں۔

توجیہ محاورات | از جناب ابوعامر خواجہ محمد باقر حسن انصاری قادری تقطیع چھوٹی، ضخامت ۳۲ صفحات قیمت ۲ر ملنے کا پتہ: ابوعامر اینڈ سن محلہ شاہ ولایت۔ سہارنپور۔
اس کتاب میں چند اردو محاورات کی تشریح اور بہتر توجیہہ کی گئی ہے۔ خواجہ صاحب یہ کام اچھا کر رہے ہیں ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔

میر مشاعرہ | از جناب عشرت رحمانی تقطیع بڑی ضخامت ۲۴ صفحے قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ نیر نگستان، دہلی۔
یہ مزاحیہ ڈراما جناب ایم اسلم کے مزاجی کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈکاسٹ بھی ہو چکا ہے۔ میر مشاعرہ کا کیرکٹر دلچسپ انداز میں کھینچا گیا ہے۔

حفظ عروض | از جناب احسان بن دانش تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحات،
ملنے کا پتہ: مکتبہ دانش، مزنگ لاہور۔ قیمت درج نہیں۔
دانش صاحب نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ عروض کے متعلق تمام معلومات یک جا کر دی ہیں

دختران ہند سے | از جناب م حسن لطیفی صحافی ضخامت ۱۰ صفحے
ملنے کا پتہ: دفتر شاطو، لدھیانہ
لطیفی صاحب نے اپنی خاص زبان اور انداز میں دختران ہند کو دعوت عمل و انقلاب دی ہے

آصف نامہ | از جناب محمد حبیب اللہ صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحات قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔
جناب محمد حبیب اللہ صاحب نے عثمانی عہد کی تاریخ نظم میں لکھی ہے۔ اعلیٰ حضرت کے عہد کے واقعات بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے نظم کئے گئے ہیں۔

رفتارِ عالم

ہندوستان

بنگال میں جوٹ ملوں کی ہڑتال: گذشتہ ۳ ماہ سے بنگال کی جوٹ ملوں میں ہڑتال کا جو سلسلہ جاری ہی اس سے مزدوروں کی بے کسی، غربت اور افلاس کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان ہڑتالوں کی ابتدا یکم فروری ۳۸ء کو ہاوڑا (کلکتہ) میں ہوئی جو رفتہ رفتہ کارخانہ فورٹ ولیم اور ہاوڑا گنگا تک پھیل گئی لیکن ۲۵ دن کی مسلسل جد وجہد کے بعد بالآخر مزدوروں کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ اور حکومت اور سرمایہ داروں کی عدم توجہی اور بے مہری نے مطالبات منظور ہونے سے قبل ہی انھیں کام پر واپس جانے کے لئے مجبور کیا۔

ابھی اس واقعہ کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ ہڑتالوں کا ایک شدید طوفان بج بج سے اُٹھا اور سرعت کے ساتھ علاقہ بوکل اور جنوبی کلکتہ کی دوسری ملوں تک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ فورٹ ولیم اور شمالی برلا ملوں کے علاوہ قرب وجوار کی تمام دیگر مشینیں بند ہوگئیں۔ مگر ان کا حشر بھی وہی ہوا جو ہاوڑا کی ہڑتالوں کا ہوا تھا۔ اور ایک ہی ہفتے کی قلیل مدت کے بعد لارنس، لیڈلا۔ پریم چند اور دوسری ملیں بھی بلا کسی خاص مصالحت کے کھل گئیں۔

ہر چند کہ یہ ناکامیاں دل شکن تھیں مگر حقوق اور مطالبات کی آگ ابتک ہڑتالیوں کے سینوں میں سلگ رہی تھی۔ اس لئے ایکبار ہاوڑا اور بج بج سے مایوس ہوکر ان کا زغنہ شمالی کلکتہ پر ہوا۔ اس حملے نے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے زیادہ منظم اور مستحکم تھا نہ صرف حکم چند حزدہ اور جوٹ کی دوسری ملوں کو متاثر کیا بلکہ برطانیہ انجنیرنگ۔ مشرقی صنعتی کمپنی اور گورلپور کے رنگ سازی کے کارخانے بھی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ جوٹ ملوں کے ساتھ ساتھ انھیں بھی بند ہونا پڑا۔ اس کامیابی کے بعد ہڑتالیوں کا حملہ دریائے ہگلی کی دوسری جانب ہوا اور ۱۴ر اپریل ۳۸ء کو ٹیٹا گڑھ کی ملوں سے ہڑتال کی ابتدا ہوئی۔ اور تیزی کے ساتھ بارکپور کے پورے حلقے میں گونج گئی۔ اس کے

انہسے ؔ انگلس‘ وکٹوریہ پریسیڈنسی اور گوندل پارہ وغیرہ تمام ملوں کو بند ہونا پڑا۔

اس پورشن سے مجموعی طور پر تقریباً ۷ لاکھ جوٹ کے چرخے بند ہوگئے۔ اور دو لاکھ سے زیادہ مزدوروں کو (جن کی آمدنی سے ان کی اور ان کے متعلقین کی گذر ہوتی تھی اور تقریباً ۱۲ لاکھ پیٹ پلتے تھے) بے روزگار ہوگئے لیکن افسوس ہے کہ مزدوروں کی اس زبردست جماعت کو تباہ حالی سے بچانے کے لئے حکومت نے کوئی سعی نہیں کی اور غریب ہڑتالیوں کو فاقہ کشی کے ساتھ ڈنڈے بازی کی مصیبت بھی برداشت کرنا پڑی۔ اس ہڑتال سے جوٹ کی بڑھتی ہوئی بین الاقوامی تجارت کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کی ذمہ دار یقیناً حکومت قرار دی جائے گی۔

اس موقع پر "جوٹ مل ایسوسی ایشن" کا اعلان مورخہ کیم مئی ۱۹۳۷ء بھی قابل غور ہے۔ وہ ان ہڑتالوں کو "غیر معاشی اور محض سیاسی پورشن" سے تعبیر کرتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جوٹ کا کاروبار ابھی اپنی اصلی حالت پر نہیں آیا ہے اس لئے یہ ہڑتال قدرتاً بے محل ہے۔ اس کے علاوہ مزدوروں کی مالی حالت بھی قابل اطمینان ہے کیونکہ وہ اپنے متعلقین کے لئے ایک کثیر رقم ماہ باہ بھیج رہے ہیں۔ اگرچہ اس اعلان کے جملہ نکات کا جواب پنڈت جواہر لعل نہرو اور مسٹر سرت چندر بوس متعدد بار دے چکے۔ لیکن اگر ہم اسی کے ان حصوں کی مزید توضیح کریں جن میں مزدوروں کے مطالبات کو رد کیا گیا ہے تو ظاہر ہو جائے گا کہ مل ایسوسی ایشن کا نظریہ فہم و ادراک سے بہت دور ہے اور صرف کوتاہ بینی پر مبنی ہے۔

مطالبات کی فہرست میں ایک اہم مطالبہ یہ ہے کہ ملوں کے اوقات کار میں ۵۴ گھنٹہ فی ہفتہ کی جو زیادتی کیم اپریل ۱۹۳۶ء سے عمل میں آئی ہے منسوخ کی جائے۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ اوقات کی یہ ترمیم مزدوروں کے لئے باعث مضرت نہیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی اجرت میں بھی مناسب اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر جوٹ کی تجارت کو فروغ حاصل نہیں ہے تو اوقات کار میں زیادتی کے کیا معنی؟ اور اگر مزدور متعینہ اوقات سے زیادہ کام کر رہے ہیں تو اجرت میں کارکردگی اور خانگی تعلقات کے کم ہو جانے والے اثرات کو ملحوظ کیوں نہیں رکھا جاتا؟

پھر یہ کیا ضروری ہے کہ اوقات کی ترمیم تمام مزدوروں پر لازمی کی جائے؟ اگر وہ اجرت کی زیادتی کے لئے ۴۸ گھنٹہ ہفتہ کی قربانی کے لئے تیار نہیں ہیں تو ملوں کو اس کے خلاف انھیں مجبور کرنے کا کیا حق ہے؟ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ جوٹ میں بنگال کی تمام ملوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور دولتمند ہیں، مگر ان میں اجرت کا نرخ ہر جگہ سے کم ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ چند سال کے مقابلہ میں بنگال کے جوٹ ملوں کی نکاسی تقریباً نوّے ہزار ٹن بڑھ گئی ہے ساتھ ہی منافع میں بھی تقریباً ایک کروڑ روپے کا اضافہ ہو گیا ہے۔ حیرت ہے کہ ان حالات کے باوجود مزدوروں کے مطالبات اپنی جگہ پر اب تک غیر معاشی ہی قرار دئے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم بنگال مسٹر فضل الحق نے بھی مالکان مل سے ہم آواز ہو کر اعلان کیا ہے کہ "یہ ہڑتال دراصل کسی معاشی بنا پر نہیں ہو بلکہ کمونسٹ جماعت نے اُس کے ذریعے ہندوستان میں انقلاب پیدا کرنے کی ایک نئی صورت نکالی ہے" (اعلان مورخہ ۵ رمئی)۔

پیرانہ سالی اور ایام ولادت کے اخراجات کے متعلق بھی مل ایسوسی ایشن کا نظریہ عجیب مضحکہ خیز ہے وہ یہ تو مانتی ہے کہ یہ اخراجات ضروری ہیں اور ملوں کی جانب سے پورے ہونے چاہئیں پھر بھی وہ قانونی صورت میں ان کے نفاذ سے روکتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ مطالبات بلا مانگے ہی دئے جا چکے ہیں اس لئے ان کے متعلق کوئی قانون زیادہ مفید ثابت نہ ہوگا۔ اگر یہ حقوق واقعی دئے جا چکے ہیں تو ان کی قانونی شکل سے مالکان مل کو متوحش ہونے کا کیا سبب ہے؟

ہڑتالی مزدوروں کی برخاستگی کے متعلق وزیر مزدور مسٹر سہروردی کا اعلان مظہر ہے کہ اگر جوٹ مل کی مزدور مجلس ہڑتال کے سلسلوں کو فوراً ختم کر کے حسب معمول مزدوروں کو اپنے اپنے کام پر لگا دیں تو وہ اس کے ذمہ دار ہوں گے کہ کوئی ہڑتالی مزدور برخاست نہ کیا جائے اس اعلان کے ساتھ ہی وزیر ممدوح نے یہ بھی فرمایا کہ ابتک وہ اس تحریک میں غیر جانبدارانہ دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ لیکن اگر صورت حال میں تبدیلی نہ ہوئی تو وہ اپنے اختیارات سے کام لے کر مزدوروں کو ہڑتال ختم کر دینے پر مجبور کریں گے۔
ہمیں افسوس ہے کہ حکومت کے اس غیر جانبدارانہ طرز عمل کے باوجود بنگال پولیس نے جو تشدد ۲۴ر اپریل کو

بمقام رشٹرا ضلع کلکتہ روا رکھا اس کے خلاف ابتک کوئی باز پرس نہیں کی گئی ۔ اور نہ مزدوروں کے جملہ مطالبات کو پورا کرنے کے لئے کوئی سعی عمل میں آئی ۔

حکومت کی طرف سے اس بات پر جو بہت اصرار ہو کہ یہ معاشی نہیں سیاسی ہے اس یہ معلوم ہوتا ہے کہ معیشت اور سیاست کے گہرے تعلق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ یہ بات ماننے کو تو مشکل ہی سے کوئی غیر جانبدار شخص آمادہ ہوگا کہ بلا جائز اور شدید شکایات کے لاکھوں مزدور کام چھوڑ بیٹھیں اور اپنی روزی کو خطرہ میں ڈال دیں ۔ لیکن بیشک وہ اپنی معاشی شکایات کے رفع کرنے کے لئے سیاسی قوتوں سے کام لے سکتے ہیں اور اگر لیں تو اس پر کسی کو طعن کا حق نہیں ۔ یہی کیا ہم نے تو سنا ہے مزدوروں کی معاشی شکایات اور عام سیاست کے تعلق کے علاوہ اس ہنگامہ میں خود سرمایہ داروں کی چالیں بھی کچھ کم شریک نہ تھیں ۔ عام افواہ تھی کہ ہڑتال میں خود جوٹ ملوں کے بعض دور اندیش مالک روپیہ دے دے کر اسے طول کرنے میں مدد دے رہے ہیں ۔ اس لئے کہ خود ان کی ملوں کے حصوں کی قیمت گھٹے اور وہ کم داموں پہ حصہ داروں سے خود خرید لیں تجارت اب سنبھلی ہے اور آنے والی جنگ کی تیاریوں نے قیمتوں کو ابھارا ہے ۔ جوٹ کی قیمت بھی یقین ہے کہ خوب بڑھیگی اور جوٹ کے کارخانوں کا نفع بھی اس کے ساتھ بڑھے گا اور حصوں کی قیمت چڑھے گی ۔ اس وقت ہڑتال کے زمانہ میں جتنے جیسے سستے داموں ہاتھ آجائیں اچھا ہے ۔

بہر حال مزدور جماعت کو اپنے ان عارضی اور خود غرض معاونوں کی چالوں میں نہ آنا چاہیئے ۔ ان کا مطالبہ درست ہے ' دولت آخر میں وہ ہیں ' سرمایہ دار کو یہ حق نہ ہونا چاہیئے کہ وہ انھیں مزدوری یوں دے گویا خیرات بانٹتا ہے ۔ اگر مزدوروں کی جماعت میں مخلص کارکن پیدا ہوتے جائیں تو ان کے اس مطالبہ کو کوئی قوت نہیں رد کر سکتی نہ حکومت ' نہ سرمایہ دار ' نہ تنگ نظر اہل سیاست ۔ ؛

۱-۱-۳

ممالک غیر

اسپین | یہ بدنصیب ملک اب تک وفاداروں اور باغیوں کی کشاکش کا خونی رزمگاہ بنا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں جو خبریں آئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وفاداروں کا پلہ کچھ بھاری پڑ رہا ہے۔ ادھر دول یورپ کی طرف سے فریقین کو التوائے جنگ کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اتنے عرصے سے اصولی اختلافات کی وجہ سے یوں برسرِ پیکار ہیں کہ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے، وہ ان نیک مشوروں کو آسانی سے کیسے مان سکتے ہیں۔ پھر ان مشوروں کی نیکی کا یقین بھی ذرا مشکل ہی سے ہوگا۔ اس لئے کہ یہ دول اگر چاہتیں تو یہ قصہ اس قدر طول ہی نہ پکڑتا۔ جنھوں نے اسے اتنا طول کرایا ان سے کوئی توقع کیسے کرے کہ وہ اب یکایک اسپین کی ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کر صلح کی مخلصانہ کوششیں کر رہے ہیں۔

اور سچ بھی ہے کہ دول یورپ کے معاشی اور سیاسی اغراض اس ملک کے ساتھ کچھ اس طرح وابستہ ہیں کہ وہ کوئی مشورہ آسانی سے ایسا نہیں دے سکتے جس میں خود غرضی کی آمیزش نہ ہو۔

مختلف دول یورپ کے لئے اسپین میں سیاسی اثر بڑھانے کی جو ضرورت ہے اس پر ان صفحات میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ ابھی ۲۴ اپریل کے New Statesman & Nation میں ایک باخبر نامہ نگار نے مختلف دول کے معاشی اغراض کا بہت اچھا نقشہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اجناس خام کے حاصل کرنے کے لئے ساری دنیا میں جو کھلی اور چھپی کشمکش جاری ہے وہی اسپین میں اپنا اثر دکھا رہی ہے۔

بات یہ ہے کہ اسپین میں بہت سی وہ چیزیں مل سکتی ہیں جو جنگ کے لئے ضروری ہیں اور اس مقدار میں مل سکتی ہیں کہ نہ اٹلی کو حبشہ میں نصیب ہوں گی نہ جرمنی کو اپنی نوآبادیوں میں ملتی تھیں،

مثلاً لوہا ہے کہ جنگی سامان کی ساری صنعت کا مدار اس پر ہے کہ کثرت سے اوویڈو کے قریب، ویگو کے نواح میں اور باسک صوبے میں دستیاب ہوتا ہے۔ صوبہ ہوئلوا میں یورپ کی سب سے اچھی تانبے کی کانیں ہیں۔ المدن میں پارہ ملتا ہے اور اس کے قریب پنا رویا میں بہت ہی اچھا سیسہ۔
ان کے علاوہ بہت سی اور معدنیات اس جزیرہ نما میں حاصل ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں اٹلی اور جرمنی کی ایک مشترکہ جمعیت نے ان ذخائر سے فائدہ اٹھانے کی تجویزیں شروع کیں۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ اٹلی اور جرمنی برطانیہ، فرانس اور سویڈن کی مدد سے بے نیاز ہو جائیں ۱۹۳۴ء کا زمانہ بھی اس جمعیت کے کام کے لئے بڑا سازگار تھا۔ رجعت پسند جماعتوں کو کامیابی ہوئی تھی۔ معدنی کانوں کے مزدوروں کو دبا دیا گیا تھا، سیاست میں موسیو لیرو کا طوطی بولتا تھا، اور یہ تھے ہی بڑے سرمایہ داروں کے پٹھو۔
اس جمعیت نے ایک مشہور روسی انجینیر کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ اس نے یہاں کے لگنائٹ سے موٹروں کا تیل بنانے کی تجویز بتائی اور قرار پایا کہ اسپین میں جرمن آب دوزوں اور ہوائی جہازوں کے لئے کیمیاوی طریق سے یہ تیل بنا کرے، اور وہیں اُن کے مستقر بنا دئے جائیں۔
لیکن اسپین میں سیاست کا رخ پلٹا۔ انقلابی جماعتوں کو کامیابی ہوئی۔ ڈر پیدا ہوا کہ جرمنی اور اٹلی کے یہ منصوبے کھٹائی میں نہ پڑ جائیں، تو ان دونوں طاقتوں نے بغاوت کرانے کی پوری کوشش کی۔ جرمنی کے بعض کارخانوں کو اسپینی مراکش میں پہلے ہی سے کچھ مراعات حاصل تھے۔ جنرل فرینکو نے علم بغاوت بلند کیا تو شروع ہی میں اعلان کر دیا کہ مراکش کی تمام کانوں پر ہمارا قبضہ ہے، پرانے مراعات سب ختم۔ اور اشبیلیہ میں ایک اسپینی نام کی کمپنی قائم کی جسے تمام مراکشی کانوں کا اجارہ دے دیا۔ بھولے لوگ سمجھے کہ جرمنی کو جو رعائتیں حاصل تھیں وہ چھن گئیں۔ لیکن دراصل یہ نئی کمپنی ایک جرمنی کمپنی ہی کا اسپینی نام تھا۔ معاہدہ یہ ہوا کہ اس نئی کمپنی سے جرمنی مال خریدے گا۔ اور مال کے باہر بھیجنے میں اسے جرمن جنگی جہازوں کی مدد حاصل ہوگی۔ چنانچہ جرمنی سے جہاز اسلحہ بھر بھر کر لاتے اور کچا لوہا لاد کر لیجانے لگے۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر اس وقت اسپین سے یہ لوہا جرمنی نہ پہنچتا تو اسلحہ سازی کا جرمن پروگرام کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ اس لئے کہ یہ سویڈن سے لوہا لیتا تھا۔ وہاں انگریز خریدار مقابلہ کرنے لگے تھے۔ فرانس

میں اب اشتراکی جماعت ٹوریں کی کانوں کے لوہے کو جرمنی جانے سے روکنے کی فکر میں تھی ا ور دو برس
کی کمی سے اسپین سے بھی کوئی سال ڈیڑھ سال سے بہت کم لوہا پہنچ رہا تھا۔

اس کے علاوہ جرمنوں نے گلیسیا کے ٹین اور ویگو کے لوہے پر بھی اپنا حق جما لیا تھا اور آ ب
استرالا آدورا کے علاقے میں ٹنگ سٹن اور وناڈیم کی کانوں پر نظر تھی کہ اٹلی نے سوچا کہ ہم کیوں
پیچھے رہیں۔ فوجی تیاری کے لئے آخر ضرورت تو ان چیزوں کی ہمیں بھی ہے۔ جھٹ اسپینی باغیوں کی مدد
کے لئے اطالوی رضاکار پہنچے، مگر بجائے اس کے کہ محاذ جنگ پر جاتے پہلے معرکہ کارزار سے بہت
پیچھے ٹنگ سٹن اور وناڈیم کی کانوں کا رُخ کیا۔ کہ پہلے نقد سودا کر لیا جائے پھر اور کچھ دیکھیں گے
جنوری میں اس اطالوی لشکر نے ملاگا کا رخ کیا۔ تو کیوں؟ اس لئے کہ ساحل کی طرف کارتاگینا
کے نواح میں جو زرخیز کانیں لوہے، سیسہ، تانبے اور گندھک کی ہیں وہ قبضہ میں آجائیں۔ قرطبہ کے
شمال میں جو اپنے فاشستی بھائیوں کی مدد کے لئے بے جگری سے بڑھے تو اس لئے بھی کہ المدن کے پارہ کے
ذخائر اس طرف تھے! اور خیال تھا کہ آسٹریا کی پارہ کی کانیں تو جنگ کے بعد مل ہی گئی ہیں۔ یہ اسپینی
کانیں بھی ہاتھ آگئیں تو دنیا میں پارہ کا اجارہ دار اٹلی بن جائے گا اور اس میں عجلت کی اور ضرورت
یوں تھی کہ انگریز جن سے اٹلی کی رقابت قدم قدم پر ظاہر ہو رہی ہے ان کانوں کو اپنے قبضے میں لینے کی
فکر میں تھے اور سنا ہے کہ اسکندر بگزنگ کی برطانوی فرم نے اسپینی پارہ کی سول ایجنسی حاصل بھی کر لی تھی

فرانس اور اٹلی جو عام خیال کے مطابق 'باغیوں' کے ہمدرد ہیں، در اصل نہ ادھر ہیں نہ ادھر
یعنی جدھر کو فائدہ ہے ادھر ہیں۔ یہ ملک اٹلی اور جرمنی پر خفا ہوتے ہیں کہ وہ کیوں اسپین کے خانگی
جھگڑے میں بولتے ہیں۔ مگر خود ان کے سرمایہ داروں کی جو کانیں ریف علاقہ میں ہیں ان کا سارا لوہا
جرمنی کو جا رہا ہے اور لطف یہ کہ جرمنی انھیں ایک پیسہ نہیں دیتا۔ سب قیمت جنرل فرینکو کے جنگی
قرضے میں شامل کر دی جاتی ہے۔ یہ جنرل فرینکو کی مدد نہیں تو کیا ہے؟ ہاں کوئی کھلے مدد کرتا ہے کوئی
چھپے۔ اسی طرح ہوئیلا کے علاقہ میں جتنا تانبا ہے وہ سب ایک برطانوی کارخانہ کے ہاتھ میں ہے جس کا
کا مال نہایت سستے داموں جرمنی کے ہاتھ بیچا جا رہا ہے اور جس کا رشتہ اسپینی سیاست سے

یوں ظاہر ہے کہ ادھر سنہ ۳۶ کے انتخابات میں انقلابی جماعتوں کو کامیابی ہوئی اور ادھر انکے حصے
۲۲ پونڈ سے گرکر ۱۳ پونڈ پر پہنچے ادھر بغاوت ہوئی ۔ اور ادھر حصے پھر ۳۰ پونڈ کے ہوگئے ۔

غرض اسپین کی بدنصیبی کی داستان میں اہل اسپین کے مخرور المزاج ہونے یا سیاسی ناتجربہ کاری یا بے جا اصول پسندی ہی کو دخل نہیں ؛ اس میں اوروں کی ٹھنڈی طبیعت ، سیاسی تجربہ ، اور بے اصول نفع طلبی کا بھی کچھ شائبہ ہے ۔ ان پوشیدہ قوتوں کے عذاب سے دیکھئے دنیا کب نجات پائے ۔

(ذ ۔ ح)

<u>اٹلی ، برطانیہ اور بحر روم</u> | ہم نے اپنی گذشتہ اشاعت میں اس معاہدہ کا ذکر کیا تھا جو اٹلی اور یوگوسلاویا کے درمیان ہوا ہے ۔ اس سے پہلے اٹلی اور برطانیہ

میں بھی ایک شریفوں کا معاہدہ ہوا تھا، لیکن اس دوسرے معاہدے کے بعد جو یوگوسلاویا سے ہوا ہے ۔ اٹلی اور برطانیہ کے تعلقات کچھ بہت خوش گوار معلوم نہیں ہوتے پچھلے دنوں اطالوی اخبارات اور رسائل میں برطانیہ کے متعلق جس طرح تند و تیز باتیں کہی گئی ہیں وہ بین الاقوامی یاداری کے معمولات میں سے نہیں ہے ۔ شاید برطانیہ کی تاج پوشی سے علیحدگی بھی رائج آداب سیاست کے خلاف ہی ہے ۔ اس میں کچھ تو مسولینی اور فاشستی جماعت کے مخصوص مبالغہ آمیز اسلوب کار کو بھی دخل ہے ۔ مگر واقعہ بھی یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان مغربی سیاست میں اور بحر روم کے معاملات میں نہایت اہم اختلافات ہیں ۔ برطانیہ خاموشی سے اس مقابلے میں اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کی تدبیریں کر رہا ہے اور اٹلی تدبیروں کے ساتھ ساتھ لاطینی حرارت مزاج کا ثبوت بھی دیتا جاتا ہے ۔ اور یوگوسلاویا سے معاہدہ دراصل اسی لئے ہے کہ برطانیہ سے نمٹنے میں سہولت رہے ۔ جس طرح پولینڈ اور جرمنی میں ڈانزگ کے معاملے پر ایسا اختلاف تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ بس یہیں جنگ کا آغاز ہوگا اور وہ بھی بس اب اور تب کا معاملہ تھا ۔ مگر روس کے مقابلے میں اپنی قوت کو محفوظ کرنے اور وسطی یورپ میں اپنی سیاست کو زور کے ساتھ آگے بڑھانے کی خاطر جرمنی نے یہ تلخ گھونٹ پیا کہ پولینڈ سے دس سال کے لئے معاہدہ کیا ۔ اسی طرح اٹلی اور یوگوسلاویا میں بنیادی اختلاف ہے ۔ اٹلی بحیرۂ ایڈریاٹک میں بلاشرکت غیرے اپنا تسلط چاہتا ہے اور ڈلمیشیا کے ساحل پر یوگوسلاوی قوت کا فروغ اس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا ہے ۔ پھر برطانیہ سے یوگوسلاویا کی پینگیں بڑھتی دیکھ کر متوحش ہوتا ہے ۔ اسی ایڈریاٹک پر تسلط کی خاطر اس نے ۱۹۱۵ء میں ٹریسٹ اور فیوم لیا ۔ پھر ۱۹۲۰ء میں عہد نامہ ریپالو کی رو سے بندرگاہ زارا اور جزیرہ لاگوسٹا پر قبضہ جمایا ۔ اسی غرض سے البانیہ کو اپنے سایہ عاطفت میں لیا ۔ اس کے لئے اطالوی بنکوں نے البانیہ کی معاشی زندگی کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور چوڑی چوڑی فوجی سڑکیں اس غیر اور برائے نام خود مختار ملک میں یوگوسلاویا کی سرحد تک بنا ڈالیں لیکن اس بنیادی مخالفت کے باوجود اس وقت جو معاہدہ کیا ہے تو اس لئے کہ برطانیہ کے سامنے کمزور نہ پڑے ، وسطی یورپ میں اس کی سیاست کے لئے ایک روک مل جانے اور بلقان میں

جرمنی کے بڑھتے ہوئے اثر کے مقابلے میں یہ بالکل پیچھے نہ رہ جائے۔ یعنی یہ صلح نامہ بھی درحاصل بہتر جنگی تیاریوں کا پیش خیمہ ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، صلح ہے اک مہلت سامان جنگ
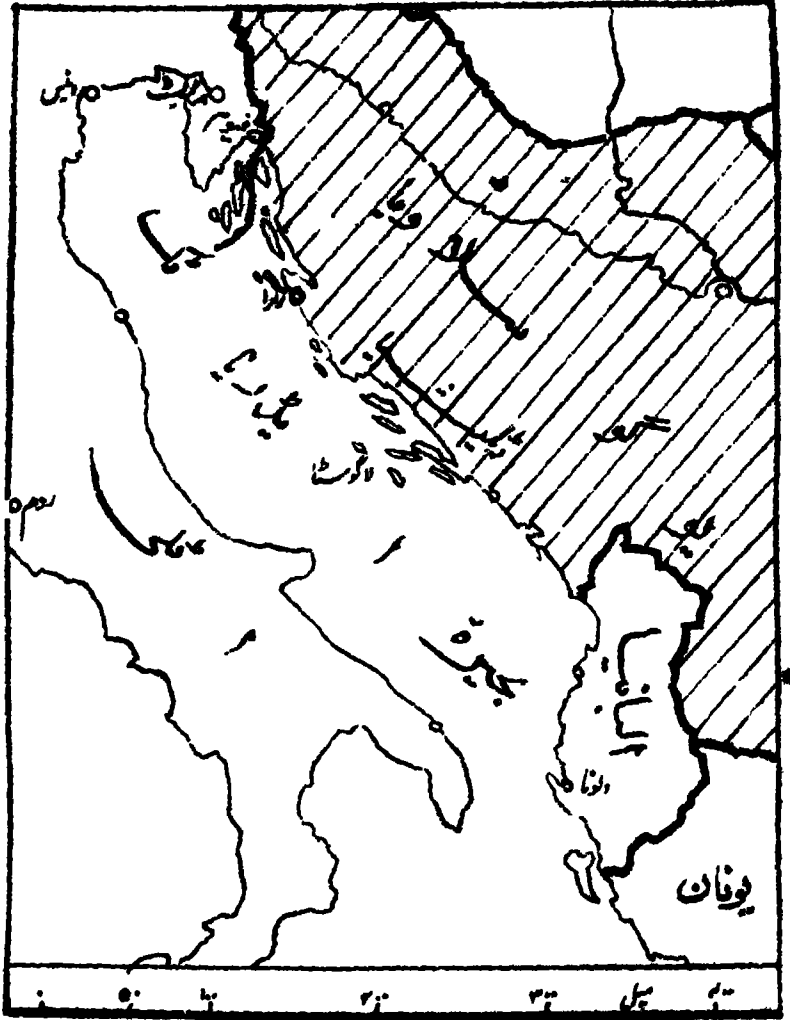
برطانیہ سے ٹکر لینا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر مسولینی آسان کاموں کا زیادہ شائق بھی نہیں معلوم ہوتا۔ گمان ہوتا ہے کہ وہ سب سے مضبوط سے پہلے نمٹنا چاہتا ہے تاکہ پھر سب سے معاملہ ایک ہی وقت میں استوار ہو جائے۔ برطانیہ سے مقابلہ بظاہر چھوٹا منہ بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حبشہ کی جنگ کے موقع پر برطانوی بیڑے پر جو گذری اس سے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ مقابلہ

برابر کا سا ہے اس لئے کہ بحیرۂ روم میں اٹلی کی بڑھتی ہی قوت برطانیہ کے لئے ایک سخت خطرہ ہے اور بحیرہ روم کے مخصوص جغرافیائی حالات نے اور ہوائی جہازوں کی ایجاد نے اس خطرے کو اور بھی سخت بنادیا ہے۔ مالٹا کا برطانوی بحری مرکز سسلی سے کل ۶۰ میل ہے اور اس فاصلے کو اٹلی کے گولوں سے لدے ہوئے ہوائی جہاز ۲۰ منٹ میں طے کر سکتے ہیں۔ مالٹا کے بندرگاہ کا منہ بہت تنگ ہے اس میں جہاز آسانی کے ساتھ آ جا نہیں سکتے۔ بندرگاہ کے اندر انھیں برطانوی ہوائی بیڑہ بڑی آسانی سے اپنا نشانہ بنا سکتا ہے۔

چنانچہ جنگ حبش کے موقع پر یہ بات کھل گئی کہ برطانیہ مالٹا میں اپنا بیڑہ نہیں رکھ سکتا، سارا بیڑہ اسکندریہ چلا گیا کہ یہاں اطالوی ہوائی جہازوں کی زد سے مقابلتہً محفوظ تھا۔ سوئز پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ اور حیفہ کے نئے بندرگاہ سے بھی ۲۹۰ میل ہی پر تھا۔ یوں تو بیڑہ کا مالٹا سے ہٹنا کوئی بات نہ ہوتی مگر ہفتوں پہلے سے اطالوی جہاز پیش گوئی کر رہے تھے کہ برطانوی شیر دم دبا کر مالٹا سے کھسک جائے گا۔ اور یہی نہیں کہ بیڑے کو اسکندریہ جانا پڑا بلکہ ملک کے لئے چین، امریکہ، جزائر غرب الہند کے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سب ۵ برطانوی بیڑوں سے جہاز بلانے پڑے۔ اگر اسی زمانے میں برطانوی بیڑے کو کسی اوسط درجے کی طاقت سے بھی مقابلہ کرنا ہوتا اور اپنے تجارتی راستوں کی حفاظت کرنی ضرور ہوتی تو مشکل پڑ جاتی۔

برطانیہ نے جنگ حبش میں جو تلخ تجربہ حاصل کیا اس کا نتیجہ فراہمی اسلحہ کا وہ پروگرام ہے جو اس نے شروع کیا ہے اور جس نے فوجی مال کی خریداری بڑھا کر ایک مرتبہ تجارت میں پھر جان ڈال دی ہے مگر اطالوی تیاریاں بھی بڑی شد و مد سے جاری ہیں۔ آج اطالوی بیڑہ ۱۹۲۶ء کے مقابلے میں دوگنا بلکہ تگنا طاقت ور ہے۔ مثلاً ۱۹۳۳ء میں اٹلی کے پاس ۵ بڑے جنگی جہاز تھے جو جنگ عظیم سے پہلے کے بنے ہوئے تھے۔ پچھلے سال اس کے پاس دو جہاز تو ۳۵، ۳۵ ہزار ٹن کے بالکل نئے تھے، دو نہایت ہی اعلیٰ درجے کے بالکل نئے بڑے جہاز ۲۷ ناٹ کی رفتار والے تھے۔ اور دو جنگ سے پہلے کے بڑے جہاز ۱۹۲۶ء میں اس کے پاس کوئی کروزر نہ

تھا جو جنگ عظیم کے بعد بنا ہو پچھلے سال ۱۹ کروزر تھے جو دنیا کے سب سے تیز رفتار جہازوں میں سے ہیں۔
۱۹۳۰ء میں اس کے پاس ۹۰ ہونے ڈسٹرائر تھے۔ پچھلے سال ۹۰، ۱۹۳۶ء میں کل ۷۰ آب دوزیں تھیں
اکثر پرانی اور ازکار رفتہ تھیں پچھلے سال ۸۸ نئی آب دوزیں اسکے بیڑے میں موجود تھیں غرض اٹلی کی بڑھتی
ہوئی قوت کا مقابلہ برطانیہ تک کے لئے کچھ سہل نہیں۔ اٹلی اور برطانیہ معاملہ کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے خوب
سمجھتے ہیں اٹلی چیختا چلاتا بھی ہے انگلستان صرف تدبیریں کرتا ہے اور حسب معمول دوقسم کی تدبیریں۔ ایک ایسی
جن سے معاملہ اس وقت سنبھل سکے، ایک وہ جو آخر تک دیکھ کر اختیار کی جائیں۔ فوری ضرورت کے لئے
تو اپنی بحری اور ہوائی قوت کو بڑھا رہا ہے اٹلی کے لئے کچھ سہل تو نہ ہوگا کہ برطانیہ کو جالے۔ مگر دور بینی کا
تقاضا یہ ہے کہ بحر روم سے ہٹنا بھی پڑے تو آگے کا انتظام ہو جائے چنانچہ برطانوی رسائل اور برطانوی
ارباب فکر اس فکر میں ہیں کہ قوم کے ذہن سے بحر روم کی غیر معمولی اہمیت کا خیال ہٹائیں چنانچہ جتایا جا رہا ہے
کہ ہر ہفتہ برطانیہ میں کوئی ایک ملین ٹن کھانے کی چیزیں اور خام اجناس دوسرے ملکوں سے آتی ہیں
اس میں سے صرف پانچواں حصہ بحر روم سے گذرتا ہے۔ بحر روم کے ساحلی ممالک سے جو مال آتا ہے اسمیں سے
بہت ہی کم کھانے پینے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ زیادہ تر مصر کی کپاس اور اسپین کے معدنیات ہوتے ہیں جن کا
آنا رک جائے تو تکلیف ضرور ہو مگر قومی زندگی خطرے میں نہ پڑے۔ پھر ان کے عوض دوسرے ممالک
سے چیزیں لانے کے امکان بھی ہیں۔ حساب لگانے والوں نے حساب لگایا ہے کہ اگر بحر روم کا سارا مال رک
جائے تو برطانیہ کے کھانے پینے کی برآمد میں بس دس فی صدی کی کمی ہوگی زیادہ نہیں۔ افریقہ کے
جنوب سے جہازوں کے لے جانے میں بے شک فاصلہ بڑھے گا۔ جس کی تلافی کچھ رفتار بڑھا کر کی جائے
گی۔ کچھ یوں کہ نہر سوئیز کے محاصل نہ پڑیں گے۔ اور بہت کچھ یوں کہ اس راستہ پر بیمہ کا صرف بہت کم ہوگا
بحر روم میں سے سفر پر خصوصاً جنگ کے زمانے میں بیمہ کی شرح بہت چڑھ جائے گی اور یہ نیا راستہ
مقابلۃً مامون ہوگا۔ غرض اٹلی سے شریفانہ معاہدہ بھی ہو رہا ہے، موقع ہو تو اسے نپٹ لینے کی تدبیریں
بھی ہو رہی ہیں۔ اور اگر یہ موقع نہ ملا تو اپنے کام کو دوسری طرح نکالنے کے نقشے بھی بنے بنائے
تیار ہیں۔ سچ ہے دور اندیشی اور عاقبت بینی اسی کو کہتے ہیں۔ (ف، ح،)

مسٹر روزولٹ کا آئینی خطرہ

۱۸۰۳ء کا واقعہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی عدالت عالیہ نے اپنے اس حق کا مطالبہ کیا کہ وہ کانگریس کے پاس کردہ قانون کو مسترد کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ دستور اساسی کے خلاف ہو۔ اسکے کچھ عرصے بعد جسٹس جکسن نے اسکی تحدید کر دی۔ کافی مدت تک عدالت عالیہ اپنے اختیارات کو اسی اعتدال کے ساتھ برتتی رہی۔ ۱۸۵۷ء کو پہلی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ عدالت عالیہ نے کانگریس کے ایک قانون کو خلاف آئین قرار دیا۔ اسکے تباہ کن نتیجے کو دیکھتے ہوئے یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ شاید یہ اپنی قسم کا پہلا اور آخری واقعہ ہو۔ امریکہ کی حدود میں غلامی کے پرچار پر طویل جھگڑا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کو ختم کرنے کے لئے عدالت عالیہ نے ۱۸۵۷ء میں اعلان کر دیا کہ وفاقی حکومت کو غلامی کے مسئلہ میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ۱۸۲۰ء کا (Missouri Compromise Act) غیر آئینی تھا۔ عدالت کا خیال تھا کہ اس فیصلے سے یہ مسئلہ شاید ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اب کچھ عرصے سے عدالت نے کھلے بندوں کانگریس کے پاس کردہ قوانین کو غیر آئینی قرار دینا شروع کر دیا۔ گذشتہ چند برس سے ہر وہ قانون جو عدالت کے پاس نظر ثانی کے لئے جاتا مسترد ہو جاتا۔ صرف ایک قانون جس کے ذریعے ڈالر میں سونے کی مقدار کم کر دی گئی تھی اس بدسلوکی سے بچا۔ اس دوران میں پے درپے تین انتخابات ہوئے ہیں، ہر ایک میں لوگوں نے امریکہ کی نئی سیاست کی پرزور تائید کی ہے۔

ہوا یہ کہ گذشتہ کئی برس سے عدالت اپنے کو ایک عدالتی مجلس ہی نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی مسائل کا بھی نگران سمجھتی رہی ہے اور یہ اختیارات ۱۸۰۳ء والے مطالبے سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ گذشتہ جون میں تو بڑا ہی نازک موقع پیش آ گیا تھا جب عدالت نے نیویارک اسٹیٹ مینی مم ویج ایکٹ (N. York State Minimam wage Act) کو رد کر دیا۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ عورتوں کو مزدوری کرنے سے روکنا انھیں ذاتی ملکیت سے محروم رکھنا ہے۔

امریکہ میں اس وقت اکثر ایسے لوگ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ عدالت عالیہ اور . . . حکومت کا جھگڑا آسانی کے ساتھ طے ہو جائے۔ نزاع اس بات پر ہے کہ ایسا کیوں کر ہو؟ سر دست تین تجویزیں زیر غور ہیں۔ اول یہ کہ دستور کے مبہم الفاظ میں تبدیلی کر دی جائے دوم یہ کہ عدالت کے اختیارات

مبہم کر دی جائے۔ سوم یہ کہ عدالت کی ہیئت ترکیبی ہی کو بدل دیا جائے۔ ہر ایک طریقے پر
یکے بعد دیگرے غور کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ صدر کانگریس نے تیسرا طریقہ کیوں
اختیار کیا ہے۔

پہلی تجویز پر عمل کرنے سے پیچیدہ 'الفاظ' اور 'مبہم تراکیب' اور ان کی تعریف پر بحثیں ہوں
گی اور جھگڑا بڑھے گا۔ نیز قانون کے الفاظ اگر جچے تلے ہوں تو اس کے حقیقی معنوں میں وسعت پیدا نہیں
ہو سکتی۔ کسی آئین یا دستور کو اگر زندہ رہنا ہے تو اس کے الفاظ اور عبارات کو جامع اور وسیع
ہونا چاہیئے تاکہ زمانے کی بدلتی ہوئی ضروریات کے ساتھ ساتھ اس کے معنی اور مفہوم کو وسعت
دی جا سکے۔ قانون اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ ہر آئے دن اس کی نئی نئی شرحیں ہوتی رہتی ہیں جیسا
کہ خود کانگریس کی آئینی تاریخ گواہ ہے۔ پس قانون کے الفاظ کی محدود اور مقید تعریف نہیں ہونی
چاہیئے بلکہ اس کی لچک کو باقی رکھنا چاہیئے۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ عدالت عالیہ کے اختیارات کو محدود کر دیا جائے۔ یعنی یا تو قانون
پر نظر ثانی کا حق اس سے چھین لیا جائے یا پھر نظر ثانی کے اختیارات پر قیود لگا دی جائیں۔ اس سلسلے
میں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جب کوئی قانون عدالت عالیہ کی طرف سے مسترد ہو جائے تو
اس کی بابت عام باشندوں کی رائے لی جایا کرے۔ ایک دوسرا طبقہ ایسا بھی ہے جو یہ
چاہتا ہے کہ کانگریس کے دو تہائی یا تین چوتہائی ارکان کو عدالت کے فیصلے کو منسوخ کر دینے کا
اختیار ملنا چاہیئے۔ غرض دوسری تجویز پر عمل کرنا بھی بڑی بڑی الجھنوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ نیز صدر
اور اس کے مشیر اسی کشمکش و پیچ میں ہیں کہ آیا عدالت کے اختیارات کو محدود کرنا
خلاف مصلحت تو نہیں ہوگا۔

اب رہی تیسری تجویز۔ سو یہ امریکہ کی آئینی روایات کے زیادہ مطابق ہے۔ مسٹر روزویلٹ کا
یہ خیال ہے کہ عدالت کے گذشتہ چند ایک فیصلوں نے حکومت کا احترام لوگوں کی نظروں
میں کم کر دیا ہے اس لئے وہ اس خیال پر زور دیتے ہیں کہ دستور کو جوں کا توں رہنے دیا جائے

اور معمر ججوں کو تبدیل کر دیا جائے۔ عدالتِ عالیہ کے اراکین میں ایسے افراد ہونے چاہئیں جو ملک کی معاشی اور سیاسی ضروریات کو پیش نظر رکھیں۔ ان کا مقصد محض یہی نہ ہو کہ دستوری حکومت کے کام میں روڑے اٹکائے جائیں، بلکہ انھیں دستوری نظام کو چلنے کا موقع دینا چاہیئے۔

اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ موجودہ عدالت عالیہ کی قیود سے امریکہ کو کسی نہ کسی طرح آزاد کرایا جائے۔ لیکن یہ مقصد اس طرح حاصل نہیں ہو گا کہ دستوری قوانین کا دائرہ تنگ کر دیا جائے۔ کیونکہ الفاظ اور عبارات کا مبہم ہونا بھی اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھتا ہے۔ دوم عدالتِ عالیہ کو تبصرے کے حق سے محروم کرنا بھی غلطی ہوگی۔ اب رہا آخری طریقہ کہ دستوری حکومت کے نظام کو عدالتِ عالیہ کی بیجا پابندیوں سے آزاد ہو کر چلنا چاہیئے تو یہی صورت بہترین ہے اس سے حکومت اور عدالت دونوں کا دائرۂ عمل جداگانہ رہے گا۔ اور تصادم کے امکانات دور ہو جائیں گے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ عدالت عالیہ کے ارکان ایسے ہوشمند افراد ہوں جو قانون پر نظرثانی کرتے وقت موجودہ سماجی اور معاشی حالت کو بھی نگاہ میں رکھیں۔ دیکھیں اس آئینی جنگ میں صدر جمہوریہ امریکہ کامیاب ہوتے ہیں یا عدالت عالیہ کا پلہ بھاری رہتا ہے۔

عدالت عالیہ (ع۔ ق)
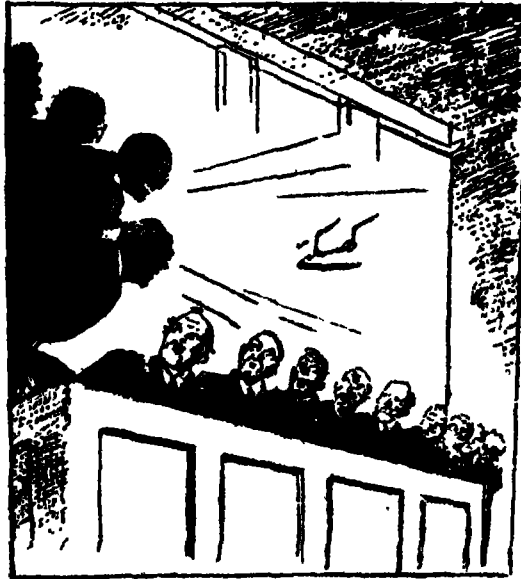
The George Matthew Adams Service, Inc.

اسلامی دنیا

ترکی عبدالحق حمید کا انتقال ترکی کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ حمید مرحوم علمی خاندان کے ایک فرد تھے، اُن کے والد خیر اللہ آفندی ترکی کے مشہور مورخ تھے، دادا عبدالحق نے سلطان محمود اور سلطان عبدالمجید کے زمانے میں ترکی میں پہلی طبی فیکٹری قائم کی تھی، مرحوم ۲ فروری ۱۸۵۲ء کو قسطنطنیہ میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم بھی وہیں پائی، اور سب سے پہلے ترکی کے سفیر متعینہ طہران کے سکریٹری بناکے ایران بھیجے گئے۔ اس کے بعد پیرس میں بھی اس خدمت پر مامور رہے۔ جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان بھی آئے اور سفیر ترکی کی حیثیت سے یہاں مدتوں مقیم رہے۔ اس کے بعد ایک زمانے میں بلجیم میں ترکی، وکیل التجار بھی رہے۔ ۸۶ سال کی عمر میں وفات پائی، ترکی میں عام طور پر زبردست ماتم کیا گیا۔ نماز جنازہ میں ہزارہا آدمیوں نے شرکت کی جن میں خود مصطفےٰ کمال بھی شامل تھے

مرحوم اس دور کے جس کو خالدہ خانم نے عہد تنظیمات سے تعبیر کیا ہے، سب سے بڑے شاعر تھے۔ اور اس حلقے میں اگر اپنی ذاتی صفات اور اپنی تعلیم کے لحاظ سے نہیں تو اپنے آرٹ کے لحاظ سے ضرور سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ترکی زبان میں ناٹک لکھے جو ادب جدید کی مستند کتابوں میں شمار ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ترکی روحانی شاعری کا اُن پر خاتمہ ہوگیا۔ مرحوم کی تصانیف نے ادب جدید کا معیار بہت بلند کر دیا اگر اُن کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہوجائے تو وہ یقیناً بین الاقوامی شہرت حاصل کرلیں۔ ان کتابوں میں ظلم اور نااتفاقی کے خلاف شدت سے احتجاج کیا گیا ہے۔ گو ان میں پرانے زمانے کے قصے ہیں، مگر اس نے جابجا سلطان عبدالحمید کے استبداد پر خوب چوٹیں کی ہیں۔ اس کے نزدیک ظلم وجور۔ زمانے کے تغیرات سے بے خبری، تعلیم کی کمی، سرکاری ملازمتوں کا کوئی باضابطہ محکمہ نہ ہونا۔ حاکم ومحکوم میں باہمی اعتماد و اعتبار نہ رہنا، سب ملک کے زوال اور تباہی کی علامتیں ہیں۔

ذیل میں مرحوم کی ایک چھوٹی سی عبارت کا آزاد ترجمہ ملاحظہ فرمائیے، یہ وہ موقع ہے

جبل طارق ابن زیاد فاتح ہسپانیہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے۔

تلے طارق آج تو شاہانِ ہسپانیہ کے خزانے میں کھڑا ہے ۔ دیکھ تو کہاں سے کہاں پہنچ گیا، شام سے طلیطلہ میں غریبوں کی جھونپڑی سے شاہوں کے خزانے میں مگر یاد رکھ ایک دن تجھے قبر میں بھی جانا ہے (بادشاہوں کے تاج دیکھ کر اور انھیں ہاتھوں میں لے کر) تیرے ہاتھوں میں یہ چمکدار چیزیں کیا ہیں جن پر نظر نہیں ٹھہرتی؛ بڑے بڑے بادشاہوں کے ٹوٹے پھوٹے تاج یہ آج تیری مٹھی میں ہیں، گذری ہوئی عظمت اور شوکت کے بےچین گواہ ۔ مگر خود تو کیا ہے اے فتح مند سپہ سالار؟ فقط قبروں کا محافظ خبردار ان تاجداروں کی تقلید نہ کرنا ۔ جو ان تاجوں کے مالک تھے ۔ وہ نادان اور مغرور تھے، انھیں انسان کی عاجزی اور بےکسی کا علم نہیں تھا اور زمانے کا تغیر نظر نہیں آتا تھا ۔

آج تو اُن کے شاندار محل میں کھڑا ہے ان کی دولت کا مالک ہے۔ تو نے اُن کے گڑے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈھ لیا ہے ۔

تقدیر کے دھارے کا پلٹنا دیکھ ۔ اس جلیل القدر قوم کا پلٹنا دیکھ جو آج تیرے قدموں کے تلے ہے ۔ یہ انقلاب تیرے ہی ہاتھوں ہوا ہے۔ مگر پھر بھی لے طارق ابن زیاد تو کیا ہے محض ایک ذرۂ بے مقدار ۔

پڑھ لے طارق ابن زیاد پڑھ ۔ ان میں سے ہر ایک تاج ایک بادشاہ کی عبرت ناک داستان سناتا ہے۔ پڑھ لے ابن ناصر کے غلام۔

راڈرک نے اپنی قوم پر ظلم کیا۔ اتنا ظلم کیا کہ آج قوم کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے ۔ دانش مند اس کی صحبت سے پرہیز کرتے تھے۔ اُس کے گرد خوشامدیوں کا حلقہ تھا۔ اور اس کے ملک پر جاہلوں اور نااہلوں کی حکومت اس شہر کی عمارتوں میں مجھے ایک مدرسہ، ایک ہسپتال بھی نظر نہیں آیا۔ جدھر دیکھیے

محل ہیں، یا قید خانے، یا گرجے۔

مارڈرک کو خبر نہ تھی کہ جس ملک کا بادشاہ ظالم ہو جس کے باشندے جاہل اور بے بس ہوں، اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔ کہ غیر قومیں اسے کچل کر رکھ دیتی ہیں۔" (خطبات خالدہ خانم)

جمہوریہ ترکیہ نے طے کیا ہے کہ ترکی حدود کے اندر صرف ترکی بولنا جائز ہے۔ عام لوگ تو ہمیشہ سے ترکی بولتے ہیں۔ اگر بولتے نہیں ہیں تو ترکی کو اپنی مادری زبان ضرور سمجھتے رہے ہیں اس وقت مشرقی ترکی (کردی قبائل) میں کردی بولی جاتی ہے۔ اور جنوب ترکی میں لوگ عربی بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ بلقان کی دوسری ریاستوں سے جو ترک مہاجر واپس آئے ہیں۔ اپنی اپنی زبانیں ساتھ لائے ہیں۔ لیکن یہ سب لوگ بہر حال ترک (مسلمان) ہیں۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ یہاں یونانی بھی آباد ہیں اور وہ ترکی کو مادری زبان کی حیثیت دینے پر آمادہ نظر نہیں آتے کہ یونان کی تہذیب و تمدن سے اُن کا نہایت گہرا تعلق ہے، دوسرے یہودی، عیسائی اور اپنی اقلیتوں کے لئے بھی یہ محل تامل ہے۔ اس لئے معاملہ ذرا پیچیدہ سا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ قومیں جن کا جذبہ ملی بیدار ہو چکا ہو، ایسی مشکلوں کو خاطر میں نہیں لایا کرتیں۔ ہم دیکھیں گے کہ ایک دن تمام ترکی عملی طور پر وحدت لسان کا قائل ہو گا۔

مصر برطانوی مصری معاہدہ کے بعد مصر میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی ہے۔ قوم اور اکابرین قوم کی خفتہ قوتیں اور فطری صلاحتیں بیدار ہو رہی ہیں ملکی دفاع اور استحکام کے لئے لوگ بڑی فراخ دلی کے ساتھ عطیات دے رہے ہیں۔ مجلس اقوام کی رکنیت میں بھی اب محض فیس داخلہ (۲۰ ہزار فرانک) ادا کرنے کی دیر ہے۔ جامعہ ازہر کا وفد جو ہندوستان آیا تھا قاہرہ پہنچ گیا ہے اس نے مصر کے ساتھ مسلمانان ہند کے گہرے تعلق کی تصدیق کرتے ہوئے دینی جماعتوں کی تفریق و تقسیم پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اس وفد نے حکومت مصر سے اپیل کی ہے کہ وہ

دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان کے طالب علموں کے تعلیمی اور اقامتی اخراجات بھی خزانۂ عامرہ سے ادا کرے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ معاہدۂ مصر و برطانیہ میں مراعات[1] کی تنسیخ کا مسئلہ ایک بین الاقوامی کانفرنس پر ملتوی کر دیا گیا تھا۔ حکومت مصر کی بار بار یاد دہانی اور اصرار کرنے کے باوجود برطانیہ اب تک حیلے حوالوں سے ٹالتی رہی۔ لیکن بالآخر اپریل میں مانٹرلو میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی تقریباً تمام متعلقہ ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے اور زبردست بحث مباحثہ رہا۔ حتیٰ کہ ۸ مئی کی صبح کو ایک معاہدے پر تمام حکومتوں کی طرف سے دستخط کر دئے گئے، اس معاہدہ کی تفصیلات تاحال اخبارات میں نہیں آئی ہیں۔ البتہ نحاس پاشا وزیر اعظم کے بیان سے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ "مصر اپنے مفاد کے لئے حق پر تھا اسی لئے یہ کانفرنس بخیر و خوبی تمام ہوئی" اور برطانوی وزیر کے اس ریمارک سے کہ "وہ امتیازات خصوصی جن کی تنسیخ عمل میں لائی گئی ہے واقعی موجودہ حالات میں مصر کے سراسر خلاف تھے فیصلے پر روشنی پڑتی ہے۔" مصر کے تعلیمی مسائل میں ایک دشواری پیدا ہوگئی ہے۔ ایک جماعت جس کی رہنمائی ڈاکٹر طہٰ حسین کر رہے ہیں چاہتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے نصاب سے دینیات کو خارج کر دیا جائے اور عورتوں کو (مغربی لباس میں) مردوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہو۔ شیخ الازہر مصطفیٰ المراغی ان تجاویز کو پسند نہیں فرماتے اور عام مغربی برائیوں کے پیش نظر اس روشن خیالی کو مصر کے لئے مفید اور مبارک نہیں سمجھتے

---

[1] ان مراعات کی رو سے مغربی حکومتوں کو۔ جن میں برطانیہ، بلجیم، ڈنمارک، فرانس، اٹلی، یونان، پرتگال، اسپین، سویڈن، امریکہ، جنوبی افریقہ، اور آئرلینڈ شامل ہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ مصر میں اپنے ڈاک خانے کھولیں۔ اپنے مدرسے قائم کریں۔ اور اپنے شفا خانے بنائیں اور عدالتوں کا قیام عمل میں لائیں۔ مصری حکومت خود مختار ہونے کے باوجود کسی سفید فوم مجرم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔

ملک کی دوسری با اثر جماعت شیخ کی تائید میں جوش کا اظہار کر رہی ہے ۔ اس سلسلے میں یہ خبر بھی قابلِ ذکر ہے کہ وزیر تعلیم نے ایک حکم نافذ کیا تھا کہ قبطیوں (مصر کی غیر مسلم اقلیت) کو قرآن کی آیات حفظ نہ کرائی جائیں ۔ اس حکم کے خلاف عام طور پر اظہار ناراضی کیا گیا ۔ پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر نے جواب دیا کہ قبطیوں کی طرف سے قرآن کے حفظ کے معاملے میں کوئی شکایت وصول نہیں ہوئی ہے " مصری اس تفریق کو بہت ناپسند کر رہے ہیں ۔ خود قبطی طلبا نے یہ اعلان کیا کہ قرآن کی بلاغت کی بنا پر ہم خود اس کی آیات کو یاد کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاں قرآن مسلمانوں کا مقدس سرمایہ دینی ہے وہاں عربی ادب کے لئے بے نظیر سامان افتخار بھی ہے ۔ اس لئے اگر قبطی قرآن کی تعلیم و حفظ پر اصرار کرتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ، ہمارے نزدیک محض غیر جانب داری کے اظہار میں کسی کو قرآن سے محروم کر دینا عقل مندی نہیں ہے ۔

شاہ فاروق کو طلبا اور تعلیم سے خاص دلچسپی ہے ، ، جاپانی طالب علم جو قاہرہ پہنچ چکے ہیں اور ۱۵ چینی طلبا ، جو جون میں مصر آنے والے ہیں ، ان کی تعلیم اور قیام کے تمام اخراجات شاہ فاروق جیب خاص سے ادا کریں گے ۔

ایران | ۲۵ر مارچ کو ایران میں سنہ ۱۳۱۶ کا آغاز ہوا ۔ نوروز کا جشن بڑے جوش و خروش سے منایا گیا ۔ شاہ پہلوی کو عنانِ حکومت ہاتھ میں لئے یہ بارھواں سال ہے ، اس عرصے میں معاشی اور سیاسی تمدنی اعتبار سے ملک کے اندر جو انقلاب پیدا ہوا ہے وہ ہر شخص کے لئے سامانِ حیرت ہے ۔ فلک بوس پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر جس تندہی کے ساتھ ریلوے لائن کی جوئے شیر نکالی گئی ہے وہ دشمنوں کو داد دینے پر مجبور کر دیتی ہے ، ایک مغربی اہل الرائے کا خیال ہے کہ " ایران سے زیادہ خوب صورت سڑکیں اس وقت دوسرے ملکوں میں مشکل سے مل سکتی ہیں " ایران میں اب ہر جگہ کار جا سکتی ہے ، پہاڑوں کے گرد گھومتے ، دریاؤں پر دوڑتے ، ریگستانوں میں فراٹے بھرتے ہوئے جہاں دل چاہے چلے جائیے ۔

سڑکوں اور ریلوں کے سلسلے میں شاہ پہلوی کا سب سے بڑا کارنامہ "ٹرانس ایرانین" ریلوے ہے۔ جس کے ذریعے وہ بحیرۂ خزر کو خلیج فارس سے ملا دینا چاہتے ہیں۔ اس کی تیاری میں عام وزراء اور مغربی دوستوں کی مخالفت کے باوجود شاہ نے محض اپنی ذمہ داری پر بے پناہ روپیہ خرچ کر ڈالا ہے۔ شاہ جہاں کو شاید تاج کی تعمیر سے وہ عشق نہ ہوگا جو رضا شاہ نے اس ریل کی تعمیر میں ظاہر کیا ہے۔ اس کے نزدیک اس کی اہمیت جسم ایران میں شہ رگ سے کم نہیں۔ اس ریل کا ایک حصہ شمالی مکمل ہو گیا ہے جس کا طول ۴۶۱ کلومیٹر اور ۲۰۰ میٹر ہے۔ اس کے علاوہ جنوب میں بھی ۲۶۱ کلو میٹر لائن طیار ہو چکی ہے حال ہی میں طہران کے ریلوے اسٹیشن کا خود شاہ نے سنگ بنیاد رکھا ہے۔ شمال، جنوب اور مشرق و مغرب کی ساری لائنیں اس نقطہ پر مرکوز کر دی جائیں گی۔ بندر شاہ پور اور بندر شاہ کے درمیان بھی ایک ریلوے لائن بچھائی جا رہی ہے۔

ترکی میں لاطینی حروف اختیار کرنے پر جس شدت سے کام لیا گیا تھا آج وہی سختی ایران میں اطالوی رسم خط کے خلاف برتی جا رہی ہے۔ دکانداروں کے بورڈ پر بھی لاطینی میں کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ اس حکم کے نافذ ہوتے ہی ایران کے بازاروں کے سارے بورڈ بدل گئے۔ غیر ملکی کمپنیوں، بنکوں اور کارخانوں کو بھی ایرانی جامہ پہننے پر مجبور ہونا پڑا۔

عراق حکومت حجاز کے ولی عہد امیر سعود[۵۱] گذشتہ مہینے دولت عراق کی دعوت پر بغداد تشریف لائے۔ عراقی حکومت نے بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور اعزاز و اکرام کے ساتھ مہمان رکھا۔ امیر سعود کے اعزاز میں بغداد میں ایک فوجی مظاہرہ ہوا۔ وزرا اور افسران حکومت

---

۵۱ حکومت حجاز کے دو مستقل حصے ہیں نجد اور حجاز جن کی ولایت سلطان ابن سعود کے دو بیٹوں فیصل اور امیر سعود کے سپرد ہے۔ امیر سعود بڑے لڑکے ہیں اور ۱۳۵۲ھ میں ولی عہد مقرر ہوئے ہیں۔ آپکے سپاہیانہ اوصاف بہت نمایاں ہیں۔ گذشتہ سال حج کے موقع پر ایک یمنی حملہ آور سے سلطان کی جان بچائی تھی۔

کے علاوہ ہزاروں عوام اس میں شریک ہوئے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں حجاز اور عراق
کی حکومتوں کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ ہوا ہے ولی عہد حجاز کی آمد نے اس معاہدے
میں جان ڈال دی اور تعلقات میں مضبوطی پیدا کر دی۔ امیر سعود کا یہ فقرہ خاص طور پر مشہور ہوا
"العراق منا و نحن منہ"۔ یہ تعلقات یوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایک ہمسائیگی اور
پھر اسلامی اخوت لیکن اگر دس بارہ سال پہلے کے حالات پیش نظر ہوں تو پھر تعجب بھی کم نہ ہوگا۔
شریف حسین مرحوم کو ترکوں کی مخالفت اور اتحادیوں کی حمایت کے صلے میں عرب کی سلطنت بخشی
گئی تھی۔ ابن سعود (امیر نجد) نے ۱۹۲۴ء میں حجاز پر حملہ کیا علی (ابن حسین) جو اس وقت باپ کے
جانشین تھے۔ مقابلے کی تاب نہ لاسکے، جان بچا کر حجاز سے چلے آئے اور اپنے بھائی فیصل امیر عراق
کے یہاں پناہ گزین ہوئے۔ حجاز پر ابن سعود کا پرچم لہرانے لگا۔ اس کے بعد کویت کے مسئلہ پر
فیصل سے بھی ابن سعود کی خاصی کشمکش رہی۔ اس وقت سے شریف حسین اور ان کے تینوں فرزند
فیصل (شاہ عراق)، عبداللہ (امیر شرق اردن) اور علی (سابق امیر حجاز) برابر انتقام کی فکر
میں رہے۔ حتیٰ کہ حسین، فیصل اور علی راہی ملک عدم ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغض و عناد
بھی ان کے ساتھ رخصت ہوا۔ شاہ غازی والی عراق اس معاملہ میں خاص طور پر قابل داد ہیں کہ
انھوں نے بڑی عالی ظرفی کے ساتھ یہ نیک قدم اٹھایا۔ ان کے چچا امیر عبداللہ امیر شرق اردن
اس تعلق پر بہت برہم ہیں۔ وہ اس فکر میں تھے کہ عراق شام اور فلسطین کو ملا کر حجاز کے خلاف محاذ قائم کیا جائے

خبر آئی ہے کہ حکومت عراق سرحد کے یزیدوں سے آخری طور پر نبٹ لینا چاہتی ہے سلیمان
حکمت وزیراعظم عراق نے طے کر لیا ہے کہ یا تو یزیدوں کو فوج میں بھرتی کریں گے یا ان کا
قلع قمع کر دیں گے۔

یزیدی عراقی فوج کو ہمیشہ پریشان کرتے رہتے ہیں۔ ان کے عقیدے میں عراقی حکومت
کافروں اور شیطانوں کی حکومت ہے اور اس کو تباہ و برباد کرنا عبادت و جہاد ہے۔ اُن کے
حملے یکایک ہوتے ہیں اس لئے زیادہ نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک گروہ ہی کا

ایک قبیلہ ہے لیکن عقائد میں اُن سے بہت کچھ مختلف ہیں، اُن کی آبادی زیادہ تر عراق کے شمال (نزد موصل) مغربی سرحد (موصل سے ۱۰۰ میل) اور جبل سنجر وغیرہ میں ہے۔ یہ لوگ بھی بڑے جنگ جو اور خوں خوار ہیں۔ حکومت عراق میں انکی تعداد ۴۰ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ عقائد اس کے عجیب ہیں۔ ایک فرشتہ طاؤس (مور) اُن کا معبود ہے۔ جگہ جگہ اس کے مجسمے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کا باقاعدہ ایک نظام ہے۔ ان کا ایک شیخ اعظم ہے جو حاکم اعلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جرائم کی سخت سے سخت سزا دینے کا مجاز ہے۔ اسی شیخ کے اشارے پر یزیدی شیطانوں کے خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں۔

البانیہ البانیہ کی آبادی میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور اس لحاظ سے اسے اسلامی ریاست کہا جا سکتا ہے۔ یہ احمد زوغو کے دورِ حکومت میں ترقی کر رہی ہے۔ ایک مغربی سیاح ترانا (دارالسلطنت) میں "جدید کشادہ سڑکوں پر برقی روشنی، خوش نما عمارتوں کا تسلسل نئے رنگ روپ میں پرانی مسجدوں کا طمطراق، جا بجا قابلِ تعریف ٹریفک کا معقول انتظام اور ہوائی جہازوں کا وسیع مرکز" دیکھ کر اس چند سالانہ انقلاب پر حیرت کا اظہار کرتا ہے۔ البانیہ آہستہ آہستہ ترکی کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ اگرچہ ترکی کی بجائے لاطینی[۵۱] حروف استعمال کرنے میں وہ ترکی کے امام کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابھی حال میں حکومت نے برقعہ کی ممانعت کا قانون پاس کیا ہے جس کی منظوری مجلسِ دینی نے بھی دے دی ہے۔ اب تک یہاں پردے کا سختی سے رواج تھا۔ البتہ نیچے کے طبقوں میں ہندوستان کی طرح وہاں بھی برقعہ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ سوائے ایک خاص قصبہ کے جہاں

۵۱۔ البانیہ کے باشندے [illegible]ء سے ترکی رسم خط کی بجائے لاطینی حروف استعمال کرتے ہیں۔

معمولی مزدور عورتیں بھی رستا پردے پر مجبور تھیں ۔ اور دلچسپ بات یہ تھی کہ ان کے برقعہ میں صرف بائیں آنکھ کے لئے ایک سوراخ کھلا رہتا تھا۔ یہ اصلاح اور دوسری ترقیاں ہمارے لئے کسی مسرت کا باعث نہیں ہو سکتیں ۔ اس لئے کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اٹلی کے مفاد کی خاطر اور مسولینی کے اشاروں پر ہو رہا ہے ۔ البانیہ کی ان ترقیوں کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے مفید سے مفید تر ہوتا جا رہا ہے۔

(ع ، م)

سیاسی رواداری

"Die Brennessel," Munich.

اشتراکی روس میں "بادشاہ سلامت" کی مشق

مارشل ٹوکاچیوسکی اور موسیو لٹوینوف کی جشن تاج پوشی میں شرکت

دنیا کی پیٹھ پر جنگی مصارف کا بوجھ

"چار سال کے مختصر عرصے میں ہٹلر نے عساکر المانی کی قوت کہاں سے کہاں پہنچا دی"
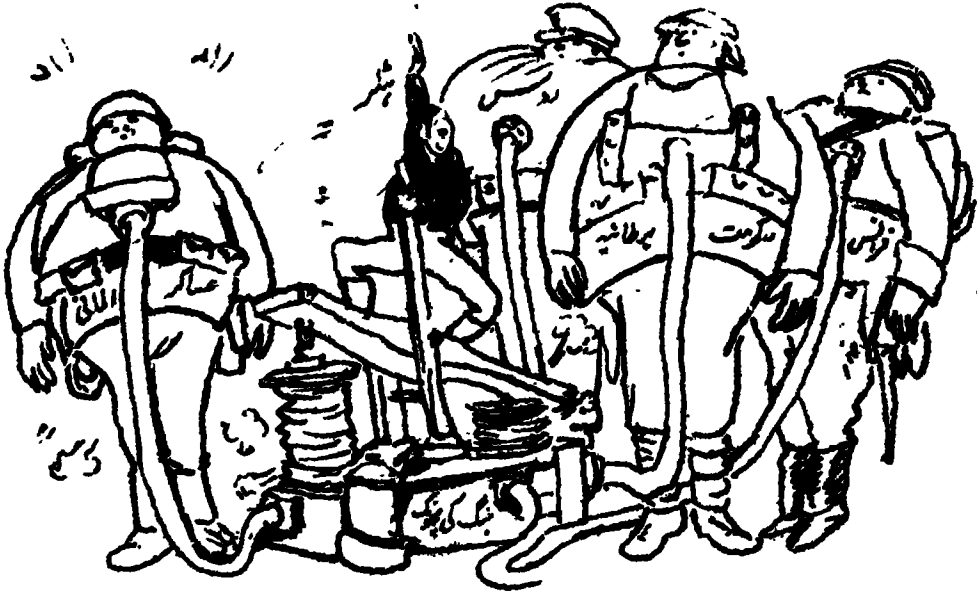
اور دوسرے عساکر؟

Daily Herald
London.

جامعہ ملیہ میں جہاں طلبہ کی دینی اور دنیوی تعلیم کا انتظام ہے وہاں ملک کو باہر کے مشاہیر سے روشناس کرانے کیلئے توسیعی خطبات کا انتظام بھی کیا جاتا ہے ترکی قوم کے مایۂ ناز اہل عمل اور اہل فکر میں سے تین شخصیتیں خاص اس غرض سے ہندوستان تشریف لا چکی ہیں :-

۱۹۳۳ء - غازی رؤف بے　　۱۹۳۴ء - ڈاکٹر بہجت وہبی

۱۹۳۵ء - خالدہ ادیب خانم

یہ لکچر دہلی اور بیرون دہلی کے ہزارہا آدمیوں نے سنے۔ اب اردو اکادمی انہیں کتابی صورت میں شائع کر رہی ہے۔ غازی رؤف بے اور ڈاکٹر بہجت وہبی کے خطبات ابھی شائع نہیں ہوئے، البتہ خالدہ خانم کے خطبات "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

اردو اکادمی اور مکتبہ جامعہ

اردو زبان میں بلند پایہ لٹریچر کی فراہمی جامعہ کا ایک خاص مقصد ہے ہمارا
ن عروج دنیا کی دوسری اقوام کی طرح بہت کچھ اچھے لٹریچر پر منحصر ہے۔ جامعہ
نے اپنی زندگی کی مختصر مدت میں ایک اکادمی اور مکتبہ قائم کیا ہے اکادمی تصنیف و
الیف کا شعبہ ہے اور مکتبہ سے ان کتابوں کی فروخت ہوتی ہے۔ اب تک بچوں
بڑوں کیلئے تقریباً سو کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اکادمی کی جانب سے ایک
ادبی ماہوار رسالہ "جامعہ" چھپتا ہے۔ مکتبہ میں اکادمی کی کتابوں
علاوہ اردو ادب کی تمام کتابیں رہتی ہیں۔ اس علمی اور ادبی خزانے
سے مزید واقفیت حاصل کرنیکے لئے فہرست کتب طلب کیجئے۔

چند خاص مطبوعات

معاہدہ عمرانی	آزادی
پستالوزی	نفسیات شباب
تاریخ الامت	تاریخ فلسفۂ اسلام
سیرت محمد علی	تلاش حق
میدان عمل	شعلۂ طور

نقش و نگار

جامعہ کی شائع کی ہوئی بچوں کی کتابیں
اُردو میں بچوں کے لئے نئی نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ جامعہ نے بھی اس کام میں حسب مقدور حصہ لیا ہے۔ جامعہ کی سب کتابوں میں ایک خاص رنگ یہ ہے کہ بچے پڑھیں تو اُنکے اخلاق پر اچھا اثر پڑے اور وُہ سچے مسلمان، اچھے شہری اور سچے محب وطن بنیں۔
مذہب اور تاریخ ان کتابوں کی روح ہے جو ادب کے قالب میں پھونکی گئی ہے بحیثیت مجموعی یہ کتابیں بچوں کیلئے ایک خاموش معلم کا کام دیتی ہیں۔
پیام تعلیم
جامعہ سے بچوں کیلئے ایک ماہانہ رسالہ "پیام تعلیم" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے ذریعہ انھیں اچھی اچھی کہانیاں سنائی جاتی ہیں اور خالی وقت میں مصروف رکھنے کیلئے کار آمد مشغلے بتائے جاتے ہیں۔ سال میں ایکبار سالنامہ شائع ہوتا ہے۔ جسے مفید اور دلچسپ معلومات کا مخزن کہنا چاہیے۔